A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

دل موم کا دیا

سائرہ رضا

خواتین ڈائجسٹ

37۔ اردو بازار کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول 2013ء

ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ

پریس .... پرنٹ لائن

قیمت .... روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار کراچی

انتساب

اپنے پاپا جی

محمد سلیم رضا کے نام

جو فقط یہ جانتے تھے کہ میں صبح سویرے پودوں کے پاس بیٹھ کر

خاموشی سے ''پتا نہیں'' کیا لکھتی رہتی ہوں؟؟؟

اگر وہ آج ہوتے تو دیکھتے۔۔۔۔

میں ''یہ سب'' لکھتی رہتی تھی۔

اپنی امّی

شاہدہ جبین فیروز احمد کے نام

جن کے ''استاد'' ہاتھوں نے کپکپاتی انگلیوں میں قلم

دے کر کہا لکھو ''الف''

(یہ سب اُسی الف کی برکت ہے)

سائرہ رضا

پیش لفظ

اپنی کہانیوں کے بارے میں کچھ بھی کہنا، وضاحت دینا، دوحرفی الفاظ میں بتانا میرے لیے لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔

دریا کو کوزے میں بند کر دینے والے لوگ تو بڑے ہی قابل ہوتے ہیں میں تو بس۔۔۔

میں کہیں سے بھی مبلغ یا ناصح نہیں ہوں۔

بس کردار پیش کر دیتی ہوں۔ نہ اچھوں کی مدح سرائی میں صفحات کالے کرتی ہوں نہ بُروں کے منہ پر کیچڑ اچھالتی ہوں۔ انہیں جو، جیسا کی بنیاد پر قاری کے سامنے رکھ دیتی ہوں۔

اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ کس کس کردار کو کون کون سے خانوں میں جگہ دیتا ہے۔

ہاں مگر میں نے یہ ضرور بتایا ہے کہ۔۔۔

تمکنت جلال بیگ، آمنہ یعقوب، مریم، بشائر سجاد جیسے کردار جو اپنی ذات پر اور اپنے تخلیق کار کے فیصلوں پر کیسے آنکھ بند کر کے یقین رکھتے ہیں۔

ان کے چاروں طرف اپنی اپنی بولیاں بولنے والے لوگ ہیں۔ انہیں ہرانے والے، ڈرانے والے، دھمکانے اور بہکانے والے۔۔۔ مگر وہ اپنے اندر کی مضبوطی اور خدا پر یقین کے سہارے ڈٹے رہتے ہیں۔

ان کہانیوں میں بھٹکے ہوئے لاعلم اور کم علم کردار بھی ہیں۔ کوتاہ بین۔۔۔ جیسے یمنیٰ محبوب، اتباع فاطمہ، عدینہ، چندرا اور الفت۔۔۔ اور کچھ ایسے کردار جو ہلکا سا بھٹک کر جھرجھری لے کر بے دار ہو جاتے ہیں جیسے اصدق عبدالقیوم، یمنیٰ، اتباع فاطمہ۔

کچھ ایسے ناعاقبت اندیش جو اسی شاخ کو کاٹ ڈالتے ہیں جس پر آشیانہ ہوتا ہے (اور پھر بھی راہ راست پر نہیں آتے بلکہ انہیں اس کا ادراک بھی نہیں ہوتا کہ کیا کر بیٹھے) الفت جیسے۔

یہ کہانیاں صبر، انتظار، یقین، دعا، توکل اور محبت کے گرد گھومتی ہیں۔

لیکن۔۔۔

صبر جبر کے بغیر، انتظار توکل کے ساتھ۔۔۔ دعا یقین کے ہمراہ اور محبت اپنے ہر روپ میں۔۔۔

رہی میں اور میرا ہنر۔۔۔

ہم تخلیق کار قطعاً کوئی آسمانی مخلوق نہیں۔۔۔ اللہ نے جب انسانوں میں کاموں کی تقسیم کی تو کچھ کے حصے میں قلم آیا۔ ہم صرف قلم اٹھاتے ہیں۔ الفاظ تو سارے اُسی کے ہیں۔ وہی دماغ کی گرہ کھولتا ہے اور صفحہ قرطاس پر رنگ بکھرنے لگتے ہیں۔

دعا فقط یہ ہے کہ۔۔۔ ہم جیسے ادنیٰ ہرکارے وہی کہیں جو اللہ چاہتا ہے۔ اس قلم سے شر نہ نکلے۔

فقط خیر۔۔۔

دعاؤں کی طلب گار
سائرہ رضا

دل موم کا دیا

Pakistanipoint

''**یار!** عورت صرف پاکستانی ہوتی ہے۔ اب کی بار صرف پاکستانی... لاسٹ چوائس۔''

ندیم نے قطعیت سے کہا، حال ہی میں وہ دو ماہ پاکستان رہ کر آیا تھا۔ اس نے یہاں شادی کی تھی۔ دو بچے بھی تھے لیکن بیوی کو وہ زمانے پہلے فارغ کر چکا تھا۔ بلکہ فارغ کیا وہ خود ہی ایک روز غائب ہوگئی تھی۔ اب ہر جگہ جائز ناجائز منہ مارنے کے بعد وہ یہی فتوی دیتا تھا۔

''تو پھر پاکستان سے ہی کوئی لے آتے۔ یا ملی نہیں کوئی۔'' وہ مچھلی کا قتلہ اٹھاتے ہوئے ہنسا۔

''نہیں یار! ۔۔۔'' وہ کشن پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے ناامید ہوا۔

''اس بار تو آپا نے ہیرا ڈھونڈ نکالا تھا۔ کوہ نور۔۔۔ یہ اپنی ملکہ کے تاج سے زیادہ آب و تاب رکھنے والا۔ خیرہ کر دیا آنکھوں کو۔۔۔ مگر۔۔۔''

''یہ دو ماہ پاکستان میں رہ کر جناب کی اردو بہت اچھی نہیں ہوگئی۔''

''یہ اُس حُسن سادہ، اداس آنکھوں اور مسکراتے لبوں کا کرشمہ ہے، بندہ خود بخود شاعر ہو جائے۔۔۔ غزل کہے۔۔۔ نظم سنائے۔۔۔ اور کچھ نہ کہے تو قیس کی طرح جنگلوں میں نکل جائے۔''

''وہ اتنی گنوں والی تحریک غزل اور موجد نظم۔۔۔ پھر ساتھ کیوں نہ آئیں۔۔۔ تم تو خود ہی برتن دھوتے پائے گئے ہو۔'' وہ یوں گردن اٹھا کر چہار اطراف دیکھنے لگا جیسے وہ کسی ٹیبل دیوار یا پنکھے پر بیٹھی نظر آئے گی۔

''یہی تو ہو نہیں سکا۔۔۔ لیکن میں آپا سے کہہ آیا ہوں۔ مجھے وہی چاہیے۔''

''اور آپا نے کہا ہوگا کیوں نہیں میرے چاند۔۔۔ ابھی لو۔''

''یار ابھی لو والی بات۔۔۔ ہو ہی نہیں سکتی۔'' ندیم کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں پکچرز دکھاتا ہوں، مووی یہیں ہے۔ پھر کہنا میں ایسے ہی شاعر نہیں ہوا۔''

وہ بیڈروم کی جانب بڑھا تو اس نے پرسکون ہو کر پیر پھیلا لیے۔ وہ اس کا نو سال پرانا دوست تھا۔ یہ کراچی سے آیا تھا اور وہ حیدر آباد سے تعلق رکھتا تھا۔ دو بیٹے تھے بالترتیب پندرہ، چودہ برس

کے۔۔۔اس کی زندگی میں اس وقت قانونی طور پر بہر حال کوئی عورت نہیں تھی۔

بیشتر ایشیائی باشندوں کی طرح ہر جگہ سے خوار ہی، کاٹنے کے بعد اب واحد چوائس اماں کی پسند رہ گئی تھی۔وہ کہہ کر گیا تھا۔آپا نے اس کے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔چونتیس پینتیس برس کی کنواری، خوب صورت، پڑھی لکھی خاندانی۔۔۔ندیم کے خاندان میں اس بار شادیوں کے حوالے سے بہت بڑا میلہ لگا تھا۔ندیم نے وہیں اسے اس کی بے خبری میں دیکھا۔وہ لٹو ہو گیا تھا۔لیکن ہوا کیا۔

ندیم کے ہاتھ میں البمز تھے اور لیپ ٹاپ۔۔۔وہ ٹشو سے ہاتھ پونچھتا سیدھا ہوا اسے ایکسائیمنٹ ہونے لگی تھی۔اس کی زندگی میں زمانوں سے سننے دیکھنے اور سوچنے تک کی رونق نہیں تھی۔

مایوں مہندی بارات اور ولیمہ کی تقریبات کی پروفیشنل فوٹو گرافر کی عکس بندی تھی۔وہ ہر تصویر کو بہت خوشی سے بغور دیکھ رہا تھا۔رنگ برنگا تنا ہوا شامیانہ اور خوب صورت شوخ مشرقی رنگ۔وہ کسی ہی چہرے کو نہیں کھوج رہا تھا۔بس رنگوں کو دل میں اتار رہا تھا۔۔۔اسکاٹ لینڈ جیسے کنجوس شہر میں رہتے اس کا دل بھی سکڑ گیا تھا۔

ندیم اس کی کیفیت سے بے پروا تیزی سے تصویریں بڑھا رہا تھا۔

"یہ۔۔۔یہ۔۔۔دیکھو۔" اس کی نظروں نے بہت اشتیاق سے انگلی کے نیچے دیکھا تھا اور زمین اپنی گردش سے رک گئی تھی۔

گرتے جھرنے اچانک جیسے برف کی طرح جہاں کے تہاں جم گئے۔

گھڑی کی سوئیاں تھم گئیں۔مگر وقت نہیں رکا تھا۔وہ تیرہ سال آگے بڑھ چکا تھا۔

اسے لگا اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے لیکن نہیں۔۔۔وہ ایک پل کو رک کر اب اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔

اس کا دل ندیم کی انگلی کے نیچے تھا اور انگلی کا یہ بوجھ سینے پر دھری سل کی طرح تھا۔وہ قطعاً فراموش کر چکا تھا۔آج انگلی کا بوجھ ناقابل برداشت تھا۔کل اس نے خود ہی تو اس دل پر پیر رکھ دیا تھا۔ آگے بڑھ گیا تھا۔

ندیم بہت اشتیاق اور فخریہ انداز میں اپنی مدح سرائی کی تصدیق چاہتا تھا۔

یہ پل دیکھنے سے پہلے کیا ہی اچھا ہوتا وہ بینائی کھو دیتا۔۔۔یا چلو۔۔۔گویائی چھن جائے۔

"بہت اچھی۔۔۔بہت اچھی ہے۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"مل۔۔۔ملی کیوں نہیں۔۔۔کیا میرڈ ہے۔" جو سوال دل و دماغ پر ضربیں مار رہے تھے۔اس نے ان کا الٹ ہی پوچھا۔

"ہاں۔۔۔نا۔۔۔پندرہ سال ہو گئے یار۔۔۔لگتی نہیں ہے نا۔۔۔؟"

وہ نشانے پر کھڑا تھا اور اس پر تیر برسائے جا رہے تھے۔سر، آنکھیں، گال، ناک جگہ جگہ تیر گڑے تھے۔

پر یہ والا تو دل کے اندر گڑ گیا۔

مگر نشانہ باز کے پاس ابھی تیروں کا اسٹاک ختم نہیں ہوا تھا۔ دن کا تو تھا اور ہمت جوان۔۔۔پیلے دوپٹا قمیص

کے ساتھ سفید تنگ پاجامہ پیروں میں ننھے سفید اور پیلے نگوں والی دوپٹی کی چپل پہنے ہوئے۔ یہ گروپ فوٹو تھی، گول میز کے گرد بیٹھے ہر چہرے کو دکھا گیا تھا مگر تصویر کا اینگل یوں تھا کہ وہ سرتاپا نمایاں تھی۔

کریم کلر کے لمبے گھیر دار فراک کے دامن پر سنہری بنارسی باڈر تھا۔ وہ ساتھیوں کے ساتھ کھڑے سب میں نمایاں تھی۔ دوپٹا شانے پر پن سے اٹکا تھا۔ ہاتھ میں سنہری پرس۔۔۔

اور وہ آخری اکیلی تصویر جو یقیناً بے خبری میں اتاری گئی تھی۔ کسی نے وحشیانہ عجلت سے دل میں گڑے تیر کو نوچ لیا تھا۔ بھل بھل خون پیروں کے پاس ڈھیری بنتا جا رہا تھا۔

''ساڑھی شادی کے بعد۔ آئین میں نہیں لکھا۔''

''اچھا چلو بس ایک بار پہن کر دکھا دو پلیز۔''

''ساڑھی پہنتے نہیں ہیں، باندھتے ہیں۔'' وہ کھلکھلائی تھی۔

''جملے نہیں پکڑو۔۔۔ جو کہتا ہوں، وہ شرافت سے مان لو۔''

''تھوڑا صبر کریں نا۔۔۔ شادی کے بعد پہنوں گی ہر روز۔۔۔ آپ تنگ ہو جائیں گے۔''

''نہیں ہوں گا، شادی کے بعد پہلی بارش میں بھیگتے ہوئے جب میں تمہاری کمر میں ہاتھ ڈال کر گاؤں گا۔

بادل یوں گرجتا ہے ڈر کچھ ایسا لگتا ہے۔ دھڑام۔

اور تم ڈر کر میرے سینے میں منہ چھپا لو گی۔۔۔ تب تم سرخ ساڑھی میں ہو گی۔ سمجھیں۔''

''آپ کی ہر تان گانے پر کیوں ٹوٹتی ہے۔''

''دراصل جب بھی کوئی فلم دیکھتا ہوں رومانٹک سانگ تو ہیرو کی جگہ خود کو اور ہیروئین تم میں بدل جاتی ہے۔''

''فلم میں ٹریجک سانگز بھی ہوتے ہیں۔''

''میں اپنی زندگی کی فلم میں کوئی ٹریجڈی نہیں آنے دوں گا۔''

ہلکی سرمئی ساڑھی پر فیبرک پینٹنگ کے گلابی پرل والے چمکیلے پھول بہت فاصلے سے موجود تھے۔ پلو البتہ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ گلابی بند کالر کا بلاؤز پہنے وہ گھڑی کا اسٹرپ بند کر رہی تھی۔

''تو گویا وہ شادی کر چکی۔۔۔'' وہ ویسی کی ویسی تھی۔ اس نے کچھ دھیان آنے پر تصویریں پلٹیں مگر اس کے ہاتھ ابھی بھی چوڑیوں سے خالی تھے۔ بے حد سونے۔

''چوڑیاں کیسے پہنتی، وہ تو آپ دلائیں گے۔''

''تو کیا اس کا شوہر چوڑیاں نہیں لے کر دیتا یا پھر وہ اب بھی۔۔۔ نہیں نہیں۔''

''جب میرڈ ہے تو تم نے تصویریں کیوں رکھیں۔'' اس کا لہجہ ٹھنڈا برف تھا۔

''ارے کہہ کر آیا ہوں آپا سے۔ عقل دیں اسے۔۔۔ جان چھڑائے ایسے نام نہاد شوہر سے۔'' ندیم نے حقارت سے کہا تھا۔

''پاگل تو نہیں ہو گئے، وہ اپنا شوہر کیوں چھوڑے۔'' وہ بھونچکا رہ گیا۔

''ارے نکاح ہوا ہے۔ رخصتی نہیں ہوئی۔ بیس بائیس برس کی عمر میں نکاح ہوا تھا۔ بیچ میں خاندانی

چپقلش آ گئی تو اگلا غصے میں طلاق دے کر غائب ہو گیا۔ تیرہ چودہ برس سے غائب ہے۔ یہ بیٹھی ہے اس کے نام پر۔''

''تو جب مطلقہ ہے تو تمہارے لیے کیا رکاوٹ ہے۔'' وہ الجھ گیا۔

''ارے یار طلاق باضابطہ طور پر نہیں دی نا۔۔۔ ایک بار ہی علیحدگی کے الفاظ استعمال کیے۔ ابھی تک اس کی بیوی ہے۔ نکاح پر نکاح کرے گی کیا۔

میں نے کہا ہے آپا۔۔۔ تمہارے لیے چیلنج ہے اسے قائل کرو کہ زندگی برباد نہ کرے۔۔۔ عدالت سے رجوع کرے تو دنوں میں فیصلہ مل جائے گا۔''

''تو آپا قائل کیوں کریں۔ وہ اتنے سال سے کیوں بیٹھی ہے'' ۔اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

''یار!'' ندیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہی تو ہے مشرقی عورت جو دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ جوانی کے خوب صورت سال برباد کر دیے۔ مگر ابھی اس کا بگڑا ہی کیا ہے ۔ مذہب کی اجازت بھی ہے مگر مشرقی عورت کا دل اللہ نے نجانے کس چیز سے ڈھالا ہے اپنی وفا کے معاملے میں بہت ہٹ دھرم ہوتی ہے۔ ایک مرد کا منہ دیکھا اب قبر کا منہ۔۔۔ بس۔'' وہ ستائشی انداز میں کہہ رہا تھا

''تمہارا مطلب ہے۔ یہ آج بھی اسی شخص کی بیوی ہے۔ اس کا انتظار کر رہی ہے۔'' اس کی آواز دور کسی کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

''تو اور کیا ۔۔۔ ورنہ مجھے آج تک کسی نے انکار کیا ہے۔'' ندیم کا لہجہ زعم سے بھرپور تھا۔

☆☆☆

''لیکن عید کارڈز ابھی سے کیوں۔ ابھی تو رمضان بھی شروع نہیں ہوئے۔'' تمکنت بیگ نے خوب صورت گلابی لفافے کو حیرت سے الٹتے پلٹتے سوالیہ نگاہوں سے مہدی کو اور پھر پوری کلاس کو دیکھا۔

''ٹیچر! اس بار ہم رمضان میں کب مل سکیں گے، پورا جون اسکول آئیں گے اور اور جولائی اگست میں چھٹیاں تو عید گریٹنگ کارڈ کیا عید گزرنے کے بعد دیتے۔''

وہ گلابی لفافے کو بصد احتیاط کھول رہی تھی ۔

''سو کیوٹ۔۔۔ زبردست۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرن لپکی وہ اندرونی متن پڑھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

''ہم سب آپ کے لیے کارڈ لائے ہیں ٹیچر۔۔۔ یہ دیکھیں۔'' کلاس مانیٹر ثنا نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو باقی ساری کلاس کے ہاتھ بھی بلند ہوئے اور سب میں رنگ برنگے سادے، چمکیلے، پھولوں والے لفافے تھے۔

''مائی گاڈ۔۔۔!'' وہ حیرت سے مسکرائی۔

اچھا پھر باری باری آئیے خاموشی سے اور دیتے جائیں ڈسٹربنس نہیں ہونی چاہیے۔ پن ڈراپ سائلنس کے ساتھ۔۔''

اس نے چاک ٹیبل پر پھینک کر ہاتھ جھاڑے۔

چند منٹوں میں ڈھیر سا لگ گیا۔

''اب میں ان سب کو ابھی تو نہیں پڑھ سکوں گی ہاں رات میں گھر جا کر خوب اہتمام سے دیکھوں گی۔'' بچوں کے چہرے لٹک گئے۔

''ٹیچر! آپ نے مہدی کا کارڈ تو ابھی ہی پڑھ لیا تھا۔''

''ارے!'' اسے ہنسی آ گئی۔ ''میں سمجھی وہ ایک ہی کارڈ ہے مجھے کیا خبر آپ سب کا آج کا پلان کیا ہے۔ اور یہ اتنے سارے ہیں ایک پیریڈ تو کم ہو گا انہیں دیکھنے کے لیے۔''

''ٹیچر تھوڑے سے تو پڑھ لیں نا۔'' منت بھری بسورتی آوازیں اور آس پر ''بس ٹیچر تھوڑے سے تو پڑھ لیں'' کے تائیدی جملے۔۔۔ تمکنت نے ہار مان لی۔

اس نے ساتویں جماعت کے بچوں کے لیول پر آنے کے لیے بڑے شرارتی انداز میں آنکھیں موند کر ایک کارڈ اٹھا لیا۔

آخری رو میں بیٹھے عمران نے ''یاہو'' کا نعرہ بلند کیا۔ تمکنت نے مسکرا کر دیکھا۔

سرخ گتے پر گلابی پھولوں کے گچھے سے تھے خوشبو شاید پرفیوم کی تھی۔

عید کا دن اور آپ کی یاد
جیسے بنا گوشت کے دھوکا کباب

تمکنت نے ہنسی ضبط کی۔

''خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔''

تمکنت کے دل پر گھونسا سا پڑا (ایسی ہزاروں عیدیں۔۔۔؟) بے رنگ، خالی کلائیوں اور سونے ہاتھوں والی۔۔۔ آنسوؤں سے دھلے چہرے۔۔۔ کے ساتھ ہر دستک پر امید بھری نگاہوں سے کوار دیکھنا اور ناکام پلٹتی نظروں کا دکھ۔

تیرہ سال میں چھبیس عیدیں۔۔۔ اور چھبیس چاند راتیں۔۔۔

عذاب راتیں

اور ایسی ہزاروں عیدیں۔۔۔۔۔؟

اس کا دل کسی شکنجے میں تھا ڈھیرے ڈھیرے ٹکڑے ہو کر گرتا پگھلتا۔۔۔

''آپ نے یہ کیوں لکھا عمران! خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ کیا پتا میں ایسی عید نہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس کا خود پر ضبط کمال تھا مگر آواز کی معمولی سی لڑکھڑاہٹ بچوں کو حق دق کر گئی۔

عمران بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کیا جواب دے۔

''ایسے نہیں لکھتے بیٹا!'' اس کا لہجہ تھکان زدہ تھا۔ ''یوں لکھتے ہیں۔ خدا آپ کو خوشیوں بھری، مسرتوں سے لبریز ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ خالی ایسی عیدیں لکھنا تو بددعا کی طرح بھی ہو سکتا ہے۔'' اس کی آواز مدھم ہو گئی

''سوری ٹیچر۔۔۔!'' عمران کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ''میں آئندہ ایسے ہی لکھوں گا۔''

''ہوسکتا ہے یہ عید۔۔۔ایسی عید کسی کے لیے بے حد عذاب ناک ہو تکلیف دہ اور وہ سوچتا ہو کہ سب کچھ ہو مگر عید کا دن کبھی طلوع نہ ہو کبھی۔''

''بس۔۔۔سوری ٹیچر بٹ ہم سب کے کارڈ پر یہ ورڈ تو لازمی لکھا ہوا ہے۔آپ کارڈ واپس دے دیں۔ہم نئے کارڈز لائیں گے۔'' مانیٹر ثنا پوری کلاس کی ترجمان تھی گویا۔

''اٹس اوکے بیٹا۔۔۔اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔مجھے آپ سب کی محبت پر یقین ہے۔اتنے پیارے، اتنے سارے بچے مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔یہ کارڈ تو ثبوت ہیں نا اب مزید کوئی لفظ نہیں، آپ بکس کھولیں۔''

وہ دوبارہ گھوم گئی۔

''ٹھیک ہے ٹیچر۔۔۔!'' ثنا کی آواز ابھری۔''آپ کارڈز مت واپس کریں۔بٹ ہم سب لوگ پورے رمضان میں روزہ رکھ کر ہر نماز کے بعد دعا کریں گے کہ۔۔۔اللہ آپ کو۔۔۔چلو سب بولو۔۔۔''اس نے کلاس کو ڈپٹا۔

''اللہ آپ کو خوشیوں بھری۔۔۔اور مسرتوں سے لبریز ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ آمین۔''

تمکنت کرنٹ کھائے انداز میں پلٹی۔بچوں کے چہرے پر شرمندگی، ہراس اور۔۔۔اور دعا کی کامیابی کا یقین تھا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکا، گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔پھر یکدم ٹھہر گیا۔پرسکون ہو گیا۔

ایک دم پُرسکون۔

وہ گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی

وہ تیرہ سال سے سینہ تان کر ایک محاذ پر اکیلی کھڑی تھی۔اس کی ہٹ دھرمی پر اسے کوسنے والے ناکامی کی پیش گوئی کرنے والے بہت تھے۔

کبھی کسی نے کامیابی کے لیے دعا نہیں دی تھی اور اب اچانک اتنی معصوم پاکیزہ فرشتوں جیسی دعا کیا وہ جیت جائے گی؟؟؟

☆☆☆

رنگ برنگی جھلمل کرتی ڈھیروں چوڑیوں کو دیکھ کر حرا، حنا کا دل للچا رہا تھا۔

''سچی خالہ! سب ایک سے بڑھ کر ایک ڈیزائن ہیں اور سیٹ بھی آفت۔۔۔بہت اچھے مہنگے والے کڑے ہیں۔لگتا ہے تمام بچوں نے باقاعدہ پلاننگ سے شاپنگ کی ہے سب ڈیزائن ایک دوسرے سے منفرد۔کلر بھی ڈفرینٹ اور یہ کڑے تو بہت پیارے ہیں۔''

وہ خاموش بیٹھی تھی۔وہ پندرہ سولہ برس کی نوعمر الہڑ لڑکیاں تھیں اور اتنے دمکتے کھلکھلاتے رنگوں کو دیکھ کر جوش میں آ کر بولتی جا رہی تھیں۔

گرمی کے باعث وہ تینوں نیم تاریک کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک میں آرام کر رہی تھیں۔

تمکنت اسکول سے آ کر عصر تک سویا کرتی تھی۔ بھانجیاں حرا اور حنا بھی ساتھ لیٹ جاتیں۔ آج اتنا بڑا تھیلا سا دیکھا تو خالہ کی اجازت سے کھول لیا۔

''خالہ! ویسے یہ حیران کن ہے۔ حنا نے اسے چھو کر متوجہ کیا، ''پہلے تو اسکول والے پرمیشن ہی نہیں دیتے تھے کہ ٹیچر بچوں سے کچھ بھی لیں۔ گفٹ یا کچھ اور، اب کیا اصول بدل گیا۔۔۔''

''نہیں اصول تو وہی ہیں۔'' تمکنت نارمل گفتگو کر کے خود کو حال میں رکھنا چاہ رہی تھی خاموشی اسے ماضی میں دھکیل دیتی تھی۔ جہاں فقط منہ کے بل گر جانے کے بعد کی ٹیسیں اور چوٹیں تھیں۔

''بچے بھی جانتے ہیں، ٹیچر کچھ نہیں لے سکتیں۔ اس لیے آج لاسٹ ڈے پر جتھا بنا کر گھر تک آ گئیں اور ضد کر کے بلکہ خفا ہو کر یہاں چھوڑ گئیں۔ عید گفٹ کے طور پر۔ اب واپس کیسے ہو۔'' وہ بدقت مسکرائی۔

''اور ہیں آپ سب کی موسٹ فیورٹ ٹیچر۔۔۔'' حنا کا انداز تفاخر سے بھرپور تھا۔ حرا نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ بجھی مسکراہٹ سے انہیں دیکھتی رہی۔

''ایسا کرو۔۔۔ یہ سب تم لوگ یہاں سے لے جاؤ۔ برابر بانٹ لو۔ اپنی امی کو بھی دو اور اپنی کزنز اور فرینڈز کے لیے بھی اس بار انہی میں سے گفٹ دینا۔''

دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''ساری ہم لے لیں۔ تو آپ کیا رکھیں گی۔ ہم نے تعریف اس لیے تو نہیں کی تھی کہ۔۔۔''

اس کے چہرے پر شرمندگی آ گئی۔

''ارے نہیں۔'' تمکنت اٹھ بیٹھی۔ ''میں بہت محبت اور خوشی سے دے رہی ہوں بیٹا۔ اور میں کب پہنتی ہوں یہ چوڑیاں، کڑے۔'' اس نے اپنی دونوں کلائیاں ان کے سامنے کر دیں۔

''کبھی دیکھا ہے مجھے۔۔۔ اتنے سالوں میں۔۔۔ ہاں بولو۔''

''خبر نہیں ہے انہوں نے جوگ لے رکھا ہے نہ چوڑیاں کھنکھنائیں گی نہ سنگھار کریں گی۔ ہونہہ۔۔۔!'' آپا کا دل جلا جملہ ان کے اندر کی آگ کا مظہر تھا اور اسے آگ لگا رہا تھا۔

''نہ سہاگن نہ ابھاگن۔۔۔ کنواری بھی نہیں ہیں۔ شادی شدہ بھی نہیں۔۔۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔۔۔ اور بہن تیرہ کی بھی خوب رہی۔۔۔ چلو یہ سال گزرے تو چودہ پورے۔''

وہ جائے نماز تہہ کرتی آ رہی تھیں۔ بولتے بولتے صوفے میں دھنس گئیں۔

عموماً اس موضوع پر سر عام گفتگو نہیں ہوا کرتی تھی اور انہیں بچیوں کی موجودگی کا خیال رہا کرتا تھا۔ مگر رنگین چوڑیوں کا ڈھیر بچیوں کا اصرار اور تمکنت کا انکار۔

''آپا پلیز۔۔۔'' تمکنت کا دل پگھل کر آنسوؤں کی شکل میں بہنے لگا۔

''تمکنت! بیوگی کاٹ رہی ہوتی نا تو دوسرا نکاح پڑھا دیتی جبراً ہی سہی۔'' آپا کا لہجہ تھکان زدہ تھا۔

''آپا!۔۔۔ تمکنت ششدر رہ گئی۔ آری کے دانے لکڑی کو کیسے کاٹتے ہیں اس نے اس احساس کو ابھی ابھی اپنے دل پر جھیلا تھا۔

''بد دعا تو مت دیں۔''

"تمہیں دعا اور بد دعا کے فرق کا کیا پتا تمکنت! لوگ مصلّے بچھا اور وضو کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ میں کسی دن ایسا اہتمام کسی بد دعا کے لیے کرنے نہ بیٹھ جاؤں۔" ان کے لہجے کا طنطنہ ٹوٹ گیا۔ تمکنت کا سر جھک گیا۔

"آٹھ سال تک غائب شوہر کے پیچھے نکاح کی اجازت مل جاتی ہے تمکنت!"

"پر یہاں اجازت کون مانگ رہا ہے؟"

وہ بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ڈھیلی ہوگئی۔ اس کے انداز میں آنے والی طمانیت آپا کو ہارنے پر مجبور کر دیتی تھی

"اور وہ غائب بھی نہیں ۔۔۔ سب جانتے ہیں، وہ کہاں ہیں۔"

"تو گریبان سے پکڑ کر پوچھتی کیوں نہیں کب تک سزا کاٹنی ہے نا کردہ جرم کی۔"

"تیرہ سال پہلے نہ بتلایا تو اب کون سی قسم دے کر پوچھوں اور جرم بھی معلوم ہے آپا۔۔۔" "اس" جیسی کہا گیا۔ وہ پوری دیگ چکھنے کو پاگل پن کہہ رہے تھے۔ مثال تو درست تھی۔ شریک کار نہیں تھی پھر بھی قصوروار کہی گئی۔ وہ انسانوں کا سجایا میدان حشر تھا۔ کچھ کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ۔۔۔ کچھ کا بائیں۔۔۔ بھگدڑ کا عالم تھا میرا کہیں گر گیا۔ فیصلہ کرنے والے نے نسب کی بنیاد پر مجھ سے پہلے والے کو جو کچھ کہا وہی سب میرے لیے بھی۔۔۔ الفت فیروز بیگ اور تمکنت جلال بیگ۔۔۔ دفعہ اتنی۔ سزا اتنی کہانی ختم۔۔۔"

وہ جملہ مکمل کر کے خود ہنسی تھی۔

"وہ تو عیش کر رہا ہوگا۔ گھر بار بسا کر زندگی آگے بڑھالی ہوگی۔ تمہارا بن باس کب ختم ہوگا۔ تیرہ سال بہت ہوتے ہیں چیلنج قبول کرنے کے لیے۔۔۔ جا کر بتا دے ایک بار کہ تو اس جیسی نہیں تھی۔۔۔ نہیں ہے۔

اب کیا بچا ہے آج 35 کی ہے اور اٹھائیس کی دکھتی ہے۔ کل 40 کی ہوگی اور پچاس کی لگے گی۔ تب سینہ تان کر سرخروئی بتانے جائے گی تو تمغہ لگانے کے لیے شانے سیدھے نہ ہوں گے۔ زندگی سے ضد باندھ لی تمکنت جلال! نام دیکھو تمکنت جلال۔۔۔ اور کیا خوب مٹی پلید ہوئی ۔۔۔ حق ہا۔۔۔"

آپا تسبیح کو مٹھی میں بند کر کے اے سی سے زیادہ ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔

"غلط کہہ رہی ہیں آپا۔۔۔" اس کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ آرکی۔

"ابھی شانے بھی سیدھے ہیں اور آئینے کا سچ سن کر مزا آتا ہے۔ میں اس کا سامنا تب کروں گی جب وہ مداوا کرنا بھی چاہے تو کوئی راہ نہ ہو۔۔۔ ابھی تو واپسی کے سارے راستے روشن ہیں۔ اس نے مجھے جانے پرکھے بنا میری ذات کا ہر پہلو کسی دوسرے سے منسوب کر دیا تھا۔

اس کی ساری باتیں غلط تھیں۔ میں یہ ثابت کرنے کے لیے زندہ رہوں گی۔ مگر اس کی ایک بات سچ ہے۔ میری اور "ان" کی ضد خون ہی کے ذریعے ایک جیسی ہے۔ مجھے تو اپنے نام کی بھی لاج رکھنی ہے۔ ٹوٹ جاؤں گی پر جھکوں گی نہیں۔"

"ٹوٹی لکڑی کس کام کی تمکنت۔۔۔!"

"تو جھکی ہوئی بھی تو ٹھوکروں کی زد میں ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔
"زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں دی گئی۔" آپا کا متاسف جملہ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ لے آیا۔
"ضائع نہیں کر رہی آپا۔۔۔! ثابت کر رہی ہوں۔ پتا ہے اب درمیان میں کچھ نہیں رہا۔ اتنے سال گزر گئے نہ ظلم یاد ہے نہ مظلومیت نہ منصف کی صورت آشنا نہ مجرم سے کوئی قرابت۔۔۔ اب تو بس ایک جملہ ہے۔
"یہ کون سی دودھ سے دھلی ہوگی ایسی ہی نکلے گی۔ دیکھتا ہوں تم کتنی اچھی ہو۔۔۔ اور کتنی الگ۔"

☆☆☆

"آج بے تحاشا تھک گئیں۔۔۔ کام بھی تو بہت زیادہ تھا۔ مگر ذائقہ لاجواب۔۔۔ انگلیاں چاٹ لینے کو دل کر رہا تھا۔" افضل سعید نے اس کے عکس کو دل میں اتارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔
"تو چاٹ لیتے۔ کسی نے روکا تھا۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔
وہ ہری لال مرچ لگ رہی تھی۔ پنڈلیوں پر کسا ہوا سرخ چوڑی دار پاجامہ، پیر میں انگوٹھے والی چپل۔۔۔ سبز قمیص، سرخ دوپٹا جو گوٹے لپے سے سجا تھا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھی خود کا ہر پہلو سے ناقدانہ جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی سونے کے جڑاؤ گلوبند کو گھماتی۔ شہادت کی انگلی سے جھمکے کی کٹوری کو ہلکا سا چھوتی اور آئینے میں جھل مل کا رقص دیکھتی۔
"میں پکانے والی کی انگلیوں کی بات کر رہا ہوں۔ آؤ ذرا ادھر۔"
الفت نے آئینے سے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھائی۔
سفید ملائم لان کے کرتا شلوار میں پشت پر تکیوں کا ڈھیر لگائے افضل سعید لمبی سی ٹانگوں کی قینچی بنائے بہت آرام دہ حالت میں اسے مسلسل دیکھتے ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔
"یاد رکھیے۔۔۔ میں بے تحاشا تھکی ہوئی ہوں۔۔۔ چائے ختم کریں اور کلمہ پڑھ کر سو جائیں۔"
"یار۔۔۔ چار، چار مددگار تھے تمہارے ساتھ۔ بی بی، نسیم اور چھوٹو اور آج تو ان کی چھوٹی بچیاں بھی تو تھیں نا۔ تم تو خالی سپروژن کرتی رہیں۔"
وہ گھر میں ہوتے تھے۔ تو ساری توجہ الفت کے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے، پھرنے پر غیر ارادی طور پر رہتی تھی اور یہ سب لاشعوری ہوتا۔
الفت چڑ جاتی۔ "ایسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہیں سیدھے پڑتے پیر بھی الٹے ہو جائیں۔ ہاتھوں سے چیزیں پھسل جاتی ہیں۔ میں گھر میں برقعہ پہن کر کام کیا کروں گی؟"
"ظالم! تمہیں گھورنے اور فدا ہونے کا فرق بھی نہیں معلوم۔۔۔ اتنی ناقدری نہ کیا کرو، محبت کا جواب محبت سے دینا تو تمہیں نہیں آتا۔ محبت کو محبت ہی سمجھ لیا کرو۔۔۔" وہ فوراً ٹوٹے لہجے میں شکوہ کناں ہوتے جواباً اس کا وہی ناک چڑھا کر "ہونہہ!"
"اچھا تو آج اسی لیے برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھے تھے۔ میرے کاموں پر نظر رکھنے کے لیے۔ سپروژن کرنی اتنی ہی آسان ہے تو جناب ہر روز کیوں تھکے آتے ہیں۔ ٹھنڈے پنکھے کے نیچے بیٹھ

کر منہ ہی تو ہلانا ہوتا ہے ایسے نہیں ویسے۔۔۔ یہاں نہیں وہاں۔۔۔ ہم شکایت کریں تو چار چار مددگار تھے نا۔۔۔'' اس نے چبا چبا کر نقل اتاری۔

''اچھا۔۔۔ اچھا خفا مت ہونا۔ اتنی قیامت لگ رہی ہو۔ میں نے تو پہلے کہا۔ آج تم نے خوب کام کیا۔ تھک چکی ہو، مگر تھوڑی ہمت ہمارے لیے بچا کر رکھتیں نا۔''

''تو وہ اگلے کون سے میرے ابا کے ولیمہ میں آئے تھے۔ آپ ہی کے ہوتے سوتے تھے۔ یہ بڑے بڑے آدمی۔۔۔ یہ لمبی عورتیں۔ بندے کی گردن دکھ جائے۔ نظر قدموں سے سفر کرتی اوپر تک پہنچنے میں ساڑھے سات منٹ لگ جائیں۔''

وہ ہر بار ان کے تمام اہل خاندان کی دراز قامتی کے لیے انوکھے ارشادات فرماتی تھی۔

افضل سعید کو اس کی کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔ کوئی بھی بات۔

وہ بوٹے سے قد کی سنہری گڑیا جیسی تھی۔ وہ جب اسے بیاہ کر لائے تو خاندان میں خوب چرچا ہوا۔

''افضل سعید نے بابرہ شریف سے شادی کر لی ہے۔''

الفت نے سنا تو برا مان گئی۔ ''نہ تو میں بابرہ ہوں۔۔۔ کہہ دیں سب سے اور نہ ہی شریف۔''

''تو کیا تم بدمعاش ہو؟'' وہ نئی نویلی دلہن تھی۔ تب افضل سعید کو ٹیکہ جھومر اور گھونگھٹ کے بیچ سے پھوٹتی دبنگ آواز مزے دے گئی۔

''کوئی ایسی ویسی۔۔۔'' اس نے عملی مظاہرہ کے لیے گھونگھٹ پلٹ دیا تھا۔

''مجھے کوئی ہلکی نہ سمجھے، ایک منٹ میں جان ہتھیلی پر رکھ دیتی یوں۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر چٹکیاں بجائیں۔

''نہیں۔۔۔ آدھا منٹ بھی کافی ہے۔۔۔ بلکہ کچھ سیکنڈ بھی بہت ہیں۔''

افضل سعید نے حیران سہمی نگاہوں سے سر تسلیم خم کیا تھا۔ وہ کتنی خوب صورت تھی۔ بابرہ شریف والی مثال بس ایویں ہی تھی۔

وہ قیامت تھی۔ پانچ منٹ کی قیامت بھی اتنی ہولناک تباہی لا سکتی ہے۔ افضل سعید اپنے دل کو پہلو سے نکل کر اس کے قدموں میں لوٹنیاں لگاتا دیکھ ششدر تھے۔

''اب پھر کہاں کھو گئے ہیں۔ چائے ختم کریں، میں نے گرم کر کے لا کر نہیں دینی۔ میرا اپنا سر پھٹ رہا ہے اور۔۔۔ اور یہ کام کرنے کی وجہ سے نہیں ہے وہ آپ لوگوں کی اسی، بیاسی کی وجہ سے۔''

افضل سعید نے چائے کا کپ ہونٹوں سے دور کیا۔ گھونٹ بھی نگلا اور ہنسی بھی روکی۔

''پھر وہی اسی بیاسی۔۔۔ اسی بیاسی نہیں ہوتا۔۔۔ اسی تسی ہوتا ہے۔ اسیں۔۔۔ ہم، تسیں۔۔۔ تم کے لیے ہوتا ہے۔ پانچ سال ہو گئے یار! اتنی مشکل نا سمجھنے والی زبان نہیں ہے پنجابی۔''

''تو میں نے کب پنجابی کو برا کہا ہے۔ مگر جب آپ کے خاندان کے لوگ تیز تیز بولتے ہوئے اسی تسی کرتے ہیں نا تو تراسی، پچاسی، چھیاسی تک فوراً پہنچ جاتی ہوں ستاسی، اٹھاسی، نواسی۔۔۔''

وہ خاصے چڑے ہوئے انداز میں بالوں میں ٹھونکی ہوئی پنیں کھول رہی تھی۔

افضل سعید نے اپنے فلک شگاف قہقہہ کو بمشکل روکا ساتھ کے کمرے میں بچے سو رہے تھے۔

''ادب۔۔۔ آداب تو ہم اردو بولنے والوں کے ہاں ہوتا ہے۔ آیئے، جایئے بیٹھئے۔ آپ لوگوں کی تو گنتی پوری نہیں ہوتی۔ ہونہہ!''

افضل نے جی بھر اس کو دیکھا۔ وہ ایسے ہی انہیں چڑایا کرتی تھی۔

''مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہے نا۔۔۔ اب بس کرو اور لائٹ بند کر دو۔''

''اونہوں۔۔۔ میں نہیں کر رہی لائٹ بند۔۔۔ آپ کو سونا ہے تو سو جایئے۔ سارا دن مصروف رہی۔ اتنے دن پہلے سے تیاریاں کیں۔ کپڑے بنوائے ضد کر کے سونے کا سیٹ لیا۔ ایک ایک منٹ انتظار کیا کہ کب ان سب چیزوں کو پہنوں گی اور ابھی تو میں نے خود کو جی بھر کے دیکھا نہیں کہ آج میں کیسی لگ رہی تھی اور آپ کہتے ہیں لائٹ بند کر دو۔''

اس نے ناراضی سے پوری کتھا سنائی اور صاف انکار کرتے ہوئے ان کے لہجے کی نقل اتاری۔

''تو یار آؤ نا ادھر۔۔۔ میں بتاتا ہوں نا تم کیسی لگ رہی تھیں۔۔۔ کیسی لگ رہی ہو۔'' وہ کپ سائیڈ پر رکھ کر اٹھ بیٹھے۔ ہاتھ بڑھایا کہ وہ ہاتھ تھام کر بیڈ تک آ جائے۔

مگر کہاں، آگے الفت تھی۔ جسے افضل سعید سے ذرا الفت نہیں تھی۔ زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر سنگھار میز کی دراز کھول کر سرخ خوں رنگ لپ اسٹک پکڑ لی۔

رات کے گیارہ بجے یہ میک اپ اتارنے کا ٹائم تھا مگر اس نے پہلے لب وا کر کے لپ اسٹک کی تہہ جمائی۔

بندھے بال کھول چکی تھی۔ پہلے سارے دائیں جانب ڈالے۔ اونہوں۔۔۔ پھر بائیں۔۔۔ نہیں۔ سیدھے پیچھے چھوڑ دیئے۔

''بتائیں کہاں زیادہ اچھے لگ رہے ہیں۔''

''چھوڑو۔۔۔ یار۔۔۔! یہاں بستر پر آ جاؤ۔۔۔ میرے بازوؤں پر بکھیر دو اس سے بڑھ کر اچھے کہاں لگ سکتے ہیں۔''

ان کا انداز اب منت بھرا سا تھا۔ کچھ ہارا۔۔۔ ہارا۔۔۔ سا۔

''ہاں بس۔ آپ کے یہی الٹے سیدھے مشورے۔۔۔ آرام سے لیٹ جائیں۔ مجھے جب سونا ہوگا تو لیٹ جاؤں گی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے اب بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ افضل سعید اس کے مزاج کے سب رنگوں سے واقف تھے۔ بیڈ پر اوندھے گر گئے۔ سر پہ تکیہ رکھ لیا۔ الفت کی گنگناہٹ مگر نمایاں تھی۔

☆☆☆

''پرسوں تو سب سے ملاقات ہوئی ہے الفت! سب لوگ آئے ہوئے تھے۔ اب آج جانے کی کیا ضد؟'' انہیں پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ جب والٹ، چابیاں اور چرمی بیگ لیے عجلت کے عالم میں کمرے سے باہر نکلے تو وہ اسد اور احد کی ٹیڑھی مانگوں میں تیز تیز کنگھی پھیر رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بیگ بغل میں دبا تھا۔

''تو کیا مطلب اب ماں باپ سے ملنے کے لیے دن اور گھنٹے گننے بیٹھ جاؤں۔۔۔اماں بادا سے ملنے تو کبھی بھی جایا جا سکتا ہے۔''

''میں نے یہ کب کہا الفت۔۔۔!'' افضل نے لہجہ حتی الامکان پرسکون رکھا۔

''لیکن ابھی اس وقت صبح سویرے۔۔۔۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ ملاقات کے لیے کچھ لوگ آئے بیٹھے ہوں گے۔ شام میں لے چلوں گا۔۔۔بس۔''

''شام کا کیا مطلب۔۔۔اب میں تیار ہو چکی ہوں۔ بچے بھی تیار ہیں۔ آپ نے کیا کرنا ہے ذرا سا گاڑی کو گھمانا ہی تو ہے۔''

''دو بالکل مخالف راستے ہیں۔ آؤٹ آف وے ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہی پروگرام تھا تو صبح سویرے کہتیں۔ ہم جلدی نکل جاتے۔''

سب بے کار۔ الفت کی دائیں آنکھ مستقل پھڑک رہی تھی۔ یہ اس کی ناگواری اور نفی کی علامت غیر ارادی حرکت ہوا کرتی تھی۔

''ٹی وی دیکھو، ریڈیو سن لو۔ اپنے رسالے نکال لو۔۔۔۔ میں چار بجے تک آ جاؤں گا۔ اچھا بچو۔۔۔شام میں چلیں گے نانا ابا کے گھر۔۔۔ بوتل بھی پلاؤں گا اور آئس کریم بھی۔''

وہ الفت کو ہدایت دیتے اور بچوں کو پچکارتے۔ الفت کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے تیزی سے باہر نکل گئے۔

دروازے پر آٹومیٹک لاک تھا۔ زور سے بند کرنے پر لاک لگ گیا۔

الفت دروازے کو گھورتی رہی۔

''امی! جوتے اتار دیں۔۔۔۔'' اسد نے خود اتارنے شروع کر دیے تھے احد بہت چھوٹا تھا۔ اسے مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔ الفت کا خون کھول رہا تھا۔

بچے کی پکار نے کھولتے خون کو بہنے کا راستہ دیا۔

''خبردار! جو جوتے اتارے، فوراً پہنو۔۔۔اور یہیں بیٹھے رہو۔'' اس نے احد کا بازو نوچا اور اسد کو تھپڑ کے زور جوتا پہننے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

''اتنی ضد الفت!۔۔۔'' افضل آنگن میں پڑے تخت پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ الفت تنگ پائنچوں کے گلابی شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ دوپٹا شانوں پر ٹکا تھا۔ آنگن کے آدھے حصے پر برآمدے کے شیڈ کا سایہ پڑتا اور آدھے میں دھوپ۔ احد کا چہرہ سائے میں اور پیر دھوپ میں تھے۔ وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ الفت موڑھے پر بیٹھی تھی۔

اسد زمین پر بیٹھا کھلونا گاڑی کو چلا رہا تھا۔

''بیٹا! صبح سے ایسے ہی ہو۔۔۔'' انہیں جواب کے اثبات کا یقین تھا مگر یونہی۔

''امی نے کپڑے نہیں بدلنے دیے۔۔۔اور شوز بھی۔۔۔منع کر دیا۔''

''الفت! اتنی احمقانہ حرکت۔۔۔۔ میں نے منع تو نہیں کیا تھا۔ مگر تم وقت تو دیکھتیں۔ ٹریفک جام

میں پھنسنے کے بعد میں ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ پہنچا۔۔۔پارٹی انتظار کر کے نکلنے والی تھی۔دوپہر کو لنچ نہیں کیا اور تم صبح سے اسی عالم میں بیٹھی ہو۔۔۔تم نے کڑی دوپہر میں خود کو اس دھوپ میں جھلسایا۔بچوں سے کس بات کا بدلہ۔۔۔چھ گھنٹے سے بچہ جوگرز میں ہے۔انگلیاں گل جائیں گی اور تم اپنی حالت دیکھو، کپڑے نچڑنے لگ گئے ہیں۔'' وہ تاسف سے بولے۔

''او خدا چلو اٹھو۔۔۔اندر چلو۔۔۔بے وقوف نادان عورت!''

آگے بڑھ کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو وہ تخت کی جانب پلٹے۔ احد کو بہت احتیاط سے اٹھایا۔شانے سے لگا کر پشت سہلاتے ہوئے۔نیم تاریک کمرے میں لے آئے، پنکھا چلایا۔بہت آہستگی سے جوگرز اتارے اور اپنی صبح اتاری جانے والی بنیان جو وہیں پڑی تھی اس سے نرمی سے پاؤں پونچھے۔بشرٹ کے بٹن کھولے پھر اپنا گیلا تولیہ اتارے جانے والے کپڑے اٹھائے اور تکیے سیٹ کر کے رکھے۔

''اسد! تم اندر آؤ۔۔۔بھائی کے ساتھ لیٹو۔'' انہیں یاد آیا۔

''امی۔۔۔بھی بیٹھی ہیں۔امی کو بھی بلائیں۔'' وہ سر اٹھا کر انہیں متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا، افضل سعید نے جھک کر اس کا ماتھا چوما۔

''امی کو بھی لاتے ہیں۔۔۔'' وہ باہر آ گئے۔

''چلو الفت! اٹھو۔۔۔دیکھو ذرا، تم سارا دن ضد کے مارے دھوپ میں خود بھی جھلسیں اور معصوم بچوں کو بھی تکلیف دی۔مجھ پر غصہ تھا تو یار۔۔۔! مجھ سے لڑتیں۔تم کو بچوں کا احساس نہیں۔۔۔پر دیکھو اپنے بیٹے کو وہیں سے کہہ رہا ہے میں کیسے آؤں میری ماں باہر دھوپ میں بیٹھی ہے۔میں اندر کیسے آؤں''

وہ موڑھا گھسیٹ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''تم کو کیا لگ رہا ہے۔تم نے خود کو اذیت دی ہے۔یار تم لوگوں کی ایک درجہ تکلیف میرے لیے سو درجے کی ہوتی ہے۔کاش! تم دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیتیں یا کسی تھرمامیٹر سے ماپ لیتیں کہ میں خود کو کتنا جھلسا ہوا پیاسا محسوس کر رہا ہوں۔چلو اٹھو اندر چلو۔۔۔حالت دیکھو اپنی۔''

الفت کی جانب سے کوئی جواب نہیں۔۔۔نہ کوئی حرکت۔وہ چند پل تاسف سے اس کی صورت دیکھتے رہے اس کی۔گندمی رنگت، سرخ ہو رہی تھی اور پسینہ پورے جسم پر گیلاہٹ بن کر پھسل چکا تھا۔ کنپٹیوں کے پاس اور بالوں کی جڑوں کی نمی دور سے چمکتی تھی۔اسی کے دوپٹے کو تھام کر اس کے چہرہ اور گردن پونچھی۔

''اندر چلو الفت۔۔۔ورنہ۔۔۔''

الفت نے پہلی بار زمین پر ٹکی نگاہ اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ہلکا آسمانی کلف لگا سوٹ چڑ مڑ گیا تھا اور اب گرمی کے باعث بھیگا سا تھا۔الفت کی نگاہوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔افضل جیسے خبرنامہ پڑھ رہے تھے۔

''میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا اور عمل درآمد پر آمادہ۔

الفت نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں جھانکا۔افضل نے پچکارنے کے انداز میں ٹھوڑی چھوئی۔

"اٹھو۔۔۔" الفت ان کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے کیے پر عمل کر سکتے تھے۔ وہ بارہا اس کی ضد سے ہار کر ایسا کر چکے تھے۔

گہرا سانولا رنگ، اونچے لمبے تڑنگے چوڑے شانے کھلے ہاتھ پیر۔ وہ دراز قامت شخص تھے۔ مگر بوٹے سے قد کی الفت کو وہ قطب مینار لگتے جب اسے گردن اٹھا کر بات کرنا پڑتی۔

اسے اپنے بوٹے قد پر کوئی احساسِ کمتری نہیں تھا۔ وہ چست کپڑے چوڑی دار پاجامہ پہنتی۔ فلیٹ دوپٹی اور انگوٹھے والی چپلیں۔ کھسے اور کبھی کبھار پنسل ہیل۔ وہ اپنے حال میں مست الست تھی صرف اپنی پروا کرنے والی۔

اور افضل بے حد عام شکل وصورت والے ایک دن بہ دن ترقی کے راستوں پہ بڑھتے کامیاب بزنس مین تھے۔ وہ شکل اور قد بت جسے الفت نگاہ غلط انداز جتنی بھی اہمت دینے کو تیار نہ تھی۔

افضل سعید کے لیے کبھی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بے حد نرم خو، محبت کرنے والے مہربان انسان تھے۔ انہیں ہر شخص سے محبت اور لگاؤ تھا۔ عزیزوں، رشتے داروں، دوستوں، پڑوسیوں گھر میں کام کرنے والے ملازمین یا آفس کے ورکرز وہ سب کی پروا کرتے تھے سب سے محبت اور۔۔۔ الفت سے عشق۔

محبت کی انتہا عشق

اور عشق کی انتہا۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟

در گزر۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟ پروا۔۔۔

"اٹھ جاؤ الفت۔۔۔ ورنہ جب تک تم یہاں بیٹھو گی۔ میں بھی یہیں بیٹھا رہوں گا۔"

اور الفت کو قطعاً یہ فکر اور پروا نہیں تھی کہ وہ اس کی خاطر دھوپ میں جلیں گے مگر اس طرح موڑھے پر بیٹھے گھٹنوں پر کہنیاں لگا کر جب وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر نثار ہوتی نگاہوں سے دیوانہ وار تکتے۔ یہ اسے کبھی برداشت نہیں تھا۔ چھ سالوں میں اس نے کبھی افضل سعید کو یہ حق نہیں دیا تھا۔

اس نے ایک پل بے حد ناراضی، سرد مہری اور احسان جتاتی نگاہوں سے افضل سعید کا چہرہ دیکھا پھر اگلے پل پیر پٹختی اندر بڑھ گئی۔

گر جانے والے موڑھے کو سیدھا کرتے افضل ٹھنڈی سانس لیتے اندر بڑھے۔

☆☆☆

خود کو بے حد جسمانی اور افضل سعید کو ذہنی اذیت سے دوچار کر لینے کے بعد بھی اس کی ناراضی آسانی سے دور تھوڑی ہوتی تھی۔

افضل سعید من وعن اس کی مان لیتے۔ اس سے معافی مانگ لیتے اپنے کان پکڑتے یا اس کے پیر۔۔۔ اس نے نہیں ماننا تھا تا وقتیکہ غصہ خود بخود ختم ہو جاتا وہ ایسی ہی تھی۔ اب یہ غصہ دو روز میں اترتا یا دس روز میں۔

اور ناراضی کا روپ انوکھا۔۔۔

اس نے سارا گھر سنبھالنا تھا۔ کام وغیرہ پہلے سے بہتر۔ مگر بس انہیں نظر انداز کرنا تھا۔ بات نہیں کرنی تھی۔ الگ کمرے میں سونا تھا اور گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالنا تھا اور ایسے میں افضل کی تمام کوششیں

بے کار جایا کرتیں مگر وہ اسے منانے سے باز نہیں آتے تھے۔

ناراضی میں وہ حکم کی غلام کی طرح ہو جاتی جیسے بڑی تابع ہو یا بہت مجبور و بے کس۔ چوں بھی نہ کر سکتی ہو۔

افضل اس کو بازار لے گئے۔ پچھلے ہفتے اسے پانچ تولے کا سیٹ لے کر دیا تھا اور رات ہی کو وہ کہنے لگی کہ سیٹ کے ساتھ کڑے بھی ہوں تو مزا آ جائے۔

وہ منہ سے باقاعدہ فرمائش نہیں کرتی تھی۔ مگر افضل کے لیے یہ جملہ کافی تھا۔ اس وقت ارادہ باندھ لیا اور وہ جیولر کے پاس بیٹھے کڑے پسند کر رہے تھے خود اس لیے کہ وہ مارے بندھے بیٹھی تھی۔ شیشے کی دیواروں کو چھت کو، آرائشی فانوسوں کو دائیں بائیں ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ سوائے کنگنوں کے۔۔۔ چونکہ اسی جیولر سے خریداری کی جاتی تھی سو وہ پہچان رہا تھا۔ افضل صاحب کی بیگم ناراض ناراض لگتی تھیں اور ایک پیسے والا آدمی تین چار تولے کے کڑے تو خرید کر دے ہی سکتا تھا۔

افضل نے اس کی مسلسل عدم توجہی سے سیلز مین کی مشکل دور کی۔

''وہ جو ہم نے سیٹ بنوایا تھا اس کے ساتھ کے کڑے دے دو۔ کوئی مسئلہ ہو گا تو بعد میں دیکھ لیں گے۔''

اسد نے ماں کی انگلی تھام رکھی تھی اور احد کبھی پیدل چلتا کبھی باپ کی گود میں چڑھ جاتا۔ افضل بچوں کے کپڑوں والی دکان میں گھس گئے۔

یہاں نہ چاہتے ہوئے غیر ارادی طور پر بھی الفت دلچسپی لینے پر مجبور ہو جایا کرتی تھی۔ وہی ہوا۔ وہ کپڑے نکلواتے نکلواتے بھول بھال گئی سب خفگی۔

شاپنگ کے بعد بہترین کھانا الفت کے پسندیدہ اسپاٹ سے۔

خفگی جمی موم کی طرح ہوتی ہے توجہ کی گرمائش اسے پگھلا دیتی ہے۔ اور توجہ بھی افضل سعید کے جیسی۔۔۔ تو پھر۔۔۔

''آپ کے خیال میں پیسے سے ہر شے خریدی جا سکتی ہے اور یہ دو کڑے اور یہ چند تھیلے۔۔۔ میری اس دن کی تکلیف کی بھرپائی کر سکتے ہیں۔'' وہ اپنی نرم گندمی کلائیوں میں کڑے گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

چار تولے کے کڑے اور تین بہترین بوتیک کے کپڑے اور بچوں کی شاپنگ۔ (چند تھیلے) افضل نے سگرٹ کی راکھ ایش ٹرے میں مسلی۔

''یہ سب میری محنت اور خون پسینے کی کمائی ہے الفت! مگر اس پسینے سے بہت ارزاں جو تم نے اس دن ایک احمقانہ ضد میں بلاوجہ بہایا۔''

''آپ کو باتوں سے جیتنا آتا ہے۔''

''کیا تمہیں جیت لیا۔۔۔'' وہ بہت امید سے ترنت بولے تھے۔

''میری جیت یا ہار۔۔۔ میرے پاس فیصلے کا اختیار کب تھا۔''

''اور اگر ہوتا تو۔۔۔''

''تو کم از کم آپ کا نام نہ لیتی۔ (اس نے ہمیشہ یہی کہا تھا)
''وہ تو خیر مجھے معلوم ہے مگر کس کا نام لیتیں یہ نہیں بتایا۔''
''کسی انسان کا۔۔۔آپ تو جن معلوم ہوتے ہیں، اتنے اونچے لمبے کالے دیو۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح کا مخصوص جواب دیا۔
افضل اس کے جواب پر ہمیشہ محظوظ ہوتے تھے۔ دل کھول کر قہقہہ لگایا۔
''دل بھی اتنا ہی بڑا ہے۔''
''یہ بھی خوبی رہی ہوگی۔''
''تو کیا نہیں ہے۔۔۔''
''ہوگی مگر مجھے اس خوبی سے کیا لینا دینا۔'' اس نے نروٹھے پن سے کہا اور تکیہ درست طور جماتے ہوئے نیم دراز ہوگئی۔ اس نے پیر سے پائنتی پر پڑے تھیلوں کو سرکا دیا تھا۔ ایک شاپر نیچے بھی گر گیا۔
افضل سعید نے اک طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب کروٹ بدل لی، وہ کہنی کے بل ذرا سا اٹھے۔ اس کے سراپے کو جاں نثاری کے عالم میں تک رہے تھے۔
''اب وہ بھی کہو کہ ابا میاں نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔۔۔'' وہی قصہ جو اس گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے ہی ان کے کانوں میں پھونک دیا تھا۔
''آپ کو اس قصے میں نجانے کیا مزا آتا ہے۔'' وہ چڑی۔
اس نے تو دولہا کو تپانے کے لیے خوب پلاننگ کر کے سچا جھوٹا قصہ گھڑا تھا۔

☆☆☆

آبائی زمین تھی مگر خود بوتے یا ٹھیکے پر دیتے۔ دونوں صورتوں میں بس سال بھر کے دانے ہی مل پاتے۔ بیماری، خوشی، غمی تعلیم تربیت اچھی زندگی گزارنے کے ڈھیروں خواب اس قلیل رقم میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے تھے۔
اباجی نے بہت کم عمری میں ان سے بڑی دونوں بہنوں کو بیاہ دیا تھا۔
اب وہ دو بہنیں اور دو چھوٹے بھائی رہ گئے۔ وہ آبائی پیشے کو ضرور اپنا لیتے۔ جی توڑ محنت کرتے مگر اتنا نہیں کما سکتے تھے کہ خون تھوکتی ماں کا علاج کروا سکیں۔ بیاہی اور کنواری دونوں بہنوں کا بوجھ اٹھائیں اور چھوٹے بھائیوں کی پڑھائی لکھائی۔
کراچی ہر دور میں محنت کرنے والوں کے لیے پارس پتھر رہا ہے۔ سو وہ بھی ایک بیگ میں دو جوڑے ڈال بہنوئی جو تایا زاد بھائی بھی تھا، کے پاس چھڑوں کے کوارٹر میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ابتدائی طور پر محنت مزدوری کی مگر جلد ہی لکھائی پڑھائی کا چھوٹا موٹا کام ملا تو عزت، مرتبہ اور پیسہ نظر آنے لگا۔
تینوں چیزوں کو ابھی نظر بھر کے دیکھا تھا کہ اباجی کی شدید بیماری کا تار ملا وہ ہر چیز چھوڑ واپس لوٹے۔ تمام جمع جتھا لگایا مگر ان کا آخری وقت آچکا تھا۔ اب کی بار جب لوٹے تو دونوں بہنیں اور چھوٹے بھائی ہمراہ تھے۔
سیدھی سادی بہنیں اردو سے انجان۔

اور بھائی بھی ویسے ہی اسکول میں پڑھتے تھے مگر کراچی کی ہر شے نئی تھی۔اب ایک اچھے رہائشی علاقے میں گھر لیا گیا۔

سب سے بڑی بہن اور بہنوئی کو اپنے ہمراہ رکھا، گھر کے بڑے کی حیثیت سے اب دن اور رات کی ان تھک محنت تھی۔اپنا مستقبل، اپنی خوشی، اپنے خواب اور آرزوئیں تمام کی تمام بہن بھائیوں کے چہروں میں کھوجنے کی عادت ہوگئی۔

دوسروں کے لیے کام کرتے کرتے نجانے کب اپنا ذاتی کام شروع کر دیا پھر اسے جمانے کی جدوجہد، بہنوں کی تعلیم اور شادیاں۔۔۔ایک گھر بھی خرید لیا۔بائیک بھی۔

الفت کے ابا میاں ان کی چھوٹی بہن کو قرآن پڑھانے آتے تھے۔وہ انٹر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر میں سلائی کڑھائی میں دلچسپی لیتی تھی۔اس نے ہی ایک دن کہا اسے قرآن پاک پڑھنے میں کچھ غلطیاں محسوس ہوتی ہیں۔روانی نہیں ہے وہ اٹک جاتی ہے پھر ہجے کر کے پڑھتی ہے۔

افضل سعید نے اپنے کسی دوست سے ذکر کیا تو انہوں نے فیروز بیگ کا ذکر کیا جو مولوی نہیں تھے مگر بہترین قرأت خواں تھے اور بھروسے کے آدمی تھے۔اور جب افضل سعید ان سے ملے تو قائل ہوگئے۔وہ ساٹھ کے ہندسے چھوتے بزرگ شخص تھے۔

دبلے پتلے، شیروانی، سفید شلوار میں ملبوس۔۔۔کسی دفتر میں حساب کتاب دیکھتے تھے اور تین بجے فارغ ہونے پر گھر جا کر درسِ قرآن دیا کرتے۔ان کے پانچ بچے تھے۔

اللہ نے انہیں ایک عمر گزر جانے کے بعد اچانک اولاد کی دولت دے دی تھی۔الفت ان کی تمام آرزوؤں کا منبع دعاؤں کی تکمیل اور اللہ کا تحفہ بن کر ان کے آنگن میں اتری تھی۔

ساری زندگی اولاد کے لیے ترسے ہوؤں کے لیے یہ نعمت عظیم تھی۔وہ اکلوتی بیٹی کو حتی الوسع نازونعم سے پال رہے تھے۔

زندگی بے حد پرسکون تھی مگر دو بیٹوں کی آمد ایک کنکر کی طرح تھی۔پھر دو بیٹیاں مزید۔۔۔دونوں چھوٹی بچیاں تو بلاشک وشبہ ان کی نواسیاں پوتیاں کہلائی جا سکتی تھیں۔

محدود آمدنی تھی اتنی مہنگائی کا زمانہ نہیں تھا سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔مگر فیروز بیگ کو ایک فکر لگ گئی، وہ اتنی عمر پا سکیں گے کہ بچوں کو پال سکیں اتنی ہمت کہاں سے لائیں گے۔بچوں کی عمر وہ تھی کہ باپ لوہا توڑ اور زمین پھاڑ کر محنت سے رزق لائے اور وہ عمر کے اس دور میں دن بہ دن تنزلی کی جانب گامزن تھے۔

یہ احساس بہت شدید تھا۔ہر بیماری موت کی دستک معلوم ہوتی۔رات کو بستر پر جاتے تو لائن سے سوئے بچوں پر نگاہ پڑتی تو کپکپا کر رہ جاتے اگر جو وہ صبح نہ اٹھے۔اور فکر بھی دو طرح کی تھی۔بھرپور جوان ہوتی الفت آرا۔

اگر وہ نہ رہے تو الفت کے ہاتھ کون پیلے کرے گا۔

اور اگر وہ نہ رہے تو۔۔۔چھوٹے بچے بیٹے پندرہ، چودہ برس اور چھوٹی بیٹیاں دس اور بارہ برس کی تھیں۔ان چھوٹوں کے روٹی پانی کا بندوبست کہاں سے ہوگا۔وہ عجیب وغریب لایعنی سوچوں کے ساتھ

عدم تحفظ کا شکار تھے۔ کچھ ان کی اپنی سوچیں اور کچھ ارد گرد کے لوگوں کے جملے۔

پائے بڑھاپے کی اولاد۔

دیگ کی کھرچن۔۔۔

اب احتیاط کریں بیگ صاحب۔۔۔ اس سے چھوٹے بچے نہ لائیے گا۔

اپنی پر اکتفا کریں۔ آپ نے کچھ جمع جتھا کر رکھا ہے کہ نہیں۔۔۔ بچوں کی روٹی کو کوئی سبیل تو بنا کر رکھیں نا۔

احمقانہ مشورے بے ہودے قیافے اور دوسروں کی زندگی میں دخل کرنے والے بے حس لوگ صرف ہمت بندھاتے دو لفظ کہتے تو صدیوں کا آسرا بنتا مگر۔۔۔

افضل سعید کے گھر میں پہلے کوثر درس لینے لگی پھر اس سے بڑی کنیز فاطمہ۔۔۔ ان دونوں کی خوش الحانی دیکھ کر ایک روز خود افضل سعید بھی پہلا سپارہ کھول بیٹھ گئے۔

چھ ماہ کے اندر وہ بہت خوب صورت قرأت سیکھ گئے اور قرآن پاک پڑھتے ہوئے خود اپنی آواز سن کر انہیں جو خوشی ملتی۔ دنیا کی ہر مسرت ان کے سامنے ہیچ تھی۔

انہیں خود پر بے پناہ فخر محسوس ہوتا اور استاد پر پیار آتا۔ معاوضہ ٹھیک ٹھاک دیتے تھے۔ مگر اس احسان کا بدل وہ معاوضہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ استاد کے گھر راشن ڈلوانے لگے۔ کبھی خود ان کے گھر نہ گئے، ملازم کے ذریعے۔۔۔ درس مکمل ہونے پر فیروز بیگ کا آنا تو بند ہوا مگر افضل سعید کا جوابی عمل جیسے تمام عمر کے لیے جاری رہنا تھا۔

اور پھر انہیں ایک خبر ملی کہ ان کے محترم استاد فیروز بیگ۔۔۔ دل کے دورے کے باعث اسپتال میں پڑے ہیں۔۔۔ وہ اپنے باپ کو کھو چکے تھے اور فیروز بیگ روحانی باپ تھے۔ جب مشینوں میں جکڑے فیروز بیگ کو ہچکیوں سے روتے دیکھا تو پریشانی کی انتہا نہ رہی، وہ ناقابلِ فہم خود کلامی کرتے تھے۔

''الفت کا کیا ہوگا؟ بیٹے چھوٹے، نابالغ، ناسمجھ۔ بچیاں بہت چھوٹی۔۔۔ بیگم بیماری کی پوٹ۔ زمانے سے ناآشنا عورت۔۔۔ خود غرض نہ کہنا افضل۔۔۔ تم سے۔۔۔ نیک بچہ۔۔۔ پوری دنیا میں دوسرا نہیں۔ تت۔۔۔ تم۔۔۔ الفت کا۔۔۔ الفت کا۔۔۔''

افضل سعید کو زمانہ شناسی کا دعوا نہیں تھا۔ وہ کاروبار کی دو جمع چار کرتے تھے۔ سیدھے سادے نیک۔ مگر ادھورا رہ جانے والا جملہ۔۔۔ انہوں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہاں۔۔۔ ہاں میں۔۔۔ الفت کا۔۔۔ بالکل۔۔۔''

وہ الفت کا نام ہی جانتے تھے وہ کون ہے کیسی ہے۔ کیسی ہو سکتی ہے اس سے غرض نہیں تھی۔

اور اپنی ذمے داریوں میں گم افضل سعید کی زندگی میں اس رنگ کی گنجائش کب تھی۔

اپنی شادی کا سان وگمان بھی نہ تھا۔ ہاں کبھی کسی کے احساس دلانے پر وہ سوچتے، اب شادی کی عمر کہاں رہی۔ ابھی زندگی میں شادی سے زیادہ اہم ذمہ داریوں کی طویل فہرست تھی۔ کاروبار بڑھانے کے منصوبے اور۔۔۔ اور۔۔۔

وہ وعدہ کر کے آ گئے۔ ساری رات ادھیڑ بن میں رہے۔ کیا فلموں کی طرح اسپتال میں نکاح ہوگا اور اگر فیروز بیگ رات ورات ہی خدانا خواستہ۔۔۔ لیکن آگے کی کہانی اب الفت کی زبانی تھی۔
''میں ابا میاں کے لیے کھچڑی اور یخنی بنا کر بیٹھی تھی اور ابا میاں نے اسی کھچڑی پر میرا نکاح پڑھا دیا۔
نہ مہندی، نہ مایوں نہ سہاگ کے گیت۔۔۔ اماں نے نجانے کون سے کون سے ٹرنک سے ٹڈیوں کے بدن کی بو سے بھرا غرارہ پہنا دیا۔ لو جی میں تیار۔۔۔ ساری زندگی کہا میری بیٹی کو بیاہنے راج کمار آئے گا گھوڑے پر سوار۔ ڈگڑگ ڈگڑگ کرتا۔۔۔
اب اباماں کو راج کمار اور چمار کا فرق نہیں معلوم تو۔۔۔ میرا نصیب۔''
افضل سعید کی اردو میں روانی الفت کی سات سالہ رفاقت نے بعد میں پیدا کی ورنہ وہ ذات کے راجپوت تھے۔ ان کے ہاں چوڑے چمیارے کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مگر اس وقت نو بیاہتا کی ڈگڑگ ڈگڑگ چلتی زبان کو دیکھ رہے تھے۔
''اچھا۔ چلو مان لیا راجوں مہاراجوں کا زمانہ نہیں رہا۔۔'' وہ کہہ رہی تھی۔
افضل نے ایسی فصاحت و بلاغت سے بھرپور روانی اپنی پوری زندگی میں نہ دیکھی نہ سنی۔ باقاعدہ عقیدت مندی کے انداز میں دوزانو بس سنتے جا رہے تھے۔
ان کی بڑی بہنیں۔۔۔ ہر بات کے جواب میں جی ویریا (جی بھائی) کہتی تھیں۔
اور چھوٹی دونوں جی بھائی جان۔۔۔ ضرورتاً بولتیں آپس میں بات کرتیں تو مدہم لفظ تول تول کر۔۔۔ جملے جوڑ جوڑ۔
پر ادھر کوئی اصول نہیں تھا۔ جو جیسے دماغ آرہا تھا، زبان سے چھوڑا جا رہا تھا۔
''تو کوئی وزیر زوال پذیر۔۔۔ کوئی صدر، ملک بدر ڈھونڈ لیتے۔۔۔ کوئی وزیر اعظم۔۔۔ ہاہ۔''
''ملک کی وزیر اعظم اس وقت ایک عورت ہیں۔۔۔ الفت!۔۔۔ اور صدر۔۔۔ صدر غلام اسحاق خان۔۔۔ تم پاگل تو نہیں۔'' افضل بھونچکے رہ گئے۔
''افوہ!۔۔۔'' اس نے اپنے سر کو پکڑا۔
''یہ تو میں نے محاورتاً کہا ہے۔ میں کوئی لیڈی ڈیانا کی طرح پاگل نہیں نہ دولت کی لالچی کہ چارلس جیسے بڈھے بندر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دو۔''
ہاہ ٹھنڈی سانس۔۔۔ ''ہماری بھی وہی مثال۔۔۔ بس رنگ کا فرق ہے باقی تو۔''
اس نے بے حد بچکانہ الہڑ انداز میں ہونٹ لٹکائے۔ افضل سعید کا قہقہہ چھت سے چپک گیا۔ انہیں اس کے بے حد قابل اعتراض جملوں پر قطعاً غصہ نہیں آرہا تھا۔ جیسے کسی چھوٹے بچے کی معصوم احمقانہ اِدھر اُدھر کی لاف زنی پر بڑے انہیں سینے سے لگا کر چوم لیتے ہیں۔
الفت کی ادائیں بالکل ویسے ہی انہیں اکساتی تھیں کہ۔۔۔ بس۔
''ایسا ہولناک نقشہ کھینچا کہ خوف سے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہوگئیں۔ بیٹا میرا بڑھاپا۔۔۔ اور تمہاری جوانی۔۔۔ ہونہہ۔۔۔! میرا ہارٹ اٹیک۔۔۔ ایٹم بم اٹیک کی طرح تم سب کو

تباہ برباد کر دے گا خصوصاً مجھے۔۔۔یعنی الفت بیگ کو۔۔۔ہونہہ!
ایک تو سر پر گرے گھڑ کی طرح شادی کر دی اچانک۔۔۔چلو میں مان گئی۔۔۔اوپر سے پرانی فلموں کی طرح سینہ مسل مسل کر وہ ڈائیلاگ بولے کہ۔۔۔اچھی ہوئی یا بری۔۔۔میں تو شادی انجوائے ہی نہ کر سکی۔۔۔ہر دستک پر لگتا۔ابا میاں کی ہی خبر آئی ہوگی۔"
ہچکی اور نادیدہ آنسو پونچھتی
"ایسے نہیں کہتے الفت!۔۔۔"افضل سعید کی آنکھیں پہلے ہی ابلی پڑی تھیں۔فوراً ٹوکا۔
"نہیں نہیں۔۔۔آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔کوئی ہارٹ اٹیک وٹیک نہیں ہوگا۔۔۔ابا خوب جئیں گے۔۔۔ابھی تین ہارٹ اٹیک کا کہتے ہیں۔"
"ابھی تو ابا میاں کی دو بیٹیاں باقی ہیں۔"اس نے بے فکری سے آنکھیں میچیں۔
"الفت۔۔۔!"افضل سعید کا سر چکرا گیا۔
"ویسے ایک بات بتائیے۔یہ ڈیانا نے صرف شہزادی بننے پیسے ویسے کے چکر میں اس اودبلاؤ سے شادی کی تھی نا۔۔۔اب آئے دن لڑتے ہیں۔"
وہ کس وقت کہاں سے کہاں نکل جائے۔افضل سعید نے دیکھ ہی لیا تھا۔اس کا سوال پراسرار سا ٹوہ لیتا ہوا تھا۔
افضل نے شانے اچکائے۔
"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔مگر سنا ہے ملکہ کو ایک کم عمر دوشیزہ کی ضرورت تھی۔اس نے اپنی مرضی چلائی تھی۔کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں ڈیانا کی بے پناہ خوب صورتی وجہ انتخاب تھی۔ملکہ کے پاس تاج برطانیہ ہے۔مگر خدا نے اتنا بڑا مرتبہ دینے کے بعد خوب صورتی کا خانہ خالی چھوڑ دیا ہے۔ڈیانا کے ذریعے حسن و جمال کو محل میں جبراً گھسانے کی کوشش کی گئی ہے۔کہ آنے والی نسل ماں کا نقشہ لائے۔۔۔جس طرح دولت،عزت و مرتبے میں شاہی خاندان اعلا ہے اگر شکل و صورت بھی مل جائے تو۔۔۔کیا کہنے۔"
الفت کے لیے یہ گویا اندر کی خبریں تھیں۔آنکھیں پھیلائے ہمہ تن گوش تھی۔افضل کے جملے کے اختتام تک اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ آر کی۔
"آپ نے بھی تو میرا انتخاب اس لیے نہیں کیا۔۔۔کہ۔۔۔اپنے خاندان میں تھوڑی بہت خوب صورتی لے آئیں۔ہی ہی ہی۔"افضل سعید اس کے جملے کی گہرائی میں پہنچے تو دل کھول کر ہنس پڑے۔
"میں نے تو تمہیں گھونگھٹ اٹھانے کے بعد دیکھا تھا یار!"ہنسی کے دوران بتایا۔"اور ہم کم از کم شاہی خاندان جتنے بھی بدشکل نہیں ہیں۔"
اس نے بغور ان کی صورت دیکھی اور پیٹ پکڑ کر دوہری ہوگئی۔"ہی ہی ہی۔۔۔ہوہو۔"افضل سعید چمکتے موتیوں کی قطار کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔
افضل سعید کا تمام خاندان گہری سانولی رنگت،لمبے قد اور چوڑے شانے۔۔۔کھلے ہاتھ پیر۔وہ

اسمارٹ آدمی تھے۔جسم پر چربی نام کو نہ تھی کسرتی جسم۔۔۔ہاں اگر کبھی موٹے ہو جاتے تو بقول الفت دیو معلوم ہوتے۔

اور اس نے تو کہہ ہی دیا تھا۔

وہ گاؤ تکیے کے سہارے افضل کے بازو کے گھیرے میں تھی۔ان کا بایاں بازو اس کے شانے کے گرد لپٹا تھا اور دائیں ہاتھ میں الفت کے دونوں ملائم ہاتھ تھام رکھے تھے۔وہ بہت دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہے تھے۔

سنگھار میز کے بڑے آئینے میں اپنا عکس دل کو خوشی سے بھر رہا تھا۔وہ وقتاً فوقتاً آئینے کی جانب دیکھ لیتے۔

ان کی نظروں کے تعاقب میں جب الفت نے سین دیکھا تو بے ساختہ بول پڑی۔

''دیو کے قبضے میں پری۔''

پھر اپنی تشبیہ پر خود ہی مزا لیتے ہوئے ان ہی کی گود میں سر گھسا کر ہنستی چلی گئی۔

اس کا ہر انداز افضل کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔وہ خود بھی خوب ہنسے۔۔۔انہوں نے تو بعد میں دیکھا تھا۔مگر خاندان کی عورتوں نے اگلے منٹ ہی میں کہہ دیا تھا۔''دلہن بہت کم عمر ہے۔بہت ہی چھوٹی ہے۔''

افضل گھبرا گئے۔غرارے میں لپٹی گٹھڑی انہیں بہت چھوٹی معلوم ہوئی تھی ۔مگر۔۔۔

''کیا واقعی۔۔۔ایک مرتبہ دیکھ لینا چاہیے تھا۔۔۔یا پوچھ ہی لیتے۔''

وہ پینتیس کا ہندسہ عبور کرنے والے تھے تو کیا دلہن پندرہ کی ہے۔ارے مولا۔۔۔وہ ڈرتے کانپتے اندر گئے تھے۔دلہن کم عمر تھی ان کے مقابلے میں۔مگر اتنی چنی کا کی بھی نہیں۔وہ تیسویں برس میں تھی۔مگر دبلا پتلا سراپا۔سانچے میں تراشا پیکر،بوٹا سا قد۔

سب سے بڑھ کر عمر چور۔۔۔

اور سونے پہ سہاگہ بچکانہ انداز۔منہ بسورنا۔باقاعدہ انگلیوں سے بات بے بات سچے جھوٹے آنسوؤں کو پونچھنا(افضل کا دل کٹ جاتا)

لاابالی پن ۔۔۔لاپروائی ۔۔۔الہڑ دوشیزہ کی سی ادائیں۔

اس کی احمقانہ گفتگو۔۔۔طنزیہ کاٹ دار جملے بھی لہجے کے اتار چڑھاؤ کے باعث بے ضرر معلوم ہوتے۔

یہی باتیں،طعنے وہ کسی اکھڑ دماغ عقل رکھنے والے کے سامنے کرتی تو اگلا گردن دبوچ دھکے دے کر نکال باہر کرتا۔

مگر افضل سعید نے پہلے ہی روز اس کی کم عمری،بھول پن،نادانی اور معصومیت کو مان لیا تھا۔وہ چاروں شانے چت تھے۔

☆☆☆

''الفت!مجھے یہ حرکت قطعاً پسند نہیں۔۔۔میں تمہیں پہلے بھی دو چار مرتبہ صاف صاف الفاظ میں

بتا چکا ہوں۔۔۔تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"
"ہاں۔۔۔ہاں آپ تو کہیں گے یہ۔۔۔اتنا بہت سا سامان بھرا ہے۔اگر میں نے تھوڑا بہت دے دیا تو کون سی خزانے میں کمی ہوگئی۔ہاں بولیے۔"
الفت نے ڈھیلا پڑنا تو کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔وہ ہر بات کو اپنے نظریات کے حساب سے توڑ مروڑ دیا کرتی تھی۔
"خزانے میں کمی کی بات نہیں ہے۔۔۔الفت!" افضل زچ ہوگئے۔
غصہ، بے بسی، برداشت۔
الفت کی حرکت پر غصہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔غصہ کی شدت کی وجہ الفت کا نہ سمجھنا اور مستقل ہٹ دھرمی تھی۔اور انہیں سب برداشت تھا یہ حرکت کبھی برداشت نہ ہوتی تھی۔
میں تمہیں ہفتے بھر کا گوشت، سبزی، راشن اس لیے لاکر دیتا ہوں کہ تم کہاں خوار ہوگی۔میں گھر میں ہوتا نہیں، اظہر اور اکمل کالج اور بعد میں آفس آتے ہیں۔تمہیں پریشانی ہوگی۔کون لاکر دے گا اور تم۔۔۔
"حالانکہ میں سب لاسکتی ہوں۔" اس پر خاک اثر نہیں تھا، فوراً بدتمیزی سے جتایا۔
"الفت۔۔۔!بس کرو۔مجھے نہیں پسند کہ تم معمولی معمولی چیزوں کے لیے گلے محلے کی پرچون پر جاؤ یا۔۔۔"
"ہاں تو اگر جاؤں گی تو خریداری کے لیے جاؤں گی نا میں کون سا دکان دار کے، ساتھ یارانہ جوڑ رہی ہوں۔"
"پھر الٹی بات۔۔۔"
"آپ کو سارا غصہ یہی ہے کہ آپ کے پیسے سے لایا سامان میں نے اپنی اماں کو کیوں دے دیا۔۔۔اتنے بڑے سینے میں دل چیونٹی جتنا۔ہونہہ!"
اس نے صریحاً الزام لگاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا گلاس بیڈ پر دے مارا تھا۔وہ جگ بھر کے دودھ روح افزا لے کر بیٹھی تھی۔
افضل کی ساری باتوں کے دوران گھونٹ گھونٹ یوں بھر رہی تھی۔جیسے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہو۔۔۔افضل نے آتے ہی بھوک بھوک کا شور مچایا تھا۔وہ صبح دس بجے جاکر چار پانچ بجے آتے تھے۔
بچے گہری نیند میں سو رہے تھے۔الفت کے ہاتھ میں دودھ روح افزا کا جگ تھا۔کرسی پر پیر رکھ کر بیٹھی تھی۔پورا جگ ڈکار چکی تھی۔
"مجھے خود بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے بھوک کے سوال پر جواب دیا۔
"تو یار کھانا لگاؤ، میں ہاتھ دھوتا ہوں۔اکٹھے کھائیں گے۔" افضل خوش ہوئے۔انہیں ساتھ ساتھ کھانا کھانا پسند تھا مگر الفت ایسے چونچلے نہیں پالتی تھی۔اس نے کبھی انتظار نہیں کیا جب دل چاہا کھا لیا۔
"کیا لگاؤں۔۔۔کچھ پکایا ہی نہیں"۔اس نے صفائی سے کہا۔

''یہ کیا الفت۔۔۔کیوں نہیں پکایا۔سب کچھ تو موجود تھا۔سارے مسالے ڈال کر گوشت بھون لیتیں۔''

''اماں آئی تھیں ملنے۔۔۔واپسی پر سبزی گوشت کے لیے مارکیٹ کے لیے نکلنے لگیں تو میں نے کہا، کہاں گرمی میں دکان دکان پھریں گی۔میں نے خود ہی تھیلے باندھ دیے۔''

افضل نے پہلے ٹھنڈی سانس لی۔پھران کا پارہ اوپر چڑھنے لگا۔

''سب کچھ دے دیا الفت! ایک ٹائم کی ہانڈی چڑھا لیتیں۔

''سب کچھ دے دیا الفت۔۔۔''اس نے ہاتھ نچا کر نقل اتاری۔

''آپ کی کمائی تھی، میں نے لٹا دی۔اتنی غریب لوگ اور تسی (آپ) مہان۔۔۔ہونہہ!''

''الفت! میں یہ سب نہیں کہہ رہا۔تم بات کو غلط رخ پر کیوں لے جاتی ہو۔۔۔''

''اپنی مرضی سے لٹاتے رہیں گے۔فلانے کی نیاز۔ڈھمکانے کا چہلم۔۔۔صدقے، زکواۃ،اب میں نے کچھ اپنی مرضی سے کیا تو۔۔۔آ گئے۔''

''خدا کا خوف کرو۔۔۔نیاز۔۔۔صدقے، زکواۃ کا نام کیوں لیا۔زیر کفالت لوگوں کو کب دیتے ہیں خیرات۔۔۔تمہارے ماں باپ سے میرا ذمے داری کا رشتہ ہے۔تم نے اتنا غلط لفظ استعمال ہی کیسے کیا۔لاحول ولا۔۔۔''

''ہونہہ!''الفت نے ناک سکوڑی۔

''تمہارا طریقہ غلط ہے۔میں ہر مہینے کسی کے علم میں لائے بغیر ان کے گھر ہر شے پہنچا دیتا ہوں اور تم نے ٹھیک کیا۔اماں دھوپ میں کہاں جاتیں۔لیکن اللہ کی بندی۔۔۔اپنا شام تک کا تو بندوبست رکھتیں۔کچھ بھی دال چٹنی بنا لیتیں۔ہم کھانا کھاتے۔سورج ڈھلنے کے بعد مارکیٹ جاتے۔سب کچھ لے آتے۔اب پیٹ خالی۔۔۔دماغ گرم۔۔۔بی پی لو ہو گیا۔قدموں میں سکت نہیں ہے۔لڑنے بیٹھ گئے۔''

افضل نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔الفت کے چہرے پر غصے کا تناؤ ابھر رہا تھا۔وہ اس کے چہرے کے ہر تاثر کو پہچان لیتے تھے۔وہ غلطی پر تھی مگر ان کے سر چڑھنے والی تھی۔

وہ فریج کو ٹٹولنے لگے۔احد کے کیلے پڑے تھے۔ایک کھا لیا۔۔۔بریڈ کے ہفتے پرانے سوکھے سلائس کو لے کر کچن میں گئے۔

دودھ کی خالی پتیلی کے پیندے اور دیواروں پر جمے ملائی نما دودھ سے سلائس لگا لگا کر حلق سے اتارے۔

باہر کی گرمی اور اندر کی بحث۔۔۔وہ نہانے اور کپڑے بدلنے غسل خانے کی جانب بڑھے پھر مارکیٹ تک جا کر کچھ پکا پکایا لاتے اور باقی سامان بھی۔۔۔

سر پر پانی بہا بہا کر خود کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔

مین دروازے کے کھل بند کی آواز آئی۔کوئی محلہ پڑوس کا ہوگا۔

مگر دوسری آواز قابل تشویش تھی۔

وہ ترنت باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ذرا سی جھری سے دیکھا۔
اسد کو گھسیٹتے احد کو بمشکل شانے سے لگائے وہ دروازے سے نکل رہی تھی۔ پھٹپھٹاتا رکشہ نظروں میں آ گیا تھا۔
وہ خفا ہو کر میکے چلی گئی تھی

☆☆☆

ان کی کاروباری مصروفیات مکمل توجہ کی طالب تھیں۔ مگر الفت کا گھر میں ہونا یا نہ ہونا دونوں سبب توجہ کو بٹا دیتے تھے۔
اسے ناراض ہونے کے لیے کسی بھی بڑے واقعہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اسے منایا جائے۔ اس کی پروا قطعاً نہیں۔۔۔
لیکن افضل کے لیے یہ دونوں باتیں بہت معنی رکھتی تھیں۔
اور کچھ آج کل اس کی حالت۔۔۔ وہ ضد کے عالم میں خود پر جبر کرتی اور تکلیف افضل سعید کو اپنے دل پر جھیلنی پڑتی۔
وہ اگلے دن ہی صبح صبح تھیلوں سے لدے پھندے سسرال پہنچے۔ بچے انہیں دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔
ساس نے والہانہ استقبال کیا۔ الفت انہیں دیکھتے ہی چھت پر چلی گئی۔
''بس میرے پیچھے پڑ گئی۔ ورنہ بیٹے! اللہ کے فضل اور تمہاری مہربانی سے کب کسی چیز کی کمی رہی۔ پڑوسی کے بچے سے رکشہ منگوا دیا اور اسی کے ساتھ مل کر تھیلے رکھنے لگی۔''
وہ اتنی اونچی آواز میں بول رہی تھیں کہ الفت کے کانوں میں پڑ جائے۔
''عقل کی اندھی ہے، اول تو دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ہانڈی چڑھا دیتی ہوں۔ چار تو چپاتیاں ڈالنی ہوتی ہیں۔ منع کر دیا۔ سارا گھر بکھیر کے بیٹھی تھی۔ تم ماسی رکھ دو ایک تو اس سے کام ہوتا نہیں دوسرے کرتی بھی نہیں۔ لاپروا ہے نا۔''
''مجھے شرمندہ کرتی ہے۔ اب یہاں آ کر کیا کیا نہ کہا ہوگا۔ استاد صاحب کیا نہ سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔۔۔ اور آپ سب لوگ۔۔۔''
''نا، نا۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔'' اماں ان کے نزدیک جھک آئیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا پھر پراسرار انداز میں سرگوشی کی۔ ''مجھے پتا ہے، جھوٹ بولتی ہے۔۔۔ جھوٹی ہے نا۔''
''اماں۔۔۔!'' ان کا سچا معصوم انداز۔۔۔ افضل سعید نے بازو پھیلا کر انہیں خود سے قریب کیا۔۔۔ انہیں زوروں کی ہنسی آ رہی تھی۔
الفت کی قصداً اُڑتی پڑتی نگاہ یوں تھی۔ جیسے نیچے کا منظر اور کردار دونوں اجنبی ہوں غیر متعلق۔۔۔
''تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔ دال کے پراٹھے ہیں۔ ٹماٹر کی چٹنی اور شامی کباب بھی بنائے تھے۔ لاؤں نا۔۔۔''
''بالکل لائیے۔۔۔'' وہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ بچے چاکلیٹس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ

ننگی بان کی چارپائی پر بازو کا تکیہ بنا کر نیم دراز ہو گئے۔
سر پر لگے بادام کے درخت کے پتوں کی درزوں سے چھت پر نظر پڑتی تھی۔ الفت ان کے لائے گول گپے بڑا سا منہ کھول خوب سی سی کرتے کھا رہی تھی۔ اس عالم میں اس کے چہرے پر نور کی برسات تھی۔ گندمی رنگت میں سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر ہلکی تندرستی کی تہہ سی تھی۔ اسے افضل سعید کی خود پر جمی نگاہوں کا بخوبی احساس تھا۔ مگر لاتعلقی کا تاثر۔
اس کے کھانے کی رفتار بہت تیز تھی۔ ''مزے کے ہیں؟'' افضل نے شی شی کر کے متوجہ کیا اور پھر پوچھا۔
الفت نے ان کی جانب دیکھا پھر اس انداز سے رخ پھیرا جیسے وہ اس کے کھائے پیے پر نظر لگانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔
افضل سعید نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے ہر انداز سے واقف تھے وہ ان کے ساتھ ہی جائے گی۔

☆☆☆

''پھر کیا خیال ہے، رکھ لیں دن تاریخ۔۔۔'' افضل سعید نے اسے بھی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ بڑی باجی آئی بیٹھی تھیں۔ مدعا اظہر کی منگنی یا شادی تھی۔
اسے الفت کی خالہ زاد پلس تایازاد بہن پسند آ گئی تھی۔ اس نے سیدھے سیدھے افضل سعید سے ذکر کیا۔ افضل بے حد خوش ہوئے۔ انہیں تمکنت بہت اچھی لگتی تھی۔ دبلی پتلی، دراز قد، پر کشش لڑکی۔۔۔ خاموش طبع، دھیمے دھیمے مسکراتی ہوئی۔
وہ فیروز بیگ کے اکلوتے بڑے بھائی کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ بی اے پاس اور ایک اچھی شہرت والے پرائیویٹ اسکول کی ٹیچر۔۔۔
بڑی بہن شادی شدہ، حیدر آباد میں تھی۔ بڑا بھائی اپنی فیملی کے ہمراہ جب سعودیہ شفٹ ہوا تو۔۔۔ تمکنت کی رہائش کا مسئلہ اٹھا۔ اکیلی رہ نہیں سکتی تھی اور بھائی کو فقط فیملی ویزا ملا تھا کمپنی کی طرف سے۔ تمکنت بہت خوشی خوشی اپنے چچا فیروز بیگ کے گھر کراچی آ گئی۔
الفت اپیا کا یہ دیور اظہر انہیں اکثر لینے اور چھوڑنے آتا تھا۔ الفت کے تمام گھر والے اس کے سسرال والوں سے بہت محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ اور بدلے میں ان کا رویہ بھی بے حد محبت اور عزت سے بھرپور ہوتا۔
تمکنت نے محسوس کیا تھا اور کھوج بھی لگائی تھی کہ وہ پہلے دروازے سے چھوڑ سلام کر کے رخصت۔ مگر اب کافی عرصے سے وہ اندر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔
الفت کا کٹھور پن، منہ پھٹ ہونا۔ اظہر، اکمل وغیرہ کو اس سے دس قدم دور رکھتا تھا۔ وہ ہفتہ وار گھر آتے تھے۔ ورنہ دفتر کے اوپر بنائے گئے دونوں کمروں میں رہتے تھے جہاں ہر سہولت مہیا کی گئی تھی۔ افضل سعید بہنوں بھائیوں کو کسی حوالے سے مسئلہ کا شکار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر وہ ان کے گھر سے دور رہ کر عزت سے رہتے تھے تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔

الفت کی زبان کے آگے تو خندق تھی۔
اس کی آنکھوں پر بدگمانی کی عینک لگی تھی۔ اسے کچھ سیدھا نظر نہیں آتا تھا۔
"ہاں، میں نے اکیلے نکل کر بھاگ جانا ہے نا۔ کبھی ایک تو کبھی دوسرے دم چھلا۔"
"آپ کو تو خوش ہونا چاہیے اپیا! سب آپ کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔" تمکنت اس دھیان کے پیچھے چھپی فکرمندی اور محبت کو پہچان چکی تھی۔
"ہاں بہن! مجھے خوش ہونا چاہیے، خوش رہنا چاہیے، سب یہی مشورہ دیتے ہیں۔ کوئی خوش رہنے نہیں دیتا۔ ہمیشہ لوگ ہی بتاتے ہیں کہ بی بی تم خوش ہو، مجھے خود کیوں نہیں لگتا کہ میں خوش ہوں یا کیسے خوش رہوں۔۔۔ ساری دنیا کے قیافے اور خوش گمانیاں۔۔۔ ہونہہ!"
ہر وہ بات جس میں افضل سعید کی مدح کا پہلو ہو، اللہ جانے الفت کو آگ کیوں لگا جاتا تھا۔

☆☆☆

مزے سے چلتا منہ اور لقمہ بناتا ہاتھ ٹھٹک کر رک گیا۔ پھولے پھولے ہلکے بے وزنی پھلکوں کی جگہ تندوری روٹی کب شروع ہوگئی، اس نے چونک کر سر اٹھایا تو کھڑکی میں تمکنت کا چاند چہرہ جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ سجا تھا۔
اظہر نے ایک نظر روٹی اور دوسری تمکین پر ڈالی۔
"دراصل گندھا آٹا ختم ہوا تو میں نے جلدی سے بچے کو بھیج دو روٹیاں منگوالیں۔ آپ کھاتے رہیے، میں اور آٹا گوندھ رہی ہوں نا۔" اس نے آٹا چپکے ہاتھوں کو لہرایا۔
"مائی گاڈ۔۔۔ میں اتنی۔۔۔ ی ی ی۔۔۔ روٹیاں کھا گیا۔"
"مم۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" تمکنت کو اس کے انداز پر ہنسی آئی مگر فوراً صفائی دی۔
"سب ہی کھا رہے تھے، شاید میں نے آٹا کم گوندھا تھا۔"
"آپ یقیناً" اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی ہوں گی کہ میرے ہاتھ رکے کہ نہیں رکے۔" اس نے پالینے والے انداز میں سر ہلایا۔
"نہیں۔۔۔ نہیں۔" تمکنت نے زور و شور سے نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں اگر گن ہی رہی تھیں تو کوئی برائی نہیں۔۔۔" وہ تخت سے اتر کچن کی کھڑکی کے سامنے آرکا اور چوکھٹ پر کہنی ٹکا کر گال ہتھیلی پر رکھا۔ "نوالے گننے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔
نمبر ایک اگر آپ محبت سے کھلا رہی ہیں تو جملہ اور لہجہ یوں ہوگا۔ ہائے اللہ ابھی تو آپ نے صرف ایک سو ننانوے نوالے کھائے ہیں۔
نمبر دو ہائے اللہ گیارہ روٹیاں کھا گیا۔ کم بخت کا پیٹ ہے کہ کنواں۔۔۔ اب آپ بتائیے، آپ کا نمبر کون سا تھا؟"
تمکنت کو زوروں کی ہنسی آرہی تھی۔
"پہلے والا۔" وہ چہرے پر اڑتے بالوں سے کچھ پریشان تھی۔ سر جھٹک کر بال پیچھے کیے۔
اظہر نے فارغ لٹکتے ہاتھ کو پشت پر کس لیا۔ دل اور دماغ کی گستاخ خواہش ہاتھ کو آلہ کار بنانے

والی تھی۔ (کاش اسے یہ حق ہو کہ وہ اس لٹ کو سمیٹ سکے)
تمکنت نے جلدی جلدی گوج لگا کر آٹا سمیٹا اور چولہے کی آنچ بڑھائی۔
''آپ بیٹھیے۔ میں بس پانچ منٹ میں۔۔۔''
''نا۔۔۔نہیں۔۔۔بس پیٹ بھر گیا۔'' وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ ''اور روٹی مت بنائیں۔ میں نے پانی پی لیا ہے بس۔۔۔''
''آپ ناراض ہو گئے شاید۔۔۔بس دو منٹ۔۔۔'' وہ پیڑا توڑنے لگی۔
''تمکنت پلیز۔۔۔! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بے خیالی میں پتا نہیں چلا ورنہ میں اتنا بھی پیٹو نہیں۔ بھنڈی گوشت پسند ہے اور اتنے ملائم پھلکے۔۔۔ دھیان ہی نہ رہا۔ آپ رک جایئے پلیز۔''
''میں اپنے لیے بنا رہی ہوں۔'' اس نے رخ موڑ کر کہا مگر مسکراہٹ کی کرن اظہر کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہی۔
''یعنی میں آپ کے حصے کی بھی روٹی کھا گیا ہوں۔'' اظہر کو خود پر افسوس ہوا۔
وہ چپ رہی۔
''اچھا آئندہ ہم مل کر کھائیں گے تو۔۔۔''
''آئندہ۔۔۔مل کر۔۔۔کیوں؟'' تمکنت کی آنکھیں پھیل گئیں۔
''اوہ!۔۔۔'' اظہر دو قدم پیچھے ہوا۔ ''لڑکی ناراض ہو کر چمٹا بھی مار سکتی ہے۔''
''اوہ سوری۔۔۔بے خیالی میں۔۔۔میرا مطلب ہے کہ۔۔۔''
''یہ بھی کیا تمہارے بھیا جی کا حکم ہے۔۔۔کہ صرف چھوڑنے نہ جاؤ جب تک الفت وہاں رہے۔ ساتھ ساتھ چپکے رہو۔'' الفت کھانے کے برتن لیے بولتی آرہی تھی۔ اس کے خیال میں اظہر جا چکا تھا۔
''وہ۔۔۔میں ہاتھ دھو رہا تھا۔'' وہ کرنٹ کھا کر پلٹا۔
''ہاں تو ہاتھ دھونے سے منع کون کر رہا تھا۔ مگر میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ پہلے تو تم ''ہاتھ دھونے'' تک آتے ہی نہیں تھے۔''
الفت نے یقیناً اس کے کھانا کھانے پر تنقید کی تھی۔ تمکنت کا رنگ اظہر کے رنگ سے زیادہ پھیکا پڑا تھا۔
پر عزت نفس پر الفت کا حملہ شدید تھا۔
اظہر جوابی حملہ کر سکتا تھا۔ یہ بھنڈی گوشت اور دیگر راشن پچھلے ہفتے افضل کے کہنے پر اظہر ہی ڈلوا کر گیا تھا۔
اور یہ جملہ الفت جیسی آنکھوں کی اندھی اور عقل کی اندھی۔۔۔ہی کہہ سکتی تھی۔ اس کے سامنے اس کی اماں نے اظہر کو کہہ کہہ کر روکا تھا کہ کھانے کا وقت ہے اور وہ اسے کھانا کھائے بغیر کبھی نہیں جانے دیں گی۔
اظہر کے دل کا حال کیا تھا، یہ دوسری بات تھی لیکن سامنے تو یہی تھا کہ اماں نے روکا تھا اور فیروز

بیگ بہت محبت کے ساتھ اس کے ساتھ کھا کر گئے تھے۔ وہ تمکنت کے چکر میں چھوٹے لقمے لے کر بیٹھا رہ گیا تھا، یہ تو اندر کی بات تھی۔

اظہر کے پاس جواب تو تھے۔ مگر وہ دے نہیں سکتا تھا۔

''میں چلتا ہوں۔'' اس نے تخت پر پڑی چابیاں پینٹ کی جیب میں ڈالیں۔

''پچ۔۔۔ چائے رکھی تھی۔'' تمکنت نے سفید کپ میں خوش رنگ چائے کو دیکھا۔

اظہر نے تمکنت کا شرمندہ سا چہرہ دیکھا وہ مسکرایا اور یہ بہت مشکل مسکراہٹ تھی۔

''پھر کبھی سہی۔۔۔'' وہ پلٹ گیا۔

الفت ''ہونہہ!'' کہہ کر فریج کھولے کھڑی تھی۔ وہ اظہر کے لائے آموں میں سے ٹکڑے آم چن کر الگ کر رہی تھی۔

مین دروازے پر جا کر اظہر کو پلٹنا پڑا۔ اس کو اپنی پشت پر ملتجی نگاہیں محسوس ہو رہی تھیں۔

تمکنت نے چائے کا کپ اٹھا کر دکھایا۔ چائے تیار تھی۔ وہ پی کر چلا جاتا۔

''نیکسٹ ٹائم تمکنت۔۔۔! وہ والٹ اٹھانے کے بہانے پلٹا تھا۔'' ان شاء اللہ!'' اظہر سعید نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ بائیس برس کا تھا اور اسے اسٹیبلش ہونے اور شادی بیاہ تک پہنچنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہ بہت مزے سے تمکنت کے ساتھ لکا چھپی کا کھیل انجوائے کر سکتا تھا ایک اٹل ارادہ، ایک مسکراہٹ۔۔۔ ہفتے بھر کی طمانیت اور خوشی کے لیے ایک گنگناتا جملہ۔

مگر الفت۔۔۔

الفت۔۔۔ خوش نہیں رہتی تھی۔ وہ کسی کو خوش رہنے بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔ الفت کی جگہ کوئی اور محبت کرنے والی پرخلوص بہن ہوتی تو خوش ہوتی کہ بہن کے لیے ایک اچھا مستقبل بن سکتا ہے۔ کوشش کرتی۔

الفت کی جگہ کوئی اور بھابھی ہوتی تو چھوٹے لاڈے دیور کے من پسند دیورانی لا کر (اور اگر اپنی ہی بہن ہو تو کیا بات ہو) خوش ہوتی۔ زمانے بھر سے واہ واہ سمیٹتی سب کی نظروں میں اچھی بنتی۔

مگر یہ الفت تھی۔ جسے کسی کی اچھائی برائی سے غرض نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب اماں نے دبے لفظوں میں کہا کہ

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ اظہر ارجمند کو پسند کر لیتا تمکنت کے بجائے۔۔۔''

تب فیروز بیگ نے اونہوں کہہ کر ناگواری کا اظہار کیا۔

تمکنت ان کے لیے چوتھی بیٹی کی طرح تھی۔ کوئی فرق نہیں۔

الفت کی رائے مانگی گئی تو جواب حق دق کر دینے والا تھا۔

''میرا حال دیکھ لیں۔ پہلی بیٹی کے سکھ دیکھ لیں تو دوسری دے دیں۔ ہونہہ!'' اور فیروز بیگ پہلی بیٹی کے سکھ دکھ سے بخوبی واقف تھے۔

اظہر نے اس روز بنا چائے پیئے واپس پلٹتے ہوئے بائیک کو کک لگاتے تک فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ دونوں بڑی باجیوں کا قطعی انکار وہ جانتا تھا۔ چھوٹیوں کو قائل کیا جا سکتا تھا۔ سب سے آسان راستہ افضل سعید ہی تھے۔

وہ دفتر میں کیلکولیٹر اور پین پکڑے بے حد مصروف تھے۔ اس نے چھوٹتے ہی کہہ دیا۔

''مجھے تمکنت سے شادی کرنی ہے۔ آپ میرا رشتہ مانگ لیں۔''

افضل سعید نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

''شادی پڑھائی لکھائی اور کام سیٹ ہونے کے بعد کروں گا۔ بس آپ منگنی کر دیں بلکہ۔۔۔ نکاح کر دیں۔ بھابھی کہتی ہیں، میں ان کی اماں کے گھر آ کر کیوں بیٹھتا ہوں۔ انہیں بھی پتا لگے ان کے لیے نہیں بیٹھتا۔'' وہ انہیں بولنے کا موقع دیے بغیر تیز تیز کہہ رہا تھا۔

''بھابھی کی ضد میں رشتہ مانگنا ہے۔'' افضل سعید نے تحمل سے پوچھا۔ ''یہ تو لڑکی کی زندگی خراب کرنے والی بات ہوئی۔'' وہ اس کے اندر ٹٹولنا چاہ رہے تھے۔ ''ایسے آندھی طوفان کی طرح۔''

''وہ نہ ملی تو میری زندگی خراب ہو جائے گی۔'' وہ تیزی سے بولا پھر بڑے بھائی کا لحاظ یاد آیا تو تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ افضل سعید کے لبوں پہ مسکراہٹ آ رکی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا

☆☆☆

افضل سعید کی چاروں بہنوں کو الفت کے طور کبھی بھی کسی پہلو سے بھی پسند نہیں تھے۔ لاپروائی، غیر ذمہ داری، منہ پھٹ پن، ناعاقبت اندیشی، بدسلیقگی۔۔۔ انہیں ہر چیز پر اعتراض تھا۔

افضل سعید کی شادی کا ارمان تھا دل میں بے حد مگر ماں باپ کا آگے پیچھے فوت ہو جانا، شہر بدل لینا اور پھر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جگہ پر جمانے میں دن سالوں میں کیسے بدلتے رہے۔ خبر ہی نہ ہوئی۔

دوسرے بڑی باجی کو کراچی میں اتنے سال رہنے کے باوجود یہ شہر ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ موسم، رہن سہن، لوگ، گفتگو، گھر، بازار، راستے اور پھر اس شہر سے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنا ایک سراسر احمقانہ خیال تھا۔ وہ ہر سال گاؤں کے چکر میں خاندان برادری کی لڑکیوں کو دیکھا کرتیں۔ مگر حتمی فیصلہ۔۔۔ افضل سعید نے کرنا تھا جو اس موضوع پر آتے نہیں تھے۔

چھوٹی باجی اتنی انتہا پسند نہیں تھیں۔ مگر وہ مشترکہ خاندانی نظام کی بڑی بہو تھیں سو جب ملتیں۔ ہر پارٹی کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔

کوثر اور کنیز کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اور افضل سعید ایک روز اچانک دھلا لٹھے کا سوٹ پہن بغیر بری اور باجے گاجے کے دلہن لے آئے۔

دلہن پہلی نگاہ ہی میں سب کو پسند آئی پر جب تک گھونگھٹ گرا رہا اور منہ بند رہا۔۔۔ بعد کی کہانی میں کوئی زیر زبر پیش نہیں۔ سیدھے سیدھے کٹھور جملے۔ بڑی باجی کے معیار پر تو وہ خیر کسی بھی صورت پوری نہیں اتری تھی۔

اور بعد کی حرکتیں آخری کیل جیسی۔۔۔

اس کی تمام باتیں برداشت کو آزماتی تھیں۔
مگر ناقابل برداشت حرکت اور عمل اور بات اس کا ہر وقت وجہ بے وجہ افضل سعید کا مذاق اڑانا تھا۔ بنا سوچے سمجھے، انتہائی عجیب وغریب مثالیں۔ وہ کبھی انہیں کالا کہتی۔ بڑی باجی کا دل کرتا تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دیں۔
قطب مینار کہہ کر دراز قامتی کی بھد اڑاتی تو باجی سوچتیں۔
''بد بخت پانچ منٹ باہر ہے۔ اسے دس فٹ اندر کر دیں۔''
وہ افضل سعید کے محبت بھرے دل کو اپنی ٹھوکر پر رکھتی تھی۔ پیار لٹاتی آنکھوں سے نگاہیں چرائے وہ اپنے آپ میں مگن رہتی۔ اسے صرف اپنے آپ سے پیار تھا۔ اپنا کھانا پینا، گھر بار، شوہر اور بچے۔۔۔ ہاں بچوں سے دو پی اور ایک چھپی کا بے ساختہ رشتہ۔
جو شاید ہر عورت کے لہو میں موجود ہوتا ہے۔ کسی بلڈ ٹیسٹ کے بغیر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔
مگر الفت کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ مضحکہ اڑانا اور بنا سوچے سمجھے کچھ بھی، کبھی بھی کسی کو بھی کہہ دینا اس کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا یہ ہتک آمیز رویہ صرف افضل سعید کے لیے نہیں تھا۔
وہ اپنے بچوں کا، ارد گرد کے لوگوں کا، ٹی وی دیکھتے اداکاروں کا۔ گلی میں سبزی والے تک کا مذاق اڑاتی۔ حد تو یہ کہ اپنے اماں باوا کے لیے بھی یہی انداز اپنائے رکھتی تھی۔
اسے گھر کی کوئی پروا نہیں تھی۔ چولہا جل رہا ہے۔ موٹر چل رہی ہے۔ پانی بہہ رہا ہے۔ فریج میں چیزیں گل سڑ جاتیں۔ پچھلا ختم نہیں ہوتا۔ وہ اگلا منگوا لیتی۔۔۔ گھر کی صفائی دھلائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ (فریج کی ہفتہ وار صفائی افضل خود کرتے)
بڑی باجی کے تمام اعتراضات افضل کے لیے ذرا در خور اعتنا نہیں تھے۔ انہیں الفت کی ہر بات، ہر ادا پسند تھی۔ آمنا صدقنا۔
صفائی ماسی کر جاتی۔ مگر صفائی ُصفایا میں کب بدلتی الفت کو خاک پتا نہ چلتا۔
ماسی پہ ماسی بدلی جاتی۔ مگر اس پر نگاہ بھی افضل کو رکھنی پڑتی۔ اب افضل ماسی پر نگاہ رکھیں یا کاروبار پر دھیان دیں۔
گاؤں سے بی بی نسیم نامی بیوہ عورت بھی بڑی باجی تنگ آمد بجنگ آمد لائی تھیں۔ مگر وہ جب جب چھٹی لے کر گاؤں جاتی۔ پیچھے افضل کے گھر دھول اڑتی۔
افضل کے کپڑے، بنیان، تولیہ، ہفتہ وار لانڈری جاتے۔ وہ بھی افضل خود اکٹھے کرتے الفت کلف لگے کپڑوں میں ازار بند ڈالتے ہوئے بھی سو سو باتیں سناتی۔
''نیفے تک کلف لگانے کی کیا تک ہے۔ لگتا ہے، نالی میں بانس ڈال کر گٹر کھول رہی ہوں۔''
وہ پین کو زور زور سے نیفے میں بڑھاتی۔ افضل کی ہر شلوار کے نیفے میں پین کی نوک کے سوراخ ہوتے تھے۔
بڑی باجی اس جملے پر اقدام قتل کا سوچتیں اور اگر افضل کو بے قابو ہو کر ہنستا دیکھ لیتیں تو سچ مچ فوری طور پر بال نوچ لیتیں۔

باجی کی موجودگی میں افضل محتاط ہو جاتے مگر سچ تو یہ تھا کہ انہیں الفت کی اول جلول باتوں اور حرکتوں پر دل کھول کر ہنسی آیا کرتی تھی۔

بہت کم عمری اور ناسمجھی کے زمانے سے وہ کڑی محنت ومشقت سے کڑے موسموں سے لڑتے خود فراموشی کی زندگی گزار رہے تھے اور آگے بھی گزارتے رہتے۔

بہن بھائیوں کی ذمے داریاں، کاروبار جمانے کی دھن، ایک مسلسل جدوجہد کے دور میں الفت ان کے لیے پھلجھڑی تھی۔ آبشار، جھرنے جیسی ہنسی، چنچل باتیں۔

بڑی باجی کو الفت پر تو جو غصہ آتا سو آتا۔۔۔ افضل کا حال دیکھ کر تو دانتوں انگلیاں داب لیتیں۔

اور اب اسی بدعقل، بدسلیقہ۔۔۔ اور بہت سارے بد رکھنے والی الفت کی خالہ زاد اور تایازاد بہن تمکنت۔

وہ سب سے بڑی مخالف تھیں۔ چھوٹی باجی دونوں فریقین کو سنتی تھیں۔ کوثر اور کنیز تمکنت سے ملتی رہی تھیں۔ وہ دونوں اسے پسند کرتی تھیں۔ رہے افضل۔ اگر ہاتھ اٹھا کر ووٹ دینا ہوتا تو وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بے ایمانی بھی کر لیتے۔

اظہر کی تو خیر ٹانگیں بھی اٹھ جائیں گی ہاتھوں کے ساتھ ساتھ۔

اظہر نا قابل عمل مضحکہ خیز حالت کا تصور کر کے واک آؤٹ کر گیا۔ بعد میں آنگن میں ٹھٹھے پہ ٹھٹھے لگاتا پایا گیا۔

اور الفت باجی کے تمام اعتراضات ایسے سن رہی تھی جیسے وہ کسی اور کا ذکر کر رہی ہوں۔ مسالہ لگے کٹے امرود کی پلیٹ گود میں تھی۔ بڑی باجی کا دماغ گھوم گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر اس دیوار کو ڈھونڈنے لگیں جس پر اپنا سر مار سکیں۔

اتنی اہم سنجیدہ گفتگو۔۔۔ ساری فیملی کا اقرار دونوں کے لیے اہم۔۔۔ انکار ہو تو تمکنت یعنی الفت کے میکے میں ایک مایوسی، ناخوشی۔۔۔ اور الفت کو کسی انکار، اقرار، جواز سے دلچسپی نہیں تھی۔

اور وہ کانٹے سے بنا رکے امرود کھاتے اور افضل اس کی جانب چہرہ کرتے تو نا چاہتے ہوئے ایک چھوٹا سا ٹکڑا ان کے منہ میں بھی رکھ دیتی تھی۔

☆☆☆

”نہیں تو اس طرف کی تیاریاں کیا مطلب۔۔۔؟ ہر شے تو نکاح کے روز ہم لے کر جائیں گے کپڑے، انگوٹھی۔۔۔ پھول۔۔۔ تمہیں اور بچوں کو شاپنگ کر دا دی۔ اب کیا تم نے اس حال میں دیواروں پر رنگ کرنا ہے یا گلی میں بتیاں لگانی ہیں۔“

وہ بے حد تھکے ہوئے چار بجے لوٹے تھے۔ نماز سے پہلے جھپکی لگانے کا ارادہ تھا۔ الفت کھانا لگا کر بیٹھی تھی۔ ان کی بھوک چمک اٹھی۔

عام طور پر وہ ایسی مہربانی کے پیچھے چھپے کارن کو بھانپ لیتے تھے مگر ابھی بھوک، تھکاوٹ اور دوبارہ جانے کا خیال حاوی تھا۔

”مجھے جاتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔“ وہ آخری لقمہ حلق سے اترتے ہی مطلب پر آئی۔

''نہیں الفت! مجھے واپس پہنچنا ہے۔ اگر پیسے اور کچھ کاغذ نہ اٹھانے ہوتے تو میں نہ آتا۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔''

''احد کو میرے پاس لٹا دو۔۔۔ اور دیکھو اسد شور نہ کرے۔ چائے اٹھنے پر پی لوں گا۔''

''میں نے آپ سے ٹائم ٹیبل نہیں پوچھا۔'' الفت بدتمیزی سے ہاتھ چلا کر بولی۔ ''یہ کر لینا وہ کر دینا۔۔۔ ہونہہ! نظر نہیں آ رہا۔ میں پوری تیاری سے بیٹھی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم مجھے چھوڑ کر آئیں۔۔۔ ہاں نہیں تو۔۔۔ ہونہہ!''

''دروازہ بند کر دینا۔'' افضل نے کروٹ بدل کر الفت کو سچی مچی کی آگ لگا دی۔

''کیا مطلب۔ دروازہ بند کر دینا۔'' اس نے بے حد بدتمیزی سے افضل کا پیر ہلایا۔

''ہاں۔۔۔ ہاں بولیں۔'' افضل سعید کے کھلتے لب دیکھ کر وہ اچھلی۔

''پہلی بات الفت! ایسی اچانک آندھی کی طرح کے پلان مت بنایا کرو۔ ہم کوئی بھی معاملہ پہلے طے کر سکتے ہیں۔ دوسرے تم کو جانا تھا تو صبح سے جاتیں۔ اب اس وقت بچوں کے ساتھ اس حالت میں کون سے بازار کی خاک چھانو گی؟ کچھ لینا ہے تو کل صبح صبح چھوڑ دوں گا۔ ابھی جاؤ گی تو لوٹو گی کب۔۔۔؟

''تو لوٹنا ضروری ہے کیا۔ میں کیا رات فٹ پاتھ پر گزاروں گی۔ بھرا پرا گھر ہے۔ ساری زندگی وہیں تو گزاری کون سا عیب لگ گیا۔ جو لگ جائے گا اب۔''

''فضول بات مت کرو۔''

''فضول تو آپ کر رہے ہیں۔ سیدھے سیدھے جو کہا، وہ کرتے کیوں نہیں؟ اور چھوڑ کر آتے ہیں یا میں خود نکلوں۔'' وہ دفعتاً پرس دبوچ کر کھڑی ہو گئی۔

''خبردار! جو۔۔۔ اکیلے نکلنے والی بات کی۔ بالکل نہیں۔'' افضل سعید کو غصہ آ گیا۔

''اتنی تکلیف ہے تو چھوڑ کر آیئے۔۔۔ بھاشن مت دیں۔'' اس نے چمک کر کہا۔

''میں یہی تو کہہ رہا ہوں، کل صبح جلدی چھوڑ دوں گا۔ رات کا کھانا کہیں باہر کھا کر لوٹیں گے۔'' افضل کا غصہ بھی ایک پل ہی کا تھا۔ وہ دوبارہ چت لیٹ گئے۔ الفت نے بے یقینی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس کی مرضی کا کیا ہوا۔

''تو کرنی تو آپ نے اپنی من مانی ہی ہے نا۔۔۔ میں نے ابھی جانے کا پروگرام بنایا تھا نا۔''

''اور میں نے کہہ دیا۔ مجھے رات والی بات پسند نہیں۔'' بند آنکھوں کے ساتھ ہی جواب دیا۔

''کیوں؟'' الفت کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

افضل کے پہلو سے لگا احد شور کے باعث کسمسا رہا تھا۔

''یار! اپنے بچوں سے لپٹے بنا مجھے رات کو نیند ہی نہیں آتی۔'' ایک ہاتھ سے احد کو تھپتھپا کر دوسرے سے اسد کو خود سے قریب کر کے چومتے ہوئے ان کا لہجہ طمانیت، سرور اور خوشی سے بھرپور تھا۔ بے فکر سا سرشار۔

ان کے دونوں چھوٹے بازوان کے پہلوؤں سے لگے تھے۔
الفت کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹیں۔۔۔اس کی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں۔افضل کی ہمت اس پر فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش۔۔۔۔
''تو پھر لیٹے رہیں اپنے بیٹوں کے ساتھ۔۔۔ساری رات چومتے رہیں اور لپٹاتے رہیں۔''
وہ تن فن کرتی باہر لپکی جیب تک افضل سمجھ کر باہر نکلتے،وہ دروازہ پار کر چکی تھی۔افضل تیر کی طرح ننگے پیر لپکے۔وہ گلی کے کونے پر تھی۔وہ جوتے پہنتے اور اس تک جاتے اور وہ الفت کو بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔
گھر کا تماشا گلی میں پیش کیا جائے تو اچھا ہو یا برا،زبان زد عام ہو جاتا ہے۔وہ سکتہ کے عالم میں تھے۔
مگر یہ اسد کے رونے کی آواز تھی۔''امی۔۔۔مما جی۔۔۔!''اس کی آوازوں میں احد کی ریں ریں بھی شامل ہوئی۔
افضل اندر کی جانب دوڑے۔

☆☆☆

افضل فطرتاً غصیلے نہیں تھے اور دوسرے یہ غصہ کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔وہ اپنی ساری مصروفیت بھول کر رات میں بچے الفت کے پاس چھوڑ آئے۔اور اس کی طنزیہ جتاتی بتلاتی نگاہوں کی پروانہ کرتے ہوئے۔ساس ،سسر اور سالے سالیوں کے ساتھ محو گفتگو رہے۔
وہ اس جھگڑے اور الفت کی بدتمیزی کی بھنک بھی اپنے بہن بھائیوں کو نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے۔مبادا بڑی باجی عین ٹائم پر تمکنت اور اظہر کے رشتے سے منکر نہ ہو جائیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے تھے۔ساس سسر اور دیگر بھی ان کے ہم خیال تھے۔
لیکن۔۔۔الفت۔۔۔
کسی بھی قسم کی محتاط روی اور دنیاداری کا خوف اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔
وہ تمام محفل میں افضل سعید کو نظر انداز کرتی رہی۔ان کے سائے سے بھی جیسے پناہ مانگتی رہی۔
ایک گروپ فوٹو نہ بنوایا۔ایک بھی فیملی فوٹو نہیں۔
افضل سعید نے جبراً ہاتھ پکڑ تے ساتھ بٹھایا تو چہرے کے تاثرات اس قدر سپاٹ اور پھر ناگوار تھے کہ بچے بچے کو اندر کے حال کی خبر ہو گئی۔
الفت کو اس فنکشن میں دوہرا کردار ادا کرنا تھا۔سالی بھی اور بھابھی بھی لیکن اس نے ہاتھ جھاڑ رکھے تھے۔
کچھ اس کا اپنا قدرتی نقشہ دل موہ لینے والا تھا۔اس پر بے فکری کی چمک اور تڑ کا تھا،اس حالت کے بے پناہ روپ کا۔
پیلے فراک اور چوڑی دار پاجامے میں سلور کرن لگے دوپٹے کو سر سے گزار پیٹ کو ڈھانپے گیندے کے پھول بالوں میں پروئے۔

جب وہ پاندان کے ڈھکن سے وقتاً فوقتاً سونف نکال کر منہ میں ڈالتی تو افضل سعید کا دل ڈول ڈول جاتا۔

تصاویر کا سیشن چل رہا تھا۔ وہ لاڈلی کوثر کے ساتھ بیٹھے الفت کو دیکھ دیکھ کر توصیفی جملے کہتے تھے "پاکیزہ کی مینا کماری لگ رہی ہے۔ تمہاری بھابھی۔۔۔ ہے نا۔۔۔"

کوثر کا سر اثبات میں زور زور سے ہلتا (بھائی ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں)

کوثر کی دوسری جانب بڑی باجی تھیں۔

"امراؤ جان ادا کی بدبخت نائیکہ والے لچھن ہیں کم بخت کے سارے ہے۔ اونہہ!" کوثر اسٹرا کے ذریعے بوتل چڑھا رہی تھی، زور سے اچھو کا لگا۔

بڑی باجی اور دیگر کو سب کی جانب سے خصوصی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ مگر الفت کی جوتی سے۔۔۔ وہ اپنے حال مست تھی۔

سب باہر کے مہمان رخصت ہونے پر یہ تمام لوگ بڑے کمرے کی فرشی نشست پر آرام دہ حالت میں چائے کے منتظر تھے۔

"تبریز (تمکنت کے سعودیہ والے بھائی جان) تقریباً دو برس بعد آئے گا رخصتی تب ہوگی۔ میں اس سے کہوں گا، درمیان میں کوئی موقع نکالے تو جتنی جلدی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کی کون سی عمر نکل رہی ہے تیئسواں لگا ہے ابھی۔"

"دو سال کا انتظار ٹھیک ہے۔ اظہر بھی تیئسویں میں لگا ہے۔ لڑکوں کے حساب سے یہ کافی کم عمری ہے۔ ذرا تعلیم مکمل کر لے۔ اسے پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ شادی تو ہو ہی جاتی ہے۔ خدا بھائی کو سلامت رکھے جو تعلیم کا خرچا اٹھا رہے ہیں جو مرضی پڑھنا چاہے۔ باقی کاروبار ماشاء اللہ پھلتا پھولتا جا رہا ہے۔ اللہ اور ترقی دے گا۔"

بڑی باجی اور باقی دونوں چھوٹی بہنیں بھی ہم خیال تھیں۔

"تعلیم اور کاروبار کا مسئلہ نہیں۔۔۔ میں ہوں نا کاروبار بڑھانے اور سنبھالنے کے لیے۔۔۔ میں تو کہتا ہوں، آپ ابھی ہی رخصتی دے دیں۔ اچھا ہے استانی گھر آئے گی۔ اظہر کو خود ہی پڑھا لے گی۔ ہاہاہا۔۔۔ اور عمر بھی ٹھیک ہے۔ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ تعلیم اور کاروبار ساری زندگی بڑھایا جا سکتا ہے۔ مجھے خبر ہوتی تو میں تو خود بیس برس ہی میں شادی کر لیتا الفت سے۔"

افضل سعید خوش دلی سے کہہ رہے تھے۔

سب کا فہمائشی قہقہہ بلند ہوا۔ الفت نیم دراز تھی۔ جھٹکے سے اٹھی۔ اسے لہجے کی نقل اتارنے میں مہارت حاصل تھی۔

"تو میں تو خود بیس برس ہی میں شادی کر لیتا۔۔۔ ہونہہ۔۔۔! الفت سے خوامخواہ۔۔۔ الفت بے چاری نے آپ کے بیس برس میں۔۔۔ فقط سات برس کا ہونا تھا۔ شادی کر لیتا الفت سے۔"

اس کا کٹیلا لہجہ۔۔۔ بانو اسے آگ لگ گئی تھی۔

اس کی بات کی گہرائی جانچ کر کمرے میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ سب سے بلند آواز خود افضل

سعید کی تھی۔
وہ اپنی اور ان کی عمر کے فرق کو جتانے کے ایک سو ایک طریقے جانتی تھی اور یہ والی مثال ہوئی ایک سو دو۔
اپنی بات کہہ کر وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ وہ کچھ کھار ہی تھی نجانے کیا۔
بڑی باجی دانت کچکچا کر رہ گئیں۔ الفت کی باتیں۔۔۔ سر پر زوردار ہتھوڑا تھیں گویا۔۔۔ افضل کا قہقہہ، خون بہنے کا منظر جیسے ہتھوڑے کی ضرب سے۔

☆☆☆

اسد کا اسکول میں داخلہ اور ننھی افزا کی پیدائش بھی الفت کے اطوار بدلنے میں ناکام رہے تھے۔
بی بی نسیم کے علاوہ چھوٹی بچی کے بہلانے کھلانے کے لیے ایک جز وقتی لڑکی بھی رکھ لی گئی۔ مگر الفت کے لیے کوئی ذمہ داری، ذمے داری نہیں تھی۔
وہ پورے دن میں ایک سالن بنانے کا کام کرتی اور اسے بھی افضل پر سو سو مرتبہ جتاتی۔ اس کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔ الٹے ہاتھ سے ہی ڈوئی گھما دیتی تو لذت آجاتی تھی۔
افضل گوشت خور تھے اور وہ نہاری، پائے مغز قورمے بریانی بنانے میں ماہر۔۔۔
افضل کے جسم پر چربی کی تہہ جمنے لگی تھی۔ الفت انہیں جتاتی تو بے فکری سے بات ہنسی میں اڑا دیتے۔ ان کی خوب محنت رنگ جمانے لگی نئے سے نئے قدم اٹھاتے ہوئے اب جھجک یا ناکامی کا خوف دل کو لرزاتا نہیں تھا۔ لیکن۔۔۔
اس بار کا ارادہ دل کو ڈانواڈول کر رہا تھا۔
وہ کاروباری مد میں کچھ نئے فیصلے کرنا چاہ رہے تھے اور سرمائے کے طور گھر کو بیچنے کا خیال تھا۔
پرکھوں کی زمین جائیداد چھوڑتے ہوئے دکھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس پانچ کمروں کے گھر اور بڑے سے آنگن سے انہیں بہت انسیت تھی۔ اسے خریدنا بھی اس وقت دانتوں پسینہ لایا تھا اور اب۔۔۔
انہیں کامیابی کا پورا یقین تھا۔ لیکن آخری قدم اٹھانے کا سوچتے ہی غیر ارادی طور پر ٹھٹک سے جاتے۔
بڑی اور چھوٹی باجی متفکر مگر خاموش تھیں۔ کوثر نے البتہ رونا شروع کر دیا۔
"ایسے موقع بار بار نہیں ملتے چھوٹی!"
"مجھے نہیں پتا۔ آپ سمجھائیے نا بھابھی۔۔۔ اتنے ارمانوں سے میں نے ایک ایک چیز سجائی تھی۔ اپنی پسند کا رنگ، دیواروں کی تصاویر، پھول بوٹے اور منی پلاٹ اگانے کے لیے کتنے جتن کیے۔ لگتی ہی نہیں تھی۔ مٹی بدلی، کھاد ڈالی، چوری کر کے بھی لگا کر دیکھی اور اب جب اسے پھلتا پھولتا دیکھتی ہوں تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور بھائی جی کو دیکھیں۔ آپ بھی تو کچھ بولیں نا۔ آپ کے دل کو کچھ نہیں ہو رہا کیا؟" کوثر نے اسے چھو کر ہلایا۔
وہ کرسی پر بیٹھی گھٹنے پر سر رکھے جھکی ہوئی پیروں کے ناخن کاٹ رہی تھی۔ حسب عادت ادائے بے نیازی، بے نیازی عروج پر تھی۔

’’میں کیا اور میرا دل کیا۔۔۔جن کا گھر ہے وہ رکھیں یا بیچیں۔میں کاہے کو رو رو کر نحوست ڈالوں۔۔۔نیا خرید لیں گے۔کرائے پر ملتے ہیں اس سے بھی اچھے۔‘‘

اس کے حقیقت پسند جملے افضل سعید کے حق میں تھے۔مگر سب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی دھچکا لگا۔الفت کو اس گھر سے ذرا سی بھی انسیت نہیں تھی کہ ذرا سا دل کڑھتا یا آنکھ نم ہوتی۔

☆☆☆

یہ اہم ترین فیصلہ تھا۔کامیابی گھر اور کاروبار دونوں کے لیے بہترین ہوتی۔اظہر اور اکمل کے کاروباری حوالے سے تحفظات تھے۔تو دوسری جانب بہنوں کے اپنے خیالات۔۔۔گھر کا بیچنا جان پر کھیلنے کے مترادف تھا۔

کوثر بھائی سے زیادہ نزدیک تھی۔وہ اپنی شادی سے پہلے جب سے گاؤں سے یہاں آئی تھی اور بھائی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔اسے کاروبار کی سمجھ بھی نہیں تھی مگر وہ گھر لوٹتے ہی ان سے پوچھتی تھی۔

’’تھک گئے نا۔۔۔‘‘پانی کا پیالہ بڑھاتی۔’’آج کام زیادہ تھا نا۔‘‘وہ ان کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کی گردن سہلاتی۔

وہ کبھی دفتر کا کام گھر لاتے تو ان کے ساتھ املا کے انداز میں لکھوانا شروع کر دیتی۔

انہیں کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ جانے چہرے سے کیسے پہچان لیتی تھی۔وہ خوش ہوتے تو بھی اسے علم ہو جاتا۔

اسے کاروباری معاملات کی الف،بے کا نہیں پتا تھا۔مگر وہ پوچھتی تھی۔نیا کام کیسا ہوا۔۔۔فلاں ہو گیا،ڈھمکاں کب ہوگا۔

اور تین سال پہلے اس کی شادی کے بعد افضل سعید کی زندگی سے چھوٹے چھوٹے بے ضرر سوال و جواب کم ہوئے تو وہ بوکھلا سے گئے۔

مگر کوثر کہاں تھی۔سب سے چھوٹی کنیز اپنی پڑھائی لکھائی والی لڑکی تھی۔وہ ان کی آمد پر چائے پانی پوچھ لیتی۔۔۔بس۔

افضل نے الفت کے ساتھ کوثر والا بے ضرر کاروباری رشتہ،بنانا چاہا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

اسے کسی تھکاوٹ،فائدے،نقصان سے دلچسپی نہیں تھی۔

افضل کا کاروبار مندا جا رہا ہے۔تو وہ کیا کرے۔کھانا پینا کم کر دے۔تو لو کر دیا۔

مگر وہ کندھے سے کندھا جوڑ للو چپو نہیں کر سکتی تھی۔

افضل کو کامیابیاں مل رہی ہیں۔تو ملتی رہیں۔

اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

اسے بس اپنی ذات سے پیار تھا اور اس سے زیادہ پیار اس کی ذات سے افضل کو تھا۔

اور پیار بھی بے جا لاڈ جو بگاڑ دیتا ہے۔

☆☆☆

اظہر کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا۔اسے اب الفت کے سہارے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔وہ جب

دل چاہتا، فیروز بیگ کے گھر پہنچ جاتا۔ اس کی عزت اور محبت میں اضافہ ہوا تھا۔ بیٹی کا دیور، بھتیجی کا شوہر۔۔۔مگر۔۔۔

مگر کسی بھی پابندی کے بغیر تمکنت اس کی آمد کی بو پاتے ہی منظر سے غائب ہو جاتی۔ کہیں سے کسی کی پابندی یا پردے کا چکر نہیں تھا۔

مگر تمکنت کو بے حد شرم آتی۔

اظہر کو تو جیسے کسی کا لحاظ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کی موجودگی میں اسے پکار لیا کرتا۔ اس کے لیے یہ بڑے مزے کی سچویشن تھی۔ مگر تمکنت بے حد سلجھی ہوئی باوقار لڑکی تھی۔ ان کا رشتہ مذہبی اعتبار سے مکمل تھا۔ مگر معاشرتی حد بندی ابھی راہ میں حائل تھی۔

وہ جتنا اس کی جانب لپکتا، وہ اتنا دامن بچاتی۔

اس روز وہ اسکول سے نکلی تو وہ بائیک پر ٹانگیں پھیلائے ہوئے کھڑا تھا۔ تیز دھوپ میں بھی طمانیت کا عالم یوں تھا جیسے گھنے درخت کے سائے میں کھڑا ٹھنڈک سمیٹ رہا ہو۔

تمکنت کے لیے یہ بالکل اچانک صورت حال تھی۔ یہ تو اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔

”تم گھر میں لفٹ نہیں کرواؤ گی تو میں ایسے ہی یہاں آجایا کروں گا۔“

”آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ اردگرد نکلتی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹ کو دیکھتے ہوئے دبی زبان سے بولی۔ ”یہ کوئی جگہ ہے۔ اس طرح۔۔۔“

”نہیں تو ہم یہاں ہی تھوڑا کھڑا رہیں گے، کہیں دور چلیں گے میری اس بائیک کو ایسا ویسا نہ سمجھو 175 ہے۔ افق کے اس پار بھی لے جا سکتی ہے۔“ اس نے بائیک کی ٹنکی پر تفاخر سے ہاتھ مارا۔

وہ بے یقینی سے بائیک کو تکنے لگی۔ ”یہ اور افق کے اس پار۔۔۔“

”چلیں پھر؟“ وہ اس کے چہرے کی بے یقینی دیکھ کر آزمانے کی دعوت دینے لگا۔

”کدھر۔۔۔؟“ وہ چونکی۔

”افق کے اس پار۔۔۔ یار!“ اس نے گلاسز نیچے کر کے آنکھ دبائی۔

تمکنت لال ہوگئی۔ وہ اسے انکار کرنا چاہتی تھی۔ مگر قریب آتی کولیگز کو دیکھ کر جن میں کچھ تصویر آشنا تھیں وہ تیزی سے بائیک پر بیٹھ گئی۔

اظہر اور اس کی بائیک دونوں ہواؤں میں اڑنے لگے جیسے۔۔۔

وہ اسے لیے ایک مشہور شاپنگ ایریا تک آ گیا۔ پہلے شاپنگ کا ارادہ تھا پھر اسے خیال آیا۔ وہ صبح سے اسکول میں مغز ماری کر رہی تھی۔ بھوک لگی ہوگی تو اوپر بنے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

ویٹر کو آرڈر اس نے کیا۔ تمکنت اتنے عرصے میں منہ پھلائے انگلیاں مروڑتی رہی۔

”مزے دار ۔۔۔ یار!“ اظہر نے کھانے کی پلیٹس دیکھ کر چٹخارا بھرا۔

”شروع کرو نا۔۔۔“

”مم ۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا ۔۔۔ یہ۔“

”کیا کھانا اچھا نہیں لگتا۔“

''نن ۔۔۔نہیں دراصل مجھے اچھا نہیں لگتا کہ۔۔۔''
''کیا میں اچھا نہیں لگتا۔''
''نہیں نہیں ۔۔۔یہ اس طرح ملنا۔لوگ ۔۔۔لوگ کیا۔پبلک پلیس پر۔۔۔''
''مجھے بھی۔۔۔''اظہر نے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔۔۔''مجھے بھی ایسے تیز دھوپ گرمی کا خشک موسم۔۔۔ بند ریسٹورنٹ میں ملنا اچھا نہیں لگتا۔کالے سیاہ بادل ہوں۔کن من ٹھنڈی ہوائیں۔ہریالی کی مہک۔۔۔تمہارے بالوں میں پھول گندھے ہوں۔جب ہم گھر سے نکلیں۔۔۔اور یہ بیک گراؤنڈ میں آرٹیفیشل دھنیں نہ ہوں۔میں بجاؤں اور تم گاؤ۔۔۔گاتے گاتے بارش تیز ہو جائے۔پھر برسات میں ہمارا ایک ڈوئٹ۔۔۔کیسا؟''

تمکنت کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔پھر اپنی بے ساختہ ہنسی کو چھپانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''یار تم کھل کر ہنستی بھی نہیں ہو۔''اس کی آنکھوں سے چھلکتی ہنسی اس کا دل سرشار کر گئی تھی۔
''یہ کھل کر ہنسنے کا موقع نہیں ہے۔''
''اور وہ موقع کب آئے گا۔''
''جب آپ بڑے ہوں گے۔میرا مطلب ہے،افضل بھائی نے یہ ہی کہا ہے۔''اس نے فوراً تصحیح کی۔
''تمہارا کہنے کا مطلب ہے،میں ابھی بڑا نہیں ہوا۔''
''میرا نہیں۔۔۔بڑی باجی اور سب کہتے ہیں۔''
''نہیں اگر تم کہو تو میں ابھی ثابت کر سکتا ہوں کہ میں۔۔۔''اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑا۔
''نن۔۔۔نن نہیں۔۔۔مم۔۔۔میرا نہیں ہے۔آپ میری کلائی تو چھوڑیں نا۔۔۔پلیز اظہر! میرا ہاتھ تو چھوڑیں۔۔۔لوگ دیکھ رہے ہیں۔''وہ اس کی اچانک جسارت پر حیران ہوئی اور آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔
''ارے تمکنت۔۔۔!''اظہر نے گھبرا کر کلائی چھوڑ دی۔اس نے مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے کلائی تھامی تھی۔اس کی مردانہ سخت پکڑ سے کلائی پر سرخ شکنجہ ابھر آیا۔
''سوری یار۔۔۔!''وہ دونوں ہاتھوں سے کلائی سہلانے لگا۔
''چھوڑیئے۔لوگ دیکھیں گے۔''وہ منمنائی۔
''میں لوگوں سے نہیں ڈرتا۔''وہ خفا ہوا۔''اور تمہیں بھی دنیا سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔میں ہوں نا تمہارا محافظ۔''
''ٹھیک ہے لیکن ابھی تو چھوڑیں نا۔ٹھیک ہے۔کچھ نہیں ہوا ہے۔''وہ آستین ہاتھ تک درست کرتے ہوئے صلح جو انداز میں بولی۔
''کھانا کھالو۔۔۔تو پھر تمہیں شاپنگ کرواؤں گا۔''
''لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔۔۔سب کچھ تو ہے میرے پاس۔''

''معلوم ہے یار! تم کماتی ہو۔۔۔ ہر چیز لے سکتی ہو اور ہم ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔''
''میرا یہ مطلب نہیں تھا اظہر!'' وہ گھبرا گئی۔
''اتنا کماتی ہو اور کلائیاں خالی رکھی ہوئی ہیں۔ چوڑیاں نہیں خرید سکتی ہو۔''
وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ایک ڈیسنٹ ٹیچر اسکول میں چوڑیاں چڑھا کر جاتی کیا اچھی لگے گی مگر وہ خفا ہو گیا تھا اور بدگمان بھی۔
''چوڑیاں تو آپ دلائیں گے۔۔۔ آپ نے آج تک لے کر ہی نہیں دیں، اسی لیے میں نے پہنی نہیں۔''
اس نے جھوٹ سچ ملا کر کہا اور وہ فوراً خوش ہو گیا۔
''سچ۔۔۔ سچ کہہ رہی ہو نا۔''
''بہت سارے سیٹ لوں گی۔۔۔ اتنے پیسے ہیں نا'' وہ شرارت پر آمادہ تھی۔
اس کا مدھم، شریر، دل موہ لینے والا لہجہ۔ اظہر کا دل لوٹ پوٹ ہو گیا۔
''اضافی کلائیوں کی ضرورت پڑ جائے گی۔ تم صرف پسند کرنا۔''
''نہیں۔۔۔ آپ کی پسند سے۔'' تمکنت نے اسے بے حال کر دیا تھا۔

☆☆☆

الفت ہر فن مولا تھی۔ خصوصاً چھوٹی سی بات کو بڑا بنانا اور بڑی بات کو چھوٹا ثابت کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔
اس نے نئے محلے میں آتے ہی تنہائی اور بوریت کا رونا ڈال دیا۔ افضل کے پاس فی الوقت اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ نئے پروجیکٹ میں بے حد مصروف تھے کامیابی کا راستہ روشن تھا۔ وہ ان تھک محنت کر رہے تھے دن رات۔۔۔
صبح کو نکلتے تو رات گئے لوٹتے، اگلی صبح سویرے کا الارم لگا کر۔۔۔ یہاں الفت کی سہیلیاں نہیں تھیں۔ دلچسپی کے لیے کوئی چیز نہیں۔
''مجھے ڈش لگوا دیں۔'' اس کی نئی فرمائش۔
''یار! میں نے سنا ہے اس پر بہت بے ہودہ پروگرام آتے ہیں۔'' افضل نے خدشہ بیان کیا۔
''سنا ہے۔۔۔'' الفت نے چٹخارا ابھرا۔ ''دیکھا تو نہیں۔'' اس نے آنکھیں میچیں۔
''یار! اظہر، اکمل بھی آتے ہیں ہفتہ وار۔۔۔ کیا سوچیں گے۔''
''سوچیں گے نہیں۔۔۔ دیکھیں گے نت نئے پروگرام۔'' اس نے ایک بار پھر آنکھ دبائی۔
''ڈش دیکھنے سے پہلے تمہارا یہ حال ہے بات بے بات آنکھیں مٹک رہی ہیں۔ تو بعد میں۔۔۔''
''بعد میں۔۔۔ میں بالکل خراب ہو جاؤں گی سر جی۔۔۔!'' الفت کو مطلب پورا کرنا تھا۔ وہ بڑے دل موہ لینے والے انداز میں ان کے گلے میں جھول گئی۔
الفت کا ایسا بے ساختہ التفات۔۔۔ افضل کے لیے حد ہوتا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے مان گئے۔
''دیکھیں نا، پھر گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ آپ کو پسند نہیں ہے نا میرا گھر سے نکلنا۔ فل ٹائم

پاس۔"

افضل سر ہلا کر رہ گئے۔ ورنہ کہہ سکتے تھے۔ اس کے پاس تو "گزارنے" کے لیے بھی وقت نہیں ہونا چاہیے تھا نا کہ پاس کرنے کی فکر پالتی۔

تین بچے۔ پورے گھر کی ذمہ داری اگر وہ ایک سلیقہ مند گرہستن کی طرح وقت کی تقسیم کرتی تو سر کھجانے کا وقت بھی نہ ملتا ۔۔۔ مگر ۔۔۔ مگر وہ الفت تھی۔

اور الفت نے خراب تو کیا ہونا تھا۔ مزید لاپرواہو گئی۔

ننھی افزا جھولے سے گری پڑی تھی۔ اس کے ماتھے پر گومڑا ابھرا تھا اور چیخ چیخ اس کا گلا بند ہو چکا تھا۔

اسٹار پلس کے کسی سوپ کی ڈشن ڈشن ڈھاں ڈھاں سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ کمرے کے باہر موجود جوتوں کا ڈھیر بتا رہا تھا کہ اندر نئی نکور سہیلیاں موجود ہیں ۔ افضل نے دانت پیس کر خود کو پرسکون کرنا چاہا۔

وہ بچی کو اٹھانے جھکے پھر رک گئے۔ جسم کے اندر خون کی جگہ گرم سیال دوڑ رہا تھا۔

"الفت ۔۔۔ الفت!" وہ حلق کے بل چلائے۔

اچانک آواز پر وہ چونکتی گرتی پڑتی آئی۔ افضل کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ افضل کے پاس آٹو میٹک لاک کی چابی موجود رہتی تھی۔

افضل کے ہاتھ کے اشارے اور نظروں کے تعاقب میں وہ ٹھٹک گئی۔ "ارے یہ کب الٹی۔"

"اور یہ کب گری اور کب اس کا یہ حال ہوا۔" افضل نے دانت کچکچا کر جملہ مکمل کیا۔

"پتا نہیں چلا ۔۔۔ دراصل ۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے الفت! تمہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ تم ۔۔۔" انہیں ایک دم احساس ہوا بچی ابھی تک اسی حال میں تھی۔ وہ تیر کی طرح بڑھے تھے اور بچی کو سینے سے لگا لیا۔ وہ گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔ افضل نے اسے سینے سے لگایا محلے کی سہیلیاں دبے قدموں سرک گئی تھیں۔

بچی کے ماتھے کو بوسہ دیتے افضل خود کو پرسکون کرنے کی سعی کر رہے تھے۔

افزا کے ماتھے پر گومڑ تھا۔ اس کے سر کے اوپر نمی تھی۔ جس نے سفید کلف لگے سوٹ کے گریبان کو سرخ کر دیا تھا۔

سرعت سے ان کی انگلیوں نے زخم ٹٹولا پھر نظریں زمین پر جمیں تو چابی کا گچھا دکھائی دیا، نجانے بچی کس طرح گری تھی۔

افضل کے نرم ہاتھوں کا لمس اور ہونٹوں کی گرمائش۔

بچی سسک رہی تھی، اس کے کپڑے بھی گندے تھے۔ الفت صورت حال کو سمجھنے اور تاویلیں گھڑنے کے عمل میں تھی۔

اسے ہوش آیا جب افضل کے پے در پے دو تھپڑ اس کے گالوں پر پڑے اور بے حد صدمے کے زیر اثر ہڑ بڑا کر لڑکھڑائی گری تو پلنگ کے کونے نے ماتھے کو لہولہان کر دیا۔

افضل کو افزا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بچی کو دھلانے کے لیے باہر نکلے۔ وہ فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتے تھے۔

اور واپسی کا منظر ان کی توقع کے برعکس تھا۔ باہر سے کنڈی لگی تھی۔ اسد اور احد کے رونے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

☆☆☆

ان کا غصہ بے حد شدید تھا اور گھر سے الفت کو غائب دیکھ کر دو چند ہو گیا ان کا پارہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ وہ الفت کی لاپروائیوں کے سامنے ہمیشہ ڈھال تھے۔ مگر اس وقت۔۔۔ فون کر کے۔۔۔ کنیز کو بلوایا۔۔۔ اس کی شادی کو دو سال ہوئے تھے اور اس کے بچے نہیں تھے۔ اسے تین بچوں کو سنبھالنے کا قطعاً تجربہ نہیں تھا۔ گھٹ گھٹ کر روتا اسد۔۔۔ گلا پھاڑتا ضدی احد اور عادتاً ماں کی کاپی تھا اور دودھ کے لیے تڑپتی افزا اس نے خاموشی سے کوثر کو بلا لیا۔

کوثر اپنی بچی سنبھالتی گرتی پڑتی پہنچی۔ سب سے خراب حالت احد کی تھی۔ وہ ماں کے لیے رو رو کر پاگل ہو رہا تھا اور افزا کی بھوک۔۔۔ وہ فیڈر منہ میں لینے کو تیار نہیں تھی۔

کوثر کیسا جبر کرتی۔ اتنے ننھے بچوں پر۔۔۔

کنیز گھر کی حالت دیکھ دیکھ حیران تھی اور آستینیں چڑھا کر پائنچے اٹھائے کونوں کھدروں میں گھسی تھی۔ بی بی نسیم ایک بار پھر گاؤں یاترا پر گئی ہوئی تھیں۔

”بھابھی کو لے آئیں بھائی!“ کوثر ہار گئی۔

”نہیں لاؤں گا۔ آج کی حرکت کے بعد کبھی نہیں لاؤں گا۔“

”ان کی حرکتیں ہمیشہ کی یہی تھیں۔ آج کون سی انہونی۔۔۔“ کوثر تاسف سے بولی۔

”فضول مت بولو اور سنبھال سکتی ہو تو سنبھالو ورنہ میں کوئی اور بندوبست کرتا ہوں۔“

”جو مرضی بندوبست کریں مگر بھائی جی! افزا اور احد کا حال بہت خراب ہے۔“

افضل نے کوئی جواب نہ دیا مگر چہرے کی سختی اور قطعیت کی چادر ذرا نہ سرکی۔ کوثر امید بھری نگاہوں سے ان کو دیکھتی رہی مگر وہ ریموٹ کنٹرول کا سیل بدل رہے تھے۔

”جب سچ مچ منانے کی ضرورت بلکہ منت ترلے کی ضرورت ہے تو اکڑ گئے ہیں اور جب ایک ٹھڈے کی ضرورت تھی، تب بھاگ بھاگ کر جاتے تھے۔ افزا کا حال یہ ہے کہ ان کے پیروں گر جائیں اور احد کی چیخ و پکار۔۔۔ اف ناک رگڑ لیں۔“

کوثر نے جلے دل سے کہا۔ افضل پر ذرا اثر نہ ہوا۔

”ویسے بھائی جی آج آپ کو ہو کیا گیا تھا۔“

☆☆☆

”اپنی بیٹی کے لیے اتنی محبت۔۔۔ میں کیا کسی کی بیٹی نہیں تھی اور چلو غلطی ہو گئی مگر بچی کو میں نے گرایا تو نہیں۔ خود بخود گر گئی۔ اپنی بیٹی ہی خون گوشت سے بنی ہے۔ دوسرے کی اولاد تو لکڑی کا بے جان ٹکڑا، راستے کا پتھر ٹھوکر مار گزر جاؤ۔۔۔ کیوں جی۔“

الفت کی آنکھیں ماتھے پر ٹکی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی۔۔۔ اپنی بیٹی کی گردان یوں کر رہی تھی جیسے وہ افضل سعید کی مانگے تانگے کی اولاد ہو یا کم از کم الفت کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

کوثر ششدر تھی۔

وہ بمشکل سوئی افزا کو ابھی تک دھیرے دھیرے ہاتھ سے تھپک رہی تھی۔ بچی گود میں تھی۔

"بھابھی! آپ کی اپنی بچی۔۔۔" کنیز الفت کی چلتی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

"ارے جاؤ۔۔۔ میری ہوتی تو۔۔۔ میں جو مرضی کرتی۔ یہ ہیں ناں بیٹھے اس کے اصل مالک۔۔۔ اب کیوں آ گئے۔ میں نے کوئی جان بوجھ کر گرائی تھی۔ بولیں ناں ابا میاں!"

اس نے پریشان عرق ندامت سے بھیگے فیروز بیگ کا شانہ جھنجوڑا۔

"میں۔۔۔ میں کیا کہوں۔" وہ واقعی کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھے۔

"ہاں ہاں۔ آپ کیوں لیں گے میری سائیڈ، جس کی روٹیاں کھاتے ہیں اس کی مالا جپیں گے ناں۔" الفت کی بدلحاظی کی حد تھی۔

"بکواس نہ کرو الفت۔" افضل سعید کو حد درجہ ناگوار گزرا۔

"دیکھیے۔۔۔ دیکھیے۔۔۔ کیسی منہ زوری سے بول رہا ہے یہ شخص۔۔۔ اب یاد آ گیا کہ الفت ماں ہے۔ جب ٹھوکر مار کے گئے، تب کیا میں ماں نہیں تھی۔" وہ حد درجہ بدتمیزی سے ہاتھ نچا نچا کر بول رہی تھی۔

کوثر، کنیز پہلو بدل کر رہ گئیں۔ افضل سعید نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے۔ احد ماں سے چپکا کھڑا تھا مگر ماں نے ابھی تک اس کو پیار سے چھوا نہیں تھا۔ بچے کے لیے کافی تھا۔ ماں نظروں کے سامنے تھی اور وہ اس سے لگا کھڑا ہے۔ وہ اس کے چیخ چیخ کر بولنے سے پریشان تو تھا مگر۔۔۔ ماں اور باپ دونوں سامنے ہیں۔ وہ بے فکر ہو چکا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ کہہ دیجیے اس شخص سے۔۔۔ خود صبح کے نکلے شام کو لوٹیں گے۔ میرے گھر سے نکلنے پر پابندی۔۔۔ جی نیا محلہ ہے تو پرانے میں کون سا میں گلی میں پچپک (پہل دوج) کھیلتی تھی۔ ہاں نہیں تو۔"

"میں افضل کو اچھی طرح جانتا ہوں الفت۔۔۔! تمہاری حرکتیں پہلی بار ہی میں تھپڑ کھانے والی تھیں۔ آج بھی تم نے کوئی حد کر دی ہوگی۔" ابا میاں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ الفت کا مانو تن من جھلس گیا۔

اس کی آنکھوں سے شعلے اور سانسوں سے پھنکاریں نکلنے لگیں۔

"اٹھو اور بچی کو دودھ دو۔" ابا میاں کے اشارے پر کوثر نے بازو بڑھا دیے۔ افزا کے ہونٹ دھیرے دھیرے لٹک رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"کیوں۔۔۔ کیوں۔۔۔ میں کیا گائے ہوں۔" اس نے بچی پر گہری نگاہ ڈالی۔ دل کو کچھ ہوا تھا۔ مگر بچی اب دودھ پیے گی افضل کے چہرے کی اس طمانیت نے دماغ پھر گھما دیا۔

ابا میاں نے آگے بڑھ کر کوثر کی گود سے بچی لے کر الفت کے بازوؤں میں جبراً گھسا دی۔

ماں کا رنگ روپ، آواز، انداز، کردار و اخلاق خواہ جیسا بھی ہو، بچے کے لیے اس کی پہلی پہچان اس کے وجود سے اٹھتی مہک ہوتی ہے۔ ماں کی گود کی خوشبو سانس میں جاتے ہی وہ پرسکون ہو چکی تھی۔ دنیا کے ہر بچے کی پسندیدہ خوشبو ماں کے پسینے کی بو ہوتی ہے۔

☆☆☆

عورت کی زبان اور مرد کا ہاتھ ایک بار کھل جائے تو اس ڈور کو دوبارہ گرہ نہیں لگائی جا سکتی۔

افضل سعید کا نیا کاروبار دن دوگنی رات چوگنی ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ انہیں توقع سے بڑھ کر فائدہ حاصل ہوا تھا اور مزید نئے راستے کھلے تھے۔

افضل سعید کو ہر جانب سے خوشیاں اور خوش خبریاں مل رہی تھیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کی خوشیوں اور فکروں سے باخبر رہا کرتے تھے۔ کنیز کے ماں بننے کی خوشی، اظہر اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔ اکمل کاروباری رموز میں ان کے شانہ بشانہ تھا۔

سب بہت اچھا ہو رہا تھا۔ لیکن افضل کے دل کا ایک بڑا حصہ بے سکون تھا۔ انہوں نے بی بی نسیم کو جلد بلوایا تھا۔ انہوں نے مستقل ایک بچی گھر رکھ دی تھی جو صرف بچوں پر نگاہ رکھے گی۔ الفت کی طرف سے ایک گرہ پڑ گئی تھی۔

وہ اپنی دلچسپیوں میں بچوں کو نظر انداز تو کرتی تھی مگر نقصان پہنچ جانے والا خیال۔۔۔ دو جمع چار کرتے ہوئے حاوی رہنے لگا تھا۔

الفت سے محبت وہیں کی وہیں تھی۔ مگر اب انہوں نے آنکھیں کھلی رکھنی شروع کر دی تھیں۔

انہیں اس روز کی لاپروائی پر بے پناہ غصہ تھا۔ مگر ان کے دل کے اندر انتہا درجے کی شرمندگی سانس لیتی تھی اور ان کی حساس طبیعت اندر ہی اندر سسکیاں بھرتی۔

انہوں نے۔۔۔ انہوں نے افضل سعید نے الفت پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ اپنا ہاتھ توڑ ڈالتے۔ واقعی بچے جھولوں سے گرتے ہیں مگر آج تک کوئی بچہ جھولے سے گر کے مرا تو نہیں۔۔۔ اور بچی تیسرے دن تک فٹ فاٹ ہو کر قلقاریاں بارنے لگی تھی۔ مگر الفت کی آنکھ کے عین اوپر ماتھے پر لگا چوٹ کا نشان اب مرنے کے ساتھ ہی جانا تھا اور افضل سعید شدید احساس جرم میں مبتلا تھے۔

ان جیسے نرم دل، حساس، محبت کرنے والے شخص کو اپنی محبت کو اس طرح ٹھوکروں کی زد پر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔

جن گالوں کو وہ یوں چھوتے تھے جیسے نو دمیدہ گلاب کی نازک پتیاں ان پر تھپڑوں کی برسات۔۔۔ وہ قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ زندگی بھر ایسا نہیں ہوگا۔

انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا کچھ بھی ہو۔ دوبارہ ایسا کم ظرفی کا عمل نہیں دہرائیں گے۔ مگر وہ بھول گئے۔

وعدہ تو ٹوٹ جاتا ہے۔

☆☆☆

اسد افضل پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے خاندان بھر کا لاڈلا تھا۔ الفت نے تو اسے جنم دیا تھا۔ مگر احد

افضل کی پیدائش کے بعد ان کا دھیان احد کی جانب زیادہ تھا۔
اسد نے رنگ روپ باپ کا چرایا تھا۔ فقط اس کی آنکھیں ہو بہو ماں جیسی تھیں۔ جبکہ احد بنا بنایا الفت تھا۔ اس کی شکل، چال ڈھال، ادائیں ضدی طبیعت اور من مانی کی عادت روٹھنا سب الفت تھا۔
اکلوتی بیٹی افزا ماں اور باپ دونوں کا مکسچر تھی۔ افضل سعید کا گمان تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار اسد سے کرتے ہیں۔ مگر یہ افزا نے تو آ کر ان کے پورے دل پر قبضہ جما لیا تھا۔
لیکن۔۔۔

ایک روز۔۔۔
بی بی نسیم کام والی چھوٹی بچی کو ڈپٹ رہی تھیں۔
"توں اپنے اندا جے (اندازے) اپنے کول رکھ۔ بیگم بی بی کا کی کو پیار نہیں کرتیں تو کیا تیرے ورگی چھٹکی (تیرے جیسی چھوٹی) کو دکھا کر کرے گی۔"
"میرا یہ مطبل نئیں۔۔۔ بی بی!" بچی کے انداز میں جھجک اور نہ سمجھا سکنے کی الجھن تھی۔
"افزا کتنی پیاری گڈی ورگی ہے سچی اگر اس کا ساہ گھٹنے کا ڈر نہ ہو (سانس گھٹنا) تو شوکیس میں سجا ڈالو۔۔۔ پر بیگم بی بی تو اسے اپنے پاس ہی نہیں آنے دیتیں۔ کبھی ہاتھ بھی آگے کرے تو پیچھے دھکیل دیتی ہیں اور جب بچوں کو سیریلیک کھلاتی ہیں تو ناں پچھو۔۔۔ کہ۔۔۔"
"بس کرنی ڈھائی نئی فسادن۔۔۔!" بی بی نسیم ششدر تھیں۔ وہ تو یہ سمجھتی تھیں، اس بات کا علم صرف انہیں ہے (الفت بچی سے فرق کرنے لگی تھی) ادھر تو کم عقل بچی بھی یہی دیکھ اور سب سمجھ رہی تھی۔
"تجھے کا کی کھڈائے کے لیے رکھا ہے (بچی کھلانا) کہ تو نے رزلٹ کارڈ بنانا ہے خبردار! جو کسی اور کے آگے بکواس کی تو۔"
"لے۔۔۔ دس تے۔۔۔ ماں کا پیار ناپنے چلی ہے۔ وڈی سپر کورٹ کی جج۔"

☆☆☆

شک رسی کے سرے پر لگی آگ کی طرح تھا اور اس کے دوسری جانب دھماکہ خیز مواد سے بھرا گولہ۔۔۔
یہ ناقابل یقین منظر تھا۔ یہ سچ تھا یا کہ جھوٹ۔۔۔ مگر اندھا بھی وہ دیکھتا جو بینائی والا دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔
چھوٹی باجی کی چھوٹی بیٹی افزا سے تھوڑی چھوٹی تھی۔ وہ چھٹیاں گزارنے بھائی کے گھر آئی ہوئی تھیں۔
الفت بڑے سے پیالے میں سوجی کا پتلا حلوہ لیے بیٹھی تھی۔ اسد۔۔۔ احد اور دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ خود الفت ہلکے اور گہرے نیلے لان کے سوٹ میں نہائی دھوئی نکھری تیار تھی۔
وہ ایک چمچ اسد کے منہ میں دیتی۔۔۔ وہ پانچ سال کا بچہ تھا اور خوب لطف اندوز ہو کر کھاتا تھا۔ احد کچھ لاڈ کر کے کچھ منہ جدا کر ایک کی جگہ دو چمچ لے کر اگلی باری دیتا تھا۔ کرن بہت چھوٹی الفت اس کو

چھوٹے سے چمچ کے سرے پر بہت معمولی سا حلوہ رکھ کر اس کے منہ میں دیتی پھر نفاست سے بپ سے ہونٹ صاف کرتی۔

یہ منظر مکمل، خوب صورت، طمانیت انگیز اور بے عیب تھا۔ مگر نہیں۔۔۔

جب افزا کی باری آتی۔ الفت اس کے منہ تک چمچ لے کر جاتی۔ وہ منہ کھولتی۔ آنکھوں میں چمک ابھر آتی۔ وہ چمچ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر قلقاری مارتی اور واکر کے رنگ بال پر زور زور سے خوشی کے عالم میں ہاتھ مارتی۔

مگر یہ کیا۔۔۔ بھرا چمچ اس کے ہونٹوں اور دو دانت سے ٹکرا واپس پلٹ جاتا۔ بچی تیز تیز زبان نکال کر مٹھاس کو چاٹتی۔ مگر اس کے منہ میں تو کچھ نہ جاتا۔ پیٹ تو ویسے ہی خالی۔

دو ایک چمچ اسد۔۔۔ دو تین چمچ احد۔۔۔ پھر افزا۔

افزا واکر کے رنگز پر زور۔۔۔ زور سے ہاتھ مار کے ماں کو متوجہ کر رہی تھی۔ اس بار الفت نے جان چھڑاتے انداز میں ایک چمچ منہ میں دیا۔

بچی کے منہ سے چپ چپ کی تیز آوازیں ابھریں۔ اسے بہت بھوک لگی تھی اور بی بی نسیم کے ہاتھ کا حلوہ پسندیدہ ترین۔

الفت بچی کو اذیت دے رہی تھی۔

وہ تین چار بار چمچ کو محض دانتوں سے ٹکرا کر واپس لے لیتی تھی۔ وہ اس کے ہونٹوں کو حلوہ چکھانے کے بعد چمچ احد کے منہ میں دیتی تو وہ معصوم اس لاڈ اور امتیازی سلوک پر تالی پیٹتا۔

''مما جی۔۔۔ بہنا زیادہ بھوکی ہے، اسے دو نا۔'' اسد کا پیٹ بھرا تو بہن کا احتجاجی ہاتھ پیر مارنا نظروں میں آ گیا۔ ''اب میرا پیٹ بھر گیا۔''

''تو دے رہی ہو نا!'' الفت نے بے پروائی سے کہا۔

کرن کا پیٹ بھر گیا تو وہ کھلونوں سے ہاتھ مارنے لگی۔ اسد نے گاڑی چلانا شروع کی تو احد اس کے پیچھے لپکا۔۔۔ پیالہ تقریباً خالی تھا۔ دیواروں سے لگے حلوے کو اپنی شہادت کی انگلی سے چاٹ الفت کھڑی ہو گئی۔

افزا کا پیٹ بدستور خالی تھا۔ وہ واکر کے اندر زور زور سے پاؤں مار رہی تھی۔ گردن اٹھا کر ماں کو اور ماں کے ہاتھ کے خالی پیالے کو دیکھ رہی تھی۔ اب اس کے چیخنے کا وقت شروع ہوا چاہتا تھا۔

''اے کاکی۔۔۔! آ کر اسے فیڈر بنا دے اور اندر لے جا کر جھولے میں ڈال۔ نیند کرے گی۔'' الفت چلا کر پلٹی۔

پشت پر دونوں ہاتھ باندھے افضل سعید سرد نگاہوں سے اسے اور پیالے کو بغور دیکھ رہے تھے۔

''بچے بھوکے ہو رہے تھے۔'' ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں الفت نے مسکرا کر کہا۔

افضل سعید لاکھ دل کو سمجھاتے۔۔۔ آنکھوں دیکھی کو جھوٹ کہتے۔۔۔ مگر بعض اوقات حقیقت وجدان کی طرح ہوتی ہے۔ بے عیب یقین۔۔۔ فقط یقین کرنے کے لیے۔

شک کی رسی کے سرے پر لگی آگ دھماکہ خیز مواد والے گولے تک پہنچی۔ زوردار دھماکہ ہوا تھا،

افضل سعید نے الفت کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دیا تھا۔ الفت بھونچکی رہ گئی۔ اس کا جرم کیا تھا۔

''ارے یہ بیٹی ہے۔ نو ماہ پیٹ میں رکھا۔ دودھ پلایا۔۔۔ مانو آستین میں سانپ رکھا۔۔۔ سانپ کو دودھ پلایا۔'' الفت خون خوار نگاہوں سے گل گوتھنی افزا کو دیکھ رہی تھی۔

''جس دن سے میری زندگی میں آئی ہے۔ میری تو مصیبت آ گئی۔ مار کٹائی، گالم گلوچ۔ اپنی بیٹی اپنی ہے۔۔۔ کوئی گرم آنکھ سے نہ دیکھے۔۔۔ اور ہم کسی کی اولاد نہیں اور یہ ہمارے ابا میاں بیٹھے ہیں۔ سر جھکائے۔ آج بھی نہ پوچھیں گے داماد جی۔۔۔ ہماری بٹیا کے گال تماچے لگا لگا کیسے لال کر دیے۔ آج بھی میرا ہی قصور نکلے گا۔''

الفت کی مرضی کا ماحول تھا۔ سب خاموش ہارے ہوئے اور اسے خطاب کی کھلی چھوٹ۔

افضل سعید کے لیے بہت مشکل، ناپسندیدہ کام تھا کہ وہ بی بی نسیم اور کاکی سے تفتیش کریں اور پھر وہ آنکھوں دیکھی۔۔۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو خیال آیا۔۔۔ شاید آنکھوں دیکھی بھی غلط ہو۔ یونہی بدگمانی سی۔۔۔ کوئی ماں اپنی اولاد سے بھید بھاؤ کیسے کر سکتی ہے اور وہ بھی اپنی لاڈلی اکلوتی دس ماہ کی بیٹی۔۔۔ تین دن تک بچے خود ہی سنبھالتے رہے۔

لیکن افضل سعید غصہ اور عناد پالنے والے شخص نہیں تھے۔

دوئم۔۔۔ احد کی ضد اور رونا پیٹنا ناقابل برداشت تھا۔ سب اسے سنبھالنے اور سمجھانے سے قاصر تھے۔ افزا کو سنبھالنا نسبتاً آسان تھا۔

احد کی ضد کے آگے وہ بھی اڑے رہے۔ پھر اسد کا بے حد خاموش رویہ۔۔۔

وہ ماں اور باپ دونوں کے درمیان سونے والا بچہ تھا۔ رات باپ کی جانب سے کروٹ بدل جب سسکیاں دبا دبا کر بے آواز مما جی کہہ کر رویا۔۔۔ تو افضل سعید کے جسم سے جیسے کانٹوں کا جھاڑ لپٹ گیا۔ رات کے دو بجے کا عمل نہ ہوتا تو اسی وقت جاتے۔

اور اب صبح صبح وہ کوثر، اظہر بچوں اور بی بی نسیم کے ہمراہ حاضر تھے۔ اسد حسب عادت ماں کو دیکھتے ہی شانت ہو کر کھیل میں مگن ہو گیا۔ اور خود ہی مما جی۔۔۔ کہہ کر لپٹ گیا۔۔۔ تو الفت نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ افزا بدستور بی بی نسیم کی گود میں تھی۔

اور الفت باقاعدہ افزا اور افضل سعید سے منہ موڑے کھڑی تھی۔

افضل سعید سے تو منہ موڑنے کی وجہ سمجھ میں آتی تھی لیکن افزا سعید سے۔۔۔

''بیٹی تو ماں کی سہیلی ہوتی ہے۔ یہ تو سنپولیا بن کر آئی۔ ابھی تو نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔۔۔ تو ماں کی چوٹی نچوا دی۔۔۔ کل کو کھڑی ہو گئی۔ تو مٹی چٹوائے گی۔۔۔ ہاں نہیں تو۔''

فیروز بیگ اور اماں سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ وہ افضل سعید کے غیر انسانی سلوک پر احتجاج کر سکتے تھے۔ ناراض ہو سکتے تھے۔ لڑ سکتے تھے۔ گالیاں دے سکتے تھے۔ پر الفت کے رویے کے لیے کس در کو کھٹکھٹاتے۔

شوہر مارے تو انسانی حقوق کے علمبردار آ جاتے ہیں۔

اتنی چھوٹی بچی پر ماں کا غیر انسانی رویہ، بہیمانہ سلوک۔۔۔ (بعض دفعہ امریکی ہونا کتنی اچھی بات

ہوتی ہے لیکن افزا تو ابھی بہت چھوٹی تھی۔ وہ پولیس کو کیسے کال کر سکتی ہے۔)

الفت ان کا گھر تھی۔ ان کی بیوی۔۔۔ بچوں کی ماں۔۔۔ اور سب سے بڑی بات ان کی محبت۔۔۔ وہ اسے لیے بغیر کیسے گھر جا سکتے تھے۔

یہ ان کی زندگی کا اہم ترین وقت تھا۔ نیا کاروبار زبردست کامیابیاں سمیٹ رہا تھا۔ وہ عنقریب ایک گھر خریدنے والے تھے۔ افزا ان کی زندگی کے لیے کامرانیاں لے کر آئی تھی۔ ان کے پاس مستقبل کے بہت سے خواب تھے اور تعبیر حاصل کرنے کے لیے بہت لگن، شوق اور جذبہ۔۔۔

اللہ نے انہیں ہر نعمت سے نوازا تھا۔ صحت، ہنر۔۔۔ علم عقل اور عزت۔۔۔ اور عزت ایک بار چلی جائے تو۔۔۔

☆☆☆

الفت کے واہیات رویے، بے لگام زبان نے تمکنت اور اظہر کے رشتے کو نگاہیں چرانے، پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ الفت نے یہ وتیرہ اپنا لیا تھا کہ وہ پندرہ روز سیدھی رہتی۔ پانچ روز کسی معمولی سی بات پر منہ پھلاتی۔ افضل سعید کا ضبط آزماتی اور میکے روانہ ہو جاتی۔ روٹھنے اور منے میں دس روز کٹ ہی جاتے۔

کبھی بچے اس کے ساتھ ہوتے۔ اسد اور راحد کی پڑھائی اس کے نزدیک ابھی اتنی اہم بھی نہیں تھی کہ فوجی ڈسپلن کے تحت گھڑی اور تاریخ دیکھی جاتی۔

اور کبھی بچے گھر چھوڑ جاتی۔ پیچھے سے جو مرضی ہوتا رہے، فائدہ نقصان۔

افضل کے لیے دونوں صورت حال ایک سے بڑھ کر ایک تکلیف دہ ہوتیں۔

بچوں کی غیر موجودگی انہیں باؤلا کر دیتی۔

اور الفت کی غیر موجودگی بچوں کو۔۔۔

ہر دو صورت گھٹنے افضل سعید ہی کو ٹیکنے ہوتے۔

الفت کے غیر جذباتی، محبت سے خالی رویوں نے افضل سعید کی اپنی کسی وجہ سے الفت کی واپسی کو خیال و خواب کا قصہ کر دیا تھا۔ کتے کی صرف دم ٹیڑھی ہوتی ہے۔ الفت ساری کی ساری ٹیڑھی تھی۔

وہ خفا ہو کر میکے بیٹھتی تو اس کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اپنی جلی کٹی سے وہ اماں باوا کا کلیجہ جلاتی۔ چھوٹے بہن بھائی ناسمجھی کے عالم میں اس کی سنتے۔

افضل کی برائیاں جو صرف الفت کو دکھائی دیتی تھیں۔

اصل مسئلہ تمکنت کے لیے تھا۔ ان کی شادی کے دن اب نزدیک آتے جا رہے تھے تبریز بھائی کی عنقریب واپسی پر رخصتی کا ارادہ تھا۔ تمکنت کی بڑی آپا۔۔۔ شوہر کے ٹرانسفر کے باعث اندرون سندھ سرکاری گھر میں رہتی تھیں۔ سنا تھا رخصتی سے پہلے وہ بچوں کے ہمراہ حیدرآباد شفٹ ہو جائیں گی۔ تمکنت نے آپا کے گھر سے رخصت ہونا تھا۔

ہر بار کسی بڑے پھڈے کے بعد جب پنچایت بیٹھتی تو نندیں اس کا چہرہ کھوجتیں۔۔۔ کہ ان بی بی کی خاموشی کے پیچھے بھی کیا ایسا ہی کوئی طوفان چھپا ہے۔ گلے پڑا پچھلا ڈھول پیٹ پیٹ کر ہی ہاتھ شل

اور گردن جھک گئی اور ان کے جلوے تو ابھی باقی ہیں حالانکہ تمکنت کا چہرہ وہ چہرہ تھا جو ہر انداز سے اپنا اندر چھلکاتا تھا۔

نفاست، نزاکت، شرافت، اس کے چہرے پر پھیلی نرم روشنی اس کے اندر کا عکس ہی تھی۔ مگر ان سب کی آنکھوں میں الفت کے انتہائی غلط رویے کی سلوٹ زدہ چادر آ گئی تھی۔ اس ملگجی دھند میں تمکنت کا چہرہ لرزتا دکھائی دیتا۔

اس کا ستھرا دل اس کے چہرہ کا نکھار تھا۔

مگر یہ نکھار سفیدی اور زردی میں بدل گیا۔ جب ایک روز الفت نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''میں تنگ آ چکی ہوں اس روز روز کی ڈرامہ بازی سے۔۔۔ میں کوئی زر خرید لونڈی نہیں ہوں۔ نہیں رہوں گی افضل سعید کے ساتھ۔۔۔ وہ مجھے طلاق دے دے۔۔۔ وہ کیا خود کو دنیا کا آخری مرد سمجھتا ہے۔ بوڑھا کالا دیو۔۔۔ اور میرا ابھی بگڑا ہی کیا ہے۔''

فیروز بیگ سینے پر ہاتھ رکھ کے جھک گئے۔ اماں کی آنکھوں کے آگے ترمرے ناچ اٹھے۔

اتنی بڑی بات۔۔۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

''بیگ صاحب! سنبھالیے خود کو۔'' وہ پسینہ پسینہ ہوئے فیروز بیگ کو سہارا دینے لگیں۔ تمکنت سینہ مسلنے لگی۔ فرحت اور عزت پنکھا جھلنے لگیں۔

''چھوڑ دیں ابا میاں! اس ڈرامے کو۔۔۔ وہ میری ناسمجھی کا زمانہ تھا۔ جب آپ کے دل کے دورے سے ڈر کر اپنی پوری زندگی برباد کرنے کی ہامی بھری تھی۔ میں نہیں آنے والی ان بہکاووں میں۔ ہونہہ!''

''آپیا پلیز، ایسا نہ کہیں۔۔۔ چچا جان کا حال تو دیکھیں اف۔'' تمکنت ہاتھ جوڑتی آگے آئی۔

''ارے ہٹو۔۔۔ ایک تمہارے چچا جان۔۔۔ دوسرے جیٹھ جی اور تیسرے سیاں۔۔۔ تم تو نماز کے بعد کی تسبیح میں بھی یہی تین نام کی مالا جپتی ہو نا۔''

الفت نے اس کے ہاتھ جھٹکے۔۔۔ وہ انگلی کی پوروں پر فیروز بیگ۔۔۔ افضل سعید اور اظہر سعید کا نام گن رہی تھی۔

''لاحول ولا۔۔۔ استغفار۔۔۔'' تمکنت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''ارے اچھی روٹی کھلاتا ہے نظر آ گیا۔ اور جو ڈنڈے، مکے، گھونسے صبح و شام کھاتی ہوں، وہ نہیں دکھائی پڑتے۔'' الفت کے جھوٹ کی حد کہاں تھی۔

''کپڑے۔۔۔ قیمتی ہوتے ہیں۔ تن ہی تو ڈھانپنا ہے۔ پتے باندھ لوں گی۔ اس پندرہ سو کے سوٹ کے پیچھے چھپے نیل نظر نہیں آئے تم لوگوں کو۔۔۔ میں کیوں رہوں اس بڈھے کے ساتھ مار کھانے کے لیے۔۔۔ میرا ابھی بگڑا ہی کیا ہے۔''

اس نے کسی چھوٹی بچی کی طرح دامن کو چٹکی سے پکڑ لہرایا اور گھوم کر جیسے خود کو دکھایا۔

''ارے تم اپنی حرکتیں تو دیکھو۔۔۔ عورت ناجائز کو گراتے ہوئے سو بار سوچتی ہے۔ تو ایسے ہی بیٹھے بیٹھے کوکھ جھاڑ کے آ گئی۔ اری ناہنجار لوگ کچرا پھینکنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں۔ کوئی کام کی چیز نہ ہو

اندر۔۔۔تو نے اپنا خون گوشت ضائع کر دیا۔''
اماں اتنا منہ پھاڑ کر یہ سچ کبھی نہ کہتیں۔وہ فیروز بیگ کو یہ شرمناک بات بتانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کی ہٹ دھرمی اور فضول گوئی نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔
''اللہ کی بھی گناہ گار۔۔۔بندے کو بھی جواب دہ۔۔۔نہیں پیدا کر سکتی تھی تو آنے ہی کیوں دیا۔ گناہ کی طرح چھپا کر رکھا۔۔۔پالنے کی ہمت نہیں تھی۔کیا کھلانے کو روٹی نہیں دے۔۔۔''
''تمہاری تو ہر تان روٹی پر آ کر ٹوٹتی ہے اماں!''الفت نے انہیں ٹوک کر ناک سے مکھی اڑائی۔
''اس روٹی کے لیے۔۔۔پہلے مجھے۔۔۔اس قصائی کے آگے۔۔۔''
''اسے چپ کرواؤ۔۔۔''فیروز بیگ کی لرزتی کانپتی آواز بمشکل نکلی انہیں یہ الزام کبھی برداشت نہ تھا۔
''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔چپ ہو جاتی ہوں۔۔۔نہیں بولتی۔کہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔۔۔ جیسے پہلے ہوا تھا نوے کا سن تھا۔آج ستانوے چڑھ آیا۔ابا جیے ہی جا رہے ہیں۔اس وقت تو ایک پل کا بھروسا نہیں تھا۔ہونہہ!''اس کے جملے کی تلخی کم تھی۔تضحیک آمیز مسکراہٹ کے سامنے۔
''اللہ کا واسطہ۔۔۔الفت آپا۔۔۔بس کریں۔کسی ایک کو بخش دیں۔۔۔دنیا کی کسی بھی عدالت میں چلی جائیں۔آپ کا جرم ہر منزل پر سنگین جرم ہی ہو گا نام نہاد لبرل کو چھوڑ کر۔۔۔ایک معصوم ننھی جان۔۔۔جب اللہ نے زندگی پھونک دی تھی تو آپ کو عزرائیل بننے کی کیا سوجھی۔۔۔قصور کیا تھا مسئلہ کیا تھا۔''
''مجھے روز خواب آ رہے تھے، بیٹی ہو گی۔''اس نے سچ اگل ہی دیا امی کا بھی یہی اندازہ تھا۔
''کیا۔''تمکنت کے سر پر دھماکا ہوا۔
''تو کیا مطلب۔۔۔آپ کی کون سی یہ ساتویں بیٹی تھی۔یا سسرال کا ظلم و جبر تھا کہ بیٹی نہیں پیدا کرنا۔۔۔افضل بھائی تو جان چھڑکتے ہیں افزا پر۔۔۔وہ تو شکرانے کے نوافل ادا کرتے۔''اس کے سر سے سب گزرنے لگا۔وہ بھونچکی الفت کا بے پرواہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔
''ہاں تو تب ہی نا۔۔پہلی نے آ کر کون سا مجھے تاج و تخت دلوا دیا۔ٹھوکروں میں پڑی ہوں۔دو ہو جاتیں تو۔۔۔میرا پائیدان بنا لیتے۔باپ بیٹیاں مل کر۔روز صبح و شام پیر پونچھتے۔مٹی رگڑتے۔۔۔ ذلیل کرتے گزرا کرتے۔۔۔ہونہہ!''
تمکنت سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔
''اللہ آپ کو سخت سزا دیں گے۔سخت ترین۔۔۔آپ معاشرے کی مجرم، شوہر کی نافرمانی اور نعوذ باللہ اللہ سے مقابلہ۔۔۔جسے وہ زندگی دے رہا تھا، آپ نے چھین لی۔''
''ارے ہٹو۔۔۔آئیں بڑی مفتی اعظم۔۔۔بندے کی سزا سے تو نبٹ لوں۔۔۔اللہ کو تو سب پتا ہے۔ایسے ہی گھونسے برسانا شروع نہیں کر دیں گے۔۔۔کم از کم میری بات سنیں گے تو۔۔۔یہاں تو سب۔۔۔''
''بس۔۔۔اب ایک لفظ نہیں۔کوئی کفریہ کلمہ نہ نکل جائے منہ سے۔آپ سچی، باقی سب غلط۔

تمکنت نے خوفزدگی کے عالم میں جھٹ سے ہاتھ جوڑ دیے۔
الفت پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔
دنیا کا سب سے آسان کام جرم کرنا ہوتا ہے اور سب سے مشکل کام جرم کو چھپانا۔۔۔الفت کی جرم کرنے تک کی پلاننگ بے عیب تھی۔ چھپانے کا پہلو نظروں سے چوک گیا۔اور جرم بھی ایسا۔۔۔اور وہ شوہر سے چھپ سکتا تھا بھلا؟؟؟
اس نے تین ماہ کا حمل ضائع کروایا تھا۔
یہ افضل کی سوچ کے دائرے سے باہر کا عمل تھا۔
انہوں نے نہیں دیکھا۔ٹھڈے کہاں پڑے۔گھونسوں نے ناک سجائی یا آنکھ پھوڑی۔
ان کے غصے کی انتہا تھی۔ وہ سات سالوں میں پہلی بار۔۔۔پہلی بار اسے باپ کی دہلیز پر روتا سسکتا چھوڑ گئے۔
''اب تمہارے میرے راستے جدا۔۔'' غصے میں ایسے جملے نکلا ہی کرتے ہیں۔
مگر الفت کے لیے یہ قطعی فیصلہ تھا۔افضل کے جملے نے راہ دی تھی۔
افضل کے لیے یہ الفت کی جانب سے انتہا تھی۔ وہ اس سے زیادہ کیا برا کر سکتی تھی۔اور یہ افضل کی خام خیالی تھی۔
افضل کی سوچ کا اختتام الفت کا نقطہ آغاز ہوتا تھا۔پھر کیا ہوا؟

☆☆☆

بچے ماں کے حاضری رجسٹر پر غیر حاضری کے سرخ نشان لگانے کے عادی ہو چکے تھے۔مگر رخصت اتفاقی ہو یا درخواست کے ساتھ۔۔۔وہ تین سے زیادہ دن نہیں برداشت کر پاتے تھے۔
اور اس بار کا جھگڑا تو انتہا تھا۔افضل کا جانے سے انکار۔۔
اسد، بی بی نسیم اور پھپھی کے سامنے بہل جاتا۔افزا پہلے ہی بی بی اور کاکی کی عادی تھی۔مسئلہ احد کا اٹھتا۔۔وہ الفت کا پرتو تھا اور کوئی بہانہ اس کے بہلاوے کے لیے کارگر نہیں تھا۔مگر افضل سعید نے زندگی میں پہلی بار احد کے گال پر بھی ایک تھپڑ دے مارا کہ ماں کا نام بھول جائے۔افضل کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔
ان کا کاروبار ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔
گھر بیچ کر کاروبار میں لگاتے ہوئے وہ ڈرے ہوئے تھے۔خدشات تھے۔مگر اب کاروبار نے بھی ترقی کی تھی اور وہ عنقریب گھر خریدنے والے تھے۔یہ سرپرائز تھا۔
پوش علاقے میں ایک انڈر کنسٹرکشن گھر وہ بہت اچھے داموں خریدنے والے تھے اور آگے اسے اپنی حسب منشا بنواتے۔بچوں کے کمرے۔۔۔بہنوں کے لیے مہمان خانہ، چھوٹا سا لان جس میں جھولے تھے۔اور کورڈ کار پارکنگ اور گھر بننے سے پہلے وہ اپنا دیرینہ شوق پورا کرنا چاہتے تھے اور ایک فرض اور ارادہ بھی۔۔۔
اظہر اور اکمل کے لیے وہ ایک ایک شہ زور ٹرک خرید چکے تھے۔ان کے نام پر تا کہ ان کی مستقل

آمدنی کا ذریعہ ہو۔
اکمل اور اظہر کے لیے کاروبار میں ایک نیا فیصلہ بھی۔
وہ انہیں خود مختار کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں ایک اچھا آغاز اور ہمیشہ کے ساتھ کی یقین دہانی دینا چاہتے تھے کہ وہ ہر اچھے برے میں ساتھ ہوں گے۔
الفت پر وقتی طور پر جیسے لعنت بھیج چکے تھے۔
بہن بھائیوں کی ذمے داری اور معاشی مسائل میں گھرے افضل کی زندگی میں کوئی رنگینی نہیں تھی۔ ان کے پاس ان سب کے لیے تو خوابوں کا ڈھیر تھا مگر اپنے لیے کچھ نہیں۔۔۔ لیکن الفت نے ان کی زندگی میں آ کر رنگ بھرے تھے۔ انہیں اولاد دی، گھر بنا۔۔۔ وہ جیسے قوس قزح میں رہتے تھے۔ لال نیلے پیلے اودے رنگ مگر قوس قزح کی خوب صورتی رنگوں کے گول دائرے مناسب امتزاج اور توازن میں ہوتی ہے۔ رنگ بے ہنگم ہو کر ایک دوسرے پر چڑھ جائیں۔ اپنا دائرہ بھول جائیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ تو فقط سیاہی رہ جاتے ہیں۔ آسمان کی سیاہی دنیا کو اندھیرا کرتی ہے۔
رنگوں کی سیاہی منہ پر پڑ جائے تو زندگی اندھیر ہو جاتی ہے۔ اور ایسی ہی ایک کالک تھوپنے الفت ان کی زندگی کی طرف آ رہی تھی

☆☆☆

گھر کی پے منٹ کرتے ہی افضل سعید نے اپنی مرضی کا کام شروع کروا دیا۔ ان کی ترقی کا سفر قابل رشک اور قابل تقلید تھا۔
افضل سعید کی شدید ترین خواہش تھی ایک نئی نکور نیو ماڈل گاڑی لینے کی۔۔۔ وہ اور انتظار نہیں کر سکتے تھے۔
ہفتے کے آغاز پر۔۔۔ وہ نیا آسمانی کلف لگا سوٹ اور نیا باٹا شوز پہن جب دفتر پہنچے تو ان کی 97ء ماڈل کی کرولا۔۔۔ ان کی شان کو چار چاند لگا رہی تھی۔
محنت مشقت کے بعد حاصل انعام کا غرور چہرے پر تنا تھا۔ ان کا سانولا رنگ دمک رہا تھا۔ دراز قامتی انہیں فاتح بناتی تھی۔ حسد، رشک، خوشی حیرت اور مبارکباد کے جملے سمیٹتے وہ دفتر میں داخل ہوئے۔
الفت کی ہٹ دھرمی اور طلاق جیسے۔۔۔ بے ہودہ مطالبے کے باوجود۔۔۔ حسب عادت تقریباً مہینے بھر میں ان کا غصہ دم توڑ چکا تھا۔
وہ گھر، کاروبار اور بچوں میں مصروف تھے۔ الفت فون پر۔۔۔ انہیں مسلسل طلاق دینے پر اکساتی تھی، بھڑکاتی تھی۔
''چھوڑ کر گئے تھے۔۔۔ تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔''
''میں نہیں رہوں گی اب۔ ناک سے لکیر کھینچو گے تب بھی نہیں۔''
''اپنی دولت اپنے پاس رکھو۔ روٹی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ شوہر نے نہیں۔۔۔'' اماں کانپ کانپ جاتی تھیں۔

اس کی طلاق کی گردان نے تمکنت کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ اس کا دل انجانے خدشات سے لرز رہا تھا۔

اظہر، بھائی کے زیرِ نگرانی اپنے کاروبار پر بھرپور توجہ دے رہا تھا۔ دوسرے وہ گھر کو بھی دیکھ رہا تھا اس کی بے پناہ مصروفیت، تمکنت کے خدشات کو ہوا دیتی تھی۔

اظہر اور اس کی ملاقات کم ہوتی تھی۔ اظہر کی محبت اسی طرح تھی اس کا التفات اور لگاوٹ نثار ہوتی نگاہیں چھوٹے چھوٹے جملے۔۔۔ سب وہیں کے وہیں تھے۔۔۔ مگر تمکنت کے دل کو قرار نہ تھا۔

یہ کاروباری مرکز تھا۔ مال اتارا اور چڑھایا جا رہا تھا۔ میٹنگ، لوگ، رش مگر اس شور میں افضل سعید کا نام پکارا جا رہا تھا۔

وہ کچھ چونک کر تصدیق کے لیے اپنے ملازمین کی جانب مڑے۔

تو حیران ہوئے۔۔۔ ان تمام کے چہروں پر خوف سے زردی کھنڈی تھی۔

وہ ان کے سوالوں پر جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ان سے نگاہیں چراتے تھے۔

کیا مسئلہ ہے۔ بولتے کیوں نہیں کیا ہوا ہے۔ ایک مسلسل چپ۔۔۔ وہ الجھ کر خفا ہو کر باہر کو لپکے۔

''سیٹھ صاحب! باہر نہ نکلو۔'' ایک بوڑھا ور کر منمنایا۔

''کیوں۔۔۔ کیا ہوا ہے۔'' وہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

''اکمل۔۔۔ اظہر۔۔۔ باہر آؤ۔۔۔ دیکھو تو۔۔۔''

''جوان خون ہے بیٹا۔۔۔! ان کو آواز نہ مارو۔'' وہی بوڑھا گھگیاتا ان کے روبرو ہو گیا۔

سیٹھ جی سے بیٹا۔۔۔ انہیں لگا، وہ بچپن کی طرح باہر لوگوں سے بھڑنے جا رہے ہیں اور انہیں ان کے والد صاحب روک رہے ہیں۔

اکمل پیچھے اسٹور میں کارٹن گنوار ہا تھا اور اظہر کوئی کھاتہ کھولے اندراج کر رہا تھا۔ بھائی کی پکار پر باہر آئے تو منظر نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ وہ بھائی سے پوچھنا چاہتے تھے۔

تب ہی ''افضل سیٹھ'' کی پکار بہت واضح تھی۔ دروازے کے باہر کا رش اب ان کی نگاہوں کے سامنے ہی آ گیا۔ وہ چونکے اور تیزی سے بھائی کے پیچھے لپکے۔ نئی نکور 97ء ماڈل کی سیاہ کرولا۔۔۔ کے نزدیک رش تھا۔

کیا گاڑی کو کوئی نقصان پہنچا؟؟؟

ان کے دفتر کے عین سامنے والے دفتر کے بیرونی حصے پر رکھی میز اور کرسی کے پاس ہجوم کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایڑیاں اٹھا، سر نکال ایک دوسرے کی بغلوں میں منہ دیے۔ اندر جھانکنے کی جستجو میں ایک دوسرے سے پیر کچل رہے تھے۔

مگر افضل سعید اور ان کے پیچھے آتے اکمل و اظہر کو دیکھ دائرے کا ابر خود بخود کھنچ گیا۔ ان کے لیے راستہ بن گیا۔ افضل کے دائیں ہاتھ میں موبائل اور بائیں میں نئی گاڑی کی چابی تھی۔ اکمل ہلکے براؤن سوٹ کے ساتھ تلے والے پسندیدہ جوتے میں تھا۔ جبکہ اظہر سیاہ جینز کے ساتھ گرے ٹی شرٹ میں اس

کی انگلیوں میں پین پھنسا تھا۔
یہ ایک بہترین کاروباری صبح کا آغاز تھا۔لیکن۔۔۔
تینوں بھائیوں کی نگاہ ایک ساتھ ہی سیاہ وسفید پرنٹ کے لان سوٹ میں ملبوس الفت پر پڑی اس نے دوپٹے کی بکل مار رکھی تھی اور ایک درمیانے سائز کا پرس بغل میں پھنسا تھا۔
آسمان ان کے سر پر گرا۔۔۔
دن کی تیز چمکیلی روشنی سیاہ تاریکی میں بدل گئی کہ۔
آنکھوں سے بینائی رخصت ہونے کا گمان ہوا۔۔۔پتھر کا ہو جانا لغت کا محاورہ نہیں ہے ایسا حقیقت میں بھی ہوتا ہے۔وہ تینوں خوب صورت، خوش لباس، بے عیب مجسموں میں ڈھل چکے تھے۔
مگر اذیت اور ذلت یہ تھی کہ وہ مجسمے نہیں تھے۔ان کا سانس چلتا تھا وہ اپنی عزت کے نکلتے جنازے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ اور سن رہے تھے۔
''جب میں رہنا نہیں چاہتی اس شخص کے ساتھ۔۔۔منہ سے طلاق مانگ رہی ہوں تو دیتا کیوں نہیں۔ہوگا دولت مند، شان وشوکت، پیسے والا، بنائے بنگلے اور محل۔گھومے بڑی گاڑیوں میں، خریدے ٹرک اور دنیا کی ہر شے۔۔۔
مگر میرے کس کام کی۔۔۔میں کیوں رہوں جب میں رہنا نہیں چاہتی۔۔۔مل جائے گی اسے دولت کے بل بوتے پر اور کوئی پاگل کی بچی مار کھانے کے لیے۔بڑا عقلِ کُل بنتا ہے۔سمجھاؤ نا آپ اسے۔۔۔کیوں نہیں فارغ کرتا مجھے۔اس دن چھوڑ کر تو آیا تھا نا۔۔۔پکا کاغذ کیوں نہیں دیتا۔''
کہتے ہیں مرنے کے بعد اعمال کے کارن چہرے بگڑ جاتے ہیں۔خوف ناک، ہیبت ناک اور اگر کسی زندہ کا چہرہ بگڑے تو۔۔۔افضل سعید کے جسم میں خون کی ایک بوند نہیں باقی تھی پھر بھی وہ زندہ کیوں تھے۔
اظہر کے منہ سے صرف بھابھی نکل سکا تھا۔اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔
اکمل کو سب سے پہلے ہوش آیا۔وہ تیزی سے آگے بڑھا۔
''کیا کر رہی ہو بھابھی۔۔۔''اس نے اس کا شانہ ہلایا۔
''ارے ہٹو۔۔۔بھابھی کے بچے۔۔۔کوئی بھابھی وابی نہیں''۔ اس نے جھٹکے سے اپنا شانہ چھڑوایا۔
''آپ دوست احباب ہیں۔کاروباری ناتا ہے۔مشورے دیتے ہیں۔سمجھائیں اسے، جب میں رہنا نہیں چاہتی تو فارغ کردے۔۔۔اس کا راستہ صاف میرا بھی۔۔۔رکھے اپنے بچے بھی۔۔۔مجھے نہیں لینے۔جب شوہر ملے گا تو بچے بھی ہو جائیں گے۔میرا کیا خاک بگڑا ہے۔''اس نے ٹھینگا دکھایا۔
''ہونہہ!''
اس کے کاروباری حریف حشمت اللہ کا دل لرز اٹھا۔وہ کچھ دیر پہلے افضل کی نئی گاڑی پر رشک کر رہا تھا۔وہ اب افضل کے حال پر کس کیفیت کا اظہار کرے۔۔۔اسے توبہ کرنی چاہیے۔
''عزت سے ذلت کا سفر اتنا مختصر۔۔۔۔''

اس کا دل چاہا، وہ اس عورت کا گلا گھونٹ دے۔
افضل سعید کے عزت کے جنازے میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔
خوف خدا رکھنے والوں کے لیے یہ مقام عبرت تھا۔ وہ افضل سعید کو زمانوں سے جانتے تھے۔
کیوں۔۔۔ کیا کب کیسے۔۔۔۔ وہ عورت سچی بھی ہوتی مظلوم بھی۔
تب بھی اسے اس طرح یہاں آ کر۔۔۔ ہاہ۔
''اب چپ کاہے کی لگی ہے۔ دھمکی تو بڑی شان سے دے گئے تھے۔ میں تمہیں جی کر دکھاؤں گی۔ پونچھتے رہنا پیسے سے ناک۔۔۔ ہونہہ۔
پیسہ کیا ہے ہاتھ کا میل۔۔۔ لو میں نے جھاڑ دیا۔''
اس نے تالی پیٹنے کے انداز میں ہاتھ بجا کر رگڑے۔
بے یقینی، خوف، سکتہ، جھٹکا۔۔۔ ذلت، الفت کے ساتھ گزارے سات سالوں کی فلم نظروں میں پھر گئی۔
پھر اس کے ابھی کے جملے کانوں سے ٹکرائے۔
انہیں غش سا آ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر سہارے کے لیے اٹھے ہاتھ کو اظہر نے تھام لیا تھا۔
''میں۔۔۔ میں افضل سعید۔۔۔ میں افضل سعید چوہدری۔۔۔ الفت بیگ کو طلاق۔۔۔ دیتا ہوں۔۔۔ طلاق۔۔۔ طلاق دے چکا ہوں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ کوئی گنجائش۔۔۔ نہیں۔۔۔ کوئی۔۔۔ رشتہ نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ افضل سعید۔۔۔ میں۔۔۔ افضل۔ میں افضل۔۔۔''
اونچا لمبا، عزت دار، شاندار مرد۔۔۔ ہوش و حواس سے بے گانہ ہونے کو تھا۔

☆☆☆

''پرسوں کہا تھا نئی گاڑی میں مما کو لینے جائیں گے اب تو چار دن ہو گئے گاڑی پرانی ہو گئی۔ مما نہیں لائے۔'' کوثر تو اسے سلا کر آئی تھی۔ بہلا پھسلا کر ڈانٹ کر پچکار کے۔۔۔ ابھی وہ افضل سعید کے پاس آ کر بیٹھی ہی تھی۔ احد آنکھیں مسلتا آ گیا۔ اس کے بال ماتھے پر بکھرے تھے۔ پھولے گال خفگی کے باعث کپا معلوم ہوتے تھے۔ افضل سعید اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کا ذہن کہیں دور خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔ اس کا گندمی رنگ، آنکھوں کی بناوٹ، ناک اور ٹھوڑی کا کٹ سب الفت جیسا تھا۔ وہ ان تین دنوں میں سب بھول چکے تھے مگر یہ ننھا چہرہ ایک دوسرے چہرے کی یاد جگا رہا تھا۔
اور یہ یاد اپنے جلو میں اور بھی بہت کچھ لائی تھی۔ ورنہ وہ ہر شے کو بھولے ہوئے تھے جیسے۔
''لے جاؤ اسے کوثر۔۔۔ اب کوئی نیا ڈرامانہ شروع ہو۔'' اکمل بھی نیم تاریک کمرے کے کونے میں صوفے پر بیٹھا تھا۔
کوثر ہمت مجتمع کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ سب سے مشکل کام احد کے چہرے سے جھلکتی ہٹ دھرمی اس کے ارادے ظاہر کر رہی تھی۔
اور افضل سعید کا بے تاثر چہرہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ کچھ سن نہ رہے ہوں کچھ دیکھ نہ پا رہے ہوں کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو۔۔۔ وہ تین دن سے اس کمرے میں بند تھے۔ وہ پکارے جانے پر اتنی خالی نگاہوں

سے اگلے کا چہرہ دیکھتے کہ سامنے والے کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا جاتی۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہے تھے اور کوئی انہیں کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

طلاق، علیحدگی، ناچاق بربادی زندگی کے رخ ہیں۔ دو افراد ساتھ نہیں رہ سکتے تو دنیا کے ہر مذہب اور معاشرے میں جدائی کی راہ دکھادی گئی ہے۔

مگر ساری زندگی دامن بچا بچا کر چلنے سے کیا حاصل ہوا جب انت میں اتنی غلاظت کے اندر منہ کے بل گرنا تھا کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔۔۔

راستے الگ کیے جاسکتے تھے۔ لیکن اب۔۔۔

ان کے جھکے کندھوں پر سر کا بوجھ اٹھانا کس قدر مشکل ہو گیا تھا۔ جسم کے ناسور بنے حصے کو کاٹ دینے سے علاج تو ہو جاتا ہے مگر جو عیب اور کم ظاہر ہوتی ہے پھر اسی کے ساتھ تمام عمر بسر کرنا پڑتی ہے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا لباس تھے۔ ایک دوسرے کو ڈھانپنے والے۔۔۔ لیکن جب الفت نے سر عام اپنا پلّو سمیٹ لیا۔ پھر افضل سعید کی برہنگ سب نے دیکھی۔

وہ نئے لبادے سے اپنی ستر پوشی کر سکتے تھے۔ مگر دنیا کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے۔

اتنی بڑی زندگی اور صدیوں پر پھیلا قصہ ایک جملے کے ادا ہونے کے بعد ختم ہو گیا۔ احد کی پکاریں اور چیخ چیخ کر رونا رات کے سناٹے میں اعصاب کے لیے کڑا امتحان تھا۔

اس نے کوثر کے سینے اور منہ پر ٹانگیں چلائیں اور اس کے بال نوچ ڈالے۔ وہ اسے کاٹنے اور ناخنوں سے نوچ ڈالنے کے لیے پاگل ہو رہا تھا جنونی۔ ''مما۔۔۔ مما کو لاؤ۔۔۔ مم کو بلاؤ۔'' وہ دھاڑ رہا تھا۔

اس نے بیڈ پر پڑی ہر شے مارنی شروع کر دی اب کوثر کے جہاں بھی لگے۔ اس نے اندر کمرے میں افضل کا چونکنا دیکھ لیا تھا۔ وہ ترنت باہر آیا۔ لیکن احد کسی کے قابو آنے والا نہیں تھا۔

''چلانا بند کرو۔ مر گئی وہ، اب کبھی نہیں آئے گی۔'' افضل چوکھٹ پر کھڑے تھے۔

''نہیں۔۔۔ نہیں مری نہیں۔ نانا میاں کے گھر گئی ہیں۔ مجھے ممی چاہیے لا کر دیں۔'' وہ ضد میں الفت سے آگے تھا۔ باپ کے چہرے کا سناٹا اور آنکھوں کی مردنی اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ افضل کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ احد کا بازو دبوچ لیا۔

اکمل اور کوثر ناسمجھی کے عالم میں تھے۔ شور کی آواز سے اسد آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ ابو نے پہلے تو کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ماں اب کبھی نہیں آئے گی۔ مر گئی ہے۔ ابو ایسے کیوں کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھنے کے لیے پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

''آج کے بعد ممی کا نام نہیں لینا۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ بھولے سے بھی نہیں۔۔۔ غلطی سے بھی نہیں۔۔۔ وہ اس گھر میں اب کبھی نہیں آئے گی۔ بھول جاؤ کہ ماں تھی بھی۔'' باپ کے ٹھہرے لہجے نے احد کے جنون کو روک دیا تھا۔

''مما ہیں۔۔۔ میری مما ہیں۔'' وہ زور دے کر بولا۔ اس کا یقین جھول سے پاک تھا۔ ''پہلے بھی تو لاتے تھے۔ ابھی لا کر دیں۔''

''اب نہیں آسکتی۔''

''نہیں۔۔۔مما لا کر دیں۔'' وہ پورا زور سے چیخا۔

''چٹاخ۔۔۔'' یہ افضل سعید کا کسی بھی بچے پر زندگی کا پہلا تھپڑ تھا۔ وہ نیچے گر گیا۔

کوثر اور اکمل آگے بڑھے تو افضل کے ہاتھ کی ٹھوکر اور گلے سے نکلتی بے معنی یہ دھاڑ نے راستہ روک دیا۔

''یاد رکھو اور۔۔۔اس کا نام مت لینا۔ وہ اب کبھی نہیں آئے گی آج آخری بار سمجھا رہا ہوں۔'' اور وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال شرر بار نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے مما چاہیے۔'' انہیں الفت کی پرچھائی احد کے چہرے سے جھلکتی نظر آرہی تھی۔

کوثر بے تابانہ آگے بڑھی اور احد سے لپٹ گئی۔

''نہیں کریں بھائی جان۔۔۔بچہ ہے اسے کیا سمجھ۔۔۔''

''تو اسے سمجھ آجانی چاہیے۔۔۔'' وہ قطعیت سے بولے تھے۔ احد کی ہمت جواب دے گئی۔ کوثر کی گود سے نکل کر تکیے سے لپٹ گیا۔

''مما لا دیں۔'' وہ سسک رہا تھا۔

اس کا لرزتا سلگتا وجود، سرخ دہکتے آگ جیسے گال۔۔۔بھیگی چپ چپ کرتی پلکیں وہ نیند کی وادی میں چلا گیا تھا یا بے دم ہو چکا۔

☆☆☆

''میرا قصور اظہر۔۔۔؟ اس کی بھری آنکھوں سے لہو ٹپک رہا تھا۔

''اور میرا قصور تمکنت جلال بیگ؟''

''مم۔۔۔مم۔۔۔دنیا کو کیا جواب دوں گی۔۔۔کیا منہ دکھاؤں گی۔''

''ویسا ہی منہ اور وہی جواب جو۔۔۔میں دنیا کو دے رہا ہوں۔'' اظہر اپنی شہادت کی انگلی اس کے شانے میں چبھو چبھو کر کہہ رہا تھا۔

تمکنت کے پیر اکھڑ گئے وہ لہرائی تو گرنے کے انداز میں صوفے پر گر گئی۔

''آپ۔۔۔تو مجھے بہت اچھی طرح جاننے کا دعوا کرتے تھے۔'' وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

''جاننے کا دعوا'' وہ سرعت سے پلٹا۔ ''اس وقت میں خود کو بھی بھول بیٹھا ہوں۔ اپنا نام، مقام، رشتے سب بھول چکا ہوں۔ یاد ہے تو صرف ایک تماشا گاہ جہاں ہماری زمانوں کی کمائی عزت لوگوں کے پیروں میں رل رہی تھی۔ ہمارے شملے تماش بینوں کی ٹھوکروں میں پڑے تھے یاد ہے تو۔۔۔''

تمکنت صوفے کی پشت سے چپکی ہوئی تھی۔ اظہر کے دونوں ہاتھ صوفے کی ہتھی پر تھے اور وہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔

''اور۔۔۔محبت؟'' اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے نوحہ پڑھا تھا۔

''او۔۔۔ڈیم اٹ۔۔۔محبت۔'' وہ بھنا کر ایڑیوں پر گھوم گیا۔

''محبت اور عزت میں سے ایک چیز چننی ہو تو میرے ہاتھ صرف عزت کی طرف بڑھیں گے۔''

''تو تھام لیجئے نا میرا ہاتھ۔۔۔ میں آپ کی عزت ہی تو ہوں۔''اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔''محبت بھی اور عزت بھی۔۔۔''

''عزت اس روز بازار میں سرعام لٹ گئی تھی اور محبت نفرت کے جذبات کو میں بھول گیا۔ایک بے حسی ہے بس۔۔۔''

''لیکن میرا قصور تو بتایئے۔''وہ بے دم ہو چکی تھی۔

''تو میرا جرم بھی بتا دو۔۔۔ میں گھر سے باہر نہیں نکل سکتا کہ وہ جا رہا ہے اظہر وہ جس کی بھابھی (آخ تھو) نے اس روز۔۔۔ میں شاید زندگی بھر دفتر والے روڈ پر نہ جاؤں۔''

''لیکن میرا نام۔۔۔ ناکردہ جرم کی سزا مجھے کیوں ملے۔''

''صرف تمہیں نہیں۔۔۔ میں بھی بھگت رہا ہوں۔ ہمارا پورا خاندان، آنے والی نسل۔''

''میں ان جیسی نہیں ہوں اظہر۔۔۔''روروکر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

وہ اسے کیسے ٹھکرا کر جا رہا تھا۔

الفت نے اپنا کارنامہ بہت فاتحانہ انداز میں بے فکری سے بتایا تھا۔ رونا پیٹنا۔ بین کرنا سب ثانوی باتیں تھیں۔

وہ سرعت سے فون کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اظہر سے تصدیق چاہتی تھی۔ وہ افضل سعید سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی انگلیاں پاگلوں کی طرح فون کے بٹن دباتی رہیں مگر ہر در بند ہو چکا تھا۔

وہ حق دق سب کی صورتیں دیکھتی اور صبح سے شام کرتی۔

دنیا بھر سے منہ چھپا کر سسکیاں بھرتے فیروز بیگ اس کے کسی کام نہ آسکتے تھے۔

کوثر اس کی مددگار بنی۔۔۔ بھائی کے گھر اور زندگی کو سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ اسے رہ رہ کر تمکنت اور اظہر کے رشتے کی فکر کھا رہی تھی۔ لیکن وہ مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہتی تھی مگر یہ وقت بڑا کڑا تھا۔ ہر وقت الٹا ہی پڑتا تھا۔

افضل سعید دنیا سے منہ چھپا کر گھر میں پڑے تھے۔ اظہر اور اکمل کی رہائش وہیں دفتر کے اوپر تھی۔ وہ کب تک لوگوں کا سامنا نہ کرتے۔

اور وہ اکمل تھا انیس برس کا جوشیلا، خوش مزاج شوخ و شنگ رنگوں پر جان دینے والا کلف لگے کپڑے پہننا اور تلے والے جوتے اور کھسے، بیش قیمت گھڑیاں دل جان سے لگا کر رکھی بائیک۔۔۔ اپنے ظاہری حلیے سے وہ ایک مغرور تاثر دیتا جو سامنے والے کو جھجک میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسے کاروباری حریف کے بیٹے نے روک کر پوچھ لیا تھا۔

''اس روز کیا ہوا۔'' وہ بظاہر افسوس کر رہا تھا۔ افضل سعید کے طلاق والے فوری ری ایکشن کو سراہ رہا تھا مگر اس کے لہجے کی تضحیک اور آنکھوں سے چھلکتی کمینی مسکراہٹ۔ اکمل کے پورے وجود کو جھلسا گئی۔

وہ راستے میں کتنوں کو مارتا اور کتنوں سے بچتا گھر آیا تھا۔ اس کی ٹھوکروں سے گملے ٹوٹ گئے۔ دیوار گیر آرائشی شیشہ گلاس مار کے توڑ دیا۔ اس نے احد کے گال پر تھپڑ مارے پھر اپنے ان ہاتھوں کو دیوار سے ٹکرانے لگا اور آخر میں بے دم ہو کر اپنے بال نوچتا ڈھے گیا۔

''اکمل۔۔۔اکمل میرے ویر۔۔۔!بہنوں کے ہوش اڑ گئے۔ بڑی باجی اس سے چمٹ گئیں۔
کوثر پانی کا گلاس لے آئی۔ چھوٹی باجی بال سنوارتے ہوئے منہ سر چومنے لگیں۔
''یہ۔۔۔یہ بچے۔۔۔یہ احد۔۔۔میرے سامنے سے لے جاؤ باجی! میں مار ڈالوں گا اسے۔
وہی صورت ہے، ویسی ہی آنکھیں۔۔۔ویسے ہی دیکھتا ہے۔''
افضل سعید کی اس سارے منظر سے لاتعلقی دیدنی تھی۔ جیسے ان کا اس سب سے کوئی واسطہ نہیں۔
وہ بہرے ہوں اور بے حس بھی۔
''شکل سے کیا ہوتا ہے۔ ارے میرے بھولے! تربیت شکل ہی بدل دیتی ہے۔ تم خود پالنا۔ ہم بتائیں گے اسے کہ اس کی ماں کیا تھی۔۔۔کیسی تھی اور اس نے شہر کے چوراہے پر ہمارے منوؤں پر کیسی کالک تھوپی۔۔۔وہ ہمارا ہے، ہمارے جیسا بنے گا۔''
''ہمارا کیا تعلق اس کٹنی سے۔۔۔ختم قصہ۔۔۔اب ڈر کیسا۔''
وہ سانس سنبھالتے ہوئے حقیقت آشنا ہو رہا تھا۔
بہنوں کی بات عقل میں آ رہی تھی۔
''لیکن! لیکن میں کس منہ سے دفتر جاؤں باجی! لوگ آوازیں کسیں گے وہ دیکھو، جا رہا ہے وہی چوہدری اکمل سعید جس کی بھابھی۔'' اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے۔
''کیسی شرم!'' بڑی باجی نے چمک کر کمان اپنے ہاتھ لی۔
''کہنے والے کیا عقل کے اندھے۔۔۔یا بہرے تھے۔ سرعام بے عزت کرنے والی عورت اپنے تئیں منہ پر تھوکنے آئی تھی۔ تماشا لگانے۔۔۔تماشا تو اس کا لگا۔ سہاگن بن کر آئی تھی اور طلاقن بن کر لوٹی۔۔۔آتے وقت کسی نے پہچانا ہوگا تو افضل سیٹھ کی بیگم۔۔۔اکمل اظہر کی بھابھی۔۔۔سعید سنز کی مالکن۔۔۔کسی کامے (کام کرنے والا) نے سلام بھی جھاڑا ہوگا پہچان کر راستہ بھی دیا ہوگا اور جب لوٹی۔۔۔تو کیا اوقات تھی ٹکے کی نہیں۔۔۔نہ بیوی رہی نہ بھابھی نہ مالکن۔۔۔آتے وقت کوئی اسے تتی آنکھ سے دیکھتا تو آنکھ نکال کر ہاتھ پر رکھنے والا شوہر اور دیور تھے۔
اور واپسی میں کوئی ہاتھ پکڑ اندر بھی گھسیٹ لیتا تو کون والی وارث ہوتا تھا۔ کٹی پتنگ۔۔۔
وہ میرے بھائی کے منہ پر تھوکنے آئی تھی۔ آئی تھی نا۔۔۔خود کیسے لوٹی ننگے سر۔ ہونہہ۔''
بڑی باجی کے اندر کا عناد اور غصہ رونے دھونے، پیٹنے اور چلانے کے بعد اس وقت صرف اکمل کی تشفی کے لیے ٹھہرا دھیما اور دلائل سے پر تھا۔
ورنہ بہنوں کی محفل میں وہ باقاعدہ مغلظات سے اسے کوس رہی تھیں۔
اکمل کے دہکتے دل و دماغ پر سکھ کی پھوار برس رہی تھی۔
ہاں انہوں نے یہی تو کہا تھا۔ وہ سینہ تان کر چل سکتے تھے۔ ان کی غیرت پر حملہ کرنے والی کو منہ توڑ جواب طلاق سے بڑھ کر کیا تھا۔
اکمل کوثر کے دیے پانی کے گلاس سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ تب ہی نگاہ سیڑھیوں پر کھڑے اظہر پر پڑی۔ وہ اوپر سو رہا تھا۔ شور کی آواز سن کر آیا تھا۔

اس نے اکمل کا ردعمل اور بہنوں کے جملے سب سنے تھے۔ اس کا دماغ سن تھا۔ اس کے فون پر مستقل ایک سسکیوں بھری کال تھی۔ جسے وہ ڈسکنکٹ کر رہا تھا۔

ایک دمکتا چہرہ سسک رہا ہے۔ اس نے فراموش کر دیا تھا۔

زندگی بس اس ''صبح'' پر محیط ہو گئی تھی اور کچھ نہیں۔

اکمل کو اچھو سا لگا۔ وہ اظہر کی جانب انگلی کر کے چلایا۔ وہ بہنوں سے پوچھ رہا تھا۔

''آپ تو کہہ رہی تھیں کہ اب کوئی تعلق نہیں۔۔۔ اس کا ہے نا۔ وہ اس ناگن کی بہن۔۔۔ یہاں اس گھر میں میرے سامنے۔۔۔ گھومے گی۔

اس سے کہے اسے فارغ کرے۔۔۔ ابھی اسی وقت۔۔۔ بولیں آپا۔۔۔'' وہ ایک بار پھر جنونیوں کی طرح چیخنا شروع ہو گیا۔

اظہر سیڑھیوں سے اترا۔

''میں نہیں لاؤں گا اسے اکمل۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔ میں اسے بھی طلاق دے رہا ہوں۔'' وہ اس کی تشفی کروا رہا تھا۔

چھوٹی باجی اور کوثر لرز اٹھیں۔

''نہیں اظہر۔۔۔ نہیں''۔ کوثر اظہر کی پشت سے چپک گئی۔

''نہیں اظہر''۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے اور سر نفی میں ہل رہا تھا۔

☆☆☆

اظہر سے ملنے کی تمام کوشش بے سود تھیں۔ وہ اس کے ہاتھ آ کے نہیں دے رہا تھا فون نہیں سنتا تھا۔ اس نے پی سی او سے فون کیا اور چھوٹتے ہی بولی۔

''مجھ سے ایک بار مل لیں اظہر۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ بس ایک بار۔ آپ گھر نہ آئیے گا۔ اسکول آ جائیں۔ پلیز اظہر۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔ ف۔۔۔ فون مت رکھیں اظہر! ہماری زندگی داؤ پر لگی ہے۔''

''ہماری زندگی ختم ہو چکی ہے۔'' اس نے پہلی بار جواب دیا تھا۔

''نن۔۔۔ نہیں۔ آپ میری بات تو سنیں۔''

''اگر آپ نہ آئے۔ تو میں آ جاتی ہوں آپ کے پاس اظہر! آپ جگہ بتائیے۔ میری کوئی نہیں سنتا۔۔۔ بھائی اتنی دور۔۔۔ آپا خود پریشان۔ وہ آئیں گی۔ تایا بستر پر پڑے ہیں۔ میں کس سے کہوں۔'' رونے سے تمکنت کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

''یہاں فون نہ کرنا تمکنت دوبارہ کبھی۔۔۔ میں۔''

''میں آپ کے دفتر آ جاؤں گی۔ آپ مجھ پر ایسے ظلم نہیں۔۔۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر رو پڑی اور اس کی تیزی اظہر کے وجود کو دہکتے کوئلوں پر ڈال گئی۔

''او آئی سی۔۔۔ یہی۔۔۔ یہی تو بات ہے۔ جانتا ہوں الفت بیگ کی بہن دفتروں چوراہوں تک آ سکتی ہے۔ ہونا اسی الفت کی بہن۔۔۔ متزلزل تھا میں، تمہارے اس پلان نے ذہن کلیئر کر دیا۔''

وہ دانت پیس کر زہر خند بولا۔
''مگر دیکھ لو بی بی! ایک دفتر آنے والی کو کیا ملا۔۔۔تم بھی آ کر دیکھ لو۔۔۔کر لو شوق پورا۔''
وہ چبا چبا کر بولا اور ریسیور پٹخ دیا۔ وہ درمیان میں روتے ہوئے تڑپ تڑپ کر ''اظہر! اظہر! میری بات تو سنیں۔'' پکارتی رہی۔ ''نہیں۔۔۔اظہر میری تو سنیں آئی ایم سوری میرا وہ مطلب نہیں اظہر۔۔۔!'' وہ نڈھال ہو کر ڈھے گئی تھی۔
آپا کے ہاں چند روز میں بچے کی پیدائش متوقع تھی اور تمکنت کا معصوم دل لرز رہا تھا۔ وہ کہاں جاتی، کس سے کہتی۔ تائی اماں کو چپ لگ گئی تھی اور تایا فیروز بیگ دنیا سے منہ چھپائے بستر پر۔ گھر میں موت کا سناٹا تھا موت سے پہلے کا۔۔۔موت کے بعد کا۔

☆☆☆

''عدت کاٹ کر چلی جاؤں گی۔'' اس نے ماں کے کوسنوں کے جواب میں مزے سے کہا تھا۔
اس کے پرس میں خوب نوٹ تھے۔ اپنے ذاتی۔۔۔اور افضل سعید کی جانب سے مہر کی رقم اور زیور۔۔۔ نجانے وہ کس بے حس مٹی سے بنائی گئی تھی۔
اس صبح کے منظر کو قصداً دہرا دیکھتی اور ان بھائیوں کے چہرے یاد کر کے حظ اٹھاتی۔ اسے بچے یاد نہیں آتے تھے۔ وہ ایف ایم ریڈیو کان سے جوڑے چھت پر نیم دراز رہتی۔ بھوک لگنے پر خود ہی پکا لیتی۔ کبھی پکے پکائے پر آ بیٹھتی۔ باہر سے سموسے رول منگواتی۔
اس کی بلا سے کہ کس کس کی زندگی آخری ہچکیاں لے رہی ہے۔
اور تمکنت کی خیر خواہ کوثر تھی۔ اس نے اسے مطمئن رہنے کا مشورہ دیا۔
صحیح وقت کا انتظار۔۔۔افضل سعید کا نارمل زندگی کی طرف لوٹ جانا۔ اکمل کے پرسکون ہونے۔ الفت کی دہکائی آگ کے سرد ہونے کا۔
مگر اس دن اکمل کے جنونی رویے، بے ہودہ فرمائش اور اس پر اظہر کی کرائی جانے والی تشفی۔ کوثر کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ان دونوں کی محبت سے واقف تھی۔ وہ تمکنت کی فطرت آشنائی کی دعوے دار بھی تھی۔
دوسری جانب اظہر کا دھماکے دار فیصلہ۔۔۔وہ ملک سے باہر جا رہا تھا۔
کیوں۔۔۔؟ کہاں۔۔۔؟ کب کس لیے۔۔۔؟ ابھی چند روز پہلے تک وہ کوثر جیسی سہیلی نما بہن کو قائل کر رہا تھا کہ اب حد ہو گئی ہے رخصتی لی جائے اور اب۔۔۔
وہ تمکنت سے اسکول جا کر ملی اسے اپنے گھر بلایا اور اظہر کو بھی بنا ارادہ ظاہر کیے بلوا لیا۔
اس کا خیال تھا۔ وہ تمکنت سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی موہنی صورت دیکھ اس کا سہما بکھرا نچڑا سراپا دیکھ کر پگھل جائے گا۔
''تم بیوی ہو۔ کیسے بھی کر کے منا لینا۔۔۔منت ترلے کر کے۔ رو پیٹ کر۔ لڑ کے، جھگڑ کے لپٹ کے۔۔۔اور مرد کا دل پگھلنا کیا مشکل ہے اور جب عورت بھی دل دار ہو تو۔۔۔اسے روک لینا۔''
اور اظہر اس کی ایک جھلک پانے کے لیے گھنٹوں دھوپ میں جلتا تھا۔ اتنے دنوں بعد اس کو دیکھ

سب بھول جائے گا۔کوثر نے اسے اندر دھکیل چٹخنی لگا دی۔
مگر یہ کوثر کی بھول تھی۔اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔
وہ سب کچھ جو تمکنت کی، ان دونوں کی زندگی کو برباد کرنے والا تھا۔
وہ روتی رہی اور یقین دلاتی رہی کہ وہ دھندلی آنکھوں سے دھند بھرے آئینے میں اس کی صورت نہ دیکھے ایک ہاتھ مارے تو چہرہ واضح ہو جائے۔
اس نے ہچکیوں کے درمیان بتایا کہ وہ ''اس'' جیسی نہیں ہے۔وہ آخری سانس تک اس کا انتظار کرے گی۔
وہ بے یقین تھا اور اس کے دعوے کو استہزا سے دیکھتا تھا۔
وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔
وہ ٹھوکر مار گیا۔
دروازہ باہر سے بند تھا۔۔۔غصے نے اس کا دماغ آگ سے بھر دیا۔اس کی ٹھوکر سے روشن دان کے پٹ بند ہو گئے۔
''میں فیصلہ کر چکا ہوں کوثر!'' وہ حلق کے بل چلایا۔
کوثر باہر کھڑی کانپتی رہی۔اس کے پیروں میں دم نہیں تھا۔''ان اوچھے ہتھکنڈوں سے تم کیا جیتنے آئی ہو۔''
اس نے اس کا بازو دبوچا۔۔۔وہ سہمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔
مرد و عورت تنہا ہوں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے۔
لیکن وہ میاں بیوی تھے۔یہاں شیطان کا کیا نام۔۔۔
یہ خام خیالی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان شیطان نہیں آتا۔۔۔آتا ہے سر کے بل آتا ہے، بلکہ اس کا سب سے پسندیدہ درمیان یہی ہے۔
اظہر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا اور اس کے بولنے کی صلاحیت پر شیطان کا قبضہ ہو گیا تھا۔
''میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔۔۔آ گئی تمہارے ان آنسوؤں کی سمجھ۔بے فکر رہو۔تمہیں نامراد چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' تمکنت کے آنسو رک گئے۔وہ ناسمجھی کے عالم میں اظہر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
''تم لوگ جوگ کاٹنے والی تھوڑی ہو۔۔۔کرنا انجوائے لائف۔۔۔تمہارا مسئلہ حل کر کے جاؤں گا۔ناانصافی کیوں بھئی۔
میں تمہیں آزاد کرتا ہوں اس رشتے سے۔۔۔مزے سے نیا راستہ بنانا۔''
''آگے ایک لفظ بھی نہ بولنا۔'' تمکنت نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
متورم چہرہ، سوجی ہوئی آنکھیں، روتی ہوئی، بلکتی ہوئی۔اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔وہ یک دم خاموش ہو گیا۔
شیطان کامیاب ہو گیا تھا۔
تمکنت تیورا کے نیچے۔

اظہر کی دھاڑ نے کوثر کو کنڈی کھولنے پر مجبور کر دیا۔

''اچھا کیا تم نے۔۔۔ مجھے تو دھیان ہی نہ رہا۔۔۔ اتنے فون اور ترلے منتیں کس لیے ہو رہی تھیں۔ حل کر دیا ہے میں نے اس کا مسئلہ۔۔۔ اب اجازت ہے۔ شکر دل پر کوئی بوجھ لے کر نہیں جا رہا۔''

وہ باہر نکل گیا۔ کوثر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

☆☆☆

تیرہ سالوں کی چار ہزار سات سو پینتالیس راتوں کو اس ایک رات میں سوچ لینا۔ کتنا عجیب لگتا تھا۔ اذیت کا ہر پل ہزار سال جتنا طویل ہوتا ہے۔ تو اس طرح تو شاید وہ اس وقت سے اذیت جھیل رہی تھی جب یہ دنیا تخلیق کی گئی تھی اور ابھی بھی خاتمے کی کوئی امید نہیں۔

وہ پاگل پن کر رہی تھی۔ ایک ضد کے پیچھے زندگی برباد۔۔۔ اس نے عدالت سے رجوع کیوں نہیں کیا۔ وہ اب تک اس نام نہاد رشتے کو کیوں نبھا رہی تھی۔ ایسے سوالات کے اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھے۔

وہ جواب میں کیا کہتی۔۔۔ یہ انا نہیں تھی۔ اس نے کوئی مقابلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی چیلنج قبول کیا تھا نہ رشتے کی ڈور ٹوٹی تھی۔ لوگ کہتے اس نے اس کے حلقوم پر ادھوری کھنڈی چھری پھیر کر کے اس کے کسے ہاتھ پیروں کو چھوڑ دیا تھا وہ نہ زندہ تھی اور نہ مردہ۔۔۔ سر شانوں پر موجود تھا مگر ٹکتا نہیں تھا۔ کبھی دائیں گرتا کبھی بائیں۔۔۔ اور تکلیف۔۔۔ تکلیف بیان کرنے کے لیے الفاظ؟ سوچ بھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔

ساری دنیا کے قیافے غلط تھے۔ وہ دور دور کی کوڑیاں لاتے۔۔۔ احمق اتنی سی بات نہیں سمجھتے تھے۔ یہ جوگ نہیں روگ تھا اور اسے محبت کہتے ہیں۔

وہ آپا کے پاس چلی گئی اور حیدر آباد کے بہترین اسکول میں ملازم ہو گئی اس نے اپنا ماسٹرز مکمل کیا۔ زندگی بس صبح اور شام تھی نہ کہیں آنا نہ جانا۔۔۔ نہ کوئی دوست نہ دشمن۔۔۔ وہ جانتی تھی۔ وہ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ وہ کوثر کو فون کر کے سب خیریت، کی تسلی لیا کرتی تھی۔

اس نے دوبارہ کبھی کراچی شہر کا رخ نہیں کیا۔

یہاں وہ سڑکیں تھیں۔ جن پر وہ اس کو ہوا میں اڑائے پھرتا تھا۔

وہ بلند عمارتیں جن کی وہ یونہی خوامخواہ گردن اٹھا کر منزلیں گنا کرتے تھے اور وہ سمندر اور ساحل جو قدموں کے نشانوں کو خود پر پل بھر کے لیے ہی ٹھہرنے نہیں دیتا۔ اس کی ہر لہر ثبوت مٹاتی جاتی ہے۔

ہاں، قدموں سے لپٹی ریت چلنے والوں کے گھروں تک جاتی ہے اور اس کی تو آنکھوں میں یہ ریت بھر گئی تھی۔

اس نے سب کی خبر رکھی تھی۔ خود کو بھول کر۔۔۔

افضل سعید کی خاموشی اور بے حسی یوں معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ جائے گی۔ مگر ایک روز وہ بہت نارمل انداز میں اٹھے اور یوں دفتر کی طرف روانہ ہوئے جیسے چھٹیاں گزار کر

اگلے روز بندہ ایک نئی لگن سے روانہ ہوتا ہے۔ان کی سیاہ کرولا اس روز کے بعد جب اس دن احاطے میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لیے گویا سب کو سانپ سونگھ گیا۔ چلتے ہاتھ اور اٹھتے قدم رک گئے۔لوگ منہ کی بات بھول گئے تھے۔

کچھ نے ہڑبونگ پر قابو پاتے ہوئے سلام جھاڑا تھا اور افضل سعید نے سر کی خفیف جنبش سے جواب دیا تھا۔

وہ اپنے ہمیشہ والے حلیے میں تھے۔سفید کلف لگے کپڑے، سیاہ چمکیلے جوتے، گاڑی کی چابی اور موبائل۔۔۔ان کا دراز قد نمایاں اور کندھے سیدھے تھے۔

اکمل انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔وہ گھر سے فون پر اسے ہدایات دینا شروع کر چکے تھے لیکن اس طرح سے اچانک۔۔۔وہ بھائی کو دیکھ ہمت دیتے انداز سے مسکرائے تھے۔

کاروباری مرکز میں آنے اور جانے والے بچے بچے کو اس صبح کا منظر ازبر تھا۔یہ ایک علم تھا گویا جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوا تھا۔

لیکن افضل سعید نے جیسے پلٹ کر نہ دیکھنے کی قسم کھالی تھی۔وہ مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا کرنے کے فن میں ماہر ہو چکے تھے۔

ان کی زندگی کا مقصد تھا۔اسد سعید۔احد سعید اور افزا سعید۔۔۔اور بہن بھانجی، زندگی میں عورت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ان کا عورت ذات سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔بہنوں سے ان کی تنہائی دیکھی نہ جاتی تھی۔پھر گھر سنبھالنے کا بھی مسئلہ تھا۔افزا بہت چھوٹی تھی۔اس کی دیکھ بھال ملازموں پر نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔بہنیں ان کا گھر بسانا چاہتی تھیں۔مگر ان کا ایک ہی انکار تھا۔

''ایک عورت۔۔۔کی وجہ سے آپ سب کو برا نہیں کہہ سکتے۔'' کوثر نے احتجاج کیا۔

''میں سب کو برا نہیں کہہ رہا۔۔۔میرے حصے میں اچھی عورت ہوتی تو پہلی بار ہی میں مل جاتی مگر اب مجھے کسی کا اعتبار نہیں۔''

لیکن بچوں کی تربیت کا مسئلہ کھڑا تھا۔انہیں سر جھکانا ہی پڑا۔

ان میں کمی بھی کیا تھی۔اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔ بڑی باجی نے بہت دیکھ بھال کر انتخاب کیا۔فاطمہ پڑھی لکھی، سمجھدار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا۔افضل سعید کو اب حسن کی چاہ نہیں تھی لیکن گھونگھٹ اٹھا کر جب فاطمہ کو دیکھا تو ششدر رہ گئے تھے۔وہ بہت خوبصورت تھی۔

اس کے حسن میں عجیب سی کشش اور تمکنت تھی۔

چہرے پر سنجیدگی اور متانت نے اس کی شخصیت میں ایک وقار سا پیدا کر دیا تھا۔الفت کے ناز و انداز، لاابالی پن، ادائیں اس میں کچھ بھی ایسا نہ تھا جو الفت کی یاد دلاتا۔افضل سعید کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔زندگی ایک ڈھرّے پر رواں ہو گئی تھی۔

افزاء اپنی ماں کا ماضی اور باپ کا حال جانتی تھی۔وہ بہت محتاط خاموش اور سمجھدار بچی تھی وہ اپنی عمر کی باقی بچیوں کی نسبت زیادہ سنجیدہ تھی۔کچھ ڈری سی۔۔۔لیکن اس کے دل و دماغ میں راسخ تھا کہ اسے

بہت اچھی بیٹی بننا ہے بہت اچھی۔۔۔

افضل سعید کی زندگی کا مسئلہ احد سعید رہا تھا۔ سال بھر کی عمر ہی سے وہ ایک ضدی بچہ تھا۔ ہٹ دھرم، بدتمیز اور ماں کے جانے کے بعد وہ جیسے ہاتھ سے نکل جانے والا تھا۔ لیکن اکمل نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کا ہر طرح خیال رکھا۔

انیس برس کی عمر میں لگنے والا جھٹکا جیسے اکمل کو دنیا کی حقیقت دکھلا گیا۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ اس کا جوشیلا مزاج نرم روی میں بدل گیا۔ وہ دوستوں کی مجلس کا شائق تھا پھر کتابوں سے دل لگا لیا۔ اس کی سخت مزاجی اور پرغرور انداز نجانے کب عاجزی اور نرمی میں ڈھلا کہ وہ خود نا آشنا رہا۔

اسد اور احد بڑی باجی اور دیگر اہل خاندان کی موشگافیوں کے باعث بہت کم عمری میں سب چیزوں سے باخبر ہو گئے۔ وہ بہت بڑے کاروبار کے مالک تھے۔ ان کی عزت تھی۔ افضل اور اکمل نے ان پر کڑی سے کڑی نگاہ رکھی تھی۔

وہ کالج جاتے تھے۔ اکمل کے ساتھ پانچ ٹائم مسجد اور درس میں شرکت کرتے۔ ان کے موبائلز پر باپ اور چچا کا بہت پکا چیک تھا۔۔۔ وہ باپ کے کاروبار میں ایک ملازم کی طرح کام کرتے اور پھر بھی ملنے والی تنخواہ باپ کے پاس جمع رہتی۔

وہ کام سے کام رکھنے والے۔۔۔ وہ اپنے ہم عمروں سے کچھ الگ تھے۔ مگر ٹھیک تھے۔

انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ انہیں سنبھال لیا گیا تھا۔

☆☆☆

سزا اور جزا انسانوں کے ہاتھ دی جاتی۔ تو انسان کی اذیت پسند، خود غرض، طوطا چشم فطرت کبھی تھوڑے پر اکتفا نہ کرتی۔ وہ سزا سناتا ڈھول کے نعرے کے ساتھ۔۔۔

ہم سب خدا کے پسندیدہ بننا چاہتے ہیں۔

گناہ کرتے ہیں اور کھسیانی ہنسی سے اس کے رحیم و کریم ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر اختیار ملے تو سب سے پہلے رحم کے وصف کا گلا گھونٹتے ہیں۔

خدا کا کرم با اختیار بنا دے تو بندگی پر غرور کرنے کے بجائے خدائی کا دعوا کر بیٹھتے ہیں اور خدائی کا دعویدار فرعون کہلاتا ہے۔

اپنے لیے رحم و کرم طلب کرتے ہیں اور اگر کبھی ہمیں موقع دیا جائے تو۔۔۔ کوئی ہمارے سامنے ہاتھ جوڑے تو انسان کے اندر کے فرعون کی انا کو تابندگی ملتی ہے۔ ہم سزا سناتے ہیں۔ سنگسار کرتے ہیں۔ آگ پر چلا کر سچائی کا ثبوت ڈھونڈتے ہیں۔

ہم سب اپنے وقت کے ڈھونگی ہیں۔ نارمل نظر آتے ابنارمل لوگ۔۔۔ ہم اچھے ہونے کا نقاب لگا کر تعریفیں بٹورتے ہیں۔ مگر گانٹھ کے پکے اپنے اندر کی کم ظرفی چھپا کر ہم دونوں ہاتھوں اعلا ظرفی دکھاتے ہیں اور جب اندر اور باہر کا ٹکراؤ ہو تو۔۔۔

اظہر سعید تیرہ سال بعد لوٹ آیا تھا۔

وہی شہر، وہی ہوا، وہی لوگ۔۔۔ہاں وہی لوگ۔پتھر دل بے درد۔۔۔
افضل سعید نے اپنے بچے بہت محنت سے پالے تھے۔ماضی کے کسی طعنے کے بغیر۔
اکمل سعید کے چہرے پر پھیلی عاجزی اور نرمی اس کے احساس جرم کو بڑھاتی تھی۔اسے اپنے کیے پر جی بھر کے افسوس ہوا۔
یہاں سب ماضی کو بھول حال میں جی رہے تھے۔
وہ سب اسے اچانک اسے دیکھ کر حیران تھے۔
سب زندگی میں آگے بڑھ چکے تھے۔
ماضی کا ایک داغ آج بھی پیشانی پر چمک رہا تھا۔مگر اس وقت کی درد چبھن، تکلیف اب یاد بن چکی تھی۔
اس کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ اپنے پچھتاوؤں کو زبان دے سکتا۔
اپنی خودساختہ جلاوطنی کاٹ کر بھائی لوٹ آیا تھا۔بہنوں کی خوشی کا حال ہی کیا۔۔۔وہ اسے چوم رہی تھیں، نثار ہو رہی تھیں۔افضل سعید اور اکمل اپنے اندر ایک توانائی، ہمت جوانی، خوشی بے دار ہوتے دیکھ رہے تھے۔
اس محفل میں قہقہے تھے۔لطیفے۔باتیں۔۔۔سب ایک دوسرے سے خوشی کے اظہار میں سبقت لے جانے کی دوڑ میں تھے۔
مگر کچھ چہرے جھینپے جھینپے ہراساں سے بھی تھے۔
اسد سعید، احد سعید اور افزا سعید۔۔۔بڑی پھپھی کی محبت میں کوئی شک نہیں تھا۔مگر وہ اپنے اس بھائی کی یاد میں جب روتی تھیں تو کچا چبا جانے کے ارادے سے ان تینوں کو گھورا کرتی تھیں۔
اکمل کا دھاڑتا چنگھاڑتا رویہ۔۔۔بچے بچے کو منہ زبانی یاد تھا۔
اور بند کمرے میں اظہر نے تمکنت کے ساتھ کیسا غیر اخلاقی، غیر انسانی سلوک کیا تھا۔اس نے خود آ کر کہا اور کوثر نے بتایا تھا۔
کیسے تمکنت ہاری، لٹی، برباد واپس پلٹی تھی۔اس کا دوپٹا جو سر پر ٹکا تھا گھر سے نکلتے سمے سرک کر کندھے پر گر گیا۔وہ چلتی نہیں تھی گھسٹتی تھی۔اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں کوثر کو کبھی نہیں بھولی تھیں۔
اتنے ظالم بے حس سے چاچو آج ان کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔وہ نہ جانے کیسے کونوں میں چھپے محفل میں موجود تھے۔مگر۔۔۔مگر یہ سب کے لیے حیران کن منظر تھا۔وہ ان تینوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں لیے ان کے سر اور پیشانی کے بے آواز بوسے لیتے روتے پائے گئے تھے۔

☆☆☆

اظہر نے اپنے واپس آنے کا مقصد دہرایا۔تو جیسے طوفان آ گیا۔یہاں سب بول رہے تھے۔اپنی اپنی بولیاں مگر معنی ایک ہی تھے۔
حیرانگی، غصہ۔۔۔اچھنبا، بے یقینی۔۔۔

"اظہر ایسا کیسے کہہ سکتا ہے۔ وہ تو اسے فارغ کر گیا تھا۔" اس نے کمرے سے باہر نکل کر کوثر سے کہا تھا۔ اس نے تمکنت بی بی کا مسئلہ حل کر دیا ہے طلاق دے کر۔ فارغ کر کے۔۔۔ کوثر کرنٹ کھا کر تمکنت کی جانب مڑی تو وہ۔۔۔

زمین پر بکھری لٹی سی بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو اور شکوہ کناں بے بس نگاہیں اظہر کے بیان کی تصدیق کر رہی تھیں۔ کیسے تمکنت ہاری بر باد واپس پلٹی تھی۔ اس کا دوپٹا جو سر پر ٹکا تھا۔ گھر سے نکلتے سے سرک کر کندھے پر گر گیا تھا وہ چلتی نہیں گھسٹتی تھی۔ اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں کوثر کو کبھی نہیں بھولی تھیں۔

اور اظہر کہتا ہے۔ وہ اسے لینے جا رہا ہے۔ اسے بنانے۔

اب اتنا سب ہونے کے بعد۔۔۔ وہ پاگل دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ یہ تو مذہبی معاملہ ہو گیا نا۔۔۔ طلاق دی ہوئی عورت کو دوبارہ۔۔۔ کیسے۔۔۔ کیسے۔

اکمل ہتھے سے اکھڑ گیا "یہی کرنا تھا تو ڈرامہ کیوں کیا۔" اس کی حلیمی بس نام کی تھی۔

بڑی باجیاں الجھ کر ناپسندیدگی سے بھائیوں کو سن رہی تھیں۔ اب باسی کڑھی میں ابال دینے کا فائدہ۔۔۔

اور کوثر لرز رہی تھی۔ سال میں ایک بار وہ فون سنا کرتی تھی اس کا۔ وہ پی سی او سے فون کرتی تھی اور حال احوال دیتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ شادی کر چکی ہے تو کیا اس نے نکاح پر نکاح کر لیا اور اگر اظہر ٹھیک کہہ رہا ہے تو اب۔۔۔ اب کیا ہوگا۔ کون سا طوفان آنے والا ہے۔

تمکنت نے اپنا پتا کبھی نہ دیا۔ وہ بہت کھنکتے لہجے میں محبت سے سب کا پوچھ کر فون رکھ دیتی تھی۔

"مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کب کہا کہ میں بارات چڑھاؤں گا۔ گھوڑی پر بیٹھوں گا۔ میں تو بس اسے لے کر آؤں گا۔۔۔ نہیں رہوں گا میں یہاں۔ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اتنے سال گزر گئے بھائی جان۔۔۔! باجی! پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر گیا۔ اب محبت لگاؤ نہیں ہے۔ ایک بوجھ ہے جو اتارنا ہے بس۔"

وہ مرد تھا، رو نہیں رہا تھا۔ مگر رونا اور کسے کہتے ہیں؟

"ان پلوں کے نیچے پانی نہیں تھا جو گزر جاتا یہ غلیظ بدبودار کیچڑ تھا جو آج بھی وہیں کی وہیں جمی ہے۔ اور تم پھر اسی گزرگاہ کو اپنانا چاہتے ہو۔"

اکمل چمک کر بولا تھا۔ وہ اپنا سر پھوڑ دینا چاہتا تھا یا پھر اس کا۔۔۔

"اس کا قصور کیا تھا؟" وہ بیچ و بیچ کھڑا بول رہا تھا۔ اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ "ہم طاق راتوں میں اذان کے وقت، سورج گرہن دیکھ کر فوراً سر بسجود ہو جاتے ہیں، رو رو کر، گڑگڑا اپنے کردہ ناکردہ، شعوری لاشعوری گناہوں، جانے انجانے جرائم سے توبہ کرتے ہیں۔ رحم مانگتے ہیں اور اگر کبھی معاف کرنے کا اختیار ہمیں دیا جائے تو ہم صرف فرعون رہ جاتے ہیں۔ کٹھور بے حس ظالم۔۔۔ بھیانک چہروں والے، تنگ دل خدا۔۔۔ جب ہم انسان ہو کر انسان کا جرم معاف نہیں کر سکتے تو پھر کوئی حق نہیں کہ ہم داڑھیاں سجا کر ٹوپیاں پہن کر۔۔۔ خود کو اللہ کا ماننے والے بتائیں۔ دکھائیں اور جتائیں۔۔۔"

اس کی آواز پھر لڑکھڑا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اتنا اونچا لمبا مرد۔۔۔
”میں اپنے لیے نہیں رو رہا، میں اس کے لیے نہیں رو رہا۔ اللہ کی قسم۔۔۔ میں تو اللہ سے ڈر رہا ہوں۔ اپنے لیے۔ کس منہ سے کب کب معافی مانگوں گا۔ کیونکہ جب اللہ نے ایک اختیار مجھے دیا تو میں نے کیسے اندھا دھند ناجائز فائدہ اٹھایا۔
تت ۔۔۔ تمہیں یاد ہے کوثر!“ وہ بے چینی سے کوثر کی جانب مڑا۔ ”اس کی چادر شانوں سے سرک رہی تھی اور اس کے پیر جوتے سے باہر تھے۔ ایڑیاں زمین پر گھسٹتی تھیں۔
اور مجھ جیسا کمینہ شخص (۔۔۔ چچ) میں نے تو وعدہ کیا تھا۔ تمام عمر اس کے سر کو ڈھانپ کر رکھنے کا۔“
”آپ نے اپنا فیصلہ صحیح کیا ہوگا۔ آپ نے جرم پکڑ لیا تھا۔ میں نے کس بات کی سزا دی۔“ وہ افضل سعید سے مخاطب ہوا۔
”تیرہ سال کا جوگ کاٹا۔۔۔ اس پر احسان نہیں۔ کوئی اس قابل ہی نہ لگی۔
میں نے اسے کیا اپنانے جانا ہے، وہ مجھے اپنائے گی؟ وہ تو سرخرو رہی۔۔۔ ہمارے منہ پر دوسری بار بھی کالک ایک عورت ہی نے ملی۔
پہلی نے بے وفائی، بے عزتی سے۔۔۔ اور دوسری نے وفا سے عزت کو سنبھال کے رکھ کر۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور آپ اسے معاف نہ کرنے کا کہہ رہے ہیں۔۔۔ میرا تو دل لرز رہا ہے۔ وہ مجھے معاف کرے گی اور اس نے نہ کیا تو۔۔۔ اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔“

☆☆☆

عصر اور مغرب کا یہ درمیانی وقت افطاری کی تیاری کے باعث چٹکی بجاتے کیسے گزر جاتا تھا۔ پتا نہیں چلتا اوپر سے آج صبح ہی سے کالے کالے بادل ٹھنڈی ہوا کے ساتھ سارے حیدر آباد شہر پر تن گئے تھے۔ ان بادلوں کو برسنے میں نجانے کیا جھجک مانع تھی۔
تمکنت مین گیٹ تک جاتی اندرونی پتلی راہداری میں کرسی ڈال کر قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ وہ افطاری میں مدد دینے کے بعد مغرب کی اذان سے بیس منٹ پہلے ایک پارہ پڑھتی تھی۔ لائٹ جانے کے باعث اندھیرا تھا۔ گرمی زیادہ محسوس ہوئی تو ادھر آ گئی۔ راہداری کی چھت نہیں تھی۔ حفاظت کے خیال سے سیاہ لوہے کی جالی لگی تھی۔ ہلکی کن من نے اس کے دوپٹے اور چند لٹوں کو نمی دے دی تھی۔
وہ کرسی پر پیر اوپر کیے پھوار سے صفحے کو بچانے کے لیے جھکی ہوئی سی تھی۔
حنا اور حرا پکوڑوں اور چاٹ سے نبرد آزما تھیں جبکہ سامنے آپا بڑے پتیلے میں لال سرخ شربت میں چینی گھول رہی تھیں۔
”کل بہت تیز میٹھا ہو گیا تھا امی!“ حرا نے کہا۔
”اور پرسوں بہت پھیکا۔“ حنا نے لقمہ دیا۔
”تو کون سی قیامت آ گئی تھی۔“ آپا بھنا گئیں۔ ”تیز ہو گیا تو پانی ڈال لینا اور کم ہوا تو چینی بڑھا لیں گے ایسا کون سا ناقابل تصحیح کام ہو گیا تھا۔۔۔ ہونہہ۔“

کاش زندگی کی تلخی کو، کمی بیشی کو بھی ایسی آسانی سے بڑھایا اور گھٹایا جا سکتا پھوار، دھار میں بدل رہی تھی اس نے انگلی پھنسا کر قرآن بند کر لیا۔

وہ چہرہ اوپر اٹھا کر بے پناہ لطف اٹھا رہی تھی۔

مٹی کی سوندھی مہک نے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑا دی تھی۔

''ٹھک ٹھک۔۔۔'' اس کی مسکراہٹ کا دم ٹوٹ گیا۔ آپا کا یہ گھر پوش علاقے میں تھا۔ مگر کالونی کی باؤنڈری وال کے پیچھے چھوٹے موٹے مزدور پیشہ لوگ ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتے تھے۔ بھوسی ٹکڑے والے، آواز لگا کر امرود اور فالسے بیچنے والے، لفافے بنانے والے۔۔۔ آپا نے ان میں سے کئی کو برف دینے کا کہہ رکھا تھا۔ وہ ڈھیروں برتن جما لیتیں۔ عصر کے بعد سے دروازے پر لگاتار دستک ہوتی تھی۔

آپا عصر کے بعد خود ہی تھیلیاں بنا کر رکھ لیتیں اور دیا کرتیں۔

اس نے پیر نیچے لٹکا کر سوفٹی پھنسائی تب ہی صدا بلند ہوئی۔ ''اللہ کے نام پر بابا اللہ بھلا کرے گا۔'' دروازے پر شاید فقیر تھا۔ اس نے پلاسٹک کے ڈونگے سے جو سکوں سے بھرا تھا دو سکے اٹھا لیے۔ آپا نے روز صدائیں لگانے والے فقیروں کے لیے سکے منگوا کر گملوں کے پاس رکھ دیے تھے۔

اس نے ذرا سا پٹ وا کر کے انگلی میں دبے دو سکے آگے بڑھائے۔

''اللہ تجھے سکھی رکھے۔ دلی مراد پوری کرے۔۔۔ دے دے بچی دے دے۔'' وہ ٹھٹکی۔

اس نے دروازے کا پٹ مزید کھولا۔ قیمتی گاڑی سے اترتی عورت اپنے پرس پر جھکی ہوئی تھی۔ باہر دو ہی فقیر تھے۔

تمکنت نے چونک کر دو سیڑھی نیچے کھڑے بلیو جینز اور بسکٹی جیکٹ والے فقیر کو دیکھا۔ اس کے سانولے پھیلے ہاتھ میں دو سکے تھے۔ وہ دو سیڑھی نیچے کھڑا تھا۔ اسے تمکنت کا چہرہ دیکھنے کے لیے اوپر نگاہیں اٹھانی پڑتی تھیں۔

''معا۔۔۔ف۔۔۔ کرو۔۔۔ بابا'' دماغ میں تیار فقرہ ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں بکھرا۔

گھڑی کی سوئی نے اس بار جب اپنا چکر پورا لیا۔ تو چھوٹی سوئی بڑی سوئی کے اوپر تھی۔ سیکنڈ منٹ گھنٹوں کا حساب اب کی بار اس کی جنبش سے معلوم ہوتا تھا۔

دنیا ہونی کا نام ہے اور آخرت انہونی۔۔۔

وہاں ہمارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال عبث ہے اور آخرت ہزاروں سال کے بعد نہیں آئے گی۔ کبھی کبھار آخرت تیرہ سال بعد بھی آ جاتی ہے۔

ترازو میں تولتے تو دونوں کا رشتہ برابری کا تھا۔

شک، نفرت اور گمان و اندیشے نے ایک بار اظہر سعید کو اوپر کر دیا تھا۔ تمکنت جلال بیگ دھاڑ سے نیچے زمین بوس۔۔۔

وفا، یقین محبت انتظار، اس بار وہ اونچی تھی۔ بلند اتنی کہ اسے دیکھنے کے لیے ایڑیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ وہ دسترس سے دور ہو چکی تھی۔

اظہر سعید کے لیے نگاہیں اٹھانے کا نہیں ۔۔۔ جھکانے کا وقت تھا۔ اس کا دایاں پیر سیڑھی پر اٹھا۔۔۔ اس نے اپنی مٹھی بند کر لی۔

اور تمکنت نے آنکھیں ۔۔۔ وہ خود پر اختیار کھو رہی تھی۔ ہوا نے دونوں پٹ وا کر دیے۔

آپا نے حیرت سے گاڑی کو، عورت کو اور مرد کو دیکھا ۔۔۔ چمچ پر ہاتھ لرزا تو سرخ پانی چھلک گیا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے اپنی بے یقینی کو یقین میں بدلتا دیکھ رہی تھیں۔

"خدا کی قسم ۔۔۔ خدا کی قسم تمکنت ۔۔۔ تم اسے کبھی معاف نہ کرنا۔ کبھی نہیں ۔۔۔ تا قیامت ۔۔۔ مگر اس کے ساتھ چلی چلنا ۔۔۔ فیصلے کا اختیار تمہارا ہے اور درخواست ہماری۔"

کوثر تیزی سے راستہ بناتی۔ تمکنت کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"زندگی بھر اس کے ساتھ رہنا، ہنسنا بولنا، رونا، خوشیاں دیکھنا، غم جھیلنا مگر اسے معاف نہ کرنا۔ اب کی بار اختیار تمہارا ہے تمکنت اظہر سعید ۔۔۔ معاف کر دو گی تو ساری عمر شرم سے پانی پانی رہے گا۔ نظروں سے نظریں ملانے کے مقابل نہ ہوگا۔ معاف نہ کیا تو جیے گا ایک احساسِ جرم کے ساتھ آخر سانس تک۔

ان تیرہ سالوں کے ایک ایک اذیت ناک پل کا حساب روزِ حشر کے لیے رکھ دینا مگر اللہ کے لیے اپنی زندگی کو میدانِ حشر نہ بناؤ ۔۔۔ جہاں سورج کندھوں پر سواری کرے گا۔"

کوثر کہنیوں سے اوپر اس کے بازو پکڑے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بارش نے یقیناً چہرے بھگو دیے تھے۔ مگر آنکھوں میں ڈولتی سرخی آنسوؤں کی تھی۔

تمکنت منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کا دماغ، آنکھیں، دل، سوچ سب ساتھ چھوڑ گئے تھے اس نے کتابِ الٰہی کو سینے میں بھینچ رکھا تھا۔ وہ دیوار سے جا لگی۔

☆☆☆

کوثر سب کے ساتھ اوپن کچن والے لاؤنج کے فرشی دسترخوان پر بیٹھی تھی۔

اظہر بیرونی مہمان خانے میں تنہا تھا۔ بھائی صاحب اور آپا کے دونوں بیٹے تھوڑا بہت کھا کر نماز مغرب کے لیے جاتے تھے۔ حنا نماز سے پہلے کمرے میں گئی۔ کہ کچھ چاہیے ہو تو ۔۔۔

"انہوں نے کچھ نہیں کھایا ۔۔۔ ویسے کے ویسے بیٹھے ہیں۔ ہر چیز جوں کی توں ہے، انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

آپا نے کوثر کی صورت دیکھی وہ اٹھنے لگی۔ تو یکدم تمکنت کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا تھا۔

میرون کارپٹ پر اس کے پیر اظہر کی نگاہوں میں آ گئے۔

درمیانی تپائی افطاری کے لوازمات اور موم بتیوں سے سجی تھی۔

وہ چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں دو بدو تھے۔ تمکنت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے آئی تھی۔ اظہر میں اتنی ہمت کہاں۔

اسے دفعتاً یہ احساس ہوا، وہ اس کے سامنے ایک پل بھی کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس کا خود پر اختیار کھو گیا۔ وہ جھٹکے سے دوزانو ہو کر گیا تھا۔

تمکنت بھی کھڑی نہ رہ سکی تھی۔ وہ بیٹھ گئی تھی۔

"کوثر ٹھیک کہہ رہی ہے میں چاہتا ہوں۔۔۔ میں ساری زندگی تم سے معافی مانگوں اور تم مجھے معاف نہ کرو۔۔۔ لیکن میرے ساتھ چلو تمکنت مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔۔۔ آ گیا ہوں۔ ساری عمر میرا جرم جتانا کچو کے لگانا۔۔۔ لیکن میرے ساتھ رہنا۔ تم جانے سے انکار کرو گی تو یہ بھی سزا ہو گی لیکن تم جاؤ گی تو زیادہ کڑی ہو گی۔ میں خود کو سزا یافتہ دیکھنا چاہتا ہوں تمکنت!" وہ رو پڑا تھا۔ اتنا اونچا لمبا مرد۔۔۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہنساتا تھا۔ لطف اٹھاتا تھا۔ اسے ہنستا دیکھنا دل کو خوشی دیتا تھا۔

اور اسی دل دار کو روتا دیکھنا؟؟؟

اس نے اس کے بند ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

وہ اس کے بغیر بہت روئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بہت ہنسی تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ رونے میں آج شانہ بہ شانہ ہوتی۔

دونوں کی پیشانیاں ایک دوسرے سے جڑی تھیں۔ ہاتھوں پر گرتے آنسو ناقابل شناخت تھے۔

☆☆☆

وہ ایئرپورٹ پر کھڑے تھے۔ عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودیہ عرب جانا تھا۔ عید میں ابھی چار یا پانچ دن باقی تھے۔ انہیں سی آف کرنے آنے والوں میں کوثر، کنیز اور چھوٹی باجی شامل تھیں۔ تمکنت کی آپا اور بھائی صاحب بچے بھی ہمراہ تھے۔

فلائٹ حسب معمول لیٹ تھی۔ اظہر کا چہرہ کسی قدر اترا ہوا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے بہت محبت کرتا تھا اور ان کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ مگر آج۔۔۔

وہ جان چکا تھا کہ وہ لوگ نہیں آئیں گے۔ مگر طیارے کے باقی مسافروں کی نسبت وہ اس انتظار سے مطمئن تھا۔ اس کی نگاہیں ہر آنے والے کو کھوجتی تھیں اور جب مایوس پلٹتی تھیں تو وہ تمکنت کا چوڑیوں بھرا ہاتھ مزید مضبوطی سے پکڑ لیتا تھا۔

گلاس وال کے پیچھے والے چہرے پر اسے افضل سعید کا گمان ہوا تھا۔ احد اور اسد اور شاید اکمل۔۔۔ وہ پلکیں جھپک کر یقین کرنا چاہتا تھا۔ گھٹتا فاصلہ یقین کو جلا بخش رہا تھا۔۔۔ ہاں یا نہیں۔

دل اور نظریں ہاں کی جانب مائل تھیں۔ وہ تصدیق کے لیے تمکنت کی جانب مڑا اس کی بھی یہی کیفیت تھی۔

اور ایسی ہی ایک تصدیق افضل سعید نے دو دن پہلے اکمل سعید سے چاہی تھی اور سیاہ پڑا نچڑا مسلا ٹوٹا دل۔۔۔ نفی سننا چاہتا تھا۔

افضل سعید کا دل تیرہ سالوں سے صرف خون کے بہاؤ کا ذریعہ تھا۔ اس میں جذبات، احساسات۔ محبت، خیال، یاد، گمان کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔

وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھے اور اگر سمجھتے تو حیران ہو جاتے مگر وہ نفی کے منتظر تھے۔
یہ رمضان کے مہینے کا ایک نسبتاً خاموش اور کاروبار کے حوالے سے ڈھیلا دن تھا۔ لوگ دیر سے آتے، نماز ظہر کے لیے اٹھتے اور عصر کے لیے گھڑی دیکھتے ہوئے مغرب کو کھوجتے۔ یہ شدید گرمی اور ایمان والوں کے امتحان والے روزے تھے۔
افضل سعید، اظہر سعید کے معاملے کو لے کر گم صم سے تھے اور آج بالکل دفتر آنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ مگر آج یہاں روزہ کھلوانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شام کو کھلی دعوت تھی اور دن میں انہیں بند آنکھوں اور رواں ہاتھوں سے خیرات بانٹنی تھی۔
بڑے بڑے کاروباری حضرات کے پاس سچی جھوٹی غیر معروف سماجی تنظیمیں آکر صدقہ، زکواۃ اور امداد کا مطالبہ کرتی تھیں۔
یہاں لاکھوں کمانے والے تو کروڑوں اللہ کے نام پر دینے والے بہت سے تھے۔
کچھ لوگوں کو خود رقوم دینے کے بعد وہ کچھ نقاہت محسوس کرنے لگے تو اپنے اے سی آفس میں جا بیٹھے۔ اکمل، اسد اور احد موجود تھے۔ وہ کسی کھاتے کو چیک کرنے لگے تھے۔ وہاں لائن لگا کر کھڑے تمام لوگ فارغ ہو گئے تھے۔
افضل سعید نے ارادہ باندھا کہ وہ بھائی اور بیٹوں کو اتنی شدید گرمی سے اندر بلا لیں۔ افطاری کے وقت دیگیں پہنچ ہی جانا تھیں۔ اسد اور احد اندر آ گئے تھے۔ اکمل میز کی درازوں کو لاک لگاتا ہوا کیش بکس اور دیگر چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ وہ اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ افضل سعید نے اشارہ کیا کہ وہ جلد اندر آ جائے۔
مگر ذرا سا منہ نکال کر دیکھا وہ کوئی عورت تھی۔ سیاہ تنگ پائنچوں کی شلوار سفید قمیص جو دھل دھل کر اپنا پرنٹ کھو چکی تھی۔ سیاہ دوپٹا چہرے اور کمر و سینہ کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس کے بغل میں سستا سا پچاس پچھتر روپے والا پرس تھا۔
اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں نمایاں تھیں جن کے سروں پر جھریاں سی تھیں مگر وہ کوئی بوڑھی عورت نہیں تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جو ڈھائی تین برس کا ہوگا، بچے کا رنگ صاف تھا۔ نہیں وہ پیلا تھا۔ سفید سا۔۔۔ بچہ بسکٹی رنگ کی رنگین لائنوں والی نیکر بشرٹ میں تھا۔ اس سوٹ کی مالیت بھی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں تھی اور کثرت دھلائی سے وہ اپنی ملائمت کھو چکا تھا۔
بچہ ماں کے کندھے پر اونگھ رہا تھا۔
اکمل کی نگاہ اٹھی۔ عورت کی آنکھوں میں تذبذب تھا۔ آگے بڑھے یا مڑ جائے۔ اکمل اپنی دکان بڑھا چکا تھا۔ اکمل نے آنکھیں چندھی کیں، اتفاق سے وہ کل ہی اس عورت کو اپنی گاڑی کے پاس ٹھٹک کر رکتا دیکھ چکا تھا۔
کاروباری مرکز میں مردوں کا زور تھا۔ یہاں چائے کی پتی یا اخروٹ اور بادام بیچنے والی عورتیں زمین پر کہیں بھی بیٹھ کر بیچا کرتی تھیں اور اگر بوہنی نہ ہو تو کسی بھی سیٹھ سے لجا کر، گڑگڑا کر شام کی روٹی کے لیے کچھ پیسے پکڑ لیا کرتیں۔

یہاں جسم فروش عورتیں بھی نظر آ جایا کرتی تھیں۔ گھروں سے دور ٹرک ڈرائیور اور کلینرز ان کے گاہک ہوتے۔ مگر اکمل کے لیے یہ عورت نئی تھی۔ کچھ بیچ بھی نہیں رہی تھی اور اگر بکنے آئی ہوتی تو اونگھتا بچہ لے کر۔۔۔

اکمل دراز کے لاک سے چابی کھینچ رہا تھا۔ اس نے چابی دوبارہ لگائی۔ اندر صرف دو لفافے بچے تھے اس نے ایک اٹھایا پھر کچھ سوچ کر دوسرا بھی اٹھا لیا۔

عورت لفافے پکڑ کر لجاجت سے شکریہ کہنے یا دعائیں دینے کے بجائے لفافے کھولنے کھڑی ہو گئی۔ اندر کی رقم ٹھیک تھی مگر اس کی ضرورت سے شاید بہت کم۔

وہ دفعتاً کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ نقاب اتارے بنا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اکمل استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔

"پ۔۔۔ پانی!" رمضان کے مہینے میں یہ انتہائی احمقانہ بدتمیزی سی ڈیمانڈ تھی۔ اکمل نے روم فریج سے بوتل نکالی اور گلاس اس کی جانب بڑھایا۔

اس نے بنا رکے ایک ہی سانس میں پانی اتار لیا وہ دوسرا گلاس اپنے بچے کے لیے چاہتی تھی۔ اس نے پیسے اپنے پرس میں ٹھونس لیے تھے۔

اکمل کا اچنبھا دوچند ہو گیا۔ یہ عورت اب جاتی کیوں نہیں۔۔۔ سارے کام تو ہو گئے تھے۔

وہ اپنی ایڑی کو جوتی سے کھسکا کر فرش پر مسل رہی تھی۔

"یہ میرا بیٹا ہے، سب سے چھوٹے والا" اس نے بچے کا اونگھتا چہرہ گھما کر اکمل کے سامنے کیا۔

"بیمار ہے۔۔۔ یہ دیکھو" اس نے بچے کی شرٹ پیٹ سے اٹھائی پیٹ حد سے زیادہ پھولا ہوا تھا۔

"اوہو۔۔۔!" اکمل نے سر ہلایا۔ اسے یقیناً زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ "کل۔۔۔ کل آنا۔۔۔ میں اور دے دوں گا۔ ابھی اتنا ہی کیش تھا۔" وہ تیزی سے بولا اور جلد از جلد اندر جانا چاہتا تھا۔ اسے روزہ لگ رہا تھا۔

اسے کرسی گھسیٹ کر نکلتا دیکھ کر عورت نے جوتی پیر میں فٹ کی اور پرس کو کندھے پہ جما لیا۔ وہ لوٹنے لگی تھی۔

"سنو۔۔۔ اکمل!" اپنے نام کی بے تکلفانہ استحقاق بھری آواز پر وہ کرنٹ کھائے انداز میں پلٹا تھا۔

"اپنے۔۔۔ اپنے بھائی سے کہنا۔۔۔ اتنی دنیا کو خیر۔۔۔ خیرات صدقہ زکواۃ دیتا ہے۔ میرے۔۔۔ کچھ مسئلے ہی حل ہو جائیں اگر وہ کچھ مدد کر دے۔ فطرانہ۔۔۔ یا زکواۃ وغیرہ۔۔۔ تین بیٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا لڑکا بھی ہے۔ مہنگائی کا تو تمہیں پتا ہے نا۔۔۔ اس کے ابو کا پان کا کھوکھا ہے۔ مگر اس کو منہ کا کینسر ہو گیا نا۔۔۔ اس لیے۔۔۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ اس کا نام کیسے جانتی تھی۔

چلو نام جاننا اہم نہیں۔ جلی حروف میں لکھا تھا۔ دفتر کے باہر۔۔۔

افضل سعید، اکمل سعید۔۔۔مگر وہ اسے کیسے مخاطب کر رہی تھی۔
''تت۔۔۔تم۔۔۔آپ کون؟'' ایک حتمی احساس اس کے سر پر ڈنڈے کی طرح برسا تھا۔وہ پرس وغیرہ درست کرتے ہوئے نقاب کو کس چکی تھی۔
اکمل نے سر سے پیر تک اسے بغور دیکھا۔بوٹا سا قد۔۔۔پیروں کی جوتی اور بے حس تاثر والی۔تو کیا ہوا، جیسا احساس بتاتی آنکھیں۔
کس کی تھیں ایسی آنکھیں؟
کیسی آنکھیں۔۔۔لاپروا۔خود میں مگن۔بس اپنی کہنے والی۔
''کیوں کھڑے ہو اکمل۔۔۔فارغ نہیں ہوئے۔'' افضل سعید باہر آ گئے۔
''ہو گیا۔'' اس کا سر خود بخود ہل گیا۔
''جاؤ بی بی! کل آنا۔۔۔آج بس اتنے ہی تھے۔'' وہ اس عورت سے مخاطب ہوئے مگر سارا دھیان اکمل کی طرف تھا۔
''پھر آ جاؤں کل۔۔۔کچھ کرو گے میرے لیے۔۔۔تم؟''
اس نے بچے کو شانے پر بدلا اور سرسری نگاہ سے افضل سعید کو دیکھا تھا۔
''آپ چلیے بھائی۔۔۔میں آیا۔'' اکمل ایک ٹرانس میں تھا۔
افضل نے ایک نگاہ غلط انداز سے اندر گھستے گھستے اس عورت کے سراپے کو دیکھا تھا۔۔۔کچھ تھا۔۔۔کچھ چونکانے والا۔
وہ بے ساختہ شیشے کی دیوار سے چپک گئے۔وہ باہر دیکھ سکتے تھے۔مگر باہر والا انہیں نہیں۔
''وہ دونوں۔۔۔جو بھی تمہارے ساتھ تھے۔میرے بیٹے تھے نا؟'' اس کا لہجہ بالکل بے تاثر تھا۔جیسے کسی اجنبی کا تذکرہ یونہی نکل آئے۔''باپ پر نہیں گئے نا؟''
وہ مسکرائی تھی۔
اکمل کے پاس جواب نہیں تھا۔نوالہ چباتے ہوئے زبان چبالی جائے تو کیا ہوتا ہے۔اکمل کے ساتھ ہو رہا تھا اور وہی جانتا تھا۔
زمین، آسمان، سورج، چاند، رنگ، روشنی اندھیرا۔۔۔ایک ریل سی تھی جو نظروں میں گھوم گئی۔
''کل آؤں پھر میں۔۔۔سچی بڑی مجبور ہوں میں۔۔۔۔''
وہ آج بھی بس اپنی کہتی تھی۔اکمل کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔وہ معمول کی طرح سر ہلا گیا۔عورت نے شیشے کے بند دروازے کو پل بھر دیکھا پھر وہ دروازے سے نکل گئی۔
افضل سعید کے گرد پھونکا سحر ٹوٹ گیا تو وہ دھاڑ سے دروازہ کھولتے باہر نکل آئے۔اکمل جوں کا توں تھا۔وہ اس راستے پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا جہاں وہ مڑی تھی۔
''کک۔۔۔کون تھی۔۔۔یہ اکمل۔'' انہیں سو فیصدی درست جواب معلوم تھا مگر اثبات میں ہلتا سر۔
''بھا۔۔۔بھابھی۔۔۔نہیں۔۔۔وہ الف۔۔۔الفت تھی۔'' وہ کہہ رہی تھی۔۔۔اس بار افضل

سعید نے اپنی زبان چبالی تھی

☆☆☆

''کس لیے یہ سب ڈراما۔۔۔'' وہ الجھ کر اکمل کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ ''تم بھی سب کچھ بھول گئے اکمل تم بھی تو۔۔۔ یہیں موجود تھے۔''

ان کے لہجے کا تعجب اور آنکھوں کی حیرانی۔۔۔ اکمل کے چلتے ہاتھوں کو روکنے سے قاصر تھی۔ وہ بہت سارے بڑے نوٹ ایک لفافے میں ڈال بند کرنے والا تھا۔

اکمل کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو افضل سعید کے اوپر کمرے کی چھت گر گئی۔ وہ آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔

افضل سعید اپنی حیرانی، غصہ، خوف سب بھول کر اب اکمل کے لیے پریشان ہو اٹھے۔

اکمل نے فون پر منشی کو پیغام دیا تھا۔ ''کالی چادر والی ایک عورت آئے تو انہیں فوراً اطلاع دے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہوگا۔ میں نے اسے کچھ دینا ہے۔''

افضل سعید کی سماعتوں کے لیے یہ صور جیسی آواز تھی۔

افضل سعید اپنی نشست سے اٹھ کر اکمل کی کرسی کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں کل اس کرسی پر الفت۔۔۔ بھا۔۔۔ بھابھی بیٹھی تھیں۔'' افضل سعید نے نام پر پہلو بدلا۔ وہ ہمہ تن گوش تھے۔ وہ اکمل کا مسئلہ جاننا چاہتے تھے۔

''نہیں۔۔۔ کل میرے سامنے میرا اعمال نامہ تھا۔ ایک بار ظلم ہم سب کے ساتھ ہوا تھا۔ ناانصافی تماشا بے عزتی، ذلت اور ہم نے اگلوں کو یہی سب لوٹایا۔ جب اظہر نے ایک سراسر بے قصور کو ظلم کے بدلے زیادہ ظلم سے نوازا دیا۔ اس کی آنکھیں تو کھل گئیں۔ دیر ہی سے۔

اور کل دوپہر ایک اور چہرہ۔۔۔ جس نے میری ہستی کو تہہ و بالا کر دیا۔

یہ جو میں ساری باتیں کر رہا ہوں نا۔ یہ میں نے کسی کتاب میں کبھی نہیں پڑھیں۔ مجھے ان کا مطلب بھی نہیں معلوم یہ تو بس زبان سے ادا ہو رہی ہیں۔

کل۔۔۔ کل میری آنکھوں نے اللہ کے انصاف کو دیکھ لیا اور آج میرے منہ میں اس کے الفاظ ہیں۔ مجھے خود پر یقین نہیں آ رہا۔ میرے پاس تو کوئی نیکی نہیں۔ گناہ ہی گناہ۔۔۔ لوگ چلّے کاٹتے ہیں۔ وظیفے کرتے ہیں اور سجدے۔۔۔ پھر بھی اللہ کو نہیں پا سکتے اور میں نے اللہ کو سمجھ لیا۔'' اس نے کلائی آنکھوں پر رگڑ لی۔

''اور دل کبھی نہیں پھرتے اگر اللہ پھیرنا نہ چاہے۔

بڑے بڑے آفاقی جملے دل کی دیوار سے ٹکرا کر دھڑ دھڑ کرتے ہیں۔''

اگر دل پتھر کا ہو لیکن دل موم سے ڈھالا گیا تھا۔

اکمل نے تو نجانے کس کیفیت کے زیرِ اثر کہا تھا اور عمل کیا تھا۔ لیکن افضل سعید نے کالی شلوار والی اس عورت کو تھکے قدموں سے موڑ مڑتے دیکھا تھا۔ وہ روزِ حشر اس معاملے کو لازمی اٹھانے والے تھے، اپنی محبت کے بدل کی بے زاری عزت کے جواب میں ملنے والی ذلت۔

لیکن اللہ نے کل دو پہر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا تھا۔
سزاوار سزا پا گیا تھا۔

☆☆☆

''جس دن قرآن خوانی تھی۔ تم دونوں نے اکمل کے ساتھ باہر خیرات دی تھی۔''
اسد اور احد کو وہ دن یاد تھا۔ اس میں ایسا خاص کیا۔ وہ باپ سے کبھی نگاہ ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔
''اکمل نے آخر میں ایک عورت کو۔۔۔ دو لفافے دے دیے تھے۔'' وہ قصداً رکے۔
وہ دونوں اس قصہ کے سیاق و سباق سے ناواقف تھے۔ اسد اور احد نے دزدیدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ہلکی سی نگاہ اٹھا کر باپ کو۔۔۔
ان کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ مگر آنکھوں میں ادھیڑبن کا تاثر تھا۔ ان کے بیٹے نہیں جانتے تھے۔ افضل سعید اپنی زندگی کا ناقابل یقین فیصلہ سنانے والے ہیں، اپنے حوالے سے اور ان کے حوالے سے۔
''اس نے نقاب کر رکھا تھا۔ تم لوگ چہرہ نہیں دیکھ سکے ہوں گے۔ اور شاید۔۔۔'' وہ کھو سے گئے
''دیکھ بھی لیتے تو پہچان نہ پاتے۔'' دونوں نے نا سمجھی کے عالم باپ کو دیکھا۔
''تم دونوں اچھے بچے ہو۔ (ان دونوں کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی)
''آج کل کے زمانے کے بچوں سے بہت مختلف۔ میں بہت ڈر رہا تھا کہ کیسے تربیت کر سکوں گا۔ کوتاہی نہ ہو جائے۔ مگر اللہ کی مہربانی اور انعام۔''
اپنی آواز کے بھرا جانے کا ان ہی کو معلوم ہوا۔
''بہرحال! کم ٹو دی پوائنٹ۔۔۔ کالج کے بعد تم لوگوں کا دفتر آنا، کام سیکھنا مستقبل کی پیش بندی ہے تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور بری صحبت سے بچے رہو۔ لیکن بہرحال تم لوگ محنت کرتے ہو تو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ میں اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ تم لوگوں کو حسب ضرورت دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ہیں تم لوگوں ہی کے پیسے۔۔۔'' وہ رک گئے۔
اسد اور احد کے سر سے یہ ساری تمہید گزر رہی تھی۔ ان کے باپ نے اتنی طویل گفتگو اور وہ بھی ایسی لایعنی پہلے تو کبھی نہیں کی تھی۔
''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ابو۔۔۔ مجھے، ہمیں نہیں سمجھ آ پا رہا۔۔۔ آپ پلیز۔۔۔''
''میں یہ چاہتا ہوں۔۔۔'' وہ پیپر ویٹ چھوڑ کر کرسی کے اگلے حصے پر جھک آئے۔ وہ اپنے بیٹوں کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔
''میں یہ چاہتا ہوں اسد سعید اور احد سعید۔۔۔ تم دونوں اپنی ماں کو فنانشلی سپورٹ کرو۔''
یہ کھلونا پستول کا ہوائی دھماکا تھا۔ آواز بہت گونج دار، دل دہلا دینے والی بجلی کی تاروں پر بیٹھے کوے کبوتر ہراساں ہو کر اڑے تھے۔ ان کی کائیں کائیں نے فضا میں ماتم بھرا شور پیدا کر دیا تھا۔
پھر پل بھر کے سناٹے کے بعد وہ دھیرے دھیرے تاروں اور شاخوں پر دوبارہ آ رکے کوئی

نقصان نہیں۔۔۔کوئی دفعہ نہیں۔

''میں اس معاملے میں مشورے یا حکم دینے جیسی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ماں اور بچے کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوتا، کبھی بھی۔۔۔''

افضل سعید کی آواز پرسکون ندی سے مشابہ تھی۔

''مگر میں تم لوگوں کو اطلاع دے سکتا ہوں۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور۔۔۔اور جبکہ تم دے بھی سکتے ہو تو۔۔۔اس سے ملنا تعلق رکھنا، آنا جانا تمہاری اپنی صوابدید پر ہے لیکن بس ایک ہی حکم یا شرط کہہ لو، ہماری اس موجودہ زندگی پر اس تعلق کو اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ کھڑے ہو گئے ''تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی دیکھ ریکھ کرو۔۔۔کرنی چاہیے بھی منشی سے معلومات لے لینا، وہ مچھر کالونی کے علاقے میں کہیں رہتی ہے۔

مگر میری واحد شرط کو گرہ سے باندھ لینا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ تم ہو۔''

اسد اور احد کے فق چہرے کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ سالوں پہلے ان کے سینے میں گوشت پوست کے دل کی جگہ پتھر کے دل ٹرانس پلانٹ کر دیے گئے تھے۔

اور پتھر جذبہ کب رکھتا ہے۔

مگر دل جب ایک بار دھڑکنا شروع کر دے تو دھیرے دھیرے ہر جذبے سے آشنا ہو جاتا ہے۔ دیر ہی سے سہی۔۔۔

دھڑکن زندگی ہے اور زندگی کے سو پہلو۔ اپنی باری آئے پر سب سامنے آجاتے ہیں۔

☆☆☆

ایک احساسِ ندامت کسی پل سکون لینے نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ خود کو ادھر ادھر مصروف رکھ کر ہر ناپسندیدہ چیز کو بھول جانا چاہتے تھے۔

دل کے کسی کونے میں کمینی خوشی نہیں ابھری تھی اسے ذلیل و خوار دیکھ کر۔ وہ نشانِ عبرت بن کر آئی تھی۔

وہ بظاہر الفت کو بھول چکے تھے مگر دل کے اندر یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ وہ ایسی کیوں تھی۔ ضدی ہٹ دھرم اپنے آپ سے، صرف اور صرف اپنے آپ سے پیار کرنے والی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی ضد اور انا کے ہاتھوں دوسروں کو تو کیا نقصان پہنچائیں گے، خود خسارے میں پڑ جاتے ہیں۔

وہ ایسی کیوں تھی۔ جب وہ بہت محبت اور لاڈ کے ساتھ ان کے ساتھ تھی۔ تب وہ سوچتے تھے اور کبھی کبھار لاڈ سے پوچھا بھی کرتے تھے۔

''میں تو بھئی ایسی ہی ہوں۔'' وہ نخریلے انداز سے منہ بنا کر شانے اچکاتی۔

وہ منتوں مرادوں کے بعد مانگی جانے والی اولاد تھی۔ مگر کیا ماں باپ کی تمام دعائیں بس اس کی دنیا میں آنے تک کے لیے تھیں۔ دنیا کی اچھائی اور آخرت کی بھلائی کے لیے کیا کبھی کوئی ہاتھ نہیں اٹھے تھے۔

وہ کس بے حس مٹی سے ڈھالی گئی تھی۔ اسے کبھی غلطی سے اولاد یاد نہ آئی یا اسے افضل سعید سے

واقعی نفرت تھی۔ وہ کیسی ماں تھی۔ لیکن نہیں وہ اکمل کے سامنے اچھی ماں بن کر آئی تھی اس نے اپنے بچے کی بیماری کا کس فکر مندی سے بتایا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ ''شوہر ملے گا تو بچے بھی مل جائیں گے۔'' اس کا دعوا سچا تھا۔

لیکن شوہر اور بچے تو پہلے بھی تھے اور کیا وہ واقعی افضل سعید کو اتنا زیادہ ناپسند کرتی تھی۔ وہ کیا تھی۔ کیسی تھی۔ کیوں تھی۔ اس کے ہر رویے نے ہر دفعہ افضل کو حیران و پریشان کیا تھا اور وہ کیسے آ گئی تھی۔ یہ بے شرمی تھی یا ہٹ دھرمی۔ لاپروائی بے نیازی۔ کیا تھا یہ۔

افضل سعید اس ٹین کی چھت کو اور چھت فراہم کرنے والے دونوں کو دیکھ آئے تھے۔ کیا تھا اس شخص میں اور اس نے عدت گزارنے کے دو ماہ بعد خود ہی اس شخص سے عقد کر لیا تھا۔

وہ ایسی کیوں تھی۔ کوئی نفسیات دان ہوتا تو شاید تحلیل نفسی سے بتاتا۔ اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی۔۔۔

وہ ہٹ دھرم تھی ضدی۔۔۔ کیا افضل سعید اس قدر ناپسندیدہ تھے کہ وہ تمام عیش و آرام کو ٹھوکر مار چلی گئی۔ اس نے ان کے منہ پر جوتا مارا تھا اور آج زمانے کی جوتیوں میں پڑی تھی۔

اس نے کبھی پلٹ کر اپنے ماں باپ کو بھی نہ دیکھا۔

اور آج کیسے ان ہی لوگوں سے مدد کی امید لیے آ گئی تھی۔

کیا وہ جانتی تھی افضل سعید اسے کبھی انکار نہیں کر سکیں گے۔ وہ ان سب کے بارے میں کتنا اندر تک جانتی تھی۔ اس نے انہیں دیکھ کر اپنا نقاب نہیں گرایا تھا۔ ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں۔ وہ آنکھیں ملانے کے قابل نہیں تھی یا انہیں اس قابل نہیں سمجھتی تھی۔

وہ کیا تھی۔۔۔؟

اتنی ہی مغرور، بے حس وہ کسی بھی احسان کو اپنے اوپر احسان نہیں مانتی تھی۔ جو کچھ پہلے کیے گئے اس کی جوتی سے اور جو وہ لینا چاہتی تھی۔

دیتے ہو تو دو، نہیں تو نہ سہی۔ کسی اور سے تو مل ہی جائے گا۔

اکمل اور افضل نے تو اس واقعے سے عبرت حاصل کی تھی۔ توبہ کا ارادہ۔ شکر کے سجدے۔۔۔

کیا الفت نے بھی ایسی کوئی ایک کیفیت محسوس کی تھی۔

اگر کی تھی تو مقام شکر۔۔۔

اور اگر نہیں تو اس کا مطلب اللہ بھی اس سے خفا تھا۔

☆☆☆

اظہر سعید کا گمان صحیح تھا۔ یہ افضل اور اکمل ہی تھے۔ ان کے چہرے سپاٹ تھے۔ تمکنت نے چند لمحے ان کی آنکھوں میں کسی بھی جذبے کی تلاش کی اور جب ناکام ہوئی تو غیر محسوس طریقے سے اظہر کے پیچھے چھپ سی گئی۔ اس کے ہاتھ کی سختی اظہر کو اپنے بازو پر بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دونوں ان دونوں کے سروں پر پہنچ گئے تھے۔

''یہ کچھ بولتے کیوں نہیں۔۔۔'' تمکنت نے ڈرتے ڈرتے شانے کی اوٹ سے چہرہ نکالا

افضل سعید اسی کو کھوج رہے تھے۔

وہ ایک دم آگے بڑھے۔ کیا وہ اسے نوچ کر اظہر سے دور کر دیں گے۔ تمکنت کے ناخن گوشت میں دھنس سے گئے۔

لیکن اگلا پل حیرانی کا تھا۔ افضل سعید نے اظہر کو بازو سے دبوچ کر اپنے سینے سے لگایا تو وہ جو پہلے ہی اظہر کے وجود میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گھسٹتی ہوئی ان کے بازو کے گھیرے میں چلی گئی۔

افضل سعید نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تھپتھپایا تھا۔

ایک ناقابل یقین احساس سے گھبر کر اس نے ذرا سا سر اٹھا کر ان کا چہرہ کھوجنا چاہا۔

وہاں نرمی، سکون اور خوشی تھی اور آنکھوں میں جھلملاہٹ سی۔ وہ کیوں بھلا۔۔۔

دل موم کا دیا ہوتا ہے جل جل کر آنکھوں کے رستے پگھلتا ہے۔ پھر ایسی روشنی دنیا کو سجا دیتی ہے اور آخرت کو سنوار۔۔۔

☆☆☆

پاکستانی ویب سائٹ ڈاٹ کام

یقین کامل ہی بندگی ہے

اس کمرے کی ہر شے سے بوسیدگی نمایاں ہو رہی تھی۔ چھتوں کے کونے میں جالے، لکڑی کے پرانی طرز کے دو پٹ دروازے اور کھڑکیاں، دروازوں کا ہلکا براؤن رنگ کہیں کہیں ہی دکھائی دے رہا تھا۔ دیواروں پر یاسیت بھرا زرد رنگ۔

دروازہ کھلتے ہی عجیب سے ناگوار بھبکے نے استقبال کیا تھا۔ دھول اور مٹی نے اسے کھانسنے اور متواتر چھینکوں پر مجبور کر دیا تھا، اس کے رہنما اور میزبان نے روشنی کے لیے بلب کا پرانا کالا ٹک بٹن دبایا تو پیلی روشنی نے کمرے کی پراسراریت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

" میں نے دس دن کی محنت سے یہ چند فائلز نکالی ہیں۔ اتفاق سے ان سب میں تصاویر ہیں۔ جن دو میں نہیں ہیں۔ ان میں ایک لڑکی تھی۔ اور دوسرا لڑکا مگر وہ آٹھ برس تک کی عمر کا ہے۔ یہ یعنی چودہ پندرہ سے بہت کم، آپ خود توجہ فرمائیں۔"

اس کا میزبان، کلرک کم نگران کم چوکیدار الماریاں ٹٹول کر دھول مٹی سے بے نیاز گھومنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا ۔ جس کا فوم ادھڑا ہوا تھا۔

اس نے فقط سر ہلایا۔ وہ مضطرب تھا اس نے جبڑے سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ آنے والا پل۔۔۔ وہ کئی سالوں سے مسلسل تلاش میں تھا۔۔۔ مسلسل سفر۔ اس کی مستقل مزاجی قابل ستائش تھی یا جنون۔

وہ نہیں جانتا تھا اور نہ اس نے کبھی سوچا تھا کہ۔۔۔ جس تلاش میں وہ اپنا وقت، پیسہ، ذہانت، دھیان اور تمام تر صلاحیتیں استعمال کر رہا تھا۔ وہ اس کا کرے گا کیا؟ اسے بس ڈھونڈنا تھا۔ ایک بار،

بس۔

''آپ اتنی محنت سے نجانے کب سے تلاش کر رہے ہیں تو جانتے ہی ہوں گے۔ میرا بتانا فضول ہے۔ مگر میرا نہیں خیال کہ وہ۔۔۔'' نگران ذرا سا اٹکا۔ ''کہ وہ زندہ ہوگا۔''

ورق پلٹتے اس کے ہاتھ رک گئے اس نے بے ساختہ نگران کا چہرہ دیکھا اور اس کی آنکھوں میں درشتی، ناگواری اور شدید ترین غصہ عود کر آیا تھا۔

نگران نظریں چرا گیا۔ وہ اس کا ماتحت نہیں تھا۔ اس کی نظروں کے چرانے اور زبان کے لڑکھڑانے کے پیچھے وہ بہت سارے نیلے نوٹ تھے جو اس کی جیب کو گرم کر چکے تھے اور اگر وہ شخص کامیاب ہو جاتا تو یقیناً وہ اسے منہ مانگا انعام ہی دیتا۔

''دراصل۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ جتنے سال پرانی بات بتا رہے ہیں۔ ایسے۔۔۔ یہ لوگ زیادہ عمر نہیں پاتے۔ بارہ چودہ حد ہوئی تو بیس۔''

''اگر وہ مر گیا ہے تو بھی مجھے معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں دفنایا گیا۔ کب مرا؟ کیسے مرا؟ اور جب تک زندہ رہا کہاں رہا؟ کیسے رہا؟'' اس کی بات کاٹ کر وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

''آپ جمع کروانے والے شخص کا نام بھی نہیں بتاتے۔ ورنہ اس سے بھی بڑی مدد ملتی۔''

''اس شخص نے خود نہیں جمع کروایا تھا۔'' اس نے آخری فائل بند کر دی۔ ''اس نے یقیناً کسی اور سے یہ کام لیا تھا۔ اور میں اس شخص کے بارے میں نہیں جانتا۔ اور جو جانتا تھا، وہ بھی مر چکا ہے۔'' اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

''یہاں لوگ بچے چھپ چھپا کر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ بعض کوئی نہ کوئی نشانی بھی رکھ دیتے ہیں۔ بعض نومولودوں کو تولیوں میں لپیٹا ہوتا ہے۔ کسی بھی قسم کی شناخت کے بغیر۔۔۔ بعض تجربات کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ ہر عمر کے بچے آتے ہیں۔ رہ زبان برادری کے جائز ناجائز۔۔۔ بب۔۔''

''وہ ناجائز نہیں تھا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر ٹیبل پر زور سے ہاتھ مار کر چلایا۔ ڈھول کا لپٹا سا اٹھا وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

''سوری جناب۔۔۔ بہت بہت معذرت۔ میں تو آپ کو بس وجوہات بتا رہا ہوں۔'' نگران گھبرا کر سیدھا ہوا۔ ''میں جانتا ہوں۔۔۔'' نگران ذرا سا آگے جھکا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خندسی مسکراہٹ آ رکی۔ ''یہاں کبھی کوئی کسی ناجائز رشتے کو کھوجتا ہوا نہیں آتا۔ ناجائز کو ڈھونڈنے کے لیے کوئی جائز راستے استعمال نہیں کرتا۔'' وہ دکھی ہوا۔ ''یہاں گنجائش بھی کم ہے۔ ہم ایک مخصوص تعداد ہی رکھ پاتے ہیں اور اگر کوئی خاص کیس ہو یا جہاں جب تعداد زیادہ ہو جائے بچوں کو بڑے شہروں میں شفٹ کر دیا جاتا ہے۔ اب کون سا بچہ کہاں جائے گا یا چلا گیا اس کا ریکارڈ بہر حال ہوتا ہے۔ آپ اگر صرف اس جگہ کا صحیح نام بتا دیتے کہ کس شہر کے کس ادارے میں بچہ بھیجا گیا تو سو فیصد چانس تھا کہ آپ کامیاب رہتے۔ مگر ایسے۔۔۔'' نگران نے بہت تفصیل سے اسے پہلے کی بتائی باتیں دوبارہ بتائیں۔

وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر اب آنکھیں اور ناک صاف کر رہا تھا اس کی خوب صورت سنہری آنکھیں سرخی مائل تھیں اور کھڑی ناک کی نوک سرخ ہو چکی تھی۔

اس کا دراز قد، چہرے کی خوبصورتی اور وقار اور مغرور ابرو مقابل کو زیر کرتے تھے۔
اسے یونہی خیال آیا کہ وہ مرد ہو کر اس قدر متاثر ہو رہا ہے تو صنف نازک کیا محسوس کرتی ہوں گی۔
اپنے خیال کو جھٹک کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا جو اب رخصت کو تیار تھا۔
''میں نے آپ کو لکھ کر تو دیا تھا۔ شاہ گوٹھ میں کوئی یتیم خانہ یا ایدھی سینٹر یا اس طرح کی دوسری چیز نہیں تھی۔ حیدر آباد میں تھی۔ مگر وہ بہت دور پڑتا ہے شاہ گوٹھ سے، وہ اسے صبح صبح لے گئے تھے اور دوپہر کا کھانا واپس آ کر کھایا تھا۔ ان کی گاڑی چار بجے شام کو پہنچی تھی، اس سے ثابت ہوا کہ وہ اسی سرکل میں کہیں چھوڑا گیا تھا۔''
''آپ کچھ پوائنٹس تو دیں بچے کی ماں۔۔۔ اگر کوئی نشانی یا۔۔۔''
گفتگو کے وقت اس کی آنکھوں میں تاثرات بھر گئے تھے۔ لفظ ''ماں'' پر زخمی سی لہر آ رکی۔ اس نے تیزی سے کہا۔
''وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں نے بتایا تھا آپ کو۔'' اس کے لہجے میں درشتی سی آئی۔
''اوہ!''
''اجازت؟''
نگران اسے دروازے تک چھوڑنے آ گیا تھا۔ اب اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ اسے لمبا سفر کر کے واپس لوٹنا تھا۔
آنکھوں پر گاگلز چڑھاتے ہوئے وہ دروازہ کھول چکا تھا۔ جب نگران نے اسے نام سے پکارا۔ وہ مڑا نہیں مگر رک گیا۔ نگران خود سامنے آ گیا۔
''اتنے سال سے اس ویرانے میں رجسٹروں میں اندراج کرتا ہوں۔ یہاں بہت لوگ آتے ہیں۔ طرح طرح کی وجوہات سے۔ مطلب سے۔ مگر میرا اندازہ ہے۔ آپ غرض مند تو ہیں مگر یہاں تک مشکل اور لمبا سفر آپ نے غرض سے نہیں درد سے کیا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا۔''
نگران کا لہجہ سچائی کا مظہر تھا اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔
اس نے بھی گرم جوشی سے اپنا ہاتھ آگے کیا اور شکر کیا وہ آنکھوں کو گاگلز میں چھپا چکا تھا ورنہ۔
غرض۔ اور۔۔۔ درد۔۔۔ ہاں درد۔

☆☆☆

شہر کے اس پوش علاقے کی اس سڑک پر آمنے سامنے بنے بنگلوں کی قطاریں اپنے مکینوں کی خوش ذوقی اور حیثیت کا تعین کرتی تھیں۔ قیمتی پتھر۔ ٹائلز، بالکونی اور ان میں سجے آرائشی پھول بوٹے، قیمتی لکڑی کے منقش دروازے اور سیاہ شیشے والی کھڑکیاں۔
سب ایک سے بڑھ کر ایک۔ مگر دائیں جانب کا وہ تیسرا گھر۔ سب سے نمایاں اور خوبصورت تھا۔
عمارت کی اہم چیز جو اسے سب سے ممتاز کرتی تھی، وہ اس کا ہر جانب سے سبزے میں ڈھکا ہونا تھا۔ لمبے سیدھے درخت ایک قطار میں کھڑے تھے اور ایک ہی قامت کے تھے۔ ہلکی انگوری دیواروں پر گہرے سبز رنگ کی بیلیں لدی پڑی تھیں۔ باقاعدہ ایک شکل اور ان گہرے اور ہلکے سبز رنگ کے تناسب کو

مجروح نہیں ہونے دیا گیا۔ بیلوں پر لٹکے پھولوں کے گچھے ایک مستقل خوشبو۔
بیرونی دیوار کے اندرونی جانب بوگن ویلیا لگی تھی۔ اور پھولوں کے گلدستے گویا دیوار گھر کے باہر بھی کیاریوں کے پھولوں پودوں کی تراش خراش، روزانہ کی نگہداشت کا باعث تھی۔ ہر شے میں ایک تناسب اور ترتیب۔
اور اگر براؤن مین گیٹ سے چپک کر اندر نگاہ دوڑائی جاتی تو اندر سارا سال بہار اپنے جوبن پر رہتی۔ تراشیدہ گھاس، جیسے کسی نے سبز چادر پھیلا رکھی ہو اور اس پر دنیا جہان کے پھولوں کے پودے، قیمتی اور نایاب رنگ چھوٹے پھول پتے اور ان سے پھوٹتی انوکھی خوشبوئیں۔
جھکی کمر والا مالی کیاریوں سے ٹوٹے مسلے پتے اکٹھا کر رہا تھا تب ہی گھر کا مرکزی منقش لکڑی کا دروازہ کھلا اور مالکن باہر آئی۔
ہاں اس گھر کے مکین کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، شاید کوئی دوسرا اتنا سج نہ سکتا۔ کبھی نہیں۔
وہ کافی براؤن رنگ کے ٹراؤزر پر گہرے بسکٹی رنگ کی لمبی سیدھی قمیص میں ملبوس تھی۔ ان ہی دو رنگوں کے امتزاج سے بنی پھولوں والی شال دائیں کندھے پر ٹکی تھی۔ اس نے لمبی سانسیں کھینچ کر بارش کے بعد کی خوشبو اور تازہ دھوپ کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ ایک آسودگی، طمانیت اور خوشی خوبصورت چہرے پر ناچنے لگی۔
اس کی نگاہیں چار جانب گھومنے لگیں۔ سب کچھ اپنے معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔
سامنے کھڑی ایک گاڑی۔ ہاں۔ اس کا شوہر وقت کا پابند تھا۔ وہ جا چکا تھا اور وہ۔ گزری رات عجب تھی۔ وہ کمبل میں چھپی نجانے کیا کیا سوچتی رہی بارش کا شور اور بادلوں کی گھن گرج۔ اس کا دل سہما سا رہا۔ اس نے اپنے شوہر کی سمت دیکھا۔ وہ مکمل طور پر کمبل میں چھپا ہوا تھا، صرف ذرا سا ماتھا اور ابرو دکھائی دیتی تھیں۔ ابرو کے کمان۔ مغرور۔ مقابل کو احساس کمتری میں مبتلا کر دینے والے۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اور اس سوچ نے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑا دی۔ (کوئی شخص اتنی بے فکری سے کیسے سو سکتا ہے) اس نے خود سے سوال کیا۔ بادل بہت زور سے گرجے تو ایک فوری خیال کے تحت وہ سرعت سے مگر چاپ پیدا کیے بنا کمبل سرکا کر کھڑی ہو گئی۔
اس نے کمرے سے نکلنے سے پہلے سوچا جب وہ صبح اس کو کمرے میں نہیں پائے گا تو بہت خفا ہو گا۔ وہ اسے ضرور ڈانٹے گا کہ وہ پھر بیٹے کے کمرے میں سوئی ہے جب وہاں ایک آیا موجود ہے تو وہ کیوں بھاگ بھاگ ماما جتانے جاتی ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے اس نے سوچا۔
وہ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں دبے قدموں مگر کسی قدر تیزی سے بیٹے کے کمرے میں داخل ہوئی۔
خدشات سے پرے۔ اس کا بیٹا، بارش، بادلوں کی گھن گرج سے بے نیاز گہری پرسکون نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔
اس کی باپ جیسی کمان ابرو۔ مگر اس کے چہرے پر باپ جیسی بے نیازی اور تنفر نہیں تھا۔ معصومیت، بھول پن اور بے تحاشا خوبصورت چہرہ۔

اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اس کے پھولے گالوں کو چوم ڈالے مگر نیند خراب ہونے کا اندیشہ۔

آیا کمرے میں گینڈ بنی سو رہی تھی۔ اس نے چہار اطراف نظر دوڑائی۔ اس کمرے میں دنیا کے ہر خطے سے لائی گئی اشیاء موجود تھیں۔ بے حد قیمتی اشیا۔ اونہہ! اس کے بیٹے سے بڑھ کر تو نہیں۔

اس کی نگاہ ایک بار پھر بیٹے پر ٹکی اور اس بار وہ خود کو روک نہیں پائی بہت غیر محسوس طریقے سے اس کے کمبل کا کونہ اٹھا کر وہ چپکے سے اندر گھس گئی۔ اس نے آہستگی سے اس کے گرد بازو رکھ دیا۔

بچہ بہت گہری نیند میں تھا مگر اس نے اسی عالم میں اپنا بازو اس کے چہرے سے مس کر کے غالباً اسے محسوس کیا۔ یہ بے ساختہ التفات۔ اس نے بچے کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بے آواز بوسہ لیا۔ گھڑی سوا تین بجا رہی تھی۔ جب وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

اور اب صبح دس بجے آنکھ کھلی۔ ایسی بے خبری کی گہری پرسکون نیند۔ وہ ہلکی پھلکی سی بے حد فریش ایک اجلی صبح سے لطف اندوز ہونے لان میں آ گئی۔ اسے ابھی نہا کر کپڑے بدلنے تھے مگر بچے کو بھوک لگی تھی۔ آیا اسے تیار کروا کر لا رہی تھی۔ وہ خانساماں کو ناشتا باہر ہی لانے کا کہہ آئی تھی۔

منقش دروازہ وا ہوا۔ آیا اس کے بیٹے کی چیئر گھسیٹتی باہر نکل رہی تھی۔

''تم جاؤ، فریش ہو کر ناشتا وغیرہ کرو اور یہ گیلے کپڑے چینج کرو، ٹھنڈ لگ جائے گی۔ اسے میں خود ناشتا کروادوں گی۔'' اس نے چیئر تھام لی۔

آیا اس کے بیٹے کو نہلانے اور کپڑے بدلوانے میں خوب ہلکان ہوتی تھی اور بھیگ جاتی تھی، اس کے حکم پر متشکر مسکراتی نگاہوں سے پلٹ گئی۔

خانساماں نے تپائی پر ناشتا چن دیا۔ آملیٹ، شہد بریڈ اور چائے۔ گرم گرم دھواں اڑاتا نوڈلز کا پیالہ۔ ابلے انڈے اور چکن اسپریڈ۔ دودھ کا گلاس اور جوس۔ اس کا بیٹا کچھ بھی مانگ سکتا تھا۔

اور بوائل ایگ بھی۔ اس نے پلیٹ آگے کی۔ انڈے صفائی سے کٹے تھے اور ان پر غیر محسوس سا نمک کالی مرچ چھڑکا ہوا تھا۔

''اوہ۔ ہوں۔ نا۔ نا۔'' اس کے بیٹے کو بوائل ایگ پسند تھا مگر وہ چیئر پر ہاتھ مارتا اپنی ناگواری بتا رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ ''ارے۔'' اسے دھیان آیا۔ ''انڈے کاٹ کیوں دیے کوئی ثابت بوائل ایگ ہے تو فوراً لاؤ۔ اور یہ لے جاؤ اور ثابت گرم مسالے کا ڈبا بھی لانا۔ یہ بگڑ گیا تو کچھ بھی نہیں کھائے گا۔ ساری محنت اکارت۔ جلدی۔''

ملازمہ عندیہ سمجھ گئی۔ سرپٹ دوڑی۔

''ہاں ہاں بابا! ابھی بس دو منٹ ابھی ہمٹی ڈمٹی بنائیں گے۔''

وہ ہل ہل کر نظم سنانے لگی۔

بچہ سر ہلا ہلا کر اپنی خوشی بتانے لگا۔ پھر یکدم رک کر آنے والی ملازمہ کو دیکھنے لگا۔ ہاتھ میں ثابت ابلے انڈے تھے۔ وہ نظم گانا چھوڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی اس نے انڈے کو لمبائی رخ درمیان سے کاٹا۔ گرم مسالے کے ڈبے سے دو کالی مرچ نکال کر آنکھیں بنائیں لونگ ناک کی جگہ لمبی سی گاڑ دی۔ کیچ اپ میں

الٹا چمچ ڈبو کر نکالا اور ہونٹوں کا نشان بنا دیا۔ ہمٹی ڈمٹی کی گول مٹول بڑے سر والی شکل تیار تھی۔ اس کے بیٹے نے سرشار ہو کر تالی پیٹی۔ وہ خوشی سے لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔

اسے کھانا کھلانا مشکل کام تھا۔ اس کام کے لیے آیا تھی۔ مگر وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ایک وقت کا کھانا اسے اپنے ہاتھ سے ضرور کھلاتی تھی۔

اپنے بچے کو کھاتا دیکھنا، بڑھتا دیکھنا کتنا خوب صورت ہوتا ہے نا۔

اس کا ناشتا ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر وہ مگن تھی۔

وہ ایک چمچ بیٹے کے منہ میں دیتی۔ ایک ہمٹی ڈمٹی کے ہونٹوں سے لگاتی۔ بعض اوقات بیٹے کے اشارے پر اسے اپنے منہ میں ہی ایک چمچ ڈالنا پڑتا تھا۔ ایسی منصفانہ تقسیم پر بچہ خوشی سے ہنستا تو وہ سحر زدہ سی اسے دیکھتی رہ جاتی۔

مائیں بچوں کو ایسے ہی لاڈ پچکار اور بہانوں سے کھلاتی پلاتی ہیں۔

لیکن اگر بچہ عون جیسا ہو تو۔۔۔۔؟؟؟

گورا چٹا۔ تندرست و توانا۔ مغرور ابرو۔ اٹھی ناک کے ساتھ خوبصورت معصوم بے ریا آنکھیں ہلکی نیلی جینز کی پینٹ۔ پیروں میں جوگرز۔

وہ اپنی عمر کے بچوں سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ مگر پھر بھی ماں کے ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا۔ وہ سات برس کا تھا۔ پھر ایسے کیوں۔ ہاں وہ چیئر پر بیٹھا تھا۔

مگر وہ وہیل چیئر تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں پر اتنے موٹے شیشے کا چشمہ تھا کہ ان سے آنکھیں یوں جھلکتیں گویا ابلی پڑی ہوں۔

اس کی ساری صحت۔ بس گوشت کے ڈھیر کی صورت تھی ورنہ اگر بات توانائی کی کرتے تو وہ اپنا ہاتھ اپنے سر تک بھی بلند نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی گردن عام طور پر دائیں بائیں ڈھلکی رہتی ہاں کھانا کھلاتے وقت اسے وہیل چیئر کے بنائے ہوئے ہیڈ سپورٹ میں ٹھہرا دیا جاتا۔ یہ وہیل چیئر اس کی ضروریات کے حساب سے آرڈر پر ڈالرز میں رقم ادا کر کے امریکا سے بنوائی گئی ہے۔ اس کی آنکھوں سے اکثر پانی بہتا ہے اور منہ سے رال۔ اس کے کانوں میں آلۂ سماعت لگا ہے۔ وہ چند لفظوں کے علاوہ بولنا نہیں جانتا۔ اوں نہ، نا، ہاں چہرے پہچانتا ہے۔ آیا کا چہرہ۔ باپ کا چہرہ۔ مگر وہ باپ سے گھبراتا ہے اور اس کی موجودگی میں سراسیمہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی مچھلیوں میں خوش رہتا ہے اور پرندوں کے پنجروں کے پاس اور خرگوش اور بطخیں اور ہرن کا بچہ۔

اور سب سے پسندیدہ۔۔۔ ماں کا چہرہ۔

اس نے یکدم اپنے ٹیڑھے میڑھے دانت سختی سے بھینچ کر ہونٹ آپس میں پیوست کر دیے اور آنکھیں موند لیں۔

ماں کے ہاتھ رک گئے۔ اس کا پیٹ بھر گیا اب وہ اور کچھ نہ کھائے گا۔

"یہ سب لے جاؤ۔" وہ ملازمہ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ نے ناشتا نہیں کیا بی بی!" ملازمہ نے یاد دلایا۔

''میں کرلوں گی۔ تم دیکھ رہی ہو نا اب عون پرندے دیکھنے پیچھے جائے گا۔ تم بس میرے لیے ایک گرم کپ چائے لے آؤ۔ ہم پیچھے ہیں۔'' وہ گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھ پونچھے اور عون کا چہرہ تولیے سے رگڑنے کے بعد چوم لیا۔ پھر اپنا گال اس کے ہونٹوں سے جوڑا کہ وہ بھی چوم لے۔

''بہت مزا آیا۔'' اس نے بیٹے کو بتایا۔

برتن سمیٹتی ملازمہ نے پل بھر کو رک کر بہترین ناشتے کے لوازمات کو دیکھا۔ اس کی مالکن اکثر بیٹے کو کھلانے کے چکر میں بھوکی ہی رہ جاتی تھی۔

''سفینہ! میڈم کہاں ہیں۔ سر کا فون آ رہا ہے۔'' آپا پھولے سانسوں کے ساتھ باہر آئی۔ ''وہ آدھے گھنٹے سے کال کر رہے ہیں یہ دیکھو سترہ مسڈ کالز۔''

''تو تم اٹینڈ کر لیتیں۔'' سفینہ نے کہا۔

''کر لیا اٹینڈ۔ کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہونے کا کہہ رہے ہیں۔''

''تم نے یہ تو نہ کہا کہ وہ عون بابا کو ناشتا کروا رہی ہیں۔'' سفینہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''لو! میں کوئی پاگل ہوں۔ کہہ دیا، نہا رہی ہیں۔'' آپا بھی بیچ کی بات سے خوب واقف تھی۔

ملازمہ سفینہ چہرے پر تاسف اور کسی قدر غصے کے تاثرات لیے تپائی سے برتن اٹھا اٹھا کر ٹرالی میں رکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''سفینہ! کیا بیگم صاحبہ تیار ہیں۔'' کپڑوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرتی سفینہ آواز پر بری طرح چونکی۔ ''ہاں۔ نو۔ یس سر۔'' وہ گڑبڑائی۔

''میرے لیے ایک کپ چائے منگوا دیں اور اپنی میم سے کہیں، ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔''

سفینہ تیزی سے کامن روم سے نکلی۔ کچن میں خانساماں کو چائے کا کہا اور پھر گومگو کیفیت میں وہیں کھڑی رہی۔

''کیا ہوا سفینہ۔ ایسے کیوں کھڑی ہیں۔''

''بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے عبدالسلام!'' وہ اپنی ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔

''میڈم کو آج سر کے ساتھ ایک بڑی پارٹی میں جانا تھا۔ صبح ہی ڈرائیور سب کپڑے وغیرہ دے گیا۔ میڈم نماز جمعہ کے بعد نماز حاجت پڑھ کے وظیفہ پڑھنے لگیں مجھے بھی دھیان نہ رہا اور سر آ گئے ہیں انہیں لینے۔ اب میں کیا کروں۔'' وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔

''تو تم میڈم کو آواز دے دو، چائے پینے تک وہ ریڈی ہو جائیں گی۔''

''ایسے کیسے آواز دے دوں۔ وظیفے بڑے جلالی ہوتے ہیں۔ بیچ میں چھوڑے نہیں جا سکتے اور نہ ہی درمیان میں پکارنا چاہیے، الٹا اثر ہو جاتا ہے۔''

سہمے ہوئے لہجے میں جھرجھری لے کر بولی۔

''پھر آواز دے بھی لوں تو فائدہ۔ انہیں پارلر جانا تھا۔ یہ سب اتنی جلدی نہیں ہو سکتا میں اسی بات

کی تنخواہ لیتی ہوں کہ میڈم کے پورے لُک کو مین ٹین رکھوں۔ مگر میں کیا کروں۔ عون بابا کے پیچھے وہ اپنی سدھ بدھ کھو دیتی ہیں اور جب وہ بیمار ہو تو۔۔۔ پھر تو وہ جیسے دیوانی ہو جاتی ہیں۔ میں تین دن سے پارلر جانے کا کہہ رہی ہوں اور وہ مجھے ڈانٹ چکی ہیں کہ بچہ بیمار ہو تو وہ کیسے ان فضولیات میں وقت گنوا سکتی ہیں۔ میں اگر سر کو یہ سب بتاؤں تو وہ کھڑے کھڑے مجھے فارغ کر دیں کہ اس اتنے بڑے گھر میں مجھے بس اسی ایک کام کے لیے تو رکھا گیا ہے اور۔۔۔"

"میں پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤں گی سفینہ! تم اتنی پریشان مت ہو۔" نرمی سے اس کے شانے کو چھوتے ہوئے میڈم نے ملائم لہجے میں کہا۔

وہ چونک کر مڑی پھر شرمندہ ہو گئی۔

"آئی ایم سوری میم!" اس نے پلکیں اٹھائیں اور اس بار بری طرح اچھلی۔ میڈم پانچ منٹ میں تیار ہو جاتیں مگر اتنے سوجے پپوٹے، سرخ ناک مسلسل رونے سے چہرہ تک سوجا سوجا تھا اور آواز بھاری۔ "آپ کا چہرہ میم!"

"میک اپ سے سب چھپ جاتا ہے۔" اس نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری کہ سب چھپ جائے گا۔" عقب سے ابھرتی غراتی آواز۔ سفینہ بلا ارادہ کچھ پیچھے سرکی۔ "میں دس روز سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں آج جانا ہے۔ ہمیں مسٹر اینڈ مسز۔" صاحب نے درشتی سے میم کا بازو پکڑا اور جھٹکا دے کر جملہ اور بازو ایک ساتھ چھوڑ دیے۔ میم بری طرح لہرا گئیں۔ پھر وہ سفینہ کی سمت گھوما۔ "ایسا نہیں ہے کہ آپ کی میڈم کوئی جاہل، کم عقل عورت ہیں اور انہیں اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لیے میں نے ایک اسٹائلسٹ کو نوکری دی ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے رکھا تھا کہ آپ انہیں یاد رکھوائیں کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔" وہ غرایا۔

"سر! میں نے کہا تھا۔ سر! وہ میم وظیفہ۔ آئی ایم سوری۔" وہ کانپ رہی تھی۔

"وظیفہ۔۔۔" وہ چلایا۔ "تم کرتی رہو اپنے وظیفے۔" اس نے تیزی سے نمبر گھمایا۔

سفینہ نے ٹھنڈی سانس لی اور جان گئی کہ صاحب کہاں کا نمبر ملا رہے ہیں

"ہاں! میں بول رہا ہوں۔ کیا تم دس منٹ میں تیار ہو سکتی ہو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔" وہ کسی کو تفصیل سمجھاتے ہوئے پیر پٹختا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"جب سب کہہ کہہ تھک گئے۔ کیا اپنے کیا پرائے، دوست دشمن سب، تب مانا نہیں اور جب سب پیچھے ہٹ گئے تو موصوف گھوڑی چڑھ گئے۔ خیر مرد کی عمر کو کون دیکھتا ہے، وہ تو پھر چالیس کا ہی تھا مگر اس کی بیٹی پندرہ برس کی ہو گئی تھی۔ میں تو بھیا گئی نہیں مگر دیکھنے والوں نے بتایا۔ وہ معصوم باوا کی بارات میں یوں شریک تھی جیسے لاڈوں پالے بھیا کی گھوڑی کی باگ تھامے چلتی ہو۔ اب کراچی، لاہور، کا فاصلہ تم دیکھو۔ پھر بھانجے کی دوسری شادی۔ لیکن میرے دل کو ارمان ہی چڑھ گیا۔ کہ دیکھوں تو سجاد میاں کس کارن مانے۔ اور دوسرے سوتیلی اماں بیٹا کے ساتھ کیسی ہیں۔ راوی تو بس چین ہی چین لکھتا تھا پر تم بتاؤ، آج کل تو راوی بھی کرائے کے ملتے ہیں۔ ہے کہ نہیں۔"

رابعہ خاتون پلاسٹک کے ڈونگے میں مٹر نکال نکال ڈالتی جارہی تھیں۔ان کے ہاتھ اور زبان تواتر سے چل رہے تھے۔پل بھر کو ہاتھ اور زبان روک کر اپنی سامع شمسہ بیگم سے تصدیق چاہی۔شمسہ بیگم مہارت سے کروشیا سے کچھ بن رہی تھیں۔وہ سارا سال کچھ نہ کچھ بنتی ہی رہتی تھیں۔

اب ان کی بولنے کی باری تھی۔

''بالکل ملتے ہیں۔آپ صحیح کہہ رہی ہیں اور بھئی وہ دیکھیں گے نا جو دکھایا جائے گا یاد ہے مجھے۔ آپ تو آ کر خوش ہی تھیں اچھی عورت مل گئی سجاد کو۔اور بچی کے ساتھ بھی بہت اچھی ہے۔میں نے تو کبھی دیکھا نہیں۔مگر آپ سے سن سن کر دل میں بچی کے لیے دعا کرتی رہی۔سگی مر جائے اور ابا سوتیلی لے آئے تو ابا بھی سوتیلا ہی بن جاتا ہے۔حق ہا۔''

ٹھنڈی سانس بھر کے انہوں نے انگلی پر دھاگہ لپیٹنے کا توقف کیا۔سفید نلکی لڑھک کر زمین بوس ہو چکی تھی۔

رابعہ بیگم ابھی تک ہاتھ رد کے انہیں سن رہی تھیں۔باری ملنے پر دوبارہ مٹروں کی جانب متوجہ ہوئیں اور ساتھ ہی سلسلہ کلام جوڑا۔

''سجاد کے کسی دوست کی سالی تھی۔راحیلہ نام ہے۔اللہ جانے حقیقتِ حال مگر شوہر چھوڑ چکا تھا۔ اس نے تو یہی بتایا۔کردار کا کچا اور ہتھ چھٹ تھا۔ایک بیٹا تھا کبھی ماں کے پاس کبھی باپ کے، چونتیس پینتیس کی عمر ہوگی۔اس کے اماں باوا کہنے لگے۔بیٹا باپ کے حوالے کر دو خوب پیسے والا ہے، اٹھائے ذمہ داری اور تمہاری تو ہم شادی کریں گے۔بچہ باپ کے پاس رہا اور راحیلہ بی بی سجاد سے بیاہی گئیں سال بعد بیٹی ہوگئی پھر ایک بیٹا بھی۔لیکن اس بچی سے بھی رویہ اچھا تھا۔اتفاق سے دو چار بار جانا ہوا۔ دھلے دھلائے کپڑے۔کتابیں پڑھتی پائی گئی۔چھوٹے بہن بھائیوں کو بڑے لاڈ سے سنبھالتی۔منہ سر چوم کر رکھتی۔کچن تو ماں کے نہ ہونے سے بچپن ہی سے دیکھنا آ گیا تھا۔ہمیں تو سب بھیا اچھا اچھا ہی لگا۔خوش حال گھرانہ۔ہاں''

مٹر چھل گئے تھے۔وہ چھلکے تھیلے میں بھرنے لگیں۔

''تو اچانک سب کے سب منہ الٹائے کینیڈا کیسے بھاگے۔اس کا بھی ٹکٹ کٹوا لیتے۔جوان بچی۔'' شمسہ بی بی نے ٹوکا۔

''یا تو جوان کہیے یا بچی۔جوان ہے تو بچی کیسے کہہ سکتے ہیں۔اور بچی ہے تو جوان کیوں کہا؟''

عدینہ ڈوئی ہاتھ میں لئے کچن سے برآمد ہوئی۔ڈوئی میں مسالا تھا۔وہ رابعہ خاتون کو نمک چکھانا چاہتی تھی۔اس کا چہرہ کچن کی گرمی کے باعث، کچھ خفگی کے باعث اور کچھ حسبِ عادت سرخ اور سوجا سوجا روٹھا سا تھا۔

''دعوت کا کھانا بننا ہے صاحبزادی۔اسپتال نہیں بھیجنی بریانی۔ایک چمچ مرچ اور آدھا نمک کا ڈال اور گرم مسالا کٹا ہوا بھی ڈال دینا۔بس جملے پکڑنے ہی آتے ہیں۔اپنی ہانڈی کے نقص پکڑنے نہ آئے۔سسرال میں ساس کی ناک کے آگے بھی ڈوئی لگا دینا۔کہ اماں چکھو۔ہونہہ۔''

رابعہ خاتون نے خفگی سے کہا۔

''میں ایسی کسی سسرال میں جانے والی ہی نہیں جہاں مجھے ڈوئی پکڑا دی جائے اونہہ!'' عدینہ نے ان ہی کے انداز میں کہہ کر پیر پٹخے۔

''اے بی بی۔ سسرال اور ڈوئی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تمہارے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ تو ساس کے ہاتھ میں ہوگی۔ مگر اس نے بھی اس وقت اسے ہنڈیا میں نہیں گھمانا۔ تمہارے پیروں ہی میں توڑے گی۔ نکمی بہو کو کون بٹھا کر کھلاتا ہے۔ اماں باوا تو ہیں نہیں۔ عدم سدھارے۔ تم دادا دادی کے چونڈے میں راکھ ڈلوانا۔ ہاں۔''

رابعہ بیگم کو غصہ اپنے بھانجے سجاد اور اس کی دوسری بیوی راحیلہ پہ تھا جو مسلسل بول بول کر ہلکا کر رہی تھیں۔ عدینہ کے بھی لتے لے لیے۔ عدینہ کا مانو دماغ گھوما مگر اس کے کھلتے لبوں پر رابعہ بیگم کی نگاہ تھی۔ سو فوراً ٹوک دیا۔

''اب خبردار جو کوئی الٹا سیدھا بولیں تو۔ جا کر مسالا ڈال دو ورنہ پھر کچا اندر رہے گی۔ صبح سے ایک کھانا تیار نہیں کر سکیں۔ ہاں باتیں کروالو آنے والے تو بھوک کا شور مچاتے آئیں گے نا۔''

''جہاز میں بھی تو کھانا ملتا ہے۔ لاہور کون سا دور ہے جہاز میں اپنے گھر سے ناشتا کر کے ہی نکلی ہوگی۔ آپ بچی کو بولائے دے رہی ہیں۔ آ جائے گا سب وقت رہتے۔''

شمسہ بیگم نے کچن کی کھڑکی سے نظر آتے عدینہ کے چہرے کو دیکھا۔ جھنجھلاہٹ غصہ اور ناراضی کے گہرے تاثر نے بھی خوبصورتی پر اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ اس روپ میں بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ لا دیتی تھی۔ حسن ہر عالم میں حسن۔

''وہ تو کھا پی کر آئے گی۔ مجھے کب ہو رہی ہے اس کی فکر۔ آپ کے بھائی صاحب۔ بھول گئیں انہیں۔ دو گھنٹے میں تو ایئرپورٹ پہنچے ہوں گے۔ پھر جہاز آنے اور وہ نکلے گی پھر واپسی کے دو گھنٹے اور اگر شومئی قسمت ٹریفک جام۔ تو بس اللہ ہی حافظ۔ مجھے تو بس ان کی فکر ہے۔''

رابعہ بیگم کی حقیقت بیانی پر شمسہ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

رابعہ خاتون مٹر فریج میں اور چھلکے کوڑے دان میں ڈالنے کو کھڑی ہوئیں۔ ساتھ ہی کچن کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ دوسرے چولہے پر پتیلی میں گاجریں، مٹر، ہری پیاز اور شملہ مرچ دم پر رکھی تھیں۔

''اب یہ کس لیے۔'' وہ اچنبھے سے عدینہ کی صورت دیکھنے لگیں۔

''میرے لیے۔ کیا میں کچھ نہ کھاؤں گی۔'' وہ بھرپور ناراضی سے بولی۔

''تو یہ اتنا سب جو بن رہا ہے اس میں کچھ نہیں تمہارے لیے۔ بریانی، چکن کڑاہی، گاجر کا حلوہ، نان اور سلاد وغیرہ۔''

''میں نہیں کھاتی اتنی آئلی ہیوی چیزیں۔ ساری اسکن سے تیل کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور دانے الگ۔''

''ارے میرے مالک۔'' رابعہ خاتون کے پاس کوئی جواب نہ رہا۔ ڈھکن اٹھا اٹھا کر خود چیک کرنے لگیں۔ عدینہ انہیں مگن پا کر دبے قدموں باہر نکل آئی۔ شمسہ بیگم اپنا سامان تھیلی میں بند کر رہی تھیں۔ عدینہ کی گربہ پائی کو بھانپتے مسکرائیں تو اس نے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر خاموش رہنے کی

گزارش کی۔ رابعہ خاتون اب کام مکمل کر کے باہر آتیں۔

☆☆☆

''عدینہ۔ ارے عدینہ بچی! سنتی ہو۔ ذرا جلدی سے آؤ تو دو روٹیاں ڈال دو۔ فون آیا ہے تمہارے دادا کا۔ پندرہ بیس منٹ میں پہنچنے کو ہیں۔'' رابعہ خاتون نے ریسور رکھتے ہی ہانک لگائی۔

''اب روٹی کس لیے، نان منگوائے تو ہیں ناں۔۔۔'' وہ انکار آمیز اچنبھے سے چلائی۔

''ارے بی بی اللہ کی بندی انجانے کو تو کتھا سناؤں اور جان بوجھ کر مزا لینے والے کے لیے کیا کروں۔ چاول سے بھوک نہیں اترے گی۔ اوپر سے شوگر اور نان ہضم کب ہوتے ہیں تمہارے دادا کو۔ خود سے تو خیال کیا آئے گا، بتانے پر بھی حجت۔'' رابعہ خاتون کی جان ہی جل گئی۔

''اتنی تمہید اف۔'' عدینہ نے نزاکت سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''تو پہلے ہی کہہ دیتیں۔ میں ڈال لیتی۔ اب تو میں تیار ہو کر آ گئی ہوں۔''

''تو جو تیار ہو کر آتے ہیں، کام سے رخصت لے لیتے ہیں۔ کھاتے پیتے نہیں۔ دو روٹیاں ڈالنے میں کتنا وقت لگے گا۔ بوڑھی دادی پر رحم کر لے بچی۔'' رابعہ خاتون عاجز آ گئیں۔ عدنیہ کے لیے کوئی راہ نہیں تھی۔ منہ تو پکا رکھا مگر دل میں خود کو کوسا۔ پتا تو تھا دادا جان کے لیے روٹی ڈلے گی تو خود سے ہی ہاٹ پاٹ میں رکھ دیتی مگر اس وقت اسے اپنے بناؤ سنگھار کی فکر تھی۔ کہ کہیں مہمان کی آمد پر ایسی ویسی نظر نہ آئے۔ سو بھاگی اور جی جان سے تیار ہو کر آئی۔ اس نے توا رکھتے ہوئے اپنا ناقدانہ جائزہ لیا۔ لہریے دار بالوں کو آدھا کلپ میں جکڑ آدھا کھلا چھوڑا، وہ بے فکر تھی اس کے براؤن بالوں میں سنہری اسٹریکنگ کی دھاریاں تھیں۔ گلابی بے حد گداز سراپے پر آدھے بازو کی تنگ اونچی قمیص کے ہمراہ بوتل کٹ شلوار، سفید گرے سرخ رنگ کی تھی۔ پیروں میں سرخ اونی سلیپر سردی سے بچاؤ کے لیے اس نے کانوں میں بہت بڑی بڑی سرخ بالیاں ڈال رکھی تھیں اور مکھن کے پیڑے جیسے ہاتھوں پر ابھی بڑی دل جمعی سے سرخ نیل پالش لگا کر ہاتھوں پر لوشن مل کر آئی تھی اور اب روٹیاں۔''

''فیشن لاہور سے شروع ہوتا ہے اور کنیرڈ کی پڑھی لڑکی۔ ہونہہ۔'' اس نے بہت احتیاط سے پیڑا بناتے سوچا اور گردن جھٹک کر خود کو دیکھا۔ دادا جان کی موجودگی کا لحاظ نہ ہوتا تو ہونٹ اور گال بھی رنگ لیتی۔ ابھی بھی خود کو بمشکل روکا تھا۔ مگر آنکھوں میں کاجل کی لکیر اور پلکوں کو مسکارے سے آراستہ کر لیا تھا۔ شیمپو کی خوشبو، صابن، باڈی اسپرے اور لوشن کی مہک چار جانب چکرا رہی تھی۔

وہ روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھ رہی تھی۔ جب گاڑی رکنے کی آواز آئی اس نے سرعت سے چولہا بند کیا اور ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی سردی کے موسم میں اس نے آدھی آستینیں شوق میں چڑھا رکھی تھیں۔ سردی لگے گی تو شال لپیٹ لے گی۔ سامنے سے دادا جان نظر آ گئے۔ وہ وہیں رک کر جائزہ لینے لگی۔ ایک بیگ۔ ایک چھوٹا بیگ۔

''پتا نہیں کتنے عرصے رہے گی۔ ناشتا دادی جان بناتی تھیں۔ دوپہر کی چپاتیاں کام والی بھولی ڈال دیتی مگر رات کا دستر خوان تمام تر کا تمام اس کے ذمہ تھا جسے وہ طوعاً کرہاً پورا کرتی۔ اب مزید ذمہ داری۔ پہلے ہی روٹی ڈالنا اتنا مشکل ہے۔ اب اور روٹیاں۔ اور یہ پنجاب کے لوگ روٹی بھی زیادہ

کھاتے ہیں۔ سامان اتنا زیادہ ہے۔ کیا ہمیشہ کے لیے رہنے آ گئی۔ ہائے اللہ نہ کرے۔''
اس نے دہل کر سوچا اب نظر بھی آ جائے کہاں رہ گئی ۔اف۔
دادا جان تخت پر ڈھے سے گئے۔
''تھک گیا بیگم۔'' بیگم چونکہ متوجہ نہیں تھیں۔ سوا ونچی آواز میں عظیم خان بولے۔
''ہاں جی۔ جہاز کے آگے جتے ہوں گے۔'' رابعہ خاتون کی ساری توجہ دروازے پر تھی۔
''پانی۔'' دادا جان نے پکارا تھا۔ وہ جگ لیے تیزی سے نکلی اور تب ہی مہمان اندر داخل ہوئی۔
''عدینہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا مگر سب الٹ ہو گیا۔ بن ماں کی بچی۔ سوتیلی ماں۔ اور اب باپ بھی اپنے بیوی بچوں کے پیچھے کینیڈا چلا گیا۔ وہ اسے بلوائے گا۔ سوتیلی ماں کو اس کے والد نے اسپانسر کیا تھا۔
''ارے بظاہر سب اچھا اچھا ہی لگ رہا تھا۔ راحیلہ کے والدین بیٹے کے پاس کینیڈا میں رہنے لگے۔ اب آگے کی ویزا پالیسیوں کی ہمیں کیا خبر۔ اس راحیلہ کا بیٹا بھی وہیں کینیڈا میں۔ سجاد نے کبھی ملنے جلنے پر اڑ چن نہیں کی۔ شوہر سے رشتہ ختم ہوا تھا بیٹے سے تو نہیں۔ وہ ایک بار یہاں آ کر بھی مل گیا۔ راحیلہ والدین سے ملنے گئیں تو بیٹے سے ملتیں۔ کبھی چھ ماہ رہی کبھی سال بھر۔ نہ جانے کون سی شق کے تحت خاموشی سے سب کرتی رہی۔ پہلے خود گئی پھر بچے مستقبل کے نام پر سجاد کو بھی بلوالیا۔ سوتیلی بیٹی کے لیے ویزا قوانین کیا کہتے ہیں۔''
''اس باریک بینی میں رابعہ خاتون نہ پڑیں۔'' وہ آدھا کانا قصہ خوب غصے سے اتنی بار سنا چکی تھیں کہ ہر ایک کو ازبر ہو گیا۔
''سجاد وہاں جائے گا سیٹ ہوگا پھر بیٹی کو بلوائے گا اب یہ سب اتنی جلدی تو ہوگا نہیں۔''
وہ رابعہ خاتون کا اکلوتا بھانجا تھا اور اس کی بیٹی سے انہیں بہت ہمدردی تھی۔ سال چھ ماہ کے لیے رابعہ خاتون کے گھر سے اچھا ٹھکانہ کون سا ہو سکتا ہے۔
سجاد کی سوچ سے قطع نظر رابعہ خاتون خود ''بچی'' کو آغوش میں بھرنے کو بے قرار تھیں۔
اتنے دن کے قصے سے عدینہ کے دماغ میں ایک شکل سی بن گئی۔
سوتیلی ماں کے ظلم و جبر اور مکر کو سہتی معصوم بچی اجڑی بچھڑی ہراساں قابل رحم ہائے ہائے۔
مگر اب جو ہائے اس کے منہ سے نکلی وہ بڑی ہی عجیب تھی۔
اونچے سیاہ ڈھیلے کرتے پر پورے آستینوں اور گلے پر سی گرین رنگ کی بہت باریک نفیس کڑھائی، سیاہ پٹیالہ نما گھیر والی شلوار، سی گرین دوپٹا شانے پر گرا تھا لینن کے اس سوٹ کے اندر سراپا۔ نازک نازک عدینہ کو بہت دیر تک دوسری کوئی نہ سوجھی۔ کیا اس نے بہت اونچی ہیل پہن رکھی ہے۔ عدینہ نے ذرا گردن نکال کر دیکھا۔ نہیں۔ وہ بالکل زمین سے چپکی جوتی میں تھی اتنا خوبصورت دراز قد۔ نزاکت سرتاپا۔ دادی کہتی تھیں حوریں پانی پییں گی تو ان کی جلد اتنی شفاف آر پار سی ہوگی کہ گزرتا پانی نظر آئے گا۔
عدنیہ نے سوچا کہ وہ جب وہ پانی پیے گی تو وہ ضرور دیکھے گی اتنی شفاف کھال۔ یا اللہ۔

سب سے حیران کن نووارد کا ہیئر اسٹائل تھا یہ شاید ڈائنا کٹ تھا۔ یا تنہائیاں کی زویا کے جیسے بال۔ مگر ان کا رنگ شہد جیسا تھا۔ اور آڑی مانگ کے ساتھ پف بہت گھنا تھا گدی تقریباً خالی۔ یہ بالکل تازہ کٹنگ تھی۔

وہ رابعہ خاتون سے گلے ملنے کو جھکی تو پف کا جھاڑ ڈھلک کر بے ترتیب سا ما تھے پر گرا جسے اس نے انگلیاں پھنسا کر اوپر چڑھایا۔ جو انگلیاں نکلتے ہی دوبارہ کنپٹی پر دائیں جانب۔

''آؤ عدینہ! بہن سے ملو۔'' رابعہ خاتون جب خوب جی بھر منہ چوم چکیں تو دھیان آیا۔

عدینہ سحرزدہ سی آگے بڑھ آئی۔ گلے لگ گئی۔ بہت بھینی سی خوشبو اس کی ساری خوشبوؤں پر حاوی ہو گئی۔ اس کے گداز مکھن جیسے سرخ رنگ میں رنگے ہاتھ پتلے لمبے تراشیدہ گلابی ناخنوں والے ہاتھوں کے اندر دبے تھے۔ گرم جوشی اور محبت کا مظاہرہ۔

اخروٹی آنکھوں میں اپنائیت محبت خلوص تھا

☆☆☆

''بالکل صحیح کہہ رہی ہیں اماں بی۔ تم کوئی سولہ برس کی کنواری دوشیزہ تو تھیں نہیں کہ تمہیں پتا نہیں چلا۔ مائی گاڈ پانچ مہینے۔ اف۔''

اس کا شوہر ٹہل ٹہل کر اپنی ٹینشن ختم کر رہا تھا اور اس کی بڑھا چکا تھا۔ اس کا کمزور دل کانپ رہا تھا۔ وہ بیڈ کی پائنتی پر پاؤں لٹکائے مجرموں کی طرح ہراساں بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں بہت دیر سے زمین پر گڑی تھیں اور شوہر کے دائیں بائیں چلتے قدموں کو تک رہی تھیں۔ رفتار کی تیزی۔ مسلسل بولتے جھکتے ہوئے رک جانا۔ پھر زمین پر پاؤں مار کر چلنا۔ دھم۔ پٹخنا۔

اگر اس کے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا جاتا کہ وہ کچھ سن نہ پاتی تب بھی وہ صرف پیروں کی حرکت سے شوہر کے غصے، ضبط، ناپسندیدگی کو جان لیتی اس کی آنکھیں برس پڑی تھیں۔

''اب رونا کس بات کا۔ بہورانی رونے کے دن تو ہمارے ہوئے نا۔'' اس کی ساس بھی کمرے میں صوفے پر پیر اوپر چڑھا کر بیٹھی تھیں۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں اماں بی! مجھے نہیں پتا تھا۔ اور۔۔۔اور جب اندازہ ہوا تو میں۔۔۔ میں ڈر گئی۔ میں ڈر گئی تھی اماں بی!'' اس کی آواز میں حجاب اور کپکپاہٹ تھی۔

''اونہہ۔ میں تو خیر مان ہی نہیں سکتی کہ اسے خبر نہ ہوئی ہوگی۔ پانچ سال کی بیاہتا ہے۔ عورت تو اپنے اندر کی ساری خبریں رکھتی ہے۔ ان کا دھیان نجانے کہاں کہاں رہتا ہے۔''

اس نے سر گردن کی ہڈی سے چپکا کر ہونٹ کچلے (سب لوگ۔ سب جانتے ہیں مگر حجاب کا پردہ۔ حد بندی) اسے اتنی ذاتی بات۔ شوہر سے اور وہ بھی ساس کی موجودگی میں ڈسکس ہونا عرق عرق کر رہا تھا۔

سرتاج شاید ٹہل ٹہل کر تھک گیا اس کے عین سامنے پڑے صوفے پر دھم سے بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ اسے گھور رہا تھا۔ اس نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر دیکھا اور سہم کر نگاہیں اپنی نم ہتھیلیوں پر جما دیں۔ اسے بخوبی محسوس ہو رہا تھا اس کے سامنے بیٹھا شوہر اور دائیں جانب بیٹھی ساس اسے گھور ہی

ہیں۔ بلکہ ساس کا گھورنا ڈبل تھا ان کا عکس ڈریسنگ ٹیبل سے جھلک رہا تھا۔ یعنی وہ تین اطراف سے نشانے کی زد میں تھی۔ مجرم تھی اور اس کے لیے کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔

ایک خاموشی۔ طوفان سے پہلے خاموشی۔ جنازہ اٹھ جانے کے بعد کا سناٹا۔ پرہول۔ تمام۔ انجام جیسا۔ نہیں نہیں۔

ہاں اس پر فرد جرم عائد کرنے والے کسی حد تک درست تھے۔ اسے تین ماہ تک واقعی پتا نہیں چلا کہ اس کے وجود میں ایک اور روح سانس لینے لگی ہے اور وہ تین ماہ۔ تب اس کا بیٹا، اس کا اکلوتا چار سالہ بیٹا۔ کتنا شدید بیمار ہو گیا تھا۔ جیسے اس کی جان کے لالے پڑ گئے اور اسے لگا کہ وہ بس۔ اللہ نہ کرے تب اسے کب ہوش تھا کسی بھی چیز کا۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، بات چیت کا۔ بچہ بیمار ہوا تو وہ ہر شے فراموش کر کے بس اس میں مگن ہو گئی۔ تب بھی مورد الزام ٹھہرائی گئی کہ اسے تو بس اس ناکارہ وجود ہی کی فکر ہے پروہ کیا کرتی۔ وہ ماں تھی اور ماں محبت کے معاملے میں بہت مجبور ہوتی ہے۔

کیا ہوا کہ وہ ایک معذور و مفلوج بچہ تھا۔

کیا ہوا کہ وہ پیدائش کے پل سے لے کر اب تک بستر نشیں تھا۔

کیا ہوا کہ وہ بے کار تھا۔ ہر حوالے سے ناکارہ۔

مگر وہ اس کے جگر کی آگ تھا۔ جس کی لو سے اس کی زندگی روشن تھی۔

اور دو ماہ پہلے جب اس پر انکشاف ہوا کہ ہاں کچھ ہے۔ تو وہ پوروں پر دن گنتی رہی کہ کب۔ کیسے۔ مانع حمل ادویات کھا کھا کر اسے لگتا اس کے اندر آپ کچھ بھی نہیں رہا۔ بار آواری۔ کونپل کا پھوٹنا اور نمو پانا۔ وہ سب کچھ کھو چکی ہے۔

اور پھر نو ماہ پیشتر دو ماہ کا حمل ضائع کروایا گیا۔ اس کا شوہر کمشنر تھا اس چھوٹے سے علاقے کا مائی باپ۔ اگر اس کی بیوی یہ غیر قانونی کام کروانے کسی بڑے اسپتال جاتی تو سب جگہ چرچا ہو جاتا۔ نہیں نہیں۔۔

سو ایک سو برس کی بڑھیا دائی نے یہ فریضہ بہت سارے پیسوں کے عوض خاموشی سے انجام دیا۔

اور موت تکلیف دہ ہے مگر ایک بار ظہور پذیر ہو گی تو پھر۔ بس آپ مر گئے ہیں۔ قصہ ختم۔ بے جان۔ سب احساسات سے عاری۔ لیکن آپ مرنے کی ساری تکلیف لذیت سہیں۔ کڑواہٹ کا ذائقہ چکھیں اور پھر بھی زندہ رہیں۔ اف۔ اس نے پھریری لی۔

ہاں وہ کہہ سکتی ہے کہ اس نے موت کے ذائقے کو چکھا۔ موت اس تاریک رات کی سیاہی اور ڈر سے کچھ ہی زیادہ ہو گی۔ یقیناً۔

اسے یقین تھا وہ جیسے ہی ذکر کرے گی وہ سب لوگ اس سو برس کی کالی جھریوں بھرے چہرے اور سخت ہڈیوں گانٹھوں والی انگلیوں کی مالکہ دائی کو بلا لائیں گے۔ اس نے تین ماہ بے خبری کے عالم میں مزے سے گزار دیے تھے اور دو ماہ کشمکش میں۔ مگر یہ چیز چھپائی نہیں جا سکتی تھی۔

اور اس کے خدشات مجسم ہو کر سامنے آ گئے۔ بھونچال ہی آ گیا نا۔

''میں نے کیا بے گار کیمپ کھول رکھا ہے۔ یا میں معذوروں فقیروں کا ٹھیکے دار ہوں اور لولے

لنگڑے سیلائی کرتا ہوں۔'' اس کے شوہر کے لہجے میں فرعونیت تھی۔ بڑے جاہ وجلال والا فرعون غرق آب ہو گیا مگر یہ چھوٹے موٹے گلی کوچے کے فرعون۔ نہ سامنے آتے ہیں نہ دعوا کرتے ہیں اور۔ نہ ہی غرق ہوتے ہیں۔

''استغفر اللہ۔'' اس نے توبہ کی۔ وہ اگلا جملہ سوچ چکی تھی کہ کیا ہوگا۔

''آپ بلوائیں۔ بچی دائی کو۔ فوراً۔'' وہ حتمی فیصلہ کر کے کھڑا ہو چکا تھا۔

''نہیں نہیں۔'' وہ سہم کر کھڑے ہوتے ہوئے لڑکھڑا کر گری۔

''میں نے بہت دعائیں کی ہیں۔'' وہ شوہر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

''یقین کریں اماں بی۔ نفلی روزے رکھے ہیں اور منتیں مانی ہیں ان شاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اماں! اسے نہ بلوائیں اماں!'' وہ ساس کے پیروں کے پاس بیٹھی پھر تڑپ کر دوبارہ شوہر کے قریب پہنچی۔

''فیصلہ وہی ہے مریم۔ جو میں چار سال پہلے کر چکا ہوں۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں۔ تمہیں چھوڑوں گا بھی نہیں۔ تم پالتی رہو اپنے سپوت کو۔ مگر تم سے کم از کم میں۔ اور۔۔۔ بچے (بچے کہتے ہوئے اس کا چہرہ بگڑا) نہیں رہنا تو آزاد ہو۔ اپنا بیٹا لے کر جا سکتی ہو۔ مجھے جب بچہ کی خواہش ہوگی تب میں نئے فیصلے بھی کر لوں گا۔ ابھی تو وہی ہوگا جو میں طے کر چکا ہوں۔''

اس کے شوہر نے اس کے شانے پر اپنے دونوں ہاتھ جما کر قطعیت سے کہا۔

مریم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بے رحم کو دیکھتی رہی۔ سنتی رہی اور سمجھنے کی کوشش۔

''ہاں وہ بار بار نئے سرے سے حیران کیوں ہوتی ہے۔''

کیا وہ جان نہیں پائی اپنے شوہر کو جو کہہ چکا تھا کہ بچے کے نام پر جو اس کو ملا۔ اس کے بعد تو اسے بچوں ہی۔۔ نعوذ باللہ اور جو اسے جبراً اندر تک سے نوچ لینے کے بعد پلٹ کر حال نہیں پوچھتا وہ بیڈ پر ڈھے گئی۔ اس کی ساس کا چہرہ بیٹے کا ترجمان ہی تھا۔

اس کا شوہر باہر نکل گیا اور ساس پیچھے پیچھے۔ اسے سنے بغیر۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ موت کے مترادف اس پل کو نہیں سہار سکتی۔ وہ اپنا بچہ نہیں کھو سکتی۔

اسے یقین ہے اللہ تعالیٰ اسے مایوس نہیں کرے گا۔ اس نے اللہ کی دی پچھلی نعمت پر بھی ناشکری اور کیوں کا لفظ نہیں کہا تھا وہ پوری تن دہی سے اس ذمہ داری کو نباہنے لگی تھی ۔ جو اللہ نے اسے دی۔ اللہ کو اطاعت اور شکر گزاری پسند ہے اور وہ اس کا بدل دیتا ہے اور اس نے بدل میں ایک صحت مند بچہ مانگا تھا۔

اور اس کا دل کہتا تھا کہ اللہ اسے ضرور دے گا۔

اس کا پانچ ماہ کا بچہ۔ چار ماہ اور گزرتے۔ تو تندرست وتوانا گل گوتھنا ان شاء اللہ اس کی گود میں ہوتا۔ دعا کی مستجابی اس کے دل پر وحی کی طرح اتر چکی تھی۔ تو پھر۔۔۔ یہ کریہہ صورت بڑھیا۔

''اے اللہ تو نے اسے اس لیے اتنی عمر دی کہ یہ۔۔۔'' وہ اپنی ساس کی ہمراہی میں اندر داخل ہوتی دائی کو دیکھ کر سسک اٹھی۔

وہ گویا خود کو موت کے لیے تیار کر چکی تھی اس نے سربسجود ہو کر صرف اپنے بیٹے کے لیے رب سے خیر مانگی تھی۔

وہ جسمانی اعتبار سے جھکڑ کی زد میں آئی بیل جیسی کمزور عورت تھی۔ مگر اس کا یقین۔ اس کا ایمان پہاڑوں کو شرمسار کرتا تھا۔ وہ سر اٹھا کے کوئے دار چلی تھی۔

''معاف کر دو بڑی بیگم صاحبہ۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب کچھ نہ ہو سکتا۔ پورا ہی کرنا ہو گا۔ ٹائم زیادہ ہو گیا۔ اس کی جان کی کوئی گارنٹی نہیں۔ بچہ گیا تو ماں کو ساتھ لے کر ہی جائے گا۔''

بچی دائی کی متاسف ٹھوڑی اور نفی میں قطعیت سے ہلتا سر۔

''ارے مائی کوشش تو کرو۔ تمہارا اتنا تجربہ۔'' ساس نے بڑھاوا دیا۔

''تجربہ ہے جب ہی تو بولوں ہوں کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ ابھی سال بھی نہ گزرا۔ یہی سب کیا۔ وہ آسان تھا۔ اب تو بچہ ہاتھ پیر مارنے لگا ہے۔''

''لیکن مائی۔'' ساس حواس باختہ ہو گئی۔ وہ دائی کو شانوں سے تھام کر ذرا دور لے گئی۔ اب وہ سر جوڑے تیز انداز میں کچھ بول رہی تھی۔ مگر دائی کا مسلسل نفی میں ہلتا سر۔

مریم بے دم تھی۔ اسے لگتا، وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہے۔ وہ کیا سن رہی ہے، کیا سمجھ رہی ہے۔

''ارے مالکن۔ پھر تم کسی بھی جگہ لے جاؤ۔ سو سال کی عمر ہے تو مانو تجربہ دو سو سال کا۔ اب تو وہ بات ہو گئی کہ ماں بچہ نے قسم کھا لی۔ جئیں گے تو اکٹھے۔ مریں گے اکٹھے۔ ہاں۔''

وہ کڑوے پن سے کہہ کر اپنا برقعہ سر پر جمانے لگی۔ اس کے بے یقین چہرے پر نگاہ پڑی تو مسکرائی۔ اس کے نزدیک آ گئی۔

''خوب کھا اور پی اور اللہ سائیں سے دعا مانگ۔ میں نے سارے داؤ آزمانے کا سوچ رکھا تھا۔ مگر وہ بھی پکے پیر جما کر بیٹھا ہے۔ ان شاء اللہ یہ دروازے جتنے قد کا لمبا ہو گا۔ کبڈی کے پہلوان جیسا۔ میں نے یہ بال کوئی دھوپ میں چٹے نہیں کیے۔ ہاں۔''

ساس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ ایک اور معذور۔ ہاں مریم پر شادی مرگ طاری ہو گئی۔ اس کا بچہ اس کے پاس تھا۔ اس نے اپنے پیٹ پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ ''ہاتھ پیر مارنے لگا ہے۔ پکے پیر جما کر بیٹھا ہے۔'' اس کے کانوں میں ان ہی دو جملوں کی گردان تھی۔

''ہاں اللہ اس بار اسے مکمل صحت مند بچہ دے گا۔''

اس نے باہر نکلتی بچی دائی کو دیکھا۔ اسے ہمیشہ اس کا چہرہ کہانیوں کی جادوگرنی جیسا لگتا تھا۔ جھاڑو پر سواری کرتی اڑتی ڈائن جیسا۔

مگر۔ چہرے کبھی برے نہیں ہوتے سیاہ یا بدشکل۔

اعمال ان کو روشن اور تاریک بناتے ہیں

☆☆☆

''میں وہی ہوں جس کے اچھا نکل آنے کی دعائیں کی جاتی ہیں۔''

وہ بڑے مزے سے کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا تھا۔ وہ خاک نہ سمجھی اور عدینہ نے تو پہلے ہی اسے آتے دیکھ کر برا سا منہ بنالیا تھا۔ وہ کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتے کھولتے رک گئی۔

''سوچیں۔ سوچیں۔ خوب سوچیں۔'' اس نے بڑھاوا دیا۔

''نہیں۔ میں نے ہار مانی۔'' اس نے اخبار تہہ کیا اور وہ پوری طرح اس بے حد شریر نظر آتے نوجوان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میں کچھ ہیلپ کروں۔'' عدینہ کا انداز جارحانہ تھا۔

''اے خبردار! تم بیچ میں مت بولنا۔'' وہ بھی اچھی طرح سے واقف تھا عدینہ کی فطرت سے۔ لہٰذا اچھل کر روکا۔

''نہیں واقعی، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کیا ہیں اور کس چیز کے اچھا نکلنے کی دعا کرتے ہیں۔''

''ارے یار!'' س نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

''خربوزہ۔ ہم خربوزے کے اچھا نکلنے کی دعا کرتے ہیں کہ اللہ میٹھا نکل آئے۔'' عدینہ نے تیزی دکھائی۔

''تم کم عقل ہو عدینہ!'' وہ چلایا۔ ''میں بخت ہوں بخت شاہ۔''

''اور قطعاً۔ اچھے نہیں نکلے۔ نام کا بھی اثر نہیں آیا۔'' عدینہ نے چڑایا۔

بخت نے باقاعدہ منہ موڑلیا اب بولتی رہے۔

'' اور آپ اپنا تعارف کروائیے۔ غائبانہ تو سب کچھ ہی سن رکھا ہے۔ مگر آپ بولیے۔'' وہ اس کی جانب مڑا۔

''میں بشائر ہوں بشائر سجاد۔ رابعہ دادی جان۔ میرے ابو کی خالہ ہیں اور وہ۔۔۔''

''بس۔'' بخت نے ہاتھ اٹھایا آگے کا قصہ دادی جان کی زبانی ہمیں از بر ہے۔ ''ویسے آپ کا نام بہت خوبصورت ہے کیا مطلب ہے اس کا۔'' بخت دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

''خوش خبری۔'' بشارت سے نکلا ہے۔ بشریٰ، بشیر، بشائر۔ وہ اپنے نام کے معنی بچپن سے بتانے کی عادی تھی۔

''بہت خوب بہت اعلا۔'' بخت نے سر ہلایا۔ ''آپ خوش خبری ہی کی طرح لگتی ہیں مگر اگر آپ کو ایک لفظ میں ڈیفائن کرنا ہو۔ یا چلیے دو الفاظ۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''نزاکت اور وقار۔ ڈیسنٹ چال ڈھال۔ قد، آواز لباس اور مسکراہٹ۔ ہر شے۔ وقار اور نزاکت سے بھرپور۔''

''زیادہ فلرٹ کرنے کی ضرورت نہیں لوفر! یہ تم سے بڑی ہیں۔ پورے ستائیس برس کی ہیں۔ سمجھے۔'' عدینہ نے بھنا کر کہا وہ نجانے کس بات سے چڑ رہی تھی۔

''تم نے حسب عادت سب سے پہلے عمر پوچھی ہوگی۔'' وہ بھی پھاڑ کھانے والے انداز میں جھپٹا ''سطحی عورت۔''

''اے بخت۔ بد بخت! خبردار! جو مجھے عورت کہا تو۔۔۔'' عدینہ نے اخبار اٹھا کر اس کے سر پر

برسایا۔

"ارے بچاؤ۔" وہ اچھل کر دور ہوا۔ "تو کیا بھائی نذیر کہوں یا یاءنذیرہاں۔۔۔"

بخت نے فوری انتقام لیا۔ عدینہ کو کوئی چیز مارنے کو نہ نظر آئی تو کرسی سے اٹھ گئی اور اسے ہاتھ میں سر تک اٹھالیا۔

"اوہ پلیز۔" بشائر ہراساں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شرم کرو عدینہ۔ نگینہ!" وہ اسے باقاعدہ منہ چڑاتا بھاگ نکلا۔ عدینہ نے پٹاخ کی آواز سے کرسی زمین پر رکھی۔

"یہ بہت کمینہ ہے۔ آپ کو نہیں پتا۔"

"اے عدینہ۔ کمینہ بھی تو عدینہ کے ہم قافیہ ہے نا۔" وہ گیٹ سے منہ اندر کر کے آگ لگا گیا۔

"دادی جان۔ دادی جان!" وہ دھڑ دھڑ کرتی اندر بھاگی۔

بشائر عجب ناسمجھی کے عالم میں کھڑی رہ گئی پھر اس نے کرسیاں درست کیں اور اندر کی جانب بڑھی اسے خیال سا آیا۔ کل دادی جان اسی بخت کا ذکر کر رہی تھیں شاید پڑوسی کا لڑکا۔ اچھا لگا اسے۔ ہلکی داڑھی۔ بدرنگی جینز پر چیک کی قمیص انداز بے فکرا سا تھا مگر آنکھوں میں ذہانت اور گہرائی تھی۔ عدینہ کا ہی ہم عمر تھا۔

اسے یاد آیا۔

خالہ دادی کا کمرے میں سامان سیٹ کرنے کا حکم سن کر وہ دیے گئے کمرے میں چلی گئی تو پیچھے عدینہ بھی آ گئی تھی۔ اسے خالہ دادی نے اس کے مددگار کے طور پر بھیجا تھا۔ مگر وہ نروٹھے پن سے کرسی پر ٹک گئی اور کھلتے بند ہوتے بیگ اور دیگر اشیاء کو دیکھتی رہی۔

وہ اپنے کپڑے، جوتے کتابیں، ڈائریاں دیگر سامان رکھتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھتی رہی جو سراسر ناقدانہ جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی کسی شے کو اٹھا کر دیکھ لیتی۔ پسندیدگی ناپسندیدگی کا تاثر آنے نہیں دیتی تھی بس اٹھایا دیکھا اور رکھا۔

"کیا آپ کی سوتیلی امی آپ پر ظلم وستم کرتی تھیں۔" اس نے اچانک بہت ہی عجیب وغریب سوال کر دیا۔

وہ بری طرح چونکی۔ "نہیں۔ نہیں بالکل نہیں۔ تمہیں ایسا خیال کیوں آیا۔" وہ پوری طرح متوجہ ہوگئی۔

"نہیں وہ دادی جان ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ یعنی آپ کی سوتیلی امی نے بظاہر اچھا بن کر اندر ہی اندر بھاگنے کا پلان طے کر رکھا تھا۔ میٹھی چھری سی۔"

بشائر کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"ایسا نہیں ہے، دراصل ان کی ساری فیملی آئی مین، بہن بھائی اور والدین سب وہاں شفٹ ہوگئے سو وہ بھی بچوں کے مستقبل کے لیے یقیناً۔۔۔!"

"میں نہیں کہہ رہی۔ دادی جان ہی ہر وقت کہتی ہیں۔ ہمیں لگا آپ۔۔۔ آپ بہت بے چاری

سی ہوں گی۔ اجڑی بچڑی سی۔ مگر آپ تو۔۔۔'' وہ کپڑوں کے ڈھیر اور دیگر اعلا چیزوں کو ایک نظر دیکھ کر جیسے کچھ جتا کر خاموش ہوگئی۔ بشائر ہولے سے مسکرا کر دوبارہ سامان اکٹھا کرنے لگی۔

''ویسے آپ کتنے سال کی ہیں۔'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد عدینہ کی آواز گونجی۔

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مڑی ستائیس واں برس لگا ہے ابھی لاسٹ منتھ۔

عدینہ کے لبوں پر مسکراہٹ کا کوندا لپکا۔

''میں اکیس کی ہوں۔ اس نے نجانے کیا جتانے کے انداز میں کمر سیدھی کی تھی۔'' (کچھ بچپن کچھ سطحیت)

بشائر باوقار انداز میں مسکرائی۔ ''اچھا! مجھے لگا تم اٹھارہ برس تک ہوگی۔''

''واقعی!'' عدینہ کے چہرے پر خوشی ابھری۔

''ہاں بالکل سچ، اگر تم نہ بتائیں تو۔'' عدینہ کا چہرہ بجھا (ہائے چپ ہی رہتی۔ مگر خیر میں نہ بتاتی تو دادی جان سن، دن تاریخ ٹائم تک بتانے سے نہیں چوکتی تھیں) بشائر نے دل میں آئے خیال کو زبان تک آنے سے روکا کہ اگر وہ اتنا تیار نہ ہو اور صرف منہ دھو کر رکھے تو شاید سولہ برس کی دکھائی دینے لگے۔ مگر وہ کام میں لگ گئی۔

وہ اس کے مزاج کا اندازہ نہیں کر پائی تھی۔ کچھ عجیب سے تاثر کے ساتھ۔ روٹھی نک چڑھی، خود پسند سی دکھائی دیتی لڑکی۔

''بخت اور میں ایک ہی روز پیدا ہوئے۔ وہ صبح میں شام کو۔ نکما ہے۔ بس پڑھتا ہی رہتا ہے۔ کام وام کچھ نہیں۔ وہ دادا جان کے دوست کا چھوٹا بیٹا ہے۔ پتا ہے اس کے ابا دادا کے ہم عمر ہیں۔ دادا جان دادا بن رہے تھے اور وہ اسی دن ابا۔ ہاہاہا۔'' وہ اپنی بات کے اختتام پر ہنسی۔

بشائر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا بس وہ مسکرادی۔

''اچھا تو یہ وہی بخت تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ بڑا معصوم سا، شریر مگر اپنائیت دیتا ہوا۔ ہوں۔''

☆☆☆

''میرے ابا اس شہر کے چنیدہ لوگوں میں سے ہیں حیرت ہے آپ انہیں نہیں جانتیں۔'' بخت بولا ''اور آپ نے انہیں ابھی تک دیکھا نہیں، افسوس۔''

''آئی ایم سوری۔ میں اتنا باہر نہیں نکلی ابھی۔'' بشائر شرمندہ ہوگئی۔ وہ آج بخت کی امی شمسہ بیگم کی چائے کی دعوت پر جا رہی تھی۔ بخت لینے آیا تھا۔ عدینہ بھی ہمراہ تھی مگر وہ ان سے چند قدم پیچھے تھی۔ دونوں کے گھر گلی کے آخری گھر تھے۔ ایک گلی کا پہلا گھر دوسرا اسی لائن کا آخری گھر۔ عدینہ گھروں کے باہر لگے پودوں سے پھول پتے چنتے نروٹھے پن سے چلتی تھی۔

میٹرک تک دونوں ایک ہی اسکول میں تھے اور جیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔

''کیوں میں نے آپ کو اس دن بک ورلڈ میں دیکھا تھا نا۔''

''ہاں تو میں میگزین لینے گئی تھی نا!'' بشائر بولی۔

''تو بک ورلڈ میرے ابا ہی کی تو ہے۔'' بخت نے زور دے کر کہا۔

''بک ورلڈ تمہارے ابو کی ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگی وہ جگہ۔'' بشائر متاثر نظر آئی۔
''ہے نا۔ دراصل میرے ابا۔۔۔!'' بخت شروع ہوا چاہتا تھا۔ ''میرے ابا کو دور ہی سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا نا وہ اس شہر کے۔۔۔''
''ہاں جی۔ وہ۔ وہ واحد آدمی ہیں جو ابھی تک شیروانی کے ساتھ جناح کیپ پہنتے ہیں۔ اب تو میوزیم میں بھی یہ ڈریس نہیں ملتا۔''
بخت کا جملہ حلق میں دبارہ گیا۔ پیچھے سے عدینہ نے کمانڈ سنبھال لی۔
''اے عدینہ کی بچی! میرے ابا کے بارے میں کچھ اگر تم بولیں تو۔'' بخت نے مکا تان کر دکھایا بشائر گھبرا کر پیچھے ہوئی۔
''لو بلا وجہ، میں نے تمہارے ابا کو کب کچھ کہا۔ جو کہا شیروانی کو کہا۔ کیوں بشائر۔''
عدینہ کب رعب میں آتی تھی۔
''ارے ارے ایک منٹ۔ تم بولو بخت! میں سن رہی ہوں اور تم چپ رہو عدینہ۔'' اس نے دونوں کو دیکھا۔
''ہاں تو میرے ابا۔ ایک عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ سے ملنے والے سارے پیسوں سے کتابوں کی دکان کھول لی حالانکہ لوگوں نے کہا بے وقوفی کر رہے ہیں۔ پیسے کہیں انویسٹ کر دیں مگر وہ نہیں مانے۔ کون کون سی کتابیں ہیں جو انہوں نے نہ رکھی ہوں۔ نئی پرانی، نایاب سے نایاب۔ ہر سنڈے فٹ پاتھوں سے کتابیں چھانتے ہیں۔ دراصل میرے ابا۔۔۔''
''سارے پیسے اس لیے لگا دیے کہ بڑا بیٹا امریکہ سے ڈالر بھیجتا ہے پھر ایسے آلتو فالتو کے کاموں میں تو دل لگنا ہی ہے نا۔'' عدینہ نے گویا پیچھے سے بخت کی پسلی میں چھرا گھونپا۔
''عدینہ کی بچی پیسے کی میت۔ آج عظیم انکل کو سب بتا کر تمہاری شامت نہ بلوائی تو کہنا بلکہ رابعہ آنٹی سے تمہارا حشر کرواؤں گا۔'' بخت کا غصہ سے برا حال ہو گیا۔
''پلیز بخت۔!'' بشائر گھبرا گئی۔
''صرف آپی کی وجہ سے تمہیں معاف کر رہا ہوں۔''
بخت نے لحاظ رکھا۔
عدینہ ''ہونہہ!'' کہہ کر خاموش ہو گئی۔ لیکن دراصل اسے اندر ہی اندر احساس ہوا بخت کو چڑانے کے چکر میں غلط جملہ بول دیا ہے۔ شمسہ آنٹی اپنے میاں کے مشغلے کو اگر نا پسند کرتی تھیں یا کہتی تھیں کہ گھر امریکہ والے بیٹے کے پیسے پر چلتا ہے ان کی بک ورلڈ کچھ خاص آمدنی نہیں دیتی تھی۔ تو بہر حال یہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ اور نوک جھونک تھی۔ عدینہ کے کانوں پڑی۔ اسے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لہٰذا وہ ہونٹ سکوڑے خود میں مگن چلی جا رہی تھی۔
بخت بشائر کو اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ اپنے ماضی کا شاندار اکیڈمک ریکارڈ، مستقبل کے خواب۔ ڈگری سے زیادہ اہم علم ہے اسے علم حاصل کرنا ہے بس وہ دولت کی اہمیت سے تو واقف ہے مگر اس کے ناگزیر ہونے پر اسے اعتراض تھا۔ عدینہ اس کے خوابوں سے، خیالوں سے بخوبی واقف تھی۔

بخت کی ساری خواہشیں اور خواب اس کے برے منہ کی ''اونہہ!'' تھے۔
وہ خود پسند تھی۔نخریلی، مزاج دار، اپنی ذات سے پیار کرنے والی، میں کا کلمہ پڑھتی ہر سو، میں دیکھنے والی۔اپنی خوشی حاصل کرنے والی ہر اچھی شے پر، اپنا حق جتانے والی۔ بلکہ حق کیا جتانا۔فیصلہ۔ یہ چیز اچھی ہے ہاں تو بس اس کی ہے اور۔
''میں جانتا ہوں میری عمر کے لڑکے بہت بڑے خواب دیکھتے ہیں۔میں بھی دیکھتا ہوں مگر خواب ہمیشہ انفرادی فائدے کی تعبیر نہیں بننے چاہیں۔خواب تو اقبال نے بھی دیکھا تھا۔اپنے دل کو اتنی وسعت دینے کی ضرورت ہے کہ اس میں سارے عالم کی بہتری کا گمان جگہ بنالے۔جاگتے میں سوچی گئی اچھی باتیں اور ارادے خوش کن خواب بن کر رات کو پلکوں میں ستاروں کی طرح ٹک جاتے ہیں۔ہم اجتماعیت سے دور ہٹ گئے ہیں۔ مجھے اپنی زندگی بہتر کرنی ہے۔اتنی بہتر کہ پھر ہر سو بہتری پیدا ہو۔ مجھے اپنے خوابوں سے عشق ہے اور اس کے علاوہ۔۔۔''
بہت خوشی سے بولتا بخت شاید بھول گیا، وہ کہاں ہے۔کیا کہہ رہا ہے۔کس سے کہہ رہا ہے۔ بولتے بولتے جیسے کہیں دور چلا گیا تھا۔نجانے کیا کہتے کہتے رکا۔پھر دھیرے سے ہنس دیا۔
''تم کتنی اعلا سوچ رکھتے ہو بخت۔میرے پاس تو جیسے الفاظ ختم ہو گئے۔''
بشائر ساکت رہ گئی۔وہ حرف حرف کو امرت کی طرح حلق سے اتار رہی تھی جیسے۔
''میں نے بہت عرصے بعد بلکہ شاید پہلی بار روبرو ایسے گہرے لفظ سنے ہیں۔اور اپنے خوابوں کے علاوہ کس سے عشق ہے۔ جملہ مکمل کرو۔تم نے کہاں سے سیکھیں ایسی باتیں بخت!'' وہ شاید بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیتی۔
''ہاں اور تو کوئی آتا جاتا ہے نہیں۔خود ہی اپنی ''بک ورلڈ'' میں بیٹھا کتابیں گھول گھول کر پیتا رہتا ہے۔'' عدینہ سے بخت کی اتنی تعریف اور بشائر کا سحر زدہ رہنا زیادہ دیر برداشت نہ ہوا۔
(تم تو جلتی رہنا) بخت نے بے پروائی سے چہرے پر تاثرات سجائے۔
''میں جانتا ہوں۔میری عمر کے لڑکے بڑے بڑے عہدوں، گھروں گاڑیوں کے خواب دیکھتے ہیں اسٹیبلش ہو جانے کی لگن میں کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ آج میرے پاس ایک سائیکل ہے مگر کل۔۔۔''
''کل اس پر غبارے اور پیپنیاں ہوں گی۔اور میں گلی گلی آواز لگاؤں گا بچوں کے کھڈونے لے جاؤ۔پھونک کے پگانے، ٹک ٹک کا بندر۔۔'' بخت کا جملہ کاٹ کر عدینہ نے جل کر پیشن گوئی کی۔ بشائر حق دق رہ گئی اس نے گھبرا کر بخت کو دیکھا جو پہلے حیران ہوا اور پھر زوردار آواز سے ہنس دیا۔
بشائر کو اس کی بے ساختگی پر ہنسی آ گئی تو عدینہ بھی ہنس پڑی۔
''' ایسے لڑکے اب پوری دنیا میں دو چار ہی ہوں گے باقیوں کو گدو بندر بھیجا جا چکا ہے اس کے بارے میں اگلوں کو ابھی پتا نہیں ہے۔''
عدینہ نے ہنسی روک کر اسے صاف پاگل کہا۔بشائر کی رکتی ہنسی پھر شروع ہوئی۔ بخت نے غصے کے بجائے بہت دلچسپی سے عدینہ کے ہنستے چہرے کو دیکھا۔

☆☆☆

بشائر کے آنے سے پہلے عدینہ کے بہت سے اعتراضات تھے جنہیں اس نے اونچی آواز سے بھی اور بڑبڑ کرتے ہوئے بھی رابعہ خاتون کے کانوں انڈیلا تھا۔

''اب ایک آدھ دن کی مہمان داری تو بندہ کر لے یہ تو نجانے کب تک رہے گی۔''

''تو تم کیا نوالے بنا کر ڈالو گی۔ اللہ نہ کرے چلتے ہاتھ پیر کی لڑکی۔ او بی بی کچھ ایسا ہوتا بھی خدا ناخواستہ تو تمہارے چلن سے کون واقف نہیں۔ تمہیں کوئی نہ کہتا۔'' رابعہ خاتون نے جل کر آئینہ دکھایا۔ ''مہمان تو اللہ کی رحمت۔ پتا نہیں کیسے بس اکیلے اکیلے جی کر لطف اٹھاتی ہو بیٹی۔ نہا دھولیا، کپڑے بدل بس شیشہ میں منہ دیکھ لیا۔ کبھی گھوم گھوم کر اپنا سراپا ہی دیکھ کر خوش ہو لیں۔ کبھی جل کر بلاوجہ منہ دھونے، کپڑے بدلنے چلی گئیں۔ اپنے ہی فیصلے، ارے لوگوں میں گھلو ملو۔ دیکھو کوئی اچھا ہے تو کیوں۔ برا معلوم ہوتا ہے تو وجہ کھوجو، اپنی شخصیت کا تجزیہ کرو، سیکھو۔ یہ کیا بس میں ہی میں۔''

رابعہ خاتون کو اپنی پوتی عدینہ سے بہت سی شکایتیں تھیں اس کی تربیت میں انہوں نے اپنے سارے ہنر لگائے تھے۔ مگر وہ اپنی ہی فطرت کی تھی۔

اپنی پرستش کرتی۔ خود پر نثار ہوتی تھی یا پھر۔

رابعہ خاتون کی گہری نگاہ جانتی تھی۔ وہ سب دیکھتی تھیں اور سمجھتی تھیں وہ اس کے اخلاق و کردار کو فطری، لچک دار اور وسعت سے بھرپور دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اس کے مصنوعی پن اور خود ساختہ اطوار سے ناگواری محسوس کرتی تھیں۔ وہ خود کو نمک کا بنا پیش کرتی تھی۔ پانی کے چھینٹے سے گھل جانے والی سوا سے سینت سینت کر رکھا جائے۔ وہ سوچتیں وہ تو سنبھال کر رکھ رہی ہیں۔ بخوشی بہ رضا مگر زندگی ہر انسان پر جب تک اپنے سارے پہلو آشکار نہ کر دے۔ اختتام پذیر نہیں ہوتی۔

رابعہ خاتون عدینہ کے حوالے سے ڈرا کرتی تھیں۔ اسے گرم ہوا بھی نہ لگے۔ وہ سب پالے۔ وہ مسکرائے، گنگنائے، اپنے دل کی نرمی کو نصیحت، پیام، پیش بندی بنا کر اسے سدھارنے کے جتن کرتیں۔ وہ اپنی زندگی کے حوالے سے شکر گزار تھیں۔ غم اور خوشی دونوں زندگی کے لازمی جزو ہیں مگر وہ اپنے بوڑھے لاچار دل کو مزید کسی صدمے کا متحمل نہیں پاتی تھیں۔ عدینہ کے والدین کی حادثاتی موت۔ بیٹا، بہو اور پوتا پل بھر میں دم توڑ گئے، زخمی پوتی کو دعاؤں کے بل پر وہ جیسے موت کے شکنجے سے کھینچ لائیں۔

پوتی کی زندگی کی خواہش نے جانے والوں کا ماتم منانے کی بھی اجازت نہ دی۔ وہ اس میں مگن ہو گئیں۔

اور پھر اکلوتی بیٹی مریم کی زندگی کا دکھ۔ ہاہ! وہ جیسے ہر پل گھلی تھیں۔

بیٹی کی مسرت و شادمانی، کاملیت کی دعا۔ ایک روز بخشش کی دعا میں بدل گئی۔ وہ اجڑی، بکھری روئی پیٹی اور واپس پلٹ گئی۔ جہاں پلٹنے کا وعدہ ہر ذی روح نے کر رکھا ہے۔ مگر جاتے جاتے ایک بار تو گردن گھما کر پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہاتھ ہلایا جا سکتا ہے ایسے ایک دم تو کوئی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

بس اس کی خبر آ گئی۔ کہ وہ اب نہیں ہے۔ مجھے ہمیشہ لگتا تھا۔ وہ اتنا جبر سہہ نہیں پائے گی مر جائے

گی۔ یہ خدشہ مجھے ڈراتا تھا۔ اور جب خدشہ حقیقت کا روپ دھار گیا تو۔ پوچھومت۔ ہم کس طرح پہنچے کہیں اندرون سندھ میں پوسٹنگ تھی داماد صاحب کی۔ پہلے ٹرین پھر کار پھر گھوڑا گاڑی۔ وہاں ان کا سارا خاندان جمع تھا۔ بس ہمارا ہی انتظار تھا۔ سفید کفن میں وہ سفید دکھائی دیتی تھی۔ نیل لگائے کپڑے جیسی ساکت۔ میں تو اسے رو بھی نہ سکی نہ میں نے اسے چھوا۔ وہ تو ٹھنڈی مٹی کا ڈھیر تھی۔ میری بیٹی تو نہیں تھی۔ گلابی عارض، لمبی پلکیں، پنکھڑی جیسے لب۔ میں نے تو گلاب کا پھول داماد صاحب کے کوٹ میں لگایا تھا۔ وہ مجھے کیا لوٹا رہے تھے۔ کیا دکھا رہے تھے جیسے میں کچھ جانتی نہیں تھی، مجھے سب خبر تھی۔

مگر وہ ایسے اچانک میدان چھوڑ دے گی۔ اس کا میں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔"

بشائر بہترین سامع تھی وہ رابعہ خاتون کو سنتے وقت چہرے کے تاثرات سے انہیں بڑھاوا دیتی تھی۔ مزید بولنے پر اکساتی تھی۔

رابعہ خاتون ہر وقت دکھ رونے پر آمادہ نہیں رہتی تھیں۔

مگر ان کے دل کے اندر گھاؤ تھے۔ آج بشائر کے ہاتھ مرہم دیکھا تو سسک اٹھیں۔

"وہاں شور تھا، آوازیں، شکایتیں، صفائیاں۔ سب خود کو مظلوم اور مر جانے والی ہی کو قصوروار کہتے تھے۔ دیکھو تو قصوروار مر گیا۔ اور باقی سب زندہ۔" رابعہ خاتون نے جھریوں بھرے گال پر دوپٹے کا پلو رگڑا۔

"اس کے کپڑے۔ اس کے زیور جو میں نے اسے دیے تھے۔ سب وہ میرے حوالے کر رہے تھے۔ وہ مجھے بس بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے بیٹی دیکھ لی تھی۔ میرے سامنے دفنا دی گئی تھی۔ اب مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں اس کے کمرے سے جو مرضی اٹھا لیتی۔"

وہ روتی جا رہی تھیں۔ بشائر منہ سے کچھ نہ بولی بس صوفے سے کھسک کر ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے گھٹنے پر دونوں ہاتھ رکھ دیے وہ چہرہ اٹھائے ان کے بھیگے چہرے کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کے گال پونچھے۔

"زیور کیا ان دیواروں پر سجا دیتی۔ اس دیوار پر جھومر، اس پر ٹیکا، اس ستون سے گلوبند باندھ دیتی۔ بولو۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگیں۔ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"آج سونا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ مگر خرید سکتے ہیں اپنے پیسوں سے چوری سے ڈاکے سے کسی سے چھین کر ہم زیور بنا سکتے ہیں۔ بیٹی بنا سکتے ہیں؟ خریدی جا سکتی ہے کیا؟ بندوق کی نال رکھ کے، جی ہمیں بیٹی چاہیے۔"

وہ رونا روک کر معصومیت سے پوچھنے لگیں۔

بشائر کی آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔ عدینہ بھی کسک کے ساتھ والے صوفے پر آ گئی۔ وہ بہت دیر سے رابعہ خاتون کو دل ہلکا کرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ از بر قصے میں کیا دلچسپی دکھاتی مگر دادی کی بے کلی اور مسلسل رونا، اس نے آگے بڑھ کر کران کا بھیگا گال چوم لیا۔

"نہ روئیں دادی۔ ورنہ میں بھی رو دوں گی۔" اس نے کارگر جملہ کہا۔

"اسی لیے میں کبھی انہیں کندھا دیتی نہیں پھر یہ اپنی حالت خراب کر لیتی ہیں۔" عدینہ نے بشائر کو

تادیب کی ڈھکے چھپے لہجے میں سمجھایا۔
''نہیں روتی۔'' انہوں نے عدینہ کا گال سہلایا۔ پھر وہ بشائر کی جانب دیکھنے لگیں۔ '' کہنے سننے والی اگر ایک ہی بات کہوں تو۔۔۔'' وہ پل بھر کو رکیں۔
''ماؤں سے کہوں۔ بیٹیوں کو بس کوکھ ہی میں رکھو وہیں پالو۔ وہ بس وہیں محفوظ ہوتی ہیں۔ پیٹ سے نکل گئیں تو بس۔ پٹتی رہتی ہیں۔ ہاتھوں سے۔ جملوں سے اور تقدیر کے فیصلوں سے۔ بیٹیاں تو بس کوکھ ہی میں محفوظ۔''
ان کا رونا بند ہو گیا۔ مگر بشائر یکدم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ہر شخص کا ایک دکھ۔
''میں نے اس کے کمرے کی کسی چیز پر نگاہ نہ ڈالی بس مانگا تو اس کی جیتی نشانی۔ اس کے بیٹے کو۔ اور وہی انہوں نے منع کر دیا۔ وہ کیوں دیتے۔ ملنے بھی نہ دیا۔''

☆☆☆

''تو بیٹی! کیا ہی اچھا ہوتا کہ تمہارے ابو تمہاری شادی ہی کر کے چلے جاتے۔'' شمسہ بیگم نے بہت دنوں سے روکے جملے کو کہہ ہی ڈالا۔ بشائر شانے اچکا کر رہ گئی۔ اب وہ کیا کہتی۔
''کوئی رشتہ وشتہ دیکھتی تھیں تمہاری راحیلہ امی۔''
بشائر نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ بدگمانی نہیں پالیتی تھی مگر اب سوچا تو ان گزرے ڈیڑھ دو سال میں امی کی جانب سے رشتوں کی قطاریں لگ گئی تھیں۔ کئی لوگوں سے ملوایا اور کئی لڑکے بھی اس نے دیکھے اور اسے بھی دکھایا گیا۔
یہ ایک عجیب و غریب معاملہ تھا۔
ابو ذات برادری اور زبان کے حوالے سے قطعی تھے۔ نو کمپرومائز۔
امی رکھ رکھاؤ، انداز، معاشی حالت کا ذکر کرتی تھیں۔ سماجی مقام میچ ہونا اس کی اپنی خواہش۔ اس نے پہلے کبھی گہرائی سے سوچا نہیں۔ مگر بعد میں ایک روز اس روز روز کے دیکھنے دکھانے سے اکتا کر اس نے سوچا کہ وہ خود کیا چاہتی ہے۔ ہاں اس کی اپنی خواہش۔
اس نے کبھی غور نہیں کیا۔
پھر اس نے سوچا۔ بعض لوگ ابو کو ناپسند ہو جاتے ہیں۔ صاف انکار۔ بعض امی کے معیار سے نیچے بالکل الٹ۔ معاملہ ختم۔
کبھی شاذ و نادر وہ دونوں باہم ہو جاتے تو وہ منع کر دیتی۔ کیوں آخر کیوں۔
ہاں مینٹل لیول، اعلا تعلیم، اخلاق و کردار اس کے باوجود اسے کوئی بھی شخص درخور اعتنا نہ لگتا۔
اس نے بہت دن تک اس الجھن میں رہنے کے بعد اپنا تجزیہ کیا۔
ہاں وہ خطرناک حد تک حسن پرست واقع ہوئی تھی۔ منہ کھلنے سے پہلے ہی شخصیت کا تاثر مکمل ہونا چاہیے۔
اس نے اپنے من کے اندر بسی شبیہہ کو پزل بکس کے ٹکڑوں کی طرح ڈھیرے ڈھیرے ترتیب وار لگایا۔ اور نتیجہ۔ ہاں حقیقت میں اسے دور دور تک کوئی شخص بھی خیالی صورت کے قریب نہ لگا۔

تو پھر کیا ضروری ہے کہ سمجھوتا کیا جائے ۔قصداً اور جبراً خود کو بتلایا جائے کہ بس یہ ٹھیک ہے۔

وہ اپنی شخصیت میں مکمل تھی۔ خاندان، ذات، تعلیم اور شکل وصورت وہ پرفیکٹ تھی تو پھر وہ کیوں پاسنگ مارکس دے کر بمشکل کامیاب بندے کو ایوارڈ تھما دے۔ اندھوں میں کانا راجہ، ڈھونڈنے کی کیا تک ہے اچھا ملے گا تو ٹھیک ہے اور اگر نہ ملا۔ تو بھی ٹھیک ہے۔

اس کے دل کے اندر کا یہ حساب کتاب اور نتیجہ دنیا کی نظروں سے مخفی تھا۔ وہ خود سے ہم کلام ہوتی تو پرفیکشنسٹ پر مائل رہتی۔ اور اگر کبھی حقیقت کے چشمے کو پل بھر کے بھی لیے آنکھ پر لگاتی تو اخلاق و کردار اور ذہنی اپروچ کو شاید اضافی نمبر مل جاتے۔ مگر بہر حال یہ سب وقت پڑنے پر کیے جانے والے فیصلے تھے۔ اور اب سال چھ ماہ کے لیے وہ جیسے ہر شے سے آزاد تھی۔ ٹی وی پر نیوز دیکھنا۔ ٹاک شوز کے گھنٹوں میں اردگرد سے بے گانہ ہونا ورنہ اخبار و رسائل اور کتب بینی۔ واؤ زندگی کتنی حسین ہے۔

مگر اسے یہاں آ کر اچھا لگا تھا۔ بہت اچھا۔ رابعہ خاتون کی محبت لگاوٹ، فکرمندی، خیال۔ عظیم خان کا بے حد پرشفقت، دوستانہ محبت سے بھرپور شریر انداز۔

شمسہ بیگم بھی گویا اسی گھر کا حصہ تھیں۔ وہ روز صبح نو بجے آتیں اور ساڑھے بارہ تک اپنی اور رابعہ بیگم کی سبزیاں بنوا کر دنیا جہان کے قصے کر کے لوٹتیں۔

شام میں دل گھبرانے کا خیال کر کے رابعہ خاتون چلی جاتیں۔

دوپہر اور رات میں بخت کے چکر لگتے ۔اسے بخت اچھا لگا تھا۔ آج کے نوجوانوں سے بہت مختلف۔ الگ سا۔ خوابوں میں رہنے والا مگر تعمیری خواب۔ اجتماعیت کے خواب، فکرمندی، گردوپیش کی بہتری کے خیالات۔ شمسہ بیگم کو اپنی اس بڑھاپے کی اولاد سے بہت پیار تھا۔ وہ اپنے ابا کا پوتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تین اور بچے آج کے زمانے کے حساب سے ترقی کے دوڑ میں تن من کے ساتھ دھن کی فکر میں مگن تھے۔ بڑا صاحبزادہ اور بڑی بیٹی امریکہ میں تھے۔ چھوٹی دو بیٹیاں ایک ہی گھر میں بیاہی تھیں اور کوئٹہ میں رہتی تھیں۔ سال کے سال آتیں۔

عظیم خان نے بخت اور اس کے ابا کا تجزیہ کیا۔

”دراصل سکندر (بڑا بیٹا) جب کاظم شاہ اسے پال رہے تھے تو خود بھی معاش کی تگ ودو میں لگے تھے۔ دن رات پیسے کمانے کی فکر کرتے اور انگلیوں پر پچیس گنتے سو بچہ بڑا ہو کر بنیا نکلا۔ سردھڑ کی بازی لگا کر ڈالر کماتا ہے اور بھیجتا ہے۔ اس کی اپنی چار بیٹیاں ہیں سو بخت کو بیٹا سمجھتا ہے جو چاہے سو کرے۔ چھوٹے بخت کی تربیت کے زمانے میں ابا موصوف ریٹائر ہو چکے تھے۔ زندگی اور پیسے سے دلچسپی کم ہو گئی۔ مسجد اور کتابوں میں گھس گئے۔

بچے نے یہی سب دیکھا، سیکھا اور سمجھا سو یہ بچہ ایسا نکلا۔“

عظیم خان ایک دوست کی حیثیت سے ایسے تبصرے کر سکتے تھے مگر عدینہ جی بھر کے بخت کا مذاق بناتی۔ اسے بڈھی روح اٹھارہ سو بارہ کا نوجوان کہتی۔ کبھی کہتی ”یہی سوچ رہی تو وہ مزاروں پر جھاڑو پھیرا کرے گا“ اسے چڑاتی۔

مگر۔۔۔

اس تمام کارروائی سے پرے بشائر نے دیکھا اور محسوس کیا۔ بخت اسے چڑاتا تھا۔ جان بوجھ کر۔ وہ اتنا بھی نان پریکٹیکل نہیں تھا مگر عدینہ کے سامنے بالکل ہی درویش منش بن کر آتا۔ شمسہ بیگم کو تو وہ بہت پیاری تھی بلکہ وہ اکثر شمسہ بیگم کے آگے رابعہ خاتون کی شکایتیں لگاتی پائی جاتی تھی۔

بشائر نے قطعیت سے سوچا بخت کے خیالات سے پرے۔ عدینہ۔ نہیں۔ وہ مادہ پرست تھی۔ ظاہری شوشا کی کسوٹی میں پرکھنے والی۔ نہیں وہ بخت کے لیے کوئی بھی خیال نہیں رکھتی تھی۔ مگر بخت بہت اچھا تھا۔ ایسا نوجوان جسے دیکھ کر پاکیزگی، ذمہ داری، خوشی کا خیال آتا۔ یونہی بلاوجہ پیار آجائے۔ اس سے منہ موڑنا بدبختی ہوتا۔ یقیناً۔

مگر نہیں۔ عدینہ۔ بشائر جانتی نہیں تھی۔ وہ دیکھتی تھی۔ بہت پیار سے مگر کسی اور کو۔

☆☆☆

''تمہاری کزن بہت اسمارٹ ہے عدینہ!'' عدینہ کی کوئی پکی سہیلی نہیں تھی۔ مگر آئی ہوئی تینوں لڑکیاں بچپن سے ہم جماعت تھیں اور ایک اپنے بھائی کی شادی کا کارڈ دینے آئی تھی۔ بشائر پر ڈالی جانے والی سرسری نگاہ بھی بڑا گہرا تاثر قائم کرتی تھی۔

''اور ان کی ہائٹ۔ اف، اب کہاں نظر آتی ہے ایسی نزاکت۔ کسی ماڈل کے جیسی ہیں۔'' دوسری نے بھی مدح سرائی کی۔

''بہت ڈیسنٹ سی ہیں۔'' تیسری نے بھی حق ادا کیا۔

عدینہ کچھ حیرت اور کچھ ناگواری سے۔ مصنوعی مسکراہٹ سے سرہلاتی رہی۔ ایسا شاید پہلی بار ہوا تھا کہ اسے موضوع بنانے کے بجائے اس کی موجودگی میں کسی اور کو سراہا جارہا تھا جبکہ۔ گولڈن ویلوٹ کے سوٹ میں گولڈن بالوں کے ساتھ وہ سنہری گڑیا دکھائی دے رہی تھی۔ سرخ اونی سلیپر۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے نزاکت سے بیٹھی اپنے لہراتے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلاتی محوگفتگو تھی۔

بشائر بہت محبت سے ان تینوں سے ملی اور فریج ٹٹولتی عدینہ سے بہت محبت سے کہا کہ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھے، وہ کچن دیکھ لیتی ہے۔ عدینہ نے اگلے منٹ ہی ہاتھ ڈھیلے کردیے اس کا ذہن واضح تھا۔

''ہاں وہ ان کے گھر میں گھر کا فرد بن کر رہنے آئی ہے تو گھر کا بندہ ہی بنے نا۔'' اس نے رابعہ خاتون کے ایک آدھ بار جتانے پر قطعیت سے کہا۔

رات کا کھانا جو وہ مارے باندھے سو احسانات کے بعد بناتی تھی۔ بشائر کے آنے سے اس سے بھی پیچھے ہٹ گئی۔

رات کی ہنڈیا جو عدینہ کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ بشائر پلک جھپکتے ہی بہت سلیقے اور ذائقے سے بنادیتی۔ عدینہ پوچھ پوچھ کر روٹیاں ڈالتی تھی۔ آٹا گوندھنے سے ناخن ٹوٹنے کا ماتم۔ چولہے کے پاس کھڑے ہونے سے اسے رنگ جلنے کا اندیشہ جلاتا۔ برتن دھونے کے لیے دستانے چڑھالیتی۔ اور کبھی کبھی کوڑے دان میں کچرا ڈالنا دنیا کا مشکل ترین کام۔ وہ باقاعدہ الٹیاں کرتی۔ دن بھر کے لیے ماسی آتی تھی۔ لیکن کیا شام کو گند کے ڈھیر پر بیٹھے رہیں۔ رابعہ خاتون بہت نارمل رویے سے اسے راہ

راست پر رکھنے کی کوشش کرتیں۔لڑکیاں ہر کام کرنے کی عادی ہونا چاہیں۔اور کسی کام میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔گندگی سمیٹنے ہی سے صفائی و پاکیزگی ملتی ہے۔

عدینہ کی نزاکت و لطافت، اداؤں میں مصنوعی پن تھا۔یا ارادی کوشش اور اب عادت بن چکی تھی۔نخریلی۔

جبکہ بشائر سراسر فطرت تھی۔پانی کے بہاؤ جیسی بے ساختہ۔

''آپ کا ہیر اسٹائل بہت پیارا ہے۔''عدینہ کی ایک دوست کب سے روکے بیٹھی تھی۔بشائر متانت سے مسکرادی وہ جھک کر درمیانی تپائی پر پلیٹس رکھ رہی تھی۔چھجا ڈمک کر چہرے پر پڑ رہا تھا اس نے سر اٹھا کر سیدھے ہوتے ہوئے حسب عادت انگلیاں پھنسا کر اسے اوپر پہنچایا اور ذرا سا سر جھٹکا کر شکریہ کا مسکائی۔

اور آپ کے دانت۔ایسے لگتا ہے ڈینٹسٹ کی دکان پر چائنا کی بتیسی بجی ہو۔''اگلی دوست نے وکھرے انداز میں توصیف کی۔

بشائر بے ساختہ قہقہہ لگا گئی۔عدینہ نے بغور دیکھا۔ہاں بشائر کے دانتوں کی قطار۔

وہ ڈارک گرے شلوار قمیص کے ساتھ ہلدی رنگ کی شال کندھے پر ڈالے سیدھی کھڑی تھی۔گردن میں پڑی نازک سی چین باریک تھی اور گردن کے گردیوں لپٹی تھی۔جیسے گردن کی موٹائی کا ناپ دے کر بنوائی ہو۔چپکی ہوئی۔

''میں ذرا بک ورلڈ تک جارہی ہوں۔''وہ ان سے معذرت کرتی عدینہ کو مطلع کر کے نکلی۔اس نے عدینہ کی طرح نکلنے سے پہلے نہ تو پرفیوم اسپرے کیا تھا نہ ہی آئینے میں خود کو گھوم گھوم کر دیکھا تھا نہ تیز تیز برش کیا۔وہ سر پر دوپٹا نہیں لپیٹتی تھی۔شال ایک کندھے پر ٹکی تھی اسے الٹا کر دوسرے پر چڑھا دیا۔وی سی بن گئی۔بالوں میں انگلیاں۔بس تیار۔

عدینہ کے دماغ میں کلک سا ہوا۔ہاں

☆☆☆

''دادا جان، اچھا لگتا ہے کیا۔۔عظیم خان کے گھر سے دوپٹا گلے میں پٹے کی طرح ڈالے لڑکی نکلے اور اخبار ہاتھ میں لیے اردگرد سے بے گانہ پڑھتے پڑھتے بک ورلڈ جائے، واپسی میں کتاب پڑھتی آئے۔لوگ سوچتے نہیں ہوں گے عظیم خان اتنے ماڈرن کب سے ہو گئے۔''

''آں ہاں!''عظیم خان اصل ایشو کو پکڑنے میں ناکام ہو گئے۔

''بولیے دادا جان! مجھے تو کہتے ہیں سر ڈھک کر نکلو۔سر جھکا کر جاؤ، تیز قدموں سے چلو تاکہ کم سے کم وقت راستے میں رہو اور۔۔۔''

''تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔''عظیم خان اکیلے بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔

''تو آپ کو یہی پتا نہیں چل رہا۔''وہ بھنائی۔''آپ مجھے سن ہی نہیں رہے۔''وہ روٹھی۔

''نہیں نہیں سن رہا ہوں۔تم اخبار، کتاب کا ذکر کر رہی تھیں۔ایسا ہے پوتی! کہ جاتے ہوئے وہ اخبار پڑھ رہی ہوتی ہے۔ہے نا، ابھی تم نے بتایا۔''وہ پوتی کو ناراض نہیں کر سکتے تھے۔

"تو واپسی میں اخبار ختم ہو جاتا ہوگا۔ اس لئے کتاب شروع کر دیتی ہوگی۔"
عظیم خان نے معصومیت سے جواب دے کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اب اور آگے بولو کوئی اور مسئلہ۔
عدینہ کی جان جل گئی۔ "میں یہ کب کہہ رہی ہوں؟"
"تو کیا کہہ رہی ہو۔ دوبارہ بولو۔"
"دوپٹا، دادا دوپٹا۔ آپ سن ہی نہیں رہے۔"
"اچھا سن لیا۔ اب تم جاؤ۔ میں جیتنے والا ہوں بھاگو۔" وہ دوبارہ شطرنج کی جانب متوجہ ہو گئے۔
عدینہ نے چند پل ٹھہر کر انہیں دیکھا پھر پیر پٹختی باہر کو نکلی۔
اگلا ٹارگٹ رابعہ خاتون تھیں۔
"لگتا ہی نہیں لڑکی ہیں کہ لڑکا یہ گدی خالی۔ مجھے تو وحشت ہوتی ہے۔"
"بھئی۔ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی تیسری جماعت کی بچی ہے جو میں آگے بٹھا کر پونیاں کسنے لگوں۔"
"مجھ پر تو آج تک فیصلے صادر کرتی ہیں آپ۔ یوں کرو۔ یوں نہ کرو۔" وہ جل کر بولی۔
"تم کیا چاہتی ہو، صاف بات کرو۔" رابعہ خاتون اسے بخوبی جانتی تھیں۔
"مجھے کیا کہنا ہے بس الجھن سی ہوتی ہے۔ وہ ماسی کہتی ہے۔ ماہی منڈا سا کچھ۔"
"کرنے والی بات کیا کرو۔" رابعہ خاتون نے صفا جواب دیا۔ "خود کو دیکھنا نہیں بس دوسروں کے عیب تلاشو۔ ہمیں بھی برے لگتے ہیں تمہارے یہ مرغی کے پنجے۔" انہوں نے اس کے بڑھے ہوئے ناخنوں کو ناگواری سے دیکھا۔
"اچھے خاصے بالوں کو جوکروں کی طرح رنگ کر گھومتی ہو۔ چلو سنہری تو سمجھ میں آئے۔ یہ لال سرخ اور نیلی لٹیں کیوں چہرے پر گرا رکھی ہیں؟ یہ ٹی وی فلموں والوں ہی کے کرنے کے فیشن ہیں۔ چار چار کان چھدوا کر بیٹھی ہو۔ بیٹی تم لڑکی ہو یا بکری۔ جھومتی بجتی۔ اتنا بھی کیا سنگھار کا شوق۔ ہونہہ! مجھے تو ڈر لگتا ہے کسی دن ناک کے درمیان سوراخ کروا کر نتھلی پہنے نہ آ جاؤ، دادی جان کیسی لگ رہی ہوں ہونہہ!"
"دادی!" وہ حلق کے بل چلائی۔ دادی نے ذرا بھی لفٹ نہ دی۔ وہ اون کے گولے کو تیار کر رہی تھیں۔ منہ موڑ کر تن دہی سے لگی رہیں۔
پورے دو دن تک سب سے منہ بسورنے کے بعد وہ خود ہی من گئی۔ دادی تو ہمیشہ سے ایسے ہی تھیں۔
پھر اس نے دیکھا کہ بشائر باہر جاتے وقت اپنے گرد بڑے اچھے طریقے سے چادر لپیٹ کر نکل رہی تھی۔ اور بجائے خوش ہونے کے عدینہ کا منہ بن گیا۔ دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ زیادہ نمایاں ہو کر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کے وقار اور رعب میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا گویا۔ اور رابعہ خاتون نے بالوں پر بھی گفتگو کر لی تھی۔ اسے ماسی ہی سے پتا چلا۔
بشائر گیارہ برس کی تھی لمبی چوٹی۔

وہ چولہے کے پاس کھڑی تھی۔ رخ موڑ کر اپنے ابو سے بات کرنے لگی۔ آگے پڑی چوٹی کو پیچھے پھینکا تو وہ جلتے چولہے سے ٹکرا گئی۔ منٹ کے اندر بال جلنے کی خوشبو۔ سجاد صاحب نے تیر کی سی تیزی سے چوٹی گدی سے کاٹ دور اچھال دی۔

بشائر کی خوف زدگی سے زیادہ سجاد صاحب کا حال برا ہوا۔ فوری طور پر گلی کے نائی کے پاس لے کر گئے اور یہ ہیئر اسٹائل دیا پھر ہر ماہ جب اپنی حجامت بنواتے تو بشائر ساتھ ہوتی۔

بعد میں راحیلہ آنٹی اسے پارلر لے جانے لگیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بشائر کا خوف تو غائب ہو گیا۔ مگر سجاد صاحب کسی طور نہ مانے۔ بشائر کی چھوٹی بہن کو بھی اجازت نہ ملی بلکہ وہ راحیلہ کو بھی اوپر جوڑا بنواتے تھے۔

اور اب تو بشائر۔ اس ہیئر اسٹائل کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے اب یہی پسند تھا۔

عدینہ کو دونوں جگہ خفت اٹھانا پڑی

☆☆☆

"کسی بھی انسان سے پہلی بار ملنے پر سب سے پہلے اس کی کس چیز سے متاثر ہوا جا سکتا ہے؟

بشائر نے خود سے نجانے کتنی بار یہ سوال کیا۔ اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں مختلف جواب گردش کرنے لگے۔

"نہیں انسان نہیں۔ مرد کی کیا چیز سب سے پہلے متوجہ کر سکتی ہے؟" اس نے بہت دیر بعد تصحیح کر کے سوچ کی درست سمت کا تعین کیا۔

"چہرہ۔ آنکھیں ہاں آنکھیں۔ اف!" اس نے جھرجھری لی کر ان سنہری آنکھوں کو سوچا۔ آج بارش کے بعد سردی میں شدت تھی اس نے خود کو کمبل میں سموتے ہوئے آنکھیں موندیں۔

ناک۔ شاید یونانی دیوتاؤں جیسی تھی۔ اتنی تیکھی، سیدھی، نوکیلی۔ پتا نہیں کیسی۔

اور اس کا ہیئر اسٹائل۔ جب بشائر نے پہلی نگاہ سے اسے دیکھا وہ برآمدے کی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ اس نے گرے ہائی نیک پہن رکھی تھی۔ سیاہ کوٹ۔ اس کا دراز قد، بشائر کی نگاہیں بلا ارادہ اوپر سے نیچے سفر کرتی گویا لمبائی ناپ رہی تھیں۔ وہ کون تھا؟

آنے والا اندر داخل ہونے سے پہلے سگریٹ کا آخری کش لینا چاہتا تھا۔ شاید وہ اندر آ کر سگریٹ نوشی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے طویل کش کا دھواں نیم وا ہونٹوں سے باہر کی سمت نکالا اور دونوں ہاتھ ہوا میں چلا کر جیسے دھویں کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ منہ کھول کر بھاپ سی باہر نکال رہا تھا۔

ایک اجنبی مین گیٹ سے لان اور لان سے برآمدہ کراس کرتے گول کمرے کے دروازے میں یعنی اندر آیا ہی چاہتا ہے۔ وہ کچن کی کھڑکی سے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ دھیان آنے پر آنچ دھیمی کرتی باہر آئی۔ تب تک وہ اندر داخل ہو کر صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے جھکا ہوا تھا۔

"آں ہاں۔ ہیلو!" وہ کھنکھاری۔ "آپ کون؟"

آنے والے نے جھکے سر کے ساتھ فقط نگاہیں اٹھائیں۔ گہری۔ اداس کھوئی کھوئی سی فراز نے

''سونے والوں کی طرح، جاگنے والوں جیسی'' کی تشبیہ یقیناً کسی عورت کی آنکھوں کے لیے استعمال کی تھی۔کاش وہ ان آنکھوں کو ہی دیکھ پاتے۔اچھا چلو ذرا بھر کو سوچو۔فراز نے ان آنکھوں کو دیکھا۔تو پھر کیا ہوگا۔

''ہشت بشائر!'' وہ اپنے خیالات پر گڑبڑائی۔کوئی سنے تو کیا کہے۔ایک مرد کی آنکھوں کی اتنی مدح سرائی۔۔آں ہاں۔اف!

وہ جوتا اتارنا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔بشائر کو لگا۔وہ پل بھر کو حیرت زدہ رہنے کے بعد مسکرایا۔ پلک جھپکنے کی ساعت برابر کی مسکراہٹ۔اس نے اردگرد نگاہ کر کے جیسے کسی اور ذی روح کو کھوجا۔

''مجھے چھوڑیے۔آپ یقیناً بشائر ہیں بشائر سجاد!'' وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال بڑے آرام سے بولا۔

''ارے!'' بشائر کی آنکھیں پھیلیں۔

''میں مامون ہوں۔مامون ابصار۔نانو کہاں ہیں اور عدی، نانا سب۔۔۔''

پھر بشائر نے سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلایا تو موصوف خالہ دادی کے نواسے تھے۔

''وہ ذرا مارکیٹ تک۔اور دادا جان۔شاید نماز کے لیے۔''اس نے گردن گھما کر گھڑی دیکھی۔

''اس کا مطلب ہے کھانے میں وقت لگے گا۔'' یہ شاید خود کلامی تھی۔وہ دوبارہ جوتے اتارنے کو جھک گیا تھا۔

وہ اب شاید اوپر جانے کا قصد کر رہا تھا۔بشائر کو دھیان آیا۔

''اگر آپ کو بھوک لگ رہی ہے تو میں کھانا لگا سکتی ہوں۔''

''آپ لگائیں گی۔'' وہ عدینہ کے نخروں اور انکار کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

''جی ہاں!'' بشائر نے حیرت کا اظہار کیا۔''یہ کون سا بڑا کام ہے۔'' جواب کے لیے کھلتے مامون ابصار کے ہونٹ فون بیل کی آواز نے سکیڑ دیے نمبر دیکھ کر وہ بہت آرام دہ حالت میں صوفے پر ٹک گیا۔ صوفے کی بیک سے سر ٹکائے وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے محو گفتگو تھا۔پھر اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔اب وہ اپنے ہاتھ کو دھیرے دھیرے اپنے پیر پر پھیر رہا تھا۔

سالن نکالتے ٹرالی سجاتے بشائر کا حلق خشک سا تھا اور ہاتھوں میں کپکپاہٹ اس کے لیے باعث حیرت تھی۔

اگر خالی شکل دیکھ کر نمبر دیے جاتے تو وہ سو میں سے دو سو حاصل کر چکا تھا مگر باقی سب چیزیں۔ پہلی نظر میں محبت ہو سکتی ہے۔نہیں نا۔

اس کی دھڑکن تیز کیوں ہو گئی تھی۔کیا اس نے زندگی مین پہلی بار کوئی خوبرو مرد دیکھا تھا۔نہیں بالکل نہیں۔اور نہ وہ دل ہاتھوں میں لیے پھرتی تھی۔پھر ہتھیلیوں سے پھوٹتا پسینہ۔کیا ہو گیا بشائر۔ بی میچور۔اس نے خود کو ڈپٹا۔وہ اتنے کمزور اعصاب نہیں رکھتی تھی کہ ایک خوش شکل مرد کو دیکھ کر ہاتھ پیر چھوڑ جائے ہاں مگر وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

اس کا چونکنا اور پلٹ پلٹ کر اس شخص کی سمت دیکھنا فقط حیرانی سی حیرانی تھی۔ماجرا دراصل یوں تھا

کہ وہ شخص اپنے ظاہری حلیے کے ہر پہلو سے اس شخص اس آئیڈیل مرد، کے تصور پر پورا اترا تھا جسے اس نے اپنے خیالوں میں تراش رکھا تھا۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی خدا کی دنیا اتنی بڑی ہے۔ اس کا تراشا پیکر اتنا ہی ماورائی نہیں کہ کسی کو مل نہ سکے یا کسی کو دکھ نہ سکے۔ وہ انیس بیس کا مارجن دے کر کسی نہ کسی پر اکتفا کر لیتی یا پھر ڈھیروں لڑکیوں کی طرح حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر کے گھر بسا، بچے پالتی اور زندگی گزار رہی ہوتی۔

اس کے اس بے حد اچنبھے کا کارن تو ہو بہو ہونا تھا اگر وہ صرف ظاہر کو دیکھتی تو۔ اور جو اس نے دیکھا بھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

کبھی ایسے بھی ہوتا ہے مگر بشائر! یہ ہو چکا ہے۔ یہ شخص مامون ابصار۔ یہ بالکل ویسا تھا جیسا اس نے سوچ رکھا تھا۔ ہاں کیا ہے یہ دنیا اور کیسے نرالے اس کے روپ۔

ابو کے جانے پر میں نے سوچا کہ اب میرے لیے زندگی کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے۔ تعلیم مکمل کر لی۔ پیسے کے لیے بے فکری۔ میں اپنا گھر بار، شہر چھوڑ کر کیوں ایک اجنبی جگہ جا رہی ہوں، کس لیے۔ مجھے وہاں کیا ملے گا۔ کیا مل سکتا ہے اور اب زندگی کس ڈھنگ سے گزاری جائے گی۔ کیا اچھا ہوتا کہ ابو امی شہر نہ چھوڑتے اور مجھے ساتھ لے کر ہی جاتے۔ مجھے لگا میری زندگی پر فل اسٹاپ لگا دیا گیا ہو مگر نہیں نقطے تھے۔ قصہ ابھی باقی ہے سو۔۔۔

طے یہ ہوا کہ یہ سب پہلے سے طے تھا۔ میرا یہاں آنا۔ اس شخص کو دیکھنا۔ اس سے ملنا اور کیا۔ پانا۔۔ اوں اونہہ۔ بشائر! اسے گدگدی سی ہوئی۔ تم صرف صورت دیکھ کر لٹو ہونے والی تو کبھی نہیں تھیں اس نے خود کو لتاڑا۔ صرف شکل دل پر وار کر کے جیت ہار کا فیصلہ نہیں کر سکتی ہے۔

ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ ضروری ہے اہم ترین۔

کردار، گفتار، شعار اور۔۔۔ اور کیا، اور اظہار۔

☆☆☆

خوشی کے پل۔ پلک جھپکنے جیسے۔

محبت کی عمر۔ اتنی مختصر۔

زندگی میں محبت آئی تھی۔ مگر اتنے چھوٹے سے وقفے کے لیے۔

فقط چوبیس گھنٹے کی طمانیت، خوشی، معطر احساس۔ بے ترتیب دھڑکن۔ ایک جوار بھاٹا۔ محبت طوفان کی طرح آئی۔ ہر شے کو تہس نہس کر گئی۔ شور چنگھاڑیں اٹھا پٹاخ سب بہا لے جانے طوفان۔ اور اب طوفان کے بعد کا سناٹا سناٹا اور بس سناٹا۔ نقصان کا تخمینہ کیا لگایا جائے۔

چوبیس گھنٹے پر محیط محبت کا ماتم باقی کی ساری زندگی منایا جائے اونہہ کہاں کی عقل مندی ہے بشائر سجاد (تم کون بھلا وہ شخص مامون ابصار اور ۔۔۔ اور عدینہ ہاں)

پچھلی رات اس کے وجود کے گرد محبت کی گرمائش لپٹی تھی۔ اس کے سکون کے کیا کہنے اور آج کی رات محبت نہیں تھی۔ کمبل کے اندر گلیشئر جیسی ٹھنڈک تھی۔ وہ کروٹیں بدل بدل تھک گئی۔

بعض دفعہ ڈسپلے کیے گئے سوٹ پر بک چکا ہے کا ٹیگ لگا ہوتا ہے ہم ہی اپنے جوش میں دیکھ نہیں

پاتے۔اس میں دکان دار یا خریدار کا کیا دوش۔ ہمارے ہوش کہاں تھے۔

ہر اچھی چیز ہماری نہیں ہو سکتی۔اس نے اپنی نم پلکوں پر خود کو سرزنش کی۔ایسا بھی کیا بچپن۔ایسا بھی کیا اتاؤلا پن۔ایسی سطحیت۔بی پریکٹیکل بشائر بس اب آنکھیں پونچھو۔دعائیں مانگو۔سورتیں پڑھو اور سو جاؤ۔اب دوبارہ نہ ماتم لے کر بیٹھ جانا۔

وہ کسی استاد کی طرح خود کو سمجھا رہی تھی۔مگر دل نالائق، ضدی نافرمان شاگرد تھا، وہ ہتھیلیوں کی پشت سے مسلسل آنکھیں رگڑتا۔عقل کے استاد کو ہٹ دھرمی سے دیکھتا تھا۔میں نہ مانوں رے۔

اچھا تو پھر یوں ہے کہ ماتم منانے کے لیے تمہیں معاشرتی اعتبار سے تین دن دیے جاتے ہیں۔بین ڈالو، سینہ کوبی کرو، بال نوچو یا کپڑے پھاڑ جنگلوں میں نکل جاؤ مگر یاد رکھو، چوتھے دن میں تمہیں ملال میں نہ دیکھوں۔عقل کے استاد کی تنبیہ۔

دل کو ماننا ہی تھی۔

پاسبان عقل نے اسے تین ون کی شرائط کے ہمراہ تنہا چھوڑ دیا تھا۔کافی ہے۔

☆☆☆

عظیم خان کھڑکی کے نزدیک کرسی گھسیٹ کر نیم دراز تھے۔ٹانگیں سیدھی لمبی، موڑھے پر ٹکی تھیں چہرے پر آج کا اخبار اوندھا پڑا تھا اور رانوں پر ان کا زمانوں پرانا ٹیپ ریکارڈ پڑا تھا۔

کھڑکی پر سفید جالی کا پردہ تھا اور چھن کر آتی دھوپ ان کے پورے جسم پر پڑ رہی تھی۔وہ اپنی پسندیدہ غزلیں اور گیت سن رہے تھے۔

بشائر کچن کی کامن والی کھڑکی سے انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔کس قدر سکون آفرین مکمل منظر تھا۔سرما کی دھوپ۔سرما کی خاموشی۔سرما کا فسوں سر چڑھ کر بول رہا تھا۔وہ رابعہ خاتون کی بتائی ترکیب سے نرگسی کوفتے بنا رہی تھی۔اس نے بڑے سکون سے ہانڈی کے اندر ہرا دھنیا چھڑکا۔اس کے اپنے بنائے کوفتوں میں قیمہ اکڑ جاتا تھا اور انڈا نظر آنے لگتا تھا۔اس نے احتیاط سے ڈوئی میں کوفتہ اٹھایا وہ فل کور تھا۔واؤ۔اس نے شہادت کی انگلی سے اسے ہلکا سا گھمایا کامیابی کی مسکراہٹ ابھری مگر اگلے ہی لمحے معدوم ہو گئی۔ٹیپ سے ابھرتی آواز۔

شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آئی کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جان تھی کہ پھر سنبھل گئی

شامِ فراق۔۔۔۔

وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ذہن جیسے یکدم خالی ہو گیا۔

''کیا واقعی شام فراق اتنی آسانی سے ٹل جاتی ہے؟'' ایک بے حد ٹھہری مگر چبھتی آواز۔وہ بری طرح چونکی۔بخت ٹرے میں کچھ لایا تھا۔بصد احتیاط رکھتے ہوئے اس کی مخاطب وہی تھی۔اس نے اس کے جملے کو دل ہی دل میں دہرایا

''کیا کہہ رہے ہو بخت؟ میں سمجھ نہیں سکی۔''

''میں کہہ رہا تھا کہ کیا واقعی شام فراق ٹل جاتی ہے۔مجھے تو لگتا ہے۔رک جاتی ہے۔ہمیشہ کے

لیے۔ جیسے ڈوبتے جہاز کی گھڑیاں بند ہو جاتی ہیں۔ شامِ فراق بھی ساکت حالت رکھتی ہے۔ اور جن دو آسان الفاظ میں شاعر کہہ رہا ہے دل بہل گیا۔ جان سنبھل گئی۔ حقیقت میں دل کب سنبھلتا ہے۔ دل لڑکھڑا جائے تو بندہ منہ کے بل یوں گرتا ہے جیسے دلدل میں جا گرا ہو۔ دھیرے دھیرے اندر دھنستا۔ سب آپ کو دلدل میں غرق ہوتا دیکھتے ہیں۔ سہارے کے لیے ہاتھ کوئی نہیں بڑھاتا۔

دل غریب کی جھونپڑی کی چھت بن جاتا ہے۔ محض خدشے پر بھی ٹپکنے لگتا ہے۔ اور شاعر کہتا ہے۔ دل سنبھل گیا۔ ہونہہ۔''

بخت کے ہاتھ ابھی تک لائی ہوئی ٹرے پر ٹکے تھے۔ بشائر نے دوسری جانب سے ٹرے پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ چونکا اور پھر اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

''کیا ہو گیا۔ تمہیں کیا اس غزل کی تشریح لکھنی ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے تو بس اس ساری شاعری پر بہت اعتراض ہے۔ سراسر بکواس۔ اس سب کو کہنا گانا، سننا آسان ہے مگر عمل۔ ناممکن۔''

بشائر کے ہاتھ ابھی تک ڈھکی ٹرے پر تھے۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر ڈھکن اٹھایا کھلے کھلے سفید چاولوں کا مٹر پلاؤ کونے پر دھرا سلاد اور رائتہ، خوشبو۔ ''واہ!'' اس کی نظریں پلاؤ پر جم سی گئیں۔

''اتنا ناممکن بھی نہیں ہے۔ دل اور جان عقل کے مطیع ہوتے ہیں۔ انہیں سیدھا کیا جا سکتا ہے۔''

''آپ کو شاعر پر یقین ہے۔'' وہ آواز دبا کر چلایا تھا۔

''ہاں!'' بشائر نے آہ! کی صورت اثبات دکھائی۔ ''مجھے اس پر یقین ہے۔''

وہ چاول ڈش میں پلٹنے کے بعد برتن دھونے سنک کی جانب مڑی۔ بخت کا انداز کس قدر اچنبھے میں ڈالنے والا تھا۔ (ہاں مگر اسے عقل پر یقین تھا وہ ابھی کل ہی تو تین دن کا سوگ منا کر عملی زندگی میں لوٹی تھی)۔ سنک کے سامنے والی بڑی کھڑکی پچھواڑے کی جانب کھلتی تھی۔ یہاں کپڑے دھلتے تھے اور عدینہ کے طوطوں کے پنجرے تھے۔ کچھ آرائشی بیلیں اور پودے۔

وہ زیادہ سے زیادہ دھوپ حاصل کرنے کے لیے دیوار کے ساتھ کرسیاں جوڑے مامون کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ پیلے رنگ کے سوٹ پر سبز شال چہرے کے گرد لپیٹی تھی اس کے ناخنوں پر سرخ پالش تھی اور زمین پر اس کے سرخ گرم سلیپر پڑے تھے۔ وہ کرسی پر پاؤں اوپر رکھ کے بیٹھی تھی۔ گود میں کینو کی پلیٹ تھی۔ وہ کینو چھیل کر پھانکیں جھاڑ جھاڑ خود بھی کھا رہی تھی اور مامون کو بھی دے رہی تھی۔ اس کی ناک کی لونگ پر دھوپ پڑ رہی تھی اور لشکارا مقابل کے چہرے پر پڑتا تھا۔ یا کبھی طوطے کے سیاہ پنجرے پر جھلمل سی ہوتی۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔ دھیما اور اونچا مگر دونوں صورتوں میں آواز کچن کے اندر تک نہیں آ رہی تھی۔

مامون کرسی پر بے حد ڈھیلا سا نیم دراز تھا۔ وہ بہت گھریلو سے حلیے میں تھا۔ بے حد گورے صاف پیروں میں نیلی ہوائی چپل۔ جینز کے پائنچے ایک بل سے مڑے تھے۔ ٹی شرٹ کے بٹن کھلے تھے۔ مگر اس نے شرٹ پیچھے کی جانب گرا رکھی تھی۔

عدینہ اردگرد سے بے گانہ تھی۔ نجانے کون کون سے قصے تھے۔کون سی باتیں کیسی باتیں۔ جو چلتی ہی رہتی تھیں۔

نجانے اس وقت کیا قصہ تھا۔ عدینہ جوش سے بولتی پھر بھنویں چڑھاتی پھر سکیڑتی۔ مامون کی ساری دلچسپی عدینہ ہی کی جانب تھی۔ وہ ہمہ تن گوش تھا مسلسل مسکراہٹ اور طمانیت تو چہرے پر چھائی ہی تھی۔ قصے کے موڑ، کبھی ہنسی لے آتے کبھی حیرت و بے یقینی۔ کبھی وہ بند آنکھیں کھول کوئی سوال پوچھ لیتا۔ وہ دونوں جیسے ایک دوسرے میں گم تھے۔ وہاں تیسرا کوئی نہیں تھا۔

اور اگر ہوتا بھی تو انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔

(یہ شخص۔ ماتم کے تین دن پورے ہو جائیں تو کیا غم بھول جاتا ہے۔)

وہ یکدم ٹھٹک گئی۔ جھاگ والے ہاتھ ٹرے پر رکے ہوئے تھے اور ٹونٹی سے نکلتی ٹھنڈی دھار۔

آں۔ ہاں، اوہ۔

''عدینہ آسٹریلوی طوطا لگ رہی ہے۔'' اس نے بخت سے یونہی کہا جھینپ مٹانے کو۔

''ہوں!'' بخت نے ذرا سا آگے ہو کر کھلا پٹ بند کر دیا۔ ''طوطا چشم بھی کہیے۔''

''ارے۔'' اس کی ہنسی نکل گئی۔

''ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔'' بخت نے پٹ بند کرنے کی توجیہہ پیش کی۔ بشائر کا دھیان پلٹا۔ ٹھنڈی نہیں۔ گرم صحرا کے گرم تھپیڑے بگولے اور دھول جو آنکھوں میں مرچیں بھرتی ہے۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔

''عظیم انکل کی آج کی پسند ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے شام فراق کا نوحہ۔ اب محبت کے انجام کی اطلاع۔ یونہی زخم لگاتی ہے۔ داد انمک مرچ لے کر بیٹھا ہے۔ آپ نے ایسی کیمسٹری کبھی دیکھی۔''

وہ ناسمجھی کے عالم میں بخت کی بات سن رہی تھی۔ اس نے گردن نکال کر عظیم خان کو دیکھا وہ اے محبت پر گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے گویا سر دھن رہے تھے۔

''ایسے سر تو مجھے پٹخنا چاہیے۔ ہے ناں۔ مگر ہم تو وہ ہیں کہ۔

میں نے صبر کیا۔ صبر بھی قیامت کا۔''

وہ بے چارگی سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''آں!'' بشائر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''بخت۔ بخت اور عدینہ۔ ارے۔''

''آج تو ان نرگسی کوفتوں کی نرگسی کٹار بھی زخموں پر پھاہا نہیں رکھ سکے گی۔ میں چلا۔''

وہ یکدم تیزی سے باہر نکل گیا۔

بشائر نے دونوں ہاتھ ڈھیلے پن سے سلیب پر ٹکا دیے۔ انکشاف۔

اے محبت تیرے انجام۔ مغنیہ کی گردان۔ آہ

☆☆☆

رابعہ خاتون اور شمسہ بیگم اپنے مخصوص تخت پر براجمان تھیں۔ حسب معمول رابعہ خاتون سبزی بنا رہی تھیں جبکہ شمسہ بیگم کروشیہ سے کچھ بن رہی تھیں۔ تبدیلی یہ تھی کہ بشائر شمسہ بیگم سے چپکی بیٹھی تھی۔ وہ

اپنی شمیزوں کے دامن پر کروشیہ کی باریک بنائی چاہتی تھی۔
شمسہ بیگم نے اس کے گال پر دھیرے سے ہاتھ پھیر کے پچکارا۔ "میں تمہیں بنادوں گی بیٹا۔"
"وہ تو آپ ابھی بنائیں گی ہی۔ مگر مجھے سیکھنا ہے۔ آپ بس سکھادیں۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔
"تو سیکھ لو۔ میں کیا اپنا فن قبر میں لے کر جاؤں گی۔"
وہ راضی تھیں مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنے بہت سے دن بعد بھی اسے کروشیہ ہی پکڑنا نہیں آیا اور پھر دھاگہ لپیٹنا۔ مصیبت۔ دھاگا لپٹ گیا تو کروشیہ پھسل جاتا اور اگر کروشیہ سنبھال لیتی تو۔۔۔
وہ اس وقت بھی جی جان سے ان سے لگی بیٹھی تھی، تب عدینہ کی ہیل کی ٹک ٹک پر وہ باقی دو خواتین کی طرح چونکی۔ سیاہ وسفید کاٹن کا جدید تراش کا سوٹ پہنے سیڑھیاں اتر کر آ رہی تھی۔ اس نے سیاہ باریک ہیئر کلپ ماتھے سے گزار ذرا سا پف دے کر کس رکھا تھا۔ پیچھے لہریے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ بالوں میں ہلکی سی نمی باقی تھی۔ اس کے پیروں میں لمبی ہیل کی پمپی تھی۔ بشائر کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔ اس نے مسکرا کر اشارہ دیا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔
عدینہ شانِ بے نیازی سے مسکرائی۔ اس نے تعریف کو حق سمجھ کر وصول کیا تھا۔ کہ وہ اتنی اچھی ہے کہ اسے سراہا جائے اور اس نے کتنی محنت بھی تو کی ہے۔
"کہاں جا رہی ہو۔" جیسا سوال شمسہ بیگم کی جانب سے آیا۔ تب ہی بشائر کی قوت شامہ نے اسے الرٹ کیا۔ اسے بخوبی اندازہ ہوا پیچھے مامون ہے جو نزدیک آتا جا رہا ہے چابی کی آواز۔ اوہ تو وہ دونوں کہیں باہر جا رہے تھے۔ جب ایک چیز آپ کی ہے ہی نہیں تو بلاوجہ ندیدوں کی طرح حسرت پرائی شے کو دیکھنا۔ یہ تمہاری تربیت تو نہیں تھی بھی تھی کہ تم دوسروں کے مال۔۔۔ بشائر نے خود کو سمجھایا۔ لفظ مال پر اسے ہنسی آ گئی۔ مامون ابصار۔۔۔ مال، ہی ہی۔ بی میچور بشائر سجاد۔
"دیکھیں شمسہ آنٹی! دھاگہ پھر کھل گیا۔" اس نے مصنوعی عجلت اور پریشانی سے (وہ اس سمت دیکھنا ہی نہیں چاہتی۔ وہ کام کر رہی ہے۔ مصروف ہے)۔
"ارے بیٹا۔" شمسہ بیگم اس کی سمت مڑیں۔ اس نے سر نیچے جھکا لیا (وہ نہ اس طرف دیکھے گی۔ نہ فساد برپا ہوگا)
"مگر تم اتنی نیک بھی نہیں بشائر سجاد! سچ تو دراصل یہ ہے کہ تم ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ ہاں۔"
"مامون مجھے گھر دکھانے لے جا رہے ہیں۔ وائرنگ کے بعد فانوس وغیرہ لگے ہیں اور کچن کے لیے آئیڈیا سلیکٹ کرنا ہے۔ کیبنٹ کلر اور۔۔۔" عدینہ، رابعہ خاتون کو جواب دے رہی تھی۔
"او اچھا چلو، ہو آؤ۔" رابعہ خاتون نے سر اثبات میں ہلایا۔
عدینہ کی ہیل کی ٹک ٹک تخت کے پاس سے گزری اور دروازے تک۔ ٹک ٹک کی آواز چلنے والے کی دلی کیفیت کی ترجمان تھی گویا۔ فخر، بے فکری، سکون، غرور۔
"اے سنو مامون! عدینہ! رکو۔" رابعہ خاتون کو نجانے کیا خیال آیا۔ "یہ اپنی بشائر کو بھی لے جاؤ۔

جب سے آئی ہے، کہیں گھومنے پھرنے نہیں نکلی۔ اب ہم بڈھا بڑھیا کہاں لے کر گھومیں۔ سمندر تک نہ دکھلایا۔ تم ہی ساتھ لے لو۔ ذرا سی سیر بھی ہو گی اور دل بھی بہلے گا۔ یہاں ہم دو بڑھیوں میں بیٹھتی ہے۔ یا تمہارے دادا کے پرانے ریکارڈ سنتی ہے۔''

''میں ارے نہیں!'' بشائر نے چونک کر سر اٹھایا۔ ساتھ ہی نگاہ سیدھی مامون پر گئی۔ وہ غور سے سننے کے بعد اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

''نہیں میں کروشیا سیکھ رہی ہوں۔ میں کیسے جا سکتی ہوں۔''

''جاؤ تم ہو آؤ۔'' شمسہ بیگم فوراً انگلی سے لپٹا دھاگا چھوڑ گول تکیے پر ڈھیر ہو گئیں۔

اس نے عدینہ کا چہرہ دیکھا جہاں حیرانی ناگواری تھی اور اس کی آنکھیں انکار سننے کی متمنی تھیں۔ بشائر اتنی چہرہ شناسی کا دعوا تو کر سکتی تھی۔

''نہیں دادو ان کا اپنا پروگرام ہے۔ میں کیسے۔ میں پھر کسی دن دیکھ لوں گی ابھی تو یہیں ہوں۔''

''نہیں بشائر! آپ پلیز چلیے۔ بلکہ مجھے پہلے ہی کہنا چاہیے تھا۔ مجھے لگا آپ بہت مصروف رہتی ہیں۔ لیکن پلیز اگر آپ فرصت سے ہیں تو۔ جوائن اَس۔''

''ہاں۔ ہاں جاؤ۔'' رابعہ خاتون کا سر بھی زور سے ہل رہا تھا۔

''میرے کپڑے۔۔۔'' اس نے کل کے کپڑے پہنے تھے جو اب مسلے دسلے تھے۔ ویسے وہ کپڑوں کی فکر پالنے والی نہیں تھی۔ مگر بہانے کے طور۔

''اب آ جائیں۔ کیا کپڑے بدلیں گی۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔'' عدینہ کی آواز میں اکتاہٹ، جھلاہٹ اور ناپسندیدگی تھی۔

اس نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر مامون کو دیکھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہ ملنے پر اشارے سے جلدی کا کہا۔

اس نے فوری فیصلہ کیا گلابی شلوار دوپٹے کے بیچ دودھیا کرتا تھا۔ اس نے گلابی دو پٹی چپل پیروں میں پھنسائی۔ تین چار بار بالوں کے گچھے میں انگلیوں پھیریں تو بال بالکل تازہ دم سے ہو کر ماتھے پر گر گئے۔ اس نے تخت کی جانب سے گھوم کر آتے ہوئے قمیص کی شکنیں ہاتھ سے درست کیں۔

مامون کی گاڑی میں جانا تھا۔ عدینہ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوپٹا شانے پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس نے عظیم خان کی ہدایت موجب اپنے گرد گلابی دوپٹا لپیٹ لیا۔

مجھے اچھا لگے گا کہ اگر اچھی بیٹی باہر نکلتے وقت خود کو اچھی طرح لپیٹ لپاٹ لے۔ یہاں بڑے برے لوگ بھی تو رہتے ہیں نا۔'' بچوں کو ڈرانے کے لیے بنایا جانے والا پراسرار سا لہجہ۔ مگر وہ بچی نہیں تھی۔ وہ دوبارہ بھی کھلے سر نہیں نکلی۔

وہ سارا راستہ اردگرد کے منظر سے لطف لیتی رہی ۔اس نے قصداً ایک بار بھی مامون ابصار کو نہ دیکھا۔ ہاں عدینہ ریموٹ سے گانے بدل بدل نجانے کون سی جھلاہٹ اتارتی رہی

☆☆☆

اس کی گود میں نور تھا۔ روشنی، چاند، چاند کا ہالہ۔ خوشبو احساس۔

مکمل۔ یقین دعا۔ اس کا گڑگڑانا۔ رونا تڑپنا۔
اس کے سجدے۔۔۔ اور سجدے کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتے۔ ان کا صلہ دنیا میں ملتا ہے ورنہ آخرت میں۔ اس نے دنیا میں مانگا تھا۔
اور۔۔۔
اور اسے مل گیا تھا۔
جون کی تپتی گرم دوپہر جب چیل انڈا چھوڑ دے۔ اس کے لیے ٹھنڈے وادیوں سے آتی نم دار خوشبو سے بوجھل ہوا بن گئی تھی۔
ایک تکلیف۔ انتہائی۔
ایک انتظار۔ قیامت کا۔
ایک نظر۔ ترسی ہوئی۔
اس نے ابھی ابھی نہلایا ہوا تولیے میں لپٹا بچہ۔ تھاما۔ وہ دنوں سے بے جان تھی اور تولیے کو کھولتے ہوئے اس کی توانائی چوکڑیاں بھرتی ہرنی جیسے ہوگئی تھی۔
اس نے تولیے کی گٹھڑی کھول دی۔ وہ ٹانگیں مارتے مٹھیاں بند کر کے پیر پٹخ پٹخ کر روتے بچے کو بے یقینی سے تکتی جاتی تھی۔ اس کے رونے کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ مگر اسے اس رونے سے کوئی تکلیف نہ تھی۔ اسے یاد تھا۔
اس کا پہلا بچہ۔ وہ اس نا سمجھ میں آتے انسانی دجود سے مشابہ بچے کو خوف کے عالم میں تکتی رہی تھی۔ وہ بچہ مردہ تھا۔ بہت بڑا سر مگر اس کی کھوپڑی بہت پلپلی تھی اور بازو۔ جیسے شانے سے دو پتلی چھڑیاں چپکا دی ہوں۔ ''توبہ استغفار۔ اس نے ایسے بچے کو جنم دیا۔'' ہائے وہ غش کھا کر گر گئی۔
''اللہ اپنے پیارے بندوں کو آزماتا ہے۔'' اس کی ماں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔
''بس اللہ سے معافی طلب کرنی ہے اور توبہ کرنی ہے بس۔'' اس کے باپ نے کہا۔
''میں اللہ کو اتنی پیاری ہوں امی!'' اس نے معصومیت سے ماں کا چہرہ دیکھا۔
''ہاں بہت پیاری۔'' اس کی امی نے اس کا بھیگا چہرہ چوما۔
بہت جلدی اس بچے کی تدفین کی گئی۔ اس کی ساس نندیں توبہ توبہ کرتی تھیں۔ مگر اللہ کے آگے نہیں۔ اسے سنانے کو۔ دکھانے کو۔ اس کا شوہر نا سمجھی کے عالم میں کچھ کترایا سا پھرتا تھا۔ مگر پھر ماں بہن کے سمجھانے پر اس کا سینہ تن گیا۔ یہ عورت ہی ایسی ہوگی۔ جس نے ایسا بچہ (توبہ استغفار) بچے ماں پر جاتے ہیں (باپ کا پرتو بھی ہوتے ہیں) اور ماں۔ وہ انیس برس کی نازک حور جیسی۔ جس کا چہرہ دیکھ دیکھ دل نہیں بھرتا تھا۔ اس کا بچہ۔ اور۔ ایسا۔
''امی! میرے لیے دعا کرنا۔'' وہ ماں کے آگے گڑگڑاتی۔
''مجھے اور کس کے لیے کرنی ہے۔'' ماں نے اپنے آنسو پیتے ہوئے مجبوری بتائی۔
وہ ماں کے ہاتھ تھام کر ان کے ہاتھوں کے بوسے لیتی رہی۔
''جتنی بڑی مصیبت اتنی اللہ کی قربت۔ اور جب اللہ سے قربت مل جائے تو راز و نیاز کی چھوٹ

مل جاتی ہے۔تم ہم سے زیادہ اللہ کے نزدیک ہو چکی ہو بیٹا! جو دل چاہے مانگ لینا۔'' ابو نے اسے آسان حل بتایا۔

''وہ انکار نہیں کرے گا۔اللہ کبھی انکار نہیں کرتا۔منکر ہونا انسانوں کی خصوصیت ہے۔''

اور ان ہی گہری نصیحتوں کے جلو میں۔مگر خدشات کے ساتھ اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو دیکھا تھا۔ جو بہت تندرست اور مکمل دکھائی دیتا تھا مگر وہ پیدائش کے وقت رویا نہیں تھا۔اور چند گھنٹوں میں پتا لگا۔اس کا سر معمول سے کچھ زیادہ بڑا ہے۔

چند دنوں میں کچھ اور انکشافات۔

چند مہینوں میں سب کچھ واضح۔

اور چند سالوں میں زبان زد عام ہو گیا۔مریم کا بیٹا ایک ایب نارمل بچہ تھا۔اس کی نظر ٹھہری نہیں۔ اس نے سر بھی نہیں ٹھہرایا۔

وہ روئی، تڑپی، مچلی اور شکوہ کناں۔

اور سب سے بڑھ کر سارا دوش اس کا نکلا۔

پھر اس کی زندگی کا، خوشیوں، خواہشوں کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ چلا گیا۔

''بس اور بچے نہیں۔''

اور پھر ان پانچ سالوں میں اس نے اپنا تجزیہ کیا۔

پہلے بچے کی دفعہ وہ مطمئن تھی۔ہاں وہ ماں بننے والی ہے۔ بیٹا یا بیٹی۔ بچوں جیسا بچہ۔ بلکہ اسے بچے کی خوبصورتی کا یقین تھا۔وہ گوری گلابی تھی اور شوہر کا رنگ بھی صاف۔ان دونوں کے نقش دل نشین تھے۔دونوں اپنی جگہ جاذب نظر تھے۔بچہ ماں باپ یا خاندان ہی کے نقش لے گا۔مگر۔۔۔۔ایسا نہیں ہوا۔

دوسری بار وہ دعاؤں اور استغفار پر آ گئی۔منتیں مرادیں۔مگر ان سب پر حاوی خدشات تھے اور خدشات مجسم ہو کر سامنے آتے ہیں۔

ایک ایب نارمل بچہ۔ہا۔اللہ۔

''اللہ کی انصاف پسند نگاہ تمہارے اوزان پر تھی۔تمہارا ایک پلڑا دعاؤں سے لدا پڑا تھا۔مگر جب تولا گیا تو دوسرے پلڑے میں موجود خدشات بھاری نکلے۔جو دعا کرتا ہے۔وہ خدشہ نہیں پالتا۔ہم دعا نہ بھی کریں مگر یقین کر لیں تو کامیابی دم چومتی ہے۔تم سے غلطی ہوئی بیٹا۔''ابو کے دوست نے اس کے بلک بلک کر رونے پر سارا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیا۔وہ لمبی مثالیں یا الزامات کے بجائے صاف بات کہہ۔یہ جا وہ جا۔

اور پھر اس نے اس بات کو سوچا اور بہت سوچا۔

اور تیسری بار اس نے بے فکری، لاپروائی سے یقین کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک مکمل توانا بچے سے نوازے گا۔

ہاں۔ہاں اس بار اس کا بچہ بالکل ٹھیک ہوگا۔

اور تولیے میں ملتے بچے کو دیکھ کر اسے اپنے یقین پر یقین ہو گیا ہاں یقین اہم ہے باقی سب لن

ترانی۔ اللہ پر یقین، ہاں وہ دے گا۔
وہ بچے کو الٹ پلٹ کر، چھو چھو کر دیکھ رہی تھی وہ مکمل تھا چار ماہ بعد بھی۔ ابھی بھی۔ چار سال بعد بھی۔ ہمیشہ۔ ٹیسٹ خیال گمان ڈاکٹر سب۔ مگر اسے یقین تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔
ڈاکٹرز کا دیا گیا ٹائم پیریڈ۔ مختلف ٹیسٹ۔ انتظار۔ وہ چار ماہ کا ہو کر نظر ٹھہرائے گا۔ سر ٹھہرائے گا قلقاریاں مارے گا۔ پکارنے پر دیکھے گا۔ آواز پر چونکے گا۔ چھوٹی چھوٹی موومنٹس۔ ایک مستقل آبزرویشن، سارے گھر کے افراد ہمہ وقت اسے دیکھتے نوٹ کرتے۔ وہ بہت خوبصورت بچہ تھا اور گل گوتھنا وہ مکمل طور پر ماں سے مشابہ تھا۔ ہاں قد کاٹھ یقیناً باپ پر جاتا۔
دادی جب جب اسے پھلتا پھولتا دیکھتیں تو منہ پھیر کے کھنکھار دیتیں۔ اس کے گلے میں تعویذ تھے۔ منتیں مرادیں۔
مگر وہ ماں تھی اور اس کا دل پر یقین تھا۔ اس کا بچہ ٹھیک ہے۔ بس اور جب اس نے دس ماہ کی عمر میں پہلی بار قدم اٹھایا۔ تب۔
اس نے باقی گھر والوں کی طرح نعرہ بلند نہیں کیا نہ اچھل کود کر بھنگڑے ڈالے وہ مسکراتی نگاہوں سے بچے کو دیکھتی رہی اور پھر سجدے میں گر گئی۔
اس کے شوہر نے بہنوں کو، بھانجیوں کو سونے کے زیورات دیے تھے لیکن اس نے مونس کے لیے وہیل چیئر مانگی تھی۔
''وہ تکیوں کے سہارے بیٹھ جاتا ہے۔ میں بٹھاؤں گی۔ مجھے کوئی سونا چاندی نہیں لینا۔ بس ایک وہیل چیئر۔ مجھے لگتا ہے وہ بیڈ پر پڑا مزید ناکارہ ہو رہا ہے۔ مجھے تو بس یہی چاہیے۔'' اس کے لہجے میں ضدی پن آ گیا۔
تمام حاضرین نے برے سے منہ بنائے۔ مگر وہ اپنی بات کہہ چکی تھی۔ وہ بچہ سب کے لیے ایک نمونہ یا بے کار چیز تھا مگر اس کے لیے وہ صرف اس کا بیٹا تھا۔ اس کا بچہ اس کی مامتا کی تسکین۔ اسے ساری دنیا سے پیارا۔
وہ جانتی تھی وہ اس بچے کو ٹھیک نہیں کر سکتی مگر وہ اسے کسی قدر آسانی تو دے سکتی ہے۔ ایک کوشش۔ ملال تو نہیں رہے گا نا۔
اور اس نے کس مشکل اور سب کی ناگواری اور مسلسل شور شرابے کے درمیان اسے وہیل چیئر پر بٹھایا تھا۔ وہ کتنا چیخ رہا تھا وہ رو رہا تھا۔ اسے بیٹھنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر وہ بڑے ڈاکٹر سے پوری ہدایات لے آئی تھی۔ اسے کوشش کرنی تھی۔
اور وہیل چیئر پر اسے بیٹھا دیکھ کر وہ یوں خوش تھی جیسے بچہ ریس جیت کر آ رہا ہو۔ فاتح۔ کاش! وہ یہ کام پہلے ہی کر لیتی۔ مگر پہلے کوئی مانتا، کبھی نہیں اس کے چہرے پر استہزاء آ رکا۔ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے لیے حق میں اچھا ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو فٹ بال سے کھیلتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے سلکی بال ماتھے پر بکھرے تھے

اورلال چہرہ۔ وہ ہانپ رہا تھا مگر کھیل کا جنون کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔
اس کی لگائی کک سے فٹ بال اس کے قدموں میں آ گری تو اس نے اس پر اپنا پیر رکھ کے بال کو ٹھہرایا۔ بچے نے چونک کر ماں کا چہرہ دیکھا۔
''امی! ہٹ کریں بال کو۔''
وہ بال اٹھا کر اس کے نزدیک چلی آئی۔
''مجھے تو کھیلنا آتا نہیں۔ کیسے ہٹ کرتے ہیں آپ سکھا دو گے؟''
اس نے اسے گود میں اٹھا لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔
''میں تو سکھا دوں مگر آپ تو میرے ساتھ رہتی ہی نہیں۔'' معصوم لہجے کا بڑا سا شکوہ۔ مریم کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ یہ یقیناً اس کے اپنے الفاظ نہیں تھے۔
''آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ نہیں رہتی۔''
''دادو کہہ رہی تھیں۔ اور وہ ماسی لوگ بھی۔ کہ آپ کو صرف بھیا اچھا لگتا ہے۔'' مریم کا دل مسلا گیا۔ اس نے اپنے اندر اٹھتے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کی۔
''اچھا یہ بتاؤ۔ آپ کو دنیا میں سب سے اچھا کون لگتا ہے۔''
''مجھے۔ مجھے۔۔۔ اوم مم۔۔۔'' بیٹے نے شہادت کی انگلی ہونٹ پر جما کر سوچنے کی مہلت لی۔ مریم کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ باپ کا نام لیتا یا اس کا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اس نے دادی، پھپھی کا نام لیا تو وہ برداشت نہ کر پاتی۔ اس خیال سے کہ بیٹا اس سے اس حد تک دور جا چکا ہے۔
''پاپا اور امی۔۔۔ دونوں سے کرتا ہوں۔''
''اوں ہوں۔ ایک نام لو۔ اچھا آنکھیں بند کرو اور دیکھو کون زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ جمائے۔
بچے نے چند پل بے حس و حرکت رہنے کے بعد سر جھٹک کر اس کا ہاتھ ہٹایا۔
''امی آپ۔ بہت زیادہ پیاری ہیں۔'' اس نے شاید ماں کی خوبصورتی کو سوچا تھا۔ محسوس کیا تھا۔
''ارے میرا بیٹا۔'' اس نے بیٹے کے گال چومے۔
''ایک بات کہوں بیٹا!'' اس نے بچے کے گرد بازو کسے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
''میری بات غور سے سننا۔ اور ہمیشہ یاد رکھنا۔ آپ نے کہا، آپ سب سے زیادہ پیار مجھ سے کرتے ہیں۔ میں آپ سے کہتی ہوں، آپ سب سے زیادہ پیار مجھ سے نہ کریں۔ کبھی نہ کریں۔ بلکہ آپ بھی میری طرح سب سے زیادہ پیار اپنے بھیا سے کریں۔ آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ پیار اپنے بھیا ہی سے کرنا ہے۔ چاہے کوئی آپ کو کچھ بھی کہے۔ منع کرے یا جو بھی۔ ساری دنیا ایک طرف بھیا ایک طرف۔''
''لیکن کیسے پیار کروں۔ وہ نہ بات کرتا ہے نہ میرے ساتھ کھیلتا ہے بلکہ وہ تو مجھے دیکھتا ہی نہیں۔ اسے ٹام اینڈ جیری کا نہیں معلوم۔ اسے اسپائیڈر مین کا نہیں معلوم۔ اس نے کبھی میرے ساتھ کرکٹ میچ نہیں دیکھا۔ امی۔''

اسے پیسال ۔ بچے نے مدبرانہ انداز میں ہاتھ چلا چلا کر دلائل دیئے۔

''وہ تو چل کر نہیں آسکتا۔ درست۔ آپ کبھی گئے اس کے پاس کہ بھیا آج میں آپ کو ٹام اینڈ جیری دکھاتا ہوں یا اسپائیڈر مین کا بتایا۔ آپ بتاتے اور دکھاتے تو اسے معلوم ہو جاتا نا۔''

''تو کیا مجھے بتانا چاہیے تھا؟'' اسے شاید اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔

''بالکل بتانا چاہیے تھا۔ کلاس روم میں آپ کی ٹیچر سوال بتانے کے بعد اگلے روز اس کے بارے میں پوچھتی ہیں نا۔ آپ نے کبھی بھیا کو کچھ بتایا نہیں اور خفا ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ کیسی بات ہوئی۔'' مریم نے خفگی کا تاثر دیا۔ چہرہ موڑا۔

''او۔ امی!'' بچے نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اپنی جانب سیدھا کیا۔ ''میں سمجھ گیا۔ میں اسے سب کچھ بتا دوں گا۔ ساری باتیں۔'' اس نے ہلکی سی تیوری چڑھا کر ہوا میں اونچا ہاتھ چلایا۔

''مگر وہ میرے ساتھ کھیل نہیں سکتا۔ اس کے لیے کیا کروں۔'' اس نے مسئلہ بتایا۔

''ہاں۔ یہ بات تو ٹھیک ہوئی۔'' مریم نے مصنوعی طور پر چہرہ پریشان بنایا۔ وہ چند لمحے جیسے سوچ میں گم ہوئی، ''مگر بچے۔ آپ اسے یہاں لان میں لا کر بٹھا سکتے ہیں۔ اب جیسے آپ اکیلے اکیلے اتنے اچھے شاٹ لگا رہے تھے۔ بھیا خوشی سے تالیاں بجاتا آپ کو اپری شیٹ کرتا۔ اسے تالی بجانا آتی ہے نا۔ کتنا مزا آتا۔''

بچے کی آنکھیں حیرانی سے نکلی تھیں اور ہونٹ نیم وا۔ پھر حیران آنکھوں میں تسلیم اور یقین بھرنے لگا۔ وہ قائل ہو چکا تھا۔ مریم نے اس کا چہرہ چوم لیا اور آنکھوں پر ہونٹ رکھے۔

''ایک بات یاد رکھو۔ جیسے امی دنیا میں سب سے زیادہ پیار بھیا سے کرتی ہے ویسے ہی آپ کو بھی دنیا میں سب سے زیادہ پیار اپنے بھیا سے کرنا ہے۔ نہ دادی، پھپھی نہ پاپا اور نہ ہی مما سے۔ آپ کو صرف اپنے بھیا کو پیار کرنا ہے۔ ہمیشہ۔

رات کو سوتے وقت کلمہ پڑھنے کے بعد آپ نے خود سے کہنا میں اپنے بھیا سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میرا بھیا دنیا کا سب سے اچھا بھیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ کہو گے نا۔''

بچے کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''میں سب سے زیادہ پیار بھیا سے کروں گا ہمیشہ۔''

☆☆☆

تازہ پینٹ کی خوشبو اور چمکتے در و دیوار، ماربل کے فرش کی پالش میں چہرہ جھلکتا تھا۔ کارپینٹر کام کر رہے تھے۔ الیکٹریشن بجلی کے تاروں میں الجھے تھے۔

بشائر کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔ ہر شے میں ایک وقار اور توازن تھا۔ خالی کمرے اس قدر جچ رہے تھے سامان و آرائش کے بعد تو چھب ہی جدا ہوتی۔ اسے سب کچھ پسند آ رہا تھا۔ سیاہ ماربل کی کچن سلیب۔۔۔ وہ اس کی چکنی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ سب ٹھیک تھا۔ تب ہی اس کے ماتھے پر شکن سی ابھر آئی۔ اس نے چاروں جانب دیکھا۔ پھر کچھ واضح ہونے پر شانے اچکا دیے۔ یہ کوئی اس کا اپنا

گھر تھوڑی تھا۔ ہر شخص کی اپنی پسند۔۔۔ وہ دوسرے کمرے کی جانب بڑھی۔

عدینہ مامون کے ساتھ ساتھ ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ وہ ہر شے کی مدح سرائی میں رطب اللسان تھی۔ عجب مالکانہ استحقاق اور شان بے نیازی اس کی شخصیت کو نمایاں کر رہی تھی۔

مامون بجلی والوں سے گفتگو کرتا ذرا باہر نکلا۔۔۔ تو وہ بشائر کے نزدیک آ گئی۔

''کیسا لگا۔'' اس کا شارہ گھر کی طرف تھا۔

''بہت پیارا۔۔۔ اللہ گھر کو شاد و آباد رکھے ہرا بھرا۔'' اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا دی۔

''ابھی صرف نچلا پورشن تیار ہوا ہے۔ مامون کہتے ہیں۔ وہ اوپری پورشن کو ہر لحاظ سے نیچے والے سے مختلف بنائیں گے۔ اٹالین طرز پر۔۔۔ یا جاپانی انداز میں۔۔۔ اور ہر کمرے کی سیٹنگ میں ایک تھیم ہوگی۔ مگر دوسرے سے بالکل الٹ۔۔۔''

''روایتی سندھی نچ اور ایک کمرے میں بلوچی زمینی نشست جیسا انداز بھی رکھا جائے گا۔'' عدینہ کے جملے کو اندر آتے مامون نے مکمل کیا۔ بشائر نے فقط مسکرا کر تائیدی سر ہلایا۔

''سب کچھ ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ اللہ آپ کو رہنا بسنا نصیب کرے۔''

مامون کی مسکراہٹ پر اس نے وضاحت کی۔ نیا گھر دیکھ کے ایسے ہی الفاظ میں دعا دیتے ہیں۔

''اٹس او کے۔ اینڈ تھینک یو فار یور پرے۔''

''نہیں۔۔۔ پھر آپ ان شاء اللہ بولیے۔۔۔ دعا پر مہر لگ جاتی ہے۔'' وہ مسکرائی۔ سگریٹ سلگاتے مامون کے ہاتھ رکے چہرے پہ خجالت آئی اس نے ان شاء اللہ کہہ کر اپنی تصحیح فوراً کی۔

پہلے خجالت آمیز نگاہیں۔۔۔ پھر جتاتی مسکراہٹ والی نگاہیں۔

بشائر نے نظر چرائی۔ وہ گھوم کر لکڑی کے دروازوں کے ڈیزائن پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ مامون نے رخ پھیرا۔ وہ کھڑکی کے قریب چلا گیا تھا اور اب دوبارہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس نے پہلا طویل کش لے کر دھواں کھڑکی سے باہر چھوڑا۔ عدینہ اس کے مقابل کھڑی کچھ کہہ رہی تھی۔

بشائر دھیرے دھیرے ان سے دور کھسکی۔ اس نے درزیدہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔ مامون نے سیاہ جینز پر نیلی کاسنی شیڈ مارتی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کف موڑے وہ عدینہ کو کسی بات کا جواب دیتے ہوئے کش لے رہا تھا۔ دونوں کھڑکی کے فریم میں کسی تصویر کی طرح فٹ آ رہے تھے۔ عدینہ گرد و پیش سے بے گانہ تھی۔ وہ بس مامون کو دیکھتی تھی۔ سنتی تھی اور کہتی تھی۔ اس کے انداز میں ایک سرشاری، بے فکری اور بے حد خود اعتمادی تھی۔ اسے کسی شے کا خوف نہیں تھا۔

بشائر نے ذرا سا سوچا۔ عدینہ کبھی اعلا سطح کی گہری گفتگو نہیں کرتی تھی۔ بس اپنی کہتی تھی۔ اپنی پسند، اپنی مرضی، اپنی خواہش، میں کا قضیہ۔۔۔ وہ حالات حاضرہ کے دکھڑے نہیں پالتی تھی۔ فلموں، ڈراموں سے بھی بس معمولی شغف تھا۔ پھول، بوٹے، بہار، موسم، شاعر، موسیقی نہیں ان میں سے کوئی چیز بھی اس کا پسندیدہ موضوع نہیں تھی۔ تو پھر۔۔۔

بشائر نے مسلسل بولتی عدینہ اور ہمہ تن گوش مامون ابصار کو دیکھ کر سنجیدگی سے دوسری بار اس بات کو

سوچا۔
وہ آخر مامون ابصار سے کون سی باتیں کرتی ہے، کس بارے میں، کیسے قصے۔۔۔جن میں سامع کی اتنی دلچسپی ہے۔کون سی باتیں؟ اسے حیرانی آمیز تجسس تو تھا۔مگر ٹوہ لی جائے۔اونہوں۔۔۔غلط بات۔

اس نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ایک گہری نگاہ مامون ابصار پر ڈالی۔یہ شخص۔۔۔اس کی آنکھیں۔۔۔آنکھیں۔۔۔کیا ہے ان آنکھوں میں جو کچھ نہیں آتا۔

وہ سیکنڈ فلور پر آ گئی تھی۔یہاں کام ابھی کافی باقی تھا۔وہ یوں ہی کھڑکی سے ٹنگ کر گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہی۔پزا کی ہوم ڈیلیوری والے کی بائیک رکی۔۔۔اوہ۔۔۔ان کی تواضع کا خیال۔۔۔کچھ دیر میں عدینہ اور مامون اوپر آ گئے۔ایک مزدور پلاسٹک کی کرسیاں میز بھی اٹھا کر لا رہا تھا۔

''یہ سب تو تکلف ہوا۔'' وہ مامون کو میز پر سامان رکھتے دیکھ کر شرمندہ ہوئی۔عدینہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ چکی تھی۔بشائر نے آگے بڑھ کر شاپرز کھولنے شروع کر دیے۔

''چھوڑ دیں بشائر! مامون ہی کو کرنے دیں۔آج ہم ان کے مہمان ہیں۔''

عدینہ کا انداز شرارتی تھا۔مزا لیتا ہوا، جتاتا سا۔

''عدی ٹھیک کہہ رہی ہے۔آپ تشریف رکھیے۔میں اچھا میزبان ثابت ہوں گا، بلیو می۔'' اس نے نرمی سے بشائر کے ہاتھ سے شاپر لے لیا۔وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔

عدینہ اسے بتانے لگی کہ اوپر کس طرف کس کا کمرہ ہوگا۔''یہ بیڈ روم ہوگا اور کامن کے ساتھ دوسرا روم۔۔۔دادا، دادی کے لیے بنا ہے۔مامون کہتے ہیں۔وہ انہیں یہاں لے آئیں گے۔مگر وہ لوگ کہتے ہیں انہیں اپنا گھر بہت پیارا ہے اور وہ اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ابھی تو خیر گھر بنا نہیں، جب مکمل ہوگا اور مامون شفٹ کریں گے۔تب دادا جان کو ماننا ہی پڑے گا۔مامون کو منوانا آتا ہے۔'' وہ دلکشی سے ہنسی۔

''سب کچھ بہت اچھا ہے۔اسپیشلی مجھے ایریا بہت اچھا لگا، بہت سکون ہے یہاں۔۔۔اسلام آباد جیسا۔۔۔کراچی، لاہور تو بہت شور والے شہر بن چکے ہیں۔'' بشائر نے کہا۔

''آپ تعریف ہی کرتی رہیں گی، کوئی نقص پکڑیے، کوئی مشورہ۔۔۔'' مامون اب اس کی جانب متوجہ تھا۔

''جب ہر چیز ہے ہی تعریف کے قابل تو غلطی کہاں نکلے گی۔'' عدینہ نے چہک کر کہا۔

بشائر کے کھلتے لب بھنچ گئے۔''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، سب اچھا ہے۔ماشاءاللہ۔''

''یقیناً اچھا ہے۔'' مامون نے گہری نگاہ اس کے اوپر گاڑی۔''مگر ابھی نیچے کچن میں آپ کو کچھ ناگوار یا اعتراض سا ہوا تھا۔آپ کچھ کہتے کہتے رکی تھیں۔اب آپ وہ کہیے۔''

''اوہ۔۔۔!'' بشائر کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔''ایسا کب۔۔۔''

''آپ مکر نہیں سکتیں۔میں اس وقت اتفاق سے آپ ہی کو دیکھ رہا تھا۔آپ بہت تیزی سے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔مگر نہ جانے کیا سوچ کر رک گئیں۔''

''میں۔۔۔'' بشائر نے ذہن پر زور دیا۔ ''ہاں۔۔۔چھوڑیے ایسا کوئی بڑا اعتراض تو نہیں ہے۔''
''تو اگر اعتراض نکلا تو کیا مامون اب توڑ پھوڑ کریں گے۔سب کچھ تیار ہے۔'' اس کے جملے کے بیچ میں عدینہ نے ٹانگ اڑائی۔وہ جیسے اس بارے میں کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔مامون کے فیصلے کیسے غلط ہو سکتے ہیں۔پاگل ہے کیا۔
''خاموش عدی۔۔۔!سننے تو دو۔۔۔میں واقعی توڑ نہیں سکتا۔مگر مجھے علم تو ہو، کیا بات ہے۔''
مامون نے عدینہ کو ٹوکا اور دوبارہ اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔
بشائر نے نوالہ نگل کر عدینہ کے چہرے کو دیکھا۔جہاں تناؤ کی سی کیفیت تھی اور مامون ہمہ تن گوش۔
''دراصل لاؤنج سے ملحق کچن۔۔۔آئی مین اوپن کچن۔بنیادی طور پر یورپی ٹھنڈے ممالک کی سردی کو دیکھتے ہوئے وجود میں آئے تھے۔ہمارے ایشین گرم ممالک میں کچن کا باقی گھر سے ذرا علیحدہ یا دور ہونا ہی بہتر ہے۔پھر ہمارے گھروں میں یورپی ممالک کی نسبت کوکنگ بہت زیادہ ہوتی ہے، تین ٹائم۔۔۔اور ہمارے کھانے بہت زیادہ ٹائم لیتے ہیں پکنے میں، آئی مین روٹی، ساگ، پائے، حلیم، بلکہ ہر چیز تو ایسے میں جب چولہا دن ورات جلے گا تو گھر تو پھر تندور بن جائے گا۔کم از کم لاؤنج تو بیٹھنے کے قابل نہیں رہ سکتا۔بس اور کچھ نہیں۔'' اس نے بہت تفصیل سے بتایا۔مگر جملے کے اختتام تک جھینپ گئی۔ خوامخواہ کا اعتراض۔
عدینہ کا منہ حق دق کھلا کا کھلا رہ گیا۔
مامون نے ہونٹ بھینچتے ہوئے چند پل خاموش رہنے کے بعد شانے اچکا دیے۔
''میں واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔پھر یہاں سب گھر اسی طرح بن رہے ہیں اور نہ ہی انجینئر نے کوئی مشورہ دیا۔یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔'' وہ متاسف نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔بشائر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
''آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔مجھے تو بھئی ایسا ہی کچن پسند ہے۔یہ کیا ڈبی جیسے کچن میں بند ہو جاؤ۔سارے گھر سے کٹ کے۔'' عدینہ نے سارا معاملہ سمیٹ دیا۔
بشائر نے ٹھنڈی سانس لے کر پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔وہ ہلکا سا رخ موڑ کر باہر دیکھ رہی تھی۔اس کے دماغ میں ایک ہی جملہ چکرا رہا تھا ''مجھے تو بھئی ایسا ہی کچن پسند ہے۔(ہاں اصل بات یہ ہے)
''چلیے بشائر!اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔مگر آپ کو کوئی نہ کوئی رائے یا مشورہ دینا ہوگا'' مامون نے اس کی عقل کو تسلیم کیا تھا۔
''میں کیسے۔'' وہ گڑبڑائی۔
''یہ عدینہ تو کان کھا لیتی ہے۔ایسے۔۔۔ویسے جیسے، آپ فوراً کچھ بولیے، کچھ بھی۔''
اوپر پڑے سامان ریت اینٹ سے بچتی بچاتی وہ کھڑکیوں سے باہر جھانکتی رہی۔اس نے دل کو اچھے سے سمجھایا تھا۔مگر دل اچانک ہر شے سے اچاٹ سا ہو گیا۔رشک اور حسد بال برابر فرق۔۔۔اس

نے سورہ الناس پڑھنی شروع کر دی۔ دل ٹھہرنے لگا اور دھیان ہٹنے۔

واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھتے وقت۔۔۔ مامون نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

''مشورہ ادھار رہے گا۔''

بشائر بدقت مسکرائی۔ ''میں ادھار کی قائل نہیں۔'' وہ قصداً بہت بے نیازی سے بولی۔ آپ آج ہی کسی مالی کو بلا لیں۔ گھر کے تیار و مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے شفٹ ہونے تک لان کی باقاعدہ شکل نکل آئے گی۔ پھر ہر شے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہوگی۔ اگر آپ نے کنسٹرکشن کے آغاز پر ہی اس جانب توجہ دی ہوتی تو اب تک تو پیڑ پودے قد نکال چکے ہوتے۔'' وہ بات کے اختتام پر مسکرائی۔ آتی ہوا نے پف کو بگاڑ دیا تھا۔ اس نے انگلیوں کی کنگھی سے اسے مشاقی سے سنوارا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

مامون کی آنکھوں میں حیرانی کے بعد ستائش ابھر آئی۔ اسے یہ دھیان کیوں نہ آیا۔ عدینہ کے چہرے پر بھی اچنبھا سا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا اور مامون سے کہا تھا کہ وہ بہت ہی بھرا لان بنوائے۔ مگر یہ خیال۔۔۔ وقت کا تعین۔۔۔ اس نے اس پہلو پر کیوں نہ سوچا۔ شاید اس لیے کہ وہ مامون کی ہاں میں ہاں ملانے کی عادی تھی۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے مامون نے ویو مرر میں بشائر کا سادہ مگر ذہانت سے چمکتا باوقار چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کی لیپا پوتی نہیں تھی۔ وہ اپنے نیچے پھنسے دوپٹے کو نکالنے کی مشقت جھیل رہی تھی۔ دوپٹا سر پر لپیٹ رہی تھی۔

عدینہ کے چہرے پر تناؤ سا تھا۔ اس نے سیٹ پر بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ واقعی بہت تھک چکی تھی۔

☆☆☆

''سنا ہے کل آپ تاج محل دیکھنے گئی تھیں۔'' بخت نے کہا۔

''تاج محل۔۔۔ کون سا تاج محل۔۔۔ ہم تو کل سی ویو گئے تھے۔ ہاں اس سے پہلے۔۔۔ اور تاج محل کراچی میں کب ہے۔ وہ تو آگرہ۔۔۔ انڈیا میں ہے۔'' جواب دیتی بشائر نے حیرت سے بخت کی شکل دیکھی۔

''میں اس تاج محل کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جو ممتاز کے لیے شاہ جہاں نے بنوایا مرنے کے بعد۔۔۔ میں تو اس کی بات کر رہا ہوں جو۔۔۔''

''یہ فالتو کی باتیں چھوڑو۔۔۔'' بشائر کو یاد آیا وہ کیا پوچھنے آئی تھی۔ وہ اتنے دن سے آیا ہی نہیں کہ وہ پوچھ پاتی۔

''تم اس روز کیا کہہ رہے تھے۔ عدینہ اور۔۔۔ تم عدینہ کا نام لے کر کہہ رہے تھے۔ وہ زخم لگاتی ہے۔ بخت تم اور عدینہ۔۔۔ تم سے عدینہ سے۔'' بشائر پر یقین تھی۔

''ہاں!۔۔۔'' بخت نے ہاں کی یا آہ خارج کی۔

''اوہو۔۔۔ مگر وہ تو۔۔۔'' بشائر تاسف میں گھری۔ اس کے چہرے پر پریشانی آرکی۔

''اتنا گمبھیر مسئلہ نہیں ہے۔'' بخت نے ڈھارس دی۔ ''چھوٹی سی بات ہے۔''

مامون اسے عدی کہتا ہے۔ میں بس یہ چاہتا ہوں۔ وہ اسے ساری زندگی ادی ہی کہے۔'' اس کا انداز بے حد سنجیدہ تھا۔

''ہائیں!'' بشائر کچھ نہ سمجھی، منہ کھول کر اس کی بے حد سنجیدہ شکل دیکھی۔ ''ادی۔۔۔ادی۔۔۔ مطلب۔۔۔''

''سندھی میں بہن کو کہتے ہیں اماں۔۔۔اب اماں پر منہ نہ کھولیں۔اماں بڑی بہن کو کہتے ہیں۔ آپ میری اماں ہوئیں نا۔'' بشائر کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''عدی۔۔۔ادی۔۔۔واہ۔۔۔تم تو بڑے بے نیاز سے نظر آتے تھے بخت۔۔۔تمہاری اپنی دنیا۔۔۔تم کب اس جھمیلے میں پڑے۔'' اسے سچ مچ دکھ ہوا تھا۔

''صرف بے نیاز نہیں، بے وقوف بھی کہیے بلکہ۔'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہنس دیا۔

''عدینہ کو دیکھ کر میں بے خود ہو جاتا ہوں اور اس محفوظ و مامون کو دیکھ کر بے قابو۔'' اس نے بے خود کہنے پر آنکھیں جذب کے عالم میں بند کر کے جھوم کے دکھایا اور بے قابو کہنے پر فضا میں گھونسا تان لیا۔ بشائر کی ہنسی بے قابو ہو گئی۔

''آپ کی ہنسی بہت خوب صورت ہے بشائر!'' بخت سحر زدہ سا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ بلکہ خوب صورت تو ہر دوسری چیز ہو سکتی ہے۔ آپ میں کچھ خاص ہے۔ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہر جنبش میں وقار۔۔۔ہر۔۔۔''

''اے۔۔۔بس۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ ''اِدھر اُدھر مت گھماؤ۔ تم مامون کو پسند نہیں کرتے، ہے نا۔'' اس نے اصل مدعا کہا۔

''اوہ۔۔۔وہ!۔۔۔'' بخت نے لاپروائی سے ''وہ'' کو کھینچا۔ ''تو آپ دلوں کے بھید بھی جان لیتی ہیں۔''

''مگر کیوں بخت۔ وہ تو۔۔۔اتنا مکمل ڈیشنگ، زبردست۔۔۔''

''اوہ!۔۔۔'' بخت نے بھنویں اٹھائیں۔ ''آپ بھی۔''

''کیا میں بھی؟ بات کر رہی ہوں۔ گھماؤ مت، تم اسے پسند کیوں نہیں کرتے؟ عدینہ کی وجہ سے؟ بولو۔''

''شاید ہاں، شاید نہیں۔''

''بخت! تم مجھے زچ کر رہے ہو۔'' وہ جھلائی۔

''آپ کسی اور موضوع پر بات کریں۔ آج کا اخبار دیکھا؟'' بخت نے اخبارات کا پلندہ اس کے سامنے سرکایا۔

''بخت!'' اس نے تنبیہی انداز میں میز پر ہاتھ مارا۔

بخت نے نظریں جھکا لیں۔ وہ پین سے اخبار پر پھول بوٹے بنانے لگا تھا۔ خاموشی بولنے لگی۔

''کیا تم اس سے جیلس ہو۔'' بخت نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔

''عدینہ کی وجہ سے۔'' بشائر نے جملہ مکمل کیا۔
بخت نے قلم چھوڑ دیا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر جواب دینے کو تیار تھا۔
''نہیں۔۔۔ ماموں کی فطرت کا جنون، انتہا پسندی، کاملیت پسندی، آپ نے کبھی اس کی آنکھوں کی سرد مہری نہیں دیکھی۔ پل بھر کی ساعت کو آنے والی یہ لہر اسے اندر تک سے واضح کرتی ہے اور اس بات کو وہ خود بھی نہیں جانتا۔ وہ ظاہر باطن میں بالکل جدا ہے۔''
بخت اپنی رائے میں ٹھوس تھا، حتمی۔
بشائر کچھ نہ سمجھی۔
''مگر عدینہ تو۔۔۔''
''عدینہ کی آپ فکر نہ کریں۔۔۔ وہ جی حضوری کی عادی ہے۔ بخوشی بہ رضا۔ وہ ساری زندگی گزارنے کے بعد بھی اصل سے واقف نہیں ہوگی۔ آپ نے اسے جانا نہیں۔ وہ سرورق کی خوب صورتی سے متن کا اندازہ لگاتی ہے۔ ورق پلٹنے اور سطریں پڑھنے سے اسے کوئی علاقہ نہیں۔ آپ اس کی فکر میں نہ گھلیں۔''
بشائر خاموش رہ گئی۔ ہاں بخت نے یقیناً زیادہ بہترین تبصرہ کیا تھا۔ وہ انہیں زیادہ جانتا تھا۔ بشائر کی تو بس ایک نظر ہی تھی نا۔
اس نے ایک خیال آنے پر اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔
''اگر بخت جان لے۔ اس نے بھی تو صرف سرورق کی خوب صورتی دیکھی تھی اور خریدنے پر مچل گئی۔ ہونہہ ہشت بشائر۔۔۔ عقل کے ناخن لو!''
☆☆☆
''میں پہلے خوش تھی۔ پھر اداس ہوگئی۔ اب پھر خوش ہوں۔''
''آپ نہیں تھے نا ابو۔۔۔ آپ سب لوگ۔۔۔ امی، بھائی، چھوٹی۔۔ لیکن اب میں یہاں مزے میں ہوں۔ آپ کی صحت اچھی ہے نا۔ باہر کے ممالک میں خوراک ملاوٹ سے پاک غذائیت بخش ہوتی ہے۔ آپ کتنے صحت مند ہوئے۔
امی کا رشتہ دیکھنے کا شوق پورا نہیں ہوا۔ اب کس پر نظر کرم۔ اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ایسا کون جو اتنا زیادہ پسند آ گیا۔'' وہ کرسی پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ ایک پیر مسلسل ہل رہا تھا۔ قمیص کی نادیدہ شکنیں دور کرتے وہ بہت پرسکون ہو کر ابو سے فون پر محو گفتگو تھی۔ بہت دنوں بعد تفصیلی بات ہو رہی تھی۔
''اچھا آپ کو بھی سب اچھا لگ رہا ہے۔ یعنی کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے بلوانے کی فکر میں کیسی جلد بازی۔۔۔ میں بہت اچھی طرح سے ہوں ابو، مزے میں۔
نہیں مجھے کوئی پریشانی نہیں۔۔۔ یہاں سب بہت اچھے ہیں۔۔۔ اچھا کہوں گی سب کو سلام دعا۔۔۔ ہاں ہاں مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ پیسوں کی بھی ضرورت نہیں۔ پچھلے والے بھی خرچ نہیں ہوئے۔''
وہ باپ کو یقین دلانے کو ہر طرح سے تسلی دے رہی تھی۔ رابعہ خاتون باقاعدہ کرسی رکھ کے اس

کے قریب بیٹھی تھیں۔ یک طرفہ گفتگو سے نتیجہ اخذ کیا تھا۔ راحیلہ اور سجاد نے اس کے لیے وہاں کینیڈا میں کوئی رشتہ دیکھا تھا۔ وہ تفصیلات جاننے کو بے چین تھیں۔

"زیادہ تو مجھے پتا نہیں۔ مگر ابو آپ کو تفصیلی کال کریں گے۔ ابھی تو کہنے لگے۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے بہت زیادہ یاد آنے لگی تو نمبر گھما لیا۔۔۔ بس۔۔۔" باپ کی آواز اور بے قراری کو وہ بھانپ لیتی تھی۔ ایک سرشاری سی اسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"تو آپ شادی کر کے کینیڈا جائیں گی۔" عدینہ اپنے پیر نیم گرم پانی میں ڈبوئے بیٹھی تھی۔ قیاس اس نے بھی لگایا۔

"شاید۔۔۔ پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

عدینہ نے ذرا سی ناک سکوڑی۔ "ہونہہ۔۔۔ کینیڈا۔۔۔" کچھ لوگ ہر اچھی چیز کو بس اپنے لیے چاہتے ہیں۔ دوسرے کو بھی اچھی مل رہی ہے۔ پتا لگ جائے تو بلا وجہ ہی پہلو بدلتے پائے جاتے ہیں۔

"ہیلو۔۔۔ السلام علیکم نانو۔۔۔" مامون تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام۔" رابعہ خاتون مسکرائیں۔ وہ راحیلہ کے حوالے سے اپنے خدشات کے غلط ثابت ہونے پر خوش تھیں۔ عدینہ نے جوش سے ہیلو کہا۔ بشائر نے فقط سر ہلا کر جواب دیا۔ وہ آج شمسہ بیگم کے ہمراہ بازار جانے کو تیار تھی۔ لاہور سے آنے کے باعث اس کے پاس بے حد گرم کپڑے تھے۔ کچھ نارمل کاٹن لینن پرنٹس کے لیے وہ چکر لگانا چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ سنگھار میز کے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ کی گہری وادیوں میں اتر سی گئی۔

"ہاں۔۔۔ اس خیال نے ہر پل اس کے دل پر ستم ڈھایا تھا کہ ابو اسے چھوڑ گئے۔ وہ فطرتاً مثبت سوچ رکھتی تھی۔ اس نے سوچا، اچھا ہوا، ابو کینیڈا چلے گئے۔ ابو اب بوڑھے ہو رہے تھے۔ وہ اکلوتے تھے۔ جبکہ راحیلہ امی کا سارا خاندان کینیڈا میں شفٹ ہو چکا تھا۔ اس کے سوتیلے چھوٹے بہن، بھائی سحر اور احد بہت چھوٹے تھے۔ ابو نے ان کے مستقبل کے حوالے سے بروقت فیصلہ کیا تھا۔ مگر اسے بہت ہلکا ہی سا مگر یہ خیال آیا تھا۔ ابو نے اس کا خیال نہ کیا۔ مگر نہیں۔۔۔ وہ اس کے لیے فکر مند تھے۔ آج کتنی دیر وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔" ابو۔۔۔ میرے پیارے ابو۔۔۔ سحر۔۔۔ احد اور راحیلہ امی آپ بھی۔۔۔ آئی لو یو آل۔"

دل ہلکا پھلکا تھا۔ اس نے یوں ہی اپنا جیولری بکس کھول لیا۔ انگلی بھر لمبائی کا باریک چین نما بندہ ایک سفید موتی کان کی لو سے چپکا تھا اور دوسرا زنجیر کے سرے سے چپکا ہر جنبش پر گردن کو چھوتا تھا۔ اس نے کچھ گنگناتے ہوئے زور سے بالوں میں برش پھیرا۔ پرفیوم کا اسپرے، اپنے گداز ہونٹوں پر چاکلیٹ، براؤن رنگ کی لپ اسٹک لگالی۔ اس کی تو مانو جون ہی بدل گئی۔ یہ یہاں آنے کے بعد اس کا پہلا سنگھار تھا۔

رابعہ خاتون کی کسی بات کا جواب دیتا مامون اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ بقیہ جملہ حلق میں پھنس گیا۔ اسے سنجیدگی سے تکتی عدینہ نے نظروں کے تعاقب میں جب گردن گھمائی۔ تو بے حد حیرت کے عالم میں یک دم کھڑی ہوئی تو پیر ٹب کے اندر تھے۔ ایک چھپاکا سا باہر اچھلا۔ وہ سرعت سے بیٹھی۔ مگر چہرے

کے ہونق تاثرات ہنوز تھے۔
''ماشاء اللہ بیٹی۔۔۔تم تو بس منہ ہی دھو کر رہتی ہو۔کیا خوب چہرہ چمک اٹھا۔ایسے ہی رہا کرو۔۔۔باپ کے فون نے خوشی بھر دی ہے اس کے اندر۔''اگلا جملہ مامون کے لیے تھا۔
مامون مسکرایا۔''کیسے ہیں وہ۔۔۔سب خیریت۔''
''ہاں وہ ٹھیک ہیں۔رات میں سحر اور احد بھی بات کریں گے۔''وہ واقعی بہت خوش تھی۔''میرے چھوٹے بہن، بھائی ہیں۔''اس کے لہجے میں محبت کا سمندر تھا۔
''ہاں ماشاء اللہ۔میں نے دیکھا تھا۔پورا سجاد کا بچپن ہے۔''رابعہ خاتون نے یادداشت ٹٹولی۔
مامون نے سر ہلایا۔عدینہ ابھی تک سکتے کے عالم میں تھی۔لال، گاجر اور براؤن رنگ کے چنری پرنٹ کا ڈھیلا ڈھالا سوٹ۔اس کے آویزے انوکھے تھے یا گردن کی لمبائی یا ہونٹوں کا نیا رنگ یا سوٹ بہت خوب صورت تھا۔وہ بے وقوفی کر رہی تھی۔ہر شے اپنی جگہ مکمل۔معاملہ یہ تھا کہ عدینہ کو اپنے آگے کوئی اور نظر آتا ہی نہیں تھا۔وہ دیکھنا چاہتی بھی نہیں تھی۔
''میں جاؤں دادی جان۔۔۔شمسہ آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی۔''اس نے دوپٹا اپنے گرد لپیٹا۔
''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔بالکل۔۔۔بہت شوقین ہیں شمسہ بازاروں میں گھومنے کی اور بھئی مہارت بھی خوب ہے بھاؤ تاؤ میں،ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔''رابعہ خاتون نے تعریف کی۔
''ایک منٹ بشائر!آپ آج شاپنگ سے فارغ ہولیں۔تو کل یا جب ٹائم نکالیں۔ذرا گھر تک چلیے گا۔لان کے لیے کام شروع ہو گیا ہے۔''مامون کے پکارنے پر وہ رک گئی۔اس نے اس شخص کے چہرے کو دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔
''آپ نے شروع کروایا ہے تو یقیناً اچھا ہوگا۔میرا جانا ضروری تو نہیں۔''وہ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔
''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار چلیں۔''مامون نے زور دے کر کہا۔بشائر نے رابعہ خاتون کا چہرہ دیکھا۔
''چلی چلنا بیٹا۔۔۔بڑی محنت سے میرے بچے نے یہ سب بنایا ہے۔بڑی ہمت ہے اس کی۔''
رابعہ خاتون کو مامون سے عشق اور آنکھ بند کر کے یقین تھا۔اس کی مداح سرائی تو وہ سوتے میں بھی کرتی تھیں۔
اس نے عدینہ کو دیکھا۔وہ اپنے پیروں پر تولیہ رگڑنے لگی تھی۔مگر اب ساکت ہاتھوں اور نظروں سے مامون کو دیکھ رہی تھی پہلی بار۔اس نے اسے نہیں کہا۔اس نے بشائر کی رائے کو۔۔۔اسے یہ خیال ہی کیوں آیا کہ وہ بشائر کو لے کر جائے گا۔اس نے۔۔۔
''دراصل لان تو آپ دیکھیں گی ہی۔۔۔اصل بات یہ ہے کہ میں نے لاؤنج اور کچن کے بیچ دیوار اٹھا دی ہے اور کچن کی بیک دیوار پر ایک بڑی ونڈو رکھوا دی جو بیک ایریا میں کھلے گی۔آپ وہ دیکھیں۔''مامون نے اصل بات کہی۔
''جی۔۔۔''بشائر اچنبھے کے عالم میں پھنسی آواز کے ساتھ بدقت کہہ سکی۔

"کیا۔۔۔" عدینہ چلائی۔
"کون سی دیوار چنوادی۔" عظیم خان نے آدھا کانا قصہ سنا" میرا مطلب اٹھوادی۔۔۔ اور خیر چنوادی تو چنوادی۔ مگر کیا بیک گراؤنڈ میں "محبت کی جھوٹی کہانی پر روئے" کا ریکارڈ چلایا تھا" وہ تسلی سے صوفے پر ٹکے۔
"اف!۔۔" رابعہ خاتون نے اپنا سر پکڑا۔ مامون کے بے ساختہ قہقہے میں بشائر اور عدینہ کی آواز بھی شامل ہوگئی۔
"بھئی، اس لیے کہا کہ ذرا ماحول سا بن جاتا۔ دیوار میں چنے جانے کا دکھ آدھا رہ جاتا۔ گانا مکمل۔۔۔ دیوار مکمل۔۔۔ اب روتی ہے تو روتی رہے۔ ہاں بڑی چوٹ کھائی جوانی پہ روئے ے ے ے۔۔۔ محبت کی۔"
رکتی ہنسی نے ایک بار پھر زور پکڑا۔ مامون کے انکشاف کا اثر ختم ہوگیا۔
فون بیل پر رابعہ خاتون نے بشائر کو عجلت سے آواز دی۔ شمسہ بیگم گھر سے نکلی گلی میں کھڑی تھیں۔ بشائر ہنستا چہرہ لیے باہر کو لپکی۔
پیچھے مامون، عظیم خان کو چنی دیوار کا حدود اربعہ بتا رہا تھا۔
عدینہ کی نظریں مامون کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ مگر دھیان کسی اور ہی انجان سفر پر گامزن تھا۔

☆☆☆

"وہ ایسا ہی ہے۔" بازار سے ڈھیروں ڈھیر خریداری کے بعد وہ شمسہ بیگم کے گھر ہی لوٹی تھی۔ بخت ان دونوں کے لیے چائے بنا کر لے آیا۔ بشائر دونوں ہاتھوں سے اپنے پیروں کی انگلیاں دباتی۔ شمسہ بیگم کو سن رہی تھی۔ اس نے مامون اور اس کے گھر کے سارے قصے کو انہیں سنایا تھا۔ اپنی حیرت۔۔۔ اور اتنا فوری اور انتہائی ری ایکشن۔۔۔ وہ راستے میں یہی گفتگو کرتی آرہی تھیں۔
"وہ کسی شے میں کمی یا کجی برداشت کر نہیں سکتا۔ بعض اوقات اس کی یہ عادت بہت اچھی لگتی ہے اور بعض دفعہ ایک جنون، بے وقوفی۔۔۔ اعتدال بہترین رویہ ہے۔ نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔" وہ کہہ رہی تھیں۔
"آپ بہت ہلکے جملے استعمال کر رہی ہیں والدہ ماجدہ۔۔۔ سیدھی بات کریں تو ایک ہی جملہ۔۔۔ یہ ایب نارملٹی کی ایک صورت ہے۔" چائے کے گھونٹ لیتے بخت نے ماں کی تصحیح کی۔
"پاگل ہے یہ ایسے ہی اِدھر اُدھر کی ہانکتا ہے۔" بیٹے کو گھورتے ہوئے وہ بشائر کی جانب گھومیں۔ "بھئی ہر بندے کی اپنی عادت ہوتی ہے۔ کچھ لوگ نقص برداشت نہیں کرتے۔ ختم کہانی۔"
"ماں! دنیا میں کوئی شے جو انسان نے بنائی ہو، بے عیب ہو ہی نہیں سکتی۔ جب انسان کا وجود عیب ثواب سے مل کر بنا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے اعمال میں بس اچھائی رہ جائے۔ انسان اچھا بھی کرتا ہے اور برا بھی۔ بس یہ ہے کہ ہر کسی کے پاس اس کا تناسب کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔"
"ارے میرے والد صاحب خدا کے لیے۔" شمسہ بیگم نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی سے ٹکرائے۔ یہ اتنے مشکل جملوں کی مار نہ مارنا، ابھی صبح ہی تمہارے ابا مجھے کفایت شعاری اور انسان کی

زندگی کے لیے انتہائی ضروری چند چیزیں گنوا گئے ہیں کہ میں بازاروں میں میچنگ دھاگے اور لیسوں کے لیے وقت کیوں ضائع کرتی ہوں۔ جبکہ زندگی بس چار دن کی ہے اور اپنے ان خیالات کو پہلے معاشرتی، پھر معاشی بعد میں کفایتی اور رانت میں خوف خدا کے حوالے سے اس طرح بیان کیا کہ۔۔۔"

وہ بشائر کی جانب مڑیں۔

"میرا دل چاہا جنگلوں میں جا نکلوں، دنیا تیاگ دوں، سب کچھ دان کر دوں اور اب بیٹا مجھے الگ فلسفے سمجھانے لگا ہے۔ ان باپ، بیٹا کو کوئی اور تو سنتا نہیں۔ بس میرے آگے ہی راگ سناتے ہیں۔ بھئی مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے مامون۔ صورت ہی دیکھو، کتنی پیاری ہے، ہے نا۔"

"اُف۔۔۔" بشائر نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ پوچھا بھی تو کس سے اور کیا؟

"جند جان ہے رابعہ خاتون کی۔۔۔ اور اگر ہے اس کی عادت۔۔۔ تو کوئی برائی تو نہیں ہے نا۔ اعلا تعلیم، کاروبار اور اب گھر بھی بنالیا۔

منہ سے براہ راست تو کچھ طے وے نہیں ہوا۔ مگر سامنے کی بات ہے۔ رابعہ خاتون تو چاہتی بھی یہی ہیں کہ عدینہ اور مامون۔۔۔ انہیں دنیا میں سب سے پیارے ہیں۔ عظیم بھائی منہ سے کچھ نہیں بولے آج تک۔ مگر انہیں اعتراض کرنا بھی کیا ہے اور بھئی سب سے اہم بات تو ہے کہ لڑکی۔۔۔ اور اس مامون کا انداز تو شروع سے یہی ہے۔ بچپن کا ساتھ ہے بھئی۔ ایک گھر۔۔۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

وہ بشائر کو بعد میں سارا قصہ سنا رہی تھیں۔ اس سے پوچھا۔

اس نے ایک حتمی احساس کے تحت نفی میں گردن ہلائی۔

ہاں کسی کو کیا اعتراض۔

☆☆☆

"میری سمجھ میں نہیں آتا مامون۔۔۔ تم کیسے ہو بیٹا۔ ہر چیز جہاں تہاں چھوڑ کر چل دیتے ہو۔"

مامون تخت پر لیٹا ہوا تھا۔ سر رابعہ خاتون کے زانو پر تھا۔ وہ کچھ آزردہ، کچھ پریشان سی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"پر جاتے کہاں ہو، یہ تو پتا چلے۔"

"پتا نہیں۔۔۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بھی نہیں پتا تو پھر کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت۔"

"مجھے یہ کشٹ اٹھانا ہی ہے نانو۔۔۔ میں بہت مجبور ہوں رک نہیں سکتا۔" اس کے انداز میں ہار، بے چینی، دکھ عود کر آیا۔ "کہیں باہر چلیں شام کو۔"

"مجھے بھی لے چلیے نا مامون۔" عدینہ کی جوشیلی آواز۔

مامون نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ عدینہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کا سنگھار رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں اور کلائی میں کہنیوں تک تازہ مہندی لگی تھی۔

''کیسی لگ رہی ہے۔'' مامون کی نظروں کے تعاقب نے اسے سوال پر مجبور کیا۔
''بہت اچھی۔۔۔ بڑی مہارت سے لگائی گئی ہے بہت خوب!'' مامون نے عدینہ کے بڑھائے ہاتھ کی سب سے لمبی درمیانی انگلی کو بصد احتیاط اپنی انگلی سے اٹھایا اور ڈیزائن بغور دیکھا۔
''ارے بنو۔۔۔ کس کی بارات چڑھ رہی ہے جو تم۔۔۔'' رابعہ خاتون نے سر پیٹا۔
''لو بارات کیوں۔ خود ہی تو کہتی ہیں۔ کنواری لڑکیاں سر میں تیل ڈالتی ہیں۔ آنکھ میں کاجل کی باریک دھار اور ہاتھ میں مہندی۔۔۔ اب میں نے لگوالی تو طنز کرنے لگی ہیں۔''
''اوئی اللہ۔۔۔ وہ کجلے کی دھار اور تمہارے لائنر مسکارے۔۔۔ اور وہ مہندی بس پورڈھک لی یا بتاشہ بنالیا۔ وہ بھی باپ، بھائیوں کی نگاہ نہ پڑے۔ یہاں تو تم نے دلہنوں کو مات دے دی۔ تمہیں سنائی غلط دیتا ہے یا اپنی مرضی کی تشریح کرنے کی عادت ہے۔'' رابعہ خاتون جلبلا کر بولنا شروع ہو گئیں۔
''آپ چھوڑیں دادو کو مامون! مجھے لے چلیے نا۔''
''چپکی بیٹھی رہو۔۔۔ مجھے بھی لے چلیے۔ ایک موصوف جب جی چاہا، جہاں دل چاہا اٹھ کر چل دیے۔ یہ بھی ہم قدم ہوں گی۔'' رابعہ خاتون کو دونوں پر ہی غصہ آ گیا۔ تیزی سے چپل پیروں میں ڈال کھڑی ہو گئیں۔
مامون بھی کھڑا ہو گیا۔ ''نانو پلیز۔'' اس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔
''ہٹو مامون! مجھے نماز پڑھنی ہے۔'' رابعہ خاتون کا چہرہ مزید تن گیا۔ وہ اندر بڑھ گئیں۔ مامون بے بسی سے ان کی پشت کو دیکھنے لگا۔ عدینہ اپنی مہندی پر پھونکیں مار رہی تھی۔ نظریں ملنے پر پروا نہ کرنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

''ارے بٹیا! تصویر تو بہت اچھی ہے۔ مگر مجھے بس یوں ہی ایک خیال آیا۔ بلکہ خیال کیا ایسا ہوتا ہی ہے۔ قبر میں ٹانگیں ہوتی ہیں اور رشتے کرواتے وقت اپنی وہ تصویر بھجوا دیتے ہیں جو میٹرک کے فارم میں لگی تھی۔'' رابعہ خاتون نے کل سے اب تک تصویر کو چھوڑا نہیں تھا۔ ''وہ بھی اگر میٹرک کیا ہوگا۔۔۔ تو۔۔۔'' شمسہ بیگم نے نقطہ یاد دلایا۔
''جس کے دیکھنے کو یہ تصویر سجاد میاں نے بھیجی ہے آپ نے اس بے چاری کو بھی دیکھنے دی ہے یا۔۔۔ خود ہی پوسٹ مارٹم کرتی رہیں گی۔''
''ہائیں۔۔۔'' عظیم میاں نے قہقہہ لگایا۔ رابعہ خاتون کے جوش و خوشی نے اس جانب دھیان ہی نہ دیا۔
''لو بٹی دیکھ لو۔۔۔ مجھے تو دھیان ہی نہ رہا۔'' رابعہ خاتون نے بے ساختہ تصویر اس کی جانب بڑھا دی۔ بٹی نے تھام لی۔ مگر دیکھنے سے احتراز کیا۔
وہ خوش تھی یہاں بہت، یہاں رہنا ایک بے حد خوش گوار تجربہ تھا۔ یہاں صرف محبت تھی۔ ہر جانب سے عزت و احترام اور پیار۔۔۔ مگر وہ مہمان تھی اور اسے واپس جانا تھا۔ اپنے والد کے پاس بہن، بھائیوں کے پاس۔۔۔ ان سب کی یاد اسے بے چین کرتی تھی اور واپسی کا سب سے آسان

راستہ۔۔۔وہاں کے نیشنل سے شادی بھی ہوسکتا تھا۔اسے راحیلہ امی کے حساب کتاب اور ہر پہلو کو سامنے رکھ کے چلنے کی عادت کا پتا تھا۔وہ اپنے معیار سے کم پر نہیں ٹھہرتی تھیں۔اور پھر جس بندے کو راحیلہ نے پسند کرلیا تھا اور سجاد نے بھی ہامی بھری۔وہ ایسا ویسا تو ہوگا نہیں۔کینیڈا کی کسی بڑی فرم میں کمپیوٹر انجینئر۔

صرف بشائر کی ہاں اور فیصلہ صادر۔

اس نے سرسری نگاہ میں ہی تصویر میں موجود بندے کی شخصیت کو بھانپ لیا تھا۔"شان دار"ابو نے پسندیدگی کی سند دی تھی۔ابو نے رات ہی عظیم خان سے بہت تفصیلی گفتگو کی تھی۔رابعہ خاتون بہت خوش تھیں۔راحیلہ اور سجاد کے حوالے سے ان کے خدشات بے بنیاد رہے۔

"تو کیا اب ٹیلی فون پر نکاح ہوگا اور آپ دلہن بن کر جہاز میں فٹوں۔۔۔"رات عدینہ تصویر لیے بیٹھی تھی۔اس نے ہاتھ کے اشارے سے جہاز اڑایا۔

"ویسے فلموں میں تو دیکھا ہے لہنگا پہن کر دلہن جہاز سے اترتی ہے۔دولہا پھول لیے منتظر۔۔۔ہائے سو رومینٹک۔"عدینہ نے آنکھیں میچیں۔

"ہاں تو پھر آپ کے ابو نے بتایا نہیں۔۔۔نکاح کب ہوگا۔میں تو کہتی ہوں،جلدی ہی کرلیں۔اچھے اچھے کپڑے بنیں گے واہ!"عدینہ کے چہکنے میں ایک طمانیت سی تھی اور اسے شاید اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

"ایسے نکاح کیسے ہوسکتا ہے عدینہ۔۔۔!میں وہاں جاؤں گی۔سب سے ملوں گی۔پھر فیصلہ ہوگا۔"

"یعنی آپ کو اپنے امی،ابو کے فیصلے پر اعتماد نہیں۔"عدینہ حیرت سے چلائی۔

"اعتماد تو ہے۔مگر یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔روبرو دیکھنا ملنا تو حق بنتا ہے نا۔"وہ متانت سے کہہ رہی تھی۔

"اور اگر آپ کو پسند نہ آیا تو۔۔۔"عدینہ کی زبان سے خدشہ اگلا۔

"میرا خیال ہے،مجھے پسند آجائے گا۔"بشائر نے ٹھنڈی سانس لی"اور اگر نہ آیا تو کسی اور کو آزمائیں گے یا پھر انتظار۔"اس نے عدینہ کو ڈرانے کی کوشش کی۔یوں ہی شرارتاً۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ بشائر۔کینیڈین نیشنل،اتنی اچھی جاب،قابل،شکل بھی اچھی ہے اور کیا چاہیے۔۔۔"

بشائر مسکرادی۔"نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"ہاں تو بس جلدی کریں۔آپ شادی وہاں جاکر کرلیجیے گا۔مگر۔۔۔ہاں ہم آپ کے جاتے وقت ڈھولکی رکھ لیں گے۔گانے گائیں گے۔بلکہ مایوں کرلیں گے۔سچ دھوم دھڑکا کیے عرصہ ہوا۔"

"تو تم شادی کرلونا۔۔۔میں نانو سے کہہ دیتی ہوں،میری موجودگی میں ہی تمہاری کردیں۔میں بھی دھوم دھڑکا دیکھ لوں گی۔"بشائر نے نہ جانے کس دل سے کہا۔وہ چاہتے ہوئے بھی رابعہ خاتون سے

ماموں اور عدینہ پر کبھی بات نہیں کر سکی تھی۔
عدینہ کا چہرہ پھیکا سا ہوا۔ "میری شادی۔ وہ تو ابھی بہت دور ہے۔ بلکہ پتا نہیں کتنی دور۔" اس کے انداز میں پہلی بار آزردگی سی آئی تھی۔
بشائر نے بے ساختہ اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ "کیوں اتنی ی ی دور کیوں کہا۔"
عدینہ چپ رہی، پھر طویل سانس لے کر بولی۔
"پتا نہیں۔" اس کے چہرے پر اکتاہٹ سی آ گئی۔ جیسے یک دم دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا ہو۔
اس سے شمسہ بیگم نے بھی ماموں اور عدینہ کے رشتے کی راہ میں حائل کسی وجہ کا ذکر کیا تھا۔ مگر بخت نے بدتمیزی سے ٹوک دیا۔
"کیا وجہ بھلا۔۔۔سب کچھ تو ٹھیک ہے۔ پھر۔۔۔"

☆☆☆

"تو یہ جو آپ اتنے دنوں سے غائب تھیں۔ تو فارغ وارغ نہیں تھیں۔ کام سے لگی تھیں۔" بخت نے پالینے کے سے انداز میں کہا۔
"کام۔۔۔کون سا کام۔" بشائر نے چونک کر بخت کی صورت دیکھی۔ پھر عدینہ کی۔ اس نے بھی آنکھیں نچا اور منہ بنا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔
"بھئی وہی۔۔۔" بخت نے لمبا کھینچا "محبت!" اس نے شعوری توقف کیا۔ "محبت بھی تو ایک کام ہے ناں۔" عدینہ کا چہرہ بگڑا، سب اس کے سر سے گزر گیا تھا۔ بشائر نے آنکھیں سکیڑ کر بخت کی شکل دیکھی۔ جو اپنی بات ختم کر کے مزے سے پکوڑا کھانے لگا تھا۔
"یہ بخت۔۔۔اسے کیسے پتا۔۔۔کیا میرے چہرے پر لکھا نظر آتا ہے کہ میں۔" بشائر نے سٹپٹا کر بے خیالی میں اپنے چہرے پر انگلیاں پھیریں اور واقعی اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ بخت کو ترس آ گیا۔ اس نے عدینہ کے چہرے پر نگاہیں جمائیں۔
"بھئی، وہ مابدولت نے سنا کہ کینیڈا سے ایک تصویر آئی تھی۔ نام پتے کے ساتھ۔ نوٹ بھی لکھا تھا کہ بیٹی بشائر اب تم اس شخص سے محبت کرو، سو جنابہ مصروف تھیں۔ اماں، ابا کے دیے کام کو بڑی دل جمعی سے کر رہی تھیں، باہر تک نہ نکلیں۔ تنگ آ کر آج مجھے ہی آنا پڑا کہ دیکھوں کہ کیا مل گیا کہ جنابہ سدھ بدھ کھو بیٹھیں۔"
"تت۔۔۔تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کیا اناپ شناپ بکے جا رہے ہو۔ ارے اللہ۔"
بشائر کی تو جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی۔ حیران آنکھوں سے بخت کی صورت دیکھنے لگی۔ عدینہ بھی سراپا سوال بنی تھی۔ مگر ایک استہزا بھی تھا۔ ایسے ہی تو وہ بخت سے نہیں چڑتی۔ دیکھیں اس کی باتیں۔
"اس میں اتنا شاک کیوں لگ رہا ہے یہی تو ہوتا ہے ناں ہمارے ہاں، اماں ابا خوب چھان پھٹک کر بر تلاشتے ہیں۔ شکل، ذات برادری، رتبہ اور مطمئن ہونے کے بعد عزیزی دختر نیک اختر کو تصویر دے کر کہتے ہیں۔ ہم نے ساری کاغذی کارروائی مکمل کر لی۔ اب تم شریف بچیوں کی طرح اس سے محبت

کرو اور اگر کوئی قسمت کی ماری کہہ دے کہ نہیں جی وہ۔۔۔ تو ڈنڈے کے زور پر۔ عقل کی اندھی! تجھے اسی سے محبت کرنی ہے۔ اچھا شکل نہ بگاڑیں۔ عقل کی اندھی نہیں کہا ہوگا۔ مگر بعض باتیں زبان سے نہیں کہی جاتیں۔ بس سمجھ لی جاتی ہیں۔ غلط کہہ رہا ہوں کیا۔"

بخت کے خاموش ہونے پر عدینہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

"اب کہی تو تم نے سچی ہے مگر جس طرح مجھ سے جوڑی ہے وہ۔۔۔" بشائر کا ہونق چہرہ مسکراتے رنگ میں ڈھل گیا۔

"میرے ابو نے ایسا ویسا کچھ نہیں کہا۔ سمجھے۔۔۔"

"منہ سے تھوڑی کہتے ہیں مجال ہے جو زبان ہلائی جائے۔ یہ تو میراث کی طرح ہوتا ہے نسل در نسل منتقل۔" وہ پکا تھا۔

"ویسے امی بتا رہی تھیں نام بھی شان اور ہر شے بھی شاندار میں نے کہا۔ بشائر ڈیز رو بھی کرتی ہیں۔ جبکہ ہمارا یہ حال ہے کہ۔۔۔

یہاں کسی کو بھی حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

اس نے بڑے جذب سے شعر پڑھا بشائر ٹھٹک کر رک گئی۔

اس نے شعر کو خود پر رکھ کے سوچا پھر اگلے ہی پل عدینہ کو دیکھا جو پکوڑے کھانے میں مگن تھی۔ بخت کی شکوہ کناں گہری نگاہوں سے انجان وہ اپنی دنیا میں مگن تھی۔ بشائر کو دکھ ہوا بخت کے لیے۔ جانتے بوجھتے بے وقوفی کیوں ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

"تو پھر تم خوش ہونا بیٹی۔۔۔!" رابعہ خاتون اس کے بالکل سامنے کرسی رکھ کر بیٹھی تھیں۔ کرسیاں اتنی نزدیک تھیں کہ آن کے گھٹنے اب ٹکرائے کہ ٹکرائے۔ بشائر بدقت مسکرائی۔

"تم خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے۔ میں تمہیں اونچ نیچ سمجھاؤں میں نے تو کہہ دیا بچی خود ہی ماشاء اللہ بہت دانا ہے۔ سلجھی ہوئی تمیز دار مگر میں کہوں گی ضرور۔۔۔"

"دیکھو بیٹی۔۔۔! شادی کی ایک عمر ہوتی ہے، اللہ توبہ طعنہ نہیں دے رہی مگر تم شادی کی عمر کو یا نو نکال ہی چکی ہو میں نے بیٹی کی شادی انیس میں کی۔ بعد میں مجھے لگا، بہت جلدی کر دی بڑا پچھتائی تھی میں۔۔۔" وہ کھو سی گئیں۔ "پکا فیصلہ کر لیا، کبھی اتنی کم عمری کی شادی کی حمایت نہ کروں گی مگر اب اس عدینہ کو دیکھو کیس کی ہے۔ مگر مجھے ہر وقت خیال آتا ہے بس رخصت کر دوں۔" ان کے چہرے پر دکھ سا تیرنے لگا۔

"تو آپ کر دیجیے ناں دادو جب کہ اب تو۔۔۔"

"ہاں کر تو دوں مگر۔۔۔ ایسے ہی خوامخواہ کی رکاوٹیں ہیں تمہارے دادا۔۔۔ اور پھر وہ ماموں، میرا ارادہ جانتا ہے مگر اپنی ضد پر۔۔۔ چھوڑو بیٹی! میں تو خود ہی مستقبل کے منصوبے بناتی رہتی ہوں۔ سب آج کل اپنے حساب سے چلتے ہیں۔"

وہ کچھ دل گرفتہ ہوگئیں۔ بشائر چونک گئی۔ رابعہ خاتون ہی تو سرپرست تھیں عدینہ اور مامون کی اور یہ دادا کا اعتراض رکاوٹ۔

''دادا جان کیا کہتے ہیں۔ انہیں کیا اعتراض۔۔۔''

رابعہ خاتون چونکیں۔ بشائر کو ان کی آنکھیں ڈبڈبائی سی لگیں۔ ''ان کی تو تمہیں پتا ہے نا دنیا سے نرالی منطق۔ بات وہاں سے نکال کر لاتے ہیں۔ جہاں ہم تم جیسوں کی سوچ کا جانا ناممکن ہو، سامنے نظر آتی پانچ حسیں انہیں غلط لگتی ہیں اور چھٹی نادیدہ حس کے الارم کو سچ مانتے ہیں۔ منہ پھاڑ کر تو کبھی نہیں بولے۔ مگر انہیں ہچکچاہٹ ہے عدینہ اور مامون کے رشتے پر۔۔۔ ان کا ہاتھ ہی تو میری پشت پر نہیں ورنہ آج نہ نکاح پڑھا دوں۔''

''جی! میں سمجھی نہیں دادو۔'' بشائر حیران تھی۔

''میں خود نہیں سمجھی تو تمہیں کیا سمجھاؤں۔'' رابعہ خاتون یکدم بے زار ہوگئیں۔

''سب ہی منہ بند کر کے بیٹھے ہیں۔ تم بولو پھر ہاں کا ٹیلی فون کر دوں تمہارے بابا کو۔''

بشائر طویل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

''میں وہاں جا کر ہی فیصلہ کر سکوں گی دادو!'' اس نے سر جھکا کر کہہ ہی دیا۔

''ہاں۔۔'' رابعہ خاتون نے اس سے زیادہ ٹھٹھری ہوئی سانس لی۔ ذرا سا سر نیچے کر کے بشائر کا چہرہ دیکھنا چاہا مگر بالوں کا گچھا درمیان میں حائل ہو گیا تھا وہ ناکامی تسلیم کرتے ہوئے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے کھڑی ہوگئیں۔ ''یہ بھی صحیح ہے بیٹی۔۔۔''

☆☆☆

بے ہنگم سا غیر متوقع شور۔۔۔ وہ گہری نیند سے یکدم بے دار ہوئی تو مانوس ہونے میں چند پل گزرے۔

''اونو۔۔۔!'' اس نے برق کی سی تیزی سے چادر اتاری۔ یہ آوازیں تو رابعہ خاتون اور عدینہ کی تھیں، وہ سرپٹ دوڑی آوازوں کے تعاقب میں۔

''اومائی گاڈ۔۔۔!'' عظیم خان سینے پر ہاتھ رکھے دہرے گیند سے بنے ہوئے تھے اور ان کا چہرہ اوپر کرنے کی سعی میں نڈھال اونچی آواز سے روتی رابعہ خاتون۔۔۔ عدینہ دادا کی پشت رگڑ رہی تھی، وہ ان سے چپکی ہوئی تھی اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ ان کے ہاتھ کے بوسے لیتی تھی۔

بشائر نے فوری فیصلے کے تحت اپنے کمرے کی جانب دوڑ لگائی۔ نیچے آ کر بخت کے گھر کا نمبر ملایا۔ بخت نے لفظ ''دادا جان کو نجانے کیا ہو رہا ہے۔۔۔'' جیسے ادھورے جملے کو سن کر ہی ریسیور رکھ دیا تھا وہ ادھر آنے کے لیے بھاگ نکلا تھا۔

''مائنر سا اٹیک تھا مگر اب وہ ٹھیک ہیں۔ کل تک کے لیے ہم آبزرویشن میں رکھیں گے۔'' ڈاکٹر نے تفصیلی چیک اپ کے بعد ان سے کہا۔

''جب۔۔۔ ٹھیک ہیں تو۔۔۔ آبزرویشن۔۔۔ میں کیوں؟'' رابعہ خاتون نے کپکپاتی آواز میں ڈاکٹر کی تسلی کو مسترد کر دیا۔ وہ کھڑی ہوتیں تو ٹانگیں کانپتی تھیں اور بیٹھ جاتیں تب بھی انجانے خوف سے

پورا وجود لرزہ براندام۔

بشائر نے اپنے بازوؤں میں انہیں سمیٹ کر دوسرے ہاتھ سے بکھرے بال جمائے اور دوپٹا سر پر ٹکاتے ہوئے ڈاکٹر کو مسکرا کر دیکھا۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔۔۔!"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ احتیاط کے پیشِ نظر ایک دن کے لیے رکھا ہے۔ کچھ سیٹ ہونا باقی ہیں۔ آپ سب بیٹھے میں چائے لاتا ہوں۔"

"میں عظیم صاحب کے بغیر ایک منٹ زندہ نہیں رہ سکتی بیٹی!" رابعہ خاتون نے شکست خوردہ لہجے میں اپنی مجبوری بتائی۔ عدینہ آگے بڑھ کر رابعہ خاتون سے لپٹ گئی۔

بشائر نے اپنی پوروں سے ان کے جھریوں والے گال پونچھے، وہ انہیں سہارا دیے بینچ پر بٹھانے لے آئی۔

"تم تو اپنا رونا بند کرو۔ پہلے ہی ان کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ مجال ہے جو تم میں ذرا سی موقع شناسی ہو۔ احمق اعظم!" بخت نے آگے بڑھتی عدینہ کا ہاتھ کھینچا اور دانت پیس کر تنبیہ کی۔ اس کے جملے سے زیادہ قطعی تاثرات اور ناگواری چہرے پر جمی تھی۔ تب ہی رابعہ خاتون نے بخت کے چہرے پر دیکھا۔ بخت فوراً مسکرایا۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ان کے بغیر نہ جی سکنے والی بات غلطی سے بھی ان کے سامنے مت دہرا دیجیے گا۔ ورنہ اس بار ہونے والا اٹیک مائنر بہر حال نہیں ہوگا۔"

اس کا انداز شرارت سے بھرپور تھا۔ بشائر کھل کر مسکرائی۔ رابعہ خاتون بھی بات سمجھ کر پھیکی مسکراہٹ لے آئیں۔ عدینہ اپنے ہاتھ کو سہلا رہی تھی۔ بخت کی پکڑ سخت تھی۔ اس نے چہرہ پکا ہی رکھا۔

خوشی سے مر نہ جاتے گر اعتبار ہوتا

بخت نے ذرا سا جھک کر رابعہ خاتون کا چہرہ دیکھا۔ بشائر بے فکری کے احساس سے بے ساختہ ہنس دی۔

☆☆☆

"ہمارا خون کا رشتہ نہیں ہے بشائر مگر۔۔۔ آنکھ کا رشتہ تو ہے نا" راحیلہ امی کی آواز اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ "آنکھ کے رشتے کا مطلب دیکھنے سمجھنے کا رشتہ میں شان کو تمہاری نظر سے دیکھ رہی ہوں اور پورے نمبر دے رہی ہوں میرا یقین رکھو۔ تم سن رہی ہونا" بشائر کی مسلسل خامشی پر وہ چونکیں۔

"ہوں۔۔۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ "سن رہی ہوں۔"

"پتا ہے اس کو دیکھنے کے دوسرے منٹ میں مجھے تمہارا خیال آیا اور دسویں منٹ تک میں فیصلہ کر چکی تھی۔ دنیا میرے کہے ہر لفظ کو جھوٹ اور سوتیلے پن میں ڈال دے گی کہ یہی روایت رہی ہے۔ مگر سچ کہوں تو۔۔۔ ضرور دکھا جاتی سوتیلا پن اگر سحر فقط گیارہ برس کی نہ ہوتی۔"

کچھ دل گرفتی سے بولتی راحیلہ آخر میں شریر لہجے میں ہنس کر بولیں۔

بشائر کو زور کی ہنس آ گئی۔

''یہی سمجھ لو۔ میں تو سجاد سے بھی کہہ رہی تھی۔''

''میری خالہ کا نواسہ ہے زبردست ایک دم۔۔۔اور سب کچھ میرے ہی ہاتھ میں ہے۔ خالہ تو بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے تو تمہیں پسند کر ہی لیا ہے۔ شان نے بھی۔ یہ احد اور سحر نے انہیں ساری موویز، برتھ ڈیز وغیرہ کی دکھادی ہیں۔ سحر تو بہت ہی خوش ہے۔''

''اوہ۔۔۔!'' بشائر نے یخ بستہ سانس بھری۔ ''تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا۔''

''ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تم جلد از جلد آ سکو۔۔۔اور اب کیا تمہاری خاموشی کو ہاں سمجھوں۔'' راحیلہ کا مسئلہ وہیں کا وہیں تھا۔

''یا اللہ۔۔۔ مجھے آ لینے دیں راحیلہ امی!'' مشکل ہی سے مگر اس نے کہہ دیا۔

''اچھا۔۔۔'' راحیلہ کے انداز میں مایوس آ گئی۔

بشائر نے ریسیور رکھ دیا۔ ''اف۔'' اس نے بالوں میں ہاتھ چلا کر ٹینشن دور کرنے کو لمبے لمبے سانس لیے۔ باہر ہوا میں بیٹھتی ہوں۔

کچن ونڈو سے عدینہ کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے حد سنجیدگی، الجھن تھی اس کی نگاہیں چولہے پر رکھی کیتلی پر تھیں۔ مگر دھیان کا پنچھی کسی اور ہی جہان کی پرواز کو گیا تھا کہ نہ پانی کا شور واپس لا رہا تھا نہ قہوہ کے جلنے کی بو۔

''کیا کر رہی ہو عدینہ۔۔۔ سب جل گیا۔'' اس نے تیزی سے چولہا بند کیا۔ اندر قہوہ پیندے سے چپک کر کاڑھا سا بن چکا تھا۔ ''دھیان کہاں ہے تمہارا۔''

''اوہ۔۔۔!'' عدینہ چونکی، وہ بشائر کو دیکھ تو رہی تھی مگر مکمل واپسی نہیں ہوئی تھی۔

''مہمان ہیں جی صاحب جی کے کمرے میں۔۔۔'' بھولی ٹرالی گھسیٹ کر کچن میں لا رہی تھی۔

''کون آیا ہے۔'' اس نے باری باری دونوں کی صورت دیکھی۔

''شمسہ آنٹی اور انکل ہیں۔ شاید بخت بھی ہے دادا جان کے کمرے میں۔۔۔'' عدینہ نمکو پلیٹ میں نکالنے لگی۔

بشائر کو عدینہ کا انداز غیر معمولی لگا۔

''تو مجھے بلا لیتیں۔ لاؤ بتاؤ، کیا کرنا ہے۔'' وہ بولی اور پھر کیتلی دھونے سنک کے پاس چلی آئی۔

''میں برتن دھوتی ہوں باجی، آپ کباب تل لیں۔'' بھولی نے کہا۔ ''دادا جان کے لیے سوپ بھی لے کر جانا ہے۔''

عدینہ اسٹول پر ٹک چکی تھی۔ وہ ان دونوں کو کام کرتا دیکھ رہی تھی مگر سوچیں اب پھر کہیں اور تھیں۔

بشائر نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے منٹوں میں ٹرالی سیٹ کی اور پھر خود ہی عظیم خان کے کمرے کی جانب گئی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، کیا شے انہیں روکے ہوئے ہے بس یہ طے ہے کہ مجھے ماموں اور عدینہ ہی کو بیاہنا ہے۔ اس میں کاہے کا اختلاف یا انتظار۔۔۔ ہاں وہ کا بار سیٹ کر رہا تھا۔ ماشاء اللہ کتنوں کو

پیچھے چھوڑ دیا۔ گھر بنانے لگا وہ اس میں بھی کامیاب اور اب اس سے بڑھ کر مناسب وقت اور کیا ہوگا۔" رابعہ خاتون کی دبی آواز میں جوش سا تھا۔ خفگی اور سخت الجھن۔۔۔ٹرالی لاتی بشائر غیر ارادی طور رک گئی۔

"ہاں! یہی شاید فیصلے کا وقت ہے۔ خالہ دادی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔مگر آخر دادا کو کیا مسئلہ ہے۔" بشائر نے سوچا۔

"اب بھی چپ شاہ بنے بیٹھے ہیں۔ مجال ہے جو ایک حرف بولیں گے۔" رابعہ خاتون کے مخاطب شمسہ بیگم اور کاظم شاہ تھے۔

"تم بھابھی بیگم سے صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے عظیم خان؟" کاظم صاحب نے کہا۔

"سب کچھ صاف صاف تو نظر آرہا ہے۔ انہیں دکھائی کیوں نہیں دیتا۔" عظیم خان پہلی بار بولے۔

"چھوڑیے پرانے قصے۔۔۔اتنے سالوں سے بچہ ہمارے سامنے ہے۔ رابعہ بھابھی سب دیکھ رہی ہیں۔" شمسہ خاتون کی آواز ابھری۔

"ان کی آنکھوں پر تو بس محبت کی پٹی بندھی ہے۔" عظیم خان نے ناگواری سے کہا۔

"بھابھی بیگم۔۔۔" کاظم انکل نے قصداً وقفہ دیا۔

"میرے خیال میں تمہیں چاہیے کہ تم بھابھی بیگم کو تسلی سے سب بتاؤ، سمجھاؤ اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔" کاظم انکل نے سنجیدگی سے کہا۔

ساکت کھڑی بشائر چونکی تو ٹرالی کو دھکا سا لگا۔ برتنوں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی جھنکار۔۔۔کمرے میں یکدم خاموشی چھا گئی۔ بشائر چہرے سے تاثرات مٹاتی پردہ ہٹا کر داخل ہوگئی۔ وہ سامان میز پر لگانے لگی۔

"تم جاؤ بیٹا۔۔۔میں چائے بنالوں گی۔" شمسہ بیگم کی آواز پر کپ اٹھاتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

☆☆☆

"بس ایسے ہی خوامخواہ۔۔۔تم کیوں رو رو کر جی ہلکان کرتی ہو۔ ڈرے ہوئے ہیں تمہارے دادا، سالوں پہلے ایک نتیجے پر پہنچے اور اب تک اس پر کاربند ہیں۔ تمہیں سب معلوم ہے ناں بچے!" رابعہ خاتون عدینہ کو پچکار رہی تھیں۔

"بس آلینے دو ماموں کو۔۔۔مجھے اب کسی کی نہیں سننی۔ بس کر گزرنی ہے۔ نہ۔۔۔نہ نہ رو میری گڑیا رانی!" ایک ہاتھ سے اس کے لہریے دار بال سمیٹے اور دوسرے سے آنسو پونچھے۔

"فیصلہ تو دادا جان ہی کا ہوگا۔" اس نے روتے ہوئے یاد دلایا۔

"ہاں۔۔۔ہاں ان ہی کا ہوگا۔۔۔لیکن ہمارے حق میں۔"

"آپ سچ کہہ رہی ہیں دادو۔" وہ بے یقین تھی۔

"سولی صد سچ۔" رابعہ خاتون نے اسے اپنی گود میں چھپا سا لیا۔

اور مامون اگلے ہی روز صبح ساڑھے سات بجے پہنچا۔ بشائر ہی نے اسے سب سے پہلے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ چھوٹے سے لان نما احاطے کی دیواروں پر لگے آرائشی گملوں میں پانی ڈال رہی تھی اسٹول پر کھڑے ہو کر۔۔۔ پانی کی بوتل ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی اور سینے سے دل (دل اتنا مچلا اور بے قابو بھی نہیں تھا کبھی بھی ۔۔۔ مگر بعض اوقات من مانی پر آ جاتا ہے)

مامون کی رنگت سنولائٹ کی جانب مائل تھی۔ ہلکی بڑھی شیو۔ پریشان بال اور گمبھیر چہرہ۔ وہ جینز اور آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں تھا۔ اس کے پیروں میں جاگرز تھے، نجانے کس دیار کی خاک چھانی تھی کہ گرد کا ہالہ سا پورے وجود سے لپٹا تھا۔ گرد پلکوں سے لپٹی تھی۔ اتنا رف ٹف حلیہ۔۔۔ بشائر نے پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ حسب عادت اندر جانے سے پہلے سگریٹ کے لمبے طویل کش لے رہا تھا۔ بشائر اپنی محویت سے انجان تھی۔ سگریٹ جوتے تلے مسلتے ہوئے مامون نے اسے دیکھا۔ وہ چونکا۔ کھانس کر اسے چونکایا

''اوہو۔۔۔'' بشائر نے گری بوتل کر دیکھا اس کے چہرے پر خجالت آ رکی تھی۔

اپنے بیگ کو وہیں چھوڑتا وہ اس تک آیا اور زمین پر گری بوتل اس کی سمت بڑھائی۔

''وہ۔۔۔ میں۔۔۔ ان بیلوں کو پانی دینے کے لیے۔۔۔'' اس نے اوپر چڑھنے کی توجیہہ پیش کی۔ وہ ہنوز اوپر تھی مامون نے نظریں اوپر اٹھا کر اس کے چہرے پر ٹکائیں۔ ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ کو وہ روک چکا تھا مگر آنکھوں سے چھلکتی کو اس نے چھوٹ دے دی۔

''آپ کو بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے۔'' اس کا اشارہ اسٹول پر چڑھنے کا تھا۔ یقیناً وہ اس کی دراز قامتی کو کہہ رہا تھا۔ بشائر چونکی۔

''آپ سراہ رہے ہیں یا چڑا رہے ہیں۔''

''کیا آپ چڑ جایا کرتی ہیں۔''

''نہیں اب نہیں۔۔۔ مگر اسکول کے زمانے میں۔۔۔ دراصل میں کلاس فیلوز سے خاصی لمبی تھی۔''

''آپ اب بھی خاصی لمبی ہیں۔'' مامون کا لہجہ متبسم تھا۔

بشائر نے آنکھیں سکیڑ کر اس کا چہرہ جانچا۔ مامون نے دونوں ہاتھ صلح جو انداز میں سیدھے کھڑے کیے۔

''یہ میں نے سراہا ہے۔ بیوٹی فل ہائیٹ۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ ستائشی انداز۔ بشائر کو زندگی میں پہلی بار اپنے قد پر جی بھر کے پیار آیا، فخر ہوا۔

''کیا آپ یونہی کھڑی رہیں گی۔''

''آں۔۔۔ نہیں میں اتر۔۔۔ تی ہوں'' اس نے دوپٹے کو شانے پر ٹکایا مبادا پیروں میں لپٹے اور وہ منہ کے بل نیچے گر جائے۔

مامون نے الٹا ہاتھ بڑھایا۔۔۔ بشائر نے بوتل تھما دی۔ وہ دیوار پر اپنا ہاتھ جما کر نیچے اترنے لگی جب اس نے مامون کا سیدھا ہاتھ بڑھا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں تو اب کچھ نہ تھا تو پھر کیا۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے مامون کا چہرہ دیکھا۔ مامون کا چہرہ مسکراہٹ سے معمور تھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے اپنا ہاتھ دکھایا کہ وہ اسے تھام کر اترے۔

مامون میزز نبھا رہا تھا۔ تو اسے بھی نبھانے پڑیں گے۔ اس کا نازک انگلیوں والا ہاتھ مامون کے مضبوط ہاتھ میں پل بھر کو گیا۔ وہ جست لگا کر نیچے اتر آئی۔ ''تھینک یو۔''

مامون نے شانے اچکائے۔ بوتل اسے تھما دی۔ اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ بشائر نے دونوں ہاتھوں میں بوتل پکڑ کر اسے سینے سے لگا رکھا تھا۔ بوتل کا ڈھکن ہونٹوں سے جڑا تھا، وہ اس راستے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے مامون الصار گزرا تھا۔

ہاں تو اصل فساد کی جڑ اس شخص کو دیکھنا ہے۔ سارے ارادے اور وعدے ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص سامنے ہو تو بشائر پھر تمہارے لیے اور کہیں کچھ نہیں ہوتا۔ تو سب سے بہتر یہ ہے کہ اس جگہ سے دور ہو جاؤ جہاں اس شخص کی موجودگی کا اندیشہ بھی ہو، زندگی بہت چین سے بے فکر گزرے گی۔

☆☆☆

معذور بچوں کی فلاح بہبود کی آرگنائزیشن نے بڑے پیمانے پر چیرٹی شو کا انعقاد کیا تھا۔ لوگوں کو باشعور کرنے کی کوشش۔۔۔ بچے معذور کیوں ہوتے ہیں۔ پیدائشی یا بعد میں ہونے والی کوئی خطرناک بیماری۔ علامتیں، حالات، واقعات، تدارک، پیش بندی، ڈاکٹروں کا ایک بورڈ تھا کچھ پیرنٹس جو والنٹیر ی آگے بڑھ کر اس حوالے سے کام کرتے تھے کہ بتایا جائے کیسے بچ سکتے ہیں۔ احتیاطی تدابیر۔

وہ اس کلب کی رکن تھی اور عون کے ہمراہ بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتی تھی۔ اس بار کا فنکشن یوں بھی اہم تھا کہ فنکاروں اور کچھ کھلاڑیوں نے والینٹری شرکت کی اور ہالی وڈ کی ایک بڑی اداکارہ خاص طور پر آئی تھی۔

ملکی وغیر ملکی میڈیا وینز قطار سے کھڑی تھیں اور رپورٹر خبروں کی تلاش میں ایک دوسرے کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پروگرام نے بہت کامیابی سمیٹی اور نتیجہ میں چندہ بھی۔

اس کے چہرے پر ایک طمانیت تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر کبھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ اخبارات یا چینلز کی فرنٹ پٹی پر چلے (کم از کم اس حوالے سے) مگر اسے اپنے اس حوالے پر کوئی شرمندگی نہ تھی۔

یہ حوالہ تو اس کا فخر تھا، اس کا کُل۔۔۔ حاصل۔ وہ ایک ماں کی حیثیت سے یہاں تھی۔ وہ عون کی ماں تھی اور اس کا بچہ دنیا کا سب سے خوب صورت پیارا بچہ تھا۔ وہ کیمروں کی زد سے ذرا دور نسبتاً ویران گوشے میں کھڑی کانچ کے نازک گلاس سے گھونٹ گھونٹ شربت حلق سے اتار رہی تھی۔ وہ دور جہاں بچوں کا رش تھا۔ عون پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ سارا وقت اسی کے ساتھ تھی مگر ابھی کسی کام سے اس جانب آئی تو ٹھہر گئی۔

پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بے فکری سے محوِ گفتگو سیاہ کوٹ میں وہ۔ اس نے ایک لحظہ ٹھہر کر پہچان لیا۔ کنفرم۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے بالکل پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ دروازے پر دستک دینے کے سے انداز میں اس کا شانہ بجایا۔ مقابل کے گردن گھمانے پر وہ ایڑیاں ذرا سی اٹھا کر

شریر انداز میں سر جھکا گئی۔
''بیسٹ آف لک۔۔۔!اس کے لبوں سے نکلا۔
''اوہ آپ۔۔۔!'' وہ حیرت سے مڑا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی کھل کر مسکرایا، ایڑیوں پر گھوم گیا۔اس کی آنکھیں خوشی سے بھر گئی تھیں۔
''آپ بھی۔۔۔یہی کہیں گی۔''اس نے مسکرا کر شکوہ کیا۔
''میں کیا۔سارا شہر، بلکہ ساری دنیا کہہ رہی ہے بیسٹ آف لک۔''اس نے اس کے ٹاک شو کے نام کا حوالہ دیا۔''تم نے کمال کر دیا۔ ہر جگہ واہ واہ۔۔۔تم اتنے ہی قابل تھے۔مجھے یقین تھا۔''وہ بہت خوش تھی۔''مجھے تم پر فخر ہے تم۔۔۔''
''اب سامنے دیکھ لیا تو منہ بھر بھر کے ڈونگرے تعریفوں کے۔۔۔ایک فون تک تو کیا نہیں۔ میں نے بھی سوچ رکھا تھا نہیں تو نہ سہی۔'' وہ بالکل کسی معصوم بچے کی طرح کہہ رہا تھا۔
اس کے چہرے پر شرمندگی نے تاریکی سی پھیلا دی۔
''ایسا نہیں ہے۔تم جانتے تو ہو، میں کتنی مصروف رہتی ہوں۔''وہ جواب سن کر پل بھر کو خاموش ہوا پھر اپنے ساتھی سے معذرت کر کے اسے لیے آگے بڑھنے لگا۔وہ دونوں ایک کونے میں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔اس نے اپنے چہرے پر ٹکی اس کی نگاہوں سے گھبرا کر چہرہ اٹھایا۔
''مجھے آپ کی مصروفیات کا یقین ہے۔''اس نے شعوری وقفہ دیا۔''آپ کے شوہر نامدار نے دلایا تھا۔''
''وہ تمہیں کہاں مل گئے۔'' وہ بری طرح چونکی۔
''ملے کہیں نہیں، بس دیکھے تھے۔''
''تو پھر۔۔۔''
''دراصل ان کے ساتھ جو خاتون تھیں۔وہ آپ نہیں تھیں نا۔اس سے معلوم ہوا کہ آپ کسی اور جگہ۔۔۔''
''تم میری اور جگہ تو جانتے ہو نا۔۔۔پچھلے دنوں عون بہت بیمار رہا اس کی بیماری میں مجھے اور کسی چیز کا ہوش ہی کب رہتا ہے۔''
''عون کی بیماری تو آج کل کی بات ہو گی۔''وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔''میں تو بہت پرانی بات کر رہا ہوں۔''
''ایسے ہی وہم ہے تمہارا۔۔۔وہ کچھ افتتاح وغیرہ کا سلسلہ تھا۔''
''کسے تسلی دے رہی ہیں۔ مجھے یا خود کو۔۔۔''
''ہم دونوں کو۔۔۔''اس نے پہلی بار نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کہا۔''ہم دونوں کو تسلی کی ضرورت ہے ناں۔''
اس بار اسے نظریں چرانی پڑی تھیں۔وہ اس ہجوم کو دیکھنے لگا جو ہالی وڈ ایکٹریس کو دیکھنے کو بڑھتا جا رہا تھا۔

''اور کسی کو عقل کی۔۔۔'' اس نے دیکھے بغیر کہا تھا۔
''مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔'' وہ بھی ہجوم ہی کو دیکھ رہی تھی۔
''ڈھکی چھپی باتوں، معنی خیز جملوں، قیافوں کے بجائے صاف بات کر لینی چاہیے۔'' وہ اس کی جانب گھوما اور مشورہ سا دے ڈالا۔
''تو پھر تم ہی بسم اللہ کرو۔ سب سے لمبی چپ تو تمہاری رہی تھی۔'' اس نے جتایا۔
''تو کیا کہہ دینے سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔''
وہ کچھ نہ بولی پھر موضوع بدلنے کو کہا۔
''عون تمہیں یاد کر رہا تھا۔''
''کیسے بھلا۔'' اس نے چونک کر دیکھا عون کے پاس ایسے ری ایکشن نہیں تھے جن سے وہ دل کا حال وضاحت سے بتا سکتا، اس کی حیرت بجا تھی۔
وہ سنبھل کر دل گرفتی سے مسکرائی۔
''تمہارے شو کی کلپ چل رہی تھی۔ ایک دم زور زور سے، مم کہنے لگا تو۔''
''وہ مجھے مم کہتا ہے۔'' اس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔
اسے چپ سی لگی۔ ''اسے مم ہی کہنا آتا ہے۔'' (اس کی آواز کرچی کرچی تھی)
''اوہ۔۔۔ تو پھر باپ کو بھی مم کہتا ہے، کیسا لگتا ہے پھر آپ کے شوہر نامدار کو۔۔۔'' اسے مزا آیا تھا۔
''وہ باپ کو کسی نام سے نہیں پکارتا۔ وہ باپ سے ڈرتا ہے۔ اس کی موجودگی سے گھبراتا ہے۔ وہ شاید باپ کو ناپسند کرتا ہے۔'' اس کا لہجہ خود اذیتی سے بھر گیا تھا۔
''ناپسندیدگی کا جواب ناپسندیدگی ہی ہوگا نا۔'' یہ خود کلامی تھی۔
''تو پھر محبت کا جواب محبت کیوں نہیں۔'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔
''تم نے کب اظہار کیا۔ بس دل ہی دل میں پوجتے رہے۔ اتنے پریکٹیکل ہو کر تمہاری یہ ڈھکی چھپی عاشقی مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔ تم نے اسٹیپ اٹھایا ہوتا تو شاید کہانی کچھ اور ہوتی۔ منہ سے براہ راست نہ سہی کوئی اشارہ ہی دیتے۔ بس جوگ لے کر بیٹھے ہو۔ تم سے تو افسوس کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔۔۔ بس تم پر افسوس ہوتا ہے۔''
وہ پر ملال مبہم مکالموں کے اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے چمک کر بولی تھی۔ اور پہلے بھی تو ہزار بار وہ ہزار طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کر چکی تھی۔ مگر ادھر وہی ایک پراسرار مسکراہٹ جواب ہوتی۔
''بے وقوف ہیں آپ۔۔۔'' وہ تختی سے مسکرایا۔
''وہ اونچی ذات والوں کے من مندر کی دیوی تھی۔ نچلی ذات والوں کی بھینٹ پر کب نظر کرم کرتی، ہم تو بس چوری چھپے دھرم نبھاتے تھے۔ اور دیویاں بے خبر نہیں ہوتیں، بن کر رہتی ہیں بس یہی دعا کرتے رہے کہ اس برہمن پجاری کو کانوں کان خبر نہ ہو۔۔۔ باقی سب پھر شانتی ہے۔''

اس نے اپنے سوال کے جواب کے لیے بہت سے موزوں جواز از خود تلاشے تھے۔ مگر یہ کبھی نہیں۔ اتنی خوب صورتی اور گہرائی سے وہ ہی کہہ سکتا تھا۔ وہ جیسے سکتے کی سی کیفیت میں ایک ٹک اسی دیکھ رہی تھی۔

اس کا نام پکارنے کو اس کے ہونٹ نیم وا ہو کر خود ہی آپس میں جڑ گئے۔ وہ تحیر کی انتہاؤں پر تھی۔

''تمہارا مطلب ہے، وہ جانتی ہے۔۔۔ مطلب جانتی تھی کہ تم۔۔۔۔ او مائی گاڈ۔''

''آپ محبت کو کیا سمجھتی ہیں۔ مختلف طریقوں سے کی جانے والی چار لفظوں کی ترتیب۔۔۔ ہونہہ پریم، پیار، لو (Love) محبت بے ترتیبی کا دوسرا نام ہے۔ الٹ پلٹ کر دینے والی، اندر باہر اکھاڑ پچھاڑ مچا دینے والی۔ بارش کہیں بہت دور بھی برسے تو ہوائیں سن گن لے آتی ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دل سے اٹھنے والی پھوار کی مہک نے اگلے کی قوت شامہ کو معطر نہ کیا ہو۔''

وہ اس کی متحیر آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالے ہمیشہ کی طرح دور کی کوڑی لایا تھا اور وہ شاید قوت گویائی کھو چکی تھی۔ حلق خشک۔۔۔ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بدقت بولی۔

''اور۔۔۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ سر تا پا کسی اور ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہے اور تم تب بھی۔۔۔۔ رقابت یا انسلٹ یا۔۔۔''

''میں پھر کہوں گا، بے وقوف ہیں آپ۔'' وہ مسکرایا۔

''وہ رنگ۔۔۔ عادت تھا جو اب رقابت میں ڈھل گیا ہے۔ جب فیصلہ سنا دیا جائے تو بیچ پر کھڑے رہنا نادانی ہوتی ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس نے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا۔''

''تو کیا تم انتظار کرو گے۔'' وہ دکھ سے دہری ہو رہی تھی۔

''تو اب تک کیا کر رہا ہوں۔'' اس نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

☆☆☆

''میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی۔'' اس نے اچانک سوال کر دیا۔

''تمہارے پاس اتنا وقت ہو جاتا ہے کہ تم سمجھنے سمجھانے کا سوال کرو۔'' وہ چونکا نہیں۔ وہ نیل پالش کے سوکھنے کی منتظر تھی۔ ہاتھ اور پیر ذرا سے پھیلائے ہوئے آرام دہ حالت میں صوفے پر بیٹھی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں شوہر کا عکس دیکھ رہی تھی۔ جو پینٹ اور سفید بنیان میں ملبوس تھا اور پینٹ کی بیلٹ کس رہا تھا۔

''کچھ خیال و گمان وقت کے محتاج نہیں ہوتے، وہ سانسوں کے ساتھ حاضری لگواتے ہیں۔ کبھی خود کو بھولنے نہیں دیتے۔''

''تم گفتگو بہت اچھی کرتی ہو۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔'' وہ ہلکی آسمانی نئی شرٹ پہن رہا تھا۔

''پہلے آپ میری گفتگو پر فوراً عمل درآمد کر لیا کرتے تھے۔'' اس نے جتایا۔

''کیا تم مجھے اب بھی کچھ کرنے کو کہہ رہی ہو۔'' بٹن بند کرتے ہاتھ رکے۔ شوہر نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں!'' اس کی آواز بے جھجک، دو ٹوک اور واضح تھی۔

"کیا؟"
"میں کہہ رہی ہوں کہ یہ جو آپ کر رہے ہیں نہ کریں۔"
"میں، میں کیا کر رہا ہوں۔" اس نے اپنی شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھی۔
"انجان مت بنیے۔ میں واقعی اس بات کو بہت شدت سے سوچنے لگی ہوں کہ آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی جب۔۔۔ جب یہی سب کرنا تھا۔ کیا آپ کو لوٹرائی اینگلز بہت پسند ہیں۔"
وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ وہ قیمتی پرفیوم کو خود پر چھڑک رہا تھا۔ ایک تازگی کا احساس تناؤ بھرے ماحول پر چھانے لگا۔
"تمہارے پاس تیار ہونے کے لیے صرف دس منٹ ہیں۔ ہمیں وقت پر پہنچنا ہے۔"
وہ اس کے صوفے کے پاس آ رکا تو اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے اسے سرتاپا دیکھا۔ نک سک سے درست۔ وجاہت مردانگی کا شاہکار۔ اس پر امارت کا تڑکہ اور سب سے بڑھ کر اپنی خوبیوں سے آشنائی نے آنکھوں میں ایک احساس تفاخر ثبت کر دیا تھا۔
وہ آج بھی آسمانی بجلی کا وہ لپکا تھا۔ جو بھسم کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔
ایک ایسا کوندا جو دل کو جلاتا تھا۔ جو دل کو بجھا بھی دیتا تھا۔
آج بھی اس چہرے پر حق سے نظر ٹکانا ایک انعام تھا اور آج بھی ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھنا ایک امتحان۔۔۔
اس نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔ اتنا سب کچھ۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔ اتنی جیت۔ اتنی ہار۔۔۔ اتنے موسم۔ مگر دل میں آج بھی محبت زندہ تھی۔
آنکھوں کے آگے یادداشتوں کی فلم سی چل گئی تو نین کٹوروں میں نمی ہلکورے لینے لگی۔
ایک تکلیف دہ کیفیت کے زیر اثر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اس کے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ اس کا شوہر ہینگر میں لگی سیاہ فراک اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ فراک ٹخنوں تک لمبی تھی اور گھیرے پر سلور پھول اور رنگ ستارے ٹکے تھے۔ چاندی کے جیسی نازک ہیل پاس ہی زمین پر پڑی تھی۔ اب شوہر کے ہاتھ میں ڈائمنڈ نیکلس سیٹ تھا۔ جو اس نے ہی برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔ وہ بیوی کے تمام ملبوسات ملک کے نامور ڈیزائنر سے خریدا کرتا تھا بمعہ لوازمات۔۔۔ اس کی بیوی نے عرصہ ہوا ان چیزوں میں دلچسپی لینی چھوڑ رکھی تھی، اس کا بس چلتا تو وہ سارا وقت گھر میں رہتی اپنے بیٹے کے ساتھ یا پھر مصلّے پر تسبیح ہاتھ میں لیے۔۔۔ مگر وہ ایسی بیوی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شانہ بشانہ ہاتھ میں ہاتھ لیے چلنے والی بیوی درکار تھی۔
دروازے پر گھبرائی سی دستک کے بعد آیا اندر داخل ہوئی۔ وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔ شوہر کے چہرے پر ناگواری سی در آئی۔
"وہ۔۔۔ وہ عون بابا۔۔۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے بے اختیار ریف ہاتھ سے چھوڑ دیا۔
عون کو دو روز سے ہلکا بخار تھا۔ وہ کسی صورت اسے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔
مگر یہ ایک بزنس ڈنر تھا جہاں اس کا اپنے شوہر کے ساتھ پہنچنا بہت ضروری تھا۔ بیٹے کی بیماری

سے بھی زیادہ۔

اس کے ڈھیلے پڑتے ہاتھ اور بدلتے رنگ کو بغور دیکھا تھا اس کے شوہر نے۔اس نے اپنے چہرے پر پھیلی درشتی کو لہجے میں آنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی وہ آیا سے مخاطب ہوا۔

''آپ جانتی ہیں نا کہ ہم ایک امپورٹنٹ بزنس ڈنر کے لیے جا رہے ہیں آپ کو یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

آیا نے ذرا سی نگاہ میڈم کو دیکھا۔جس کی آنکھیں بس ٹپکنے کو تھیں۔

''پلیز۔''سر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کے لیے دروازہ دکھایا۔وہ اس بار میڈم کی جانب دیکھے بغیر سرعت سے نکل گئی۔

''کیا اب آپ سے بھی کہا جائے گا کہ ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔''وہ تسلی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے طنز سے بولا۔

''میں بس دوائی پلا آتی ہوں۔''اس کا دل بیٹے کے پاس جانے کو ہمک رہا تھا۔

وہ جواباً کچھ نہ بولا اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر گھڑی دکھائی۔مگر چہرے کے انتہائی درشت تاثرات۔

وہ کپڑے بدل کر لوٹی تو آنکھوں کی سرخی بتاتی تھی،وہ رو کر آئی ہے اس کی ذرا سی جنبش سے فراک کا گھیرا بل کھا جاتا تھا۔وہ اب ڈریسنگ کے آئینے میں اسے بغور دیکھ رہا تھا یقیناً اس کی بیوی کا حسن لوازمات کا محتاج نہیں تھا۔وہ اپنے اداس چہرے کو غازے سے رنگ رہی تھی۔ضبط گریہ سے سرخ آنکھوں پر اس نے کاجل سے خط کھینچ دیا۔اپنے کپکپاتے لبوں پر گلابی رنگ پھیر دیا۔اپنے پیروں میں چاندی کی جوتی پہننے کے بعد وہ نیکلس کا ہک بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ سی تھی۔وہ ہک بند کرنے کے لیے اٹھ آیا۔آئینے میں ان دونوں کی جوڑی چاند سورج جیسی تھی۔

''آپ کو مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی مامون!''اس نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے ایک ہارا سا جملہ کہہ دیا۔اس کی گردن پر سرکتی انگلیاں پل بھر کو تھمیں۔آئینے میں وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نظر آئے۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو بشائر!مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''اس نے ملائمت سے اس کے گال پر انگلی پھیری۔

☆☆☆

وی آر ناٹ اسپیشل (We are not special)

''ہمیں احساس برتری کی ضرورت نہیں۔۔۔ہم برابری کی بنیاد پر جینا جانتے ہیں۔''

W.N.S نامی معذور بچوں کی فلاح و بہبود کا یہ سماجی ادارہ اپنے پچاس سال پورے ہونے پر بڑے پیمانے پر پروگرام کر رہا تھا۔انہی میں ایک نئے اعزازی صدر کا انتخاب بھی تھا اور وہ بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئی۔

اس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا معذور ہونے اور معذور کی ماں ہونے میں کتنا درد ہوتا ہے۔ اس کے حلقہ احباب کا پرزور اصرار تھا کہ ایک گرینڈ پارٹی دی جائے اسے پارٹی دینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر وہ پارٹی اپنے گھر میں دیتی یا کہیں باہر، مامون کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ وہ کیا کہہ کر لوگوں کو بہلاتی کہ یہ وہ اور یہ۔۔۔''

پارٹی کا سن کر مامون نے بہت خوش ہونا تھا۔ مگر یہاں مسئلہ پارٹی کی نوعیت کا تھا۔ وہ ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل نیک نام ادارے کی صدر بنا دی گئی تھی۔ مگر اس ادارے کی وجۂ شہرت تھی معذور بچے۔۔۔ اور مامون شاید اس پر خوش ہو جاتا اگر اس کے اپنے گھر میں ایک معذور بچہ نہ ہوتا۔

نہ تو بشائر نے کبھی تجزیہ کیا اور نہ خود اس نے کہ۔۔۔ اسے اپنے ہی جگر گوشے کو دنیا کے سامنے لانے میں کیا ہچکچاہٹ تھی۔

مامون کے چند جاننے والوں نے اسے بشائر کی اس عزت و کامیابی پر جب مبارکباد دی تو وہ بھناتا ہوا گھر لوٹا تھا۔

''کوشش کیا کرو کہ تمہاری سرگرمیاں مجھ تک کسی بھی حوالے سے نہ پہنچا کریں۔''

اور اب ایسے میں وہ اس سے امید رکھتی کہ وہ اپنے گھر میں ایسی کسی پارٹی کی اجازت دے گا اور اس میں شرکت کرے گا۔ نو۔ نیور امپاسبل۔۔۔

ابھی پرسوں ہی تو اس نے اس کا اچھا موڈ دیکھ کے پوچھا تھا۔

''ٹاک شو میں بلوایا ہے مجھے۔''

''گڈ۔۔۔ کون سا ٹاک شو۔''

''بیسٹ آف لک۔۔۔ وُد بخت!'' اس نے کہا۔

''بہت تعریفیں سن رہا ہوں میں اس شو کی۔۔۔ ریٹنگ بھی نمبر ون جا رہی ہے ضرور جاؤ۔ وہ ایسے ہی کام کر سکتا تھا۔'' اس نے تنقید کی تھی یا تعریف۔۔۔ مگر بشائر کو برا لگ گیا۔

''ایسے ویسے کام کا کیا مطلب۔۔۔ وہ اتنا لائق فائق، پڑھا لکھا۔ اسے یہی کام کرنا چاہیے تھا اور اگر آپ کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھیں تو لاکھوں کما رہا ہے۔ ایسے جوانوں کی ہی تو ضرورت ہے اس۔۔۔''

''اور اس ایسے جوان نے آپ کو کس سلسلے میں بلوایا ہے۔''

وہ گڑبڑا گئی۔

وہ W.N.S۔۔۔ کی ففٹی ایئرز پر ہونے والے ایونٹس اور۔۔۔''

''اور معذور بچوں کے بارے میں آپ سے زیادہ اتھینٹک (مستند) رائے کہاں سے مل سکتی ہے۔ مامون نے اس کا جملہ اچک لیا۔'' اونہہ! جو نہیں جانتے وہ بھی جان لیں کہ۔۔۔''

''وہ ہمارا بچہ ہے مامون۔۔۔!'' وہ تڑپ اٹھی۔

''ہاں۔۔۔ مگر برائے مہربانی اسے ہمارا بچہ ہی رہنے دو۔ قوم کا بچہ بنانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ نمائش کا ارادہ ہے ہونہہ۔''

اور ایسے میں وہ اس پارٹی میں شرکت کرے گا۔ جہاں میڈیا کا جمگھٹا ہو پھر بھی اس نے کوشش کی تھی۔

''پلیز مامون۔ میری شناخت مسز بشائر مامون ہے میں گھر کی پارٹی میں مہمانوں کو اکیلے ریسیو کرتے کتنی ایمبرلیس ہوں گی۔ تھوڑی دیر کو ساتھ رہ کر آپ معذرت کر لینا کہ آپ کو کہیں ارجنٹ جانا ہے مگر ویل کم کہنے کو تو موجود ہوں۔''

اس نے ان خوب صورت آنکھوں کی قطعیت کو دیکھا (اسے سحرزدہ کر دیا تھا کبھی ان آنکھوں نے)

''عون سامنے تھوڑی آئے گا۔ بچے تھوڑی ہوں گے۔ ہمارے کچھ فیملی فرینڈز اور باقی ادارے کے اراکین وغیرہ جسٹ پارٹی۔ ڈنر اور بعد میں سوچ رہی ہوں۔ کسی غزل گائیک کو بلوالیں۔'' اس نے ملتجی لہجے میں اپنی منتوں کو پرکشش بنایا۔

اور مامون نے پہلی بار پرسوچ انداز میں اسے دیکھا۔

''اوکے۔۔۔ مگر میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں رک سکتا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوہ تھینک یو۔۔۔ مامون!'' اس نے یکدم سرشار ہو کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس کے چہرے پر خوشی نے خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے۔ موتیوں جیسے دانتوں کی قطار احساس کرواتی تھی وہ ہمیشہ مسکراتی رہے۔ مامون نے بے ساختہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے قریب کیا۔ بحث تمحیص منت ترلے۔۔۔ پیار لاڈ ناز و ادا ان کے رشتے سے کب یہ چیزیں غائب ہوئیں۔ پتا ہی نہ چلا ایسا برجستہ التفات تو گئے زمانوں کا قصہ ہوا۔

ان دونوں کے لیے بھی ایک دوسرے کا لمس اور قربت گویا حیرانی تھی۔ پل بھر کی بے خودی، بشائر نے دھیرے سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ عرصہ پہلے اس نے اس شخص سے عشق کیا تھا۔ بے حد، اسے یاد تھا ذرا ذرا۔۔۔

عورت کا دوسرا نام بے وقوفی ہے۔

☆☆☆

مامون نے آدھے گھنٹے ٹھہرنے کا عندیہ دیا تھا۔ مگر وہ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک پارٹی میں موجود رہا۔ بڑے بڑے نامی گرامی لوگ موجود تھے۔ میڈیا کی چند جانی مانی شخصیات اور کچھ رپورٹرز وغیرہ بھی۔۔۔ وہ بہت عرصے بعد دل سے خوش تھی۔ مامون کی ہمراہی کا فخر اس کی سنگت کے ''جبر'' نے کب کا معدوم کر دیا تھا اور اس روز اس کے الجھے، ہارے، نڈھال، بے بس سوال کے جواب میں ملنے والا جملہ۔۔۔

''مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' اس نے اندر باہر سے مار ڈالا تھا۔

وہ لاشعوری طور پر کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ مگر جو جواب مامون کی جانب سے ملا وہ ۔۔۔ آہ۔۔۔

وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور پھر دوبدو اس کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی کہ جہاں مزاح یا یونہی۔ ایسے ہی خوامخواہ چھیڑنے کے لیے جواب دے دیا جیسا تاثر ملے۔ مگر وہاں موجود یخ بستہ سرد مہری، قطعیت اور

بے فکری نے اسے بلندی سے منہ کے بل نیچے پھینک دیا۔ گویا آگے کچھ بولنے کے لیے، پوچھنے کے لیے بچا ہی نہیں۔

مگر اس وقت۔۔۔

مامون کی شخصیت کا تاثر سارے ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ پورے کا پورا اس کا ہو کر بھی اس کے لیے ایک امتحان کی طرح تھا۔ جسے کن اکھیوں سے دیکھنا ایک مسلسل خوشی اور اعزاز تھا۔

تیس تیس میٹر کے یہ جبے (فراک) پہن کر گھومتی یہ خواتین۔۔۔

''آپ عورتوں نے کہیں کپڑے کی اسمگلنگ تو شروع نہیں کر دی۔''

پرستائش آواز پر چونک کر گھومی تو فرش کو چھوتا اس کا سفید انگرکھا فراک چکر کھا گیا۔

''اوہ۔۔۔ بخت! تم آئے تھینکس گاڈ!'' اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

''آنے کا ارادہ تو نہیں تھا مگر آپ کا خفا چہرہ بار بار دھیان میں آ رہا تھا سو۔۔۔ مجبوری۔''

''صحیح بات ہے اگر تم نہ آتے۔۔۔ تو۔۔۔ سچ میں بہت خوش ہوں۔ میں ایسا ہی کچھ کرنا چاہتی تھی مگر بے اختیار تھی۔ اب مجھے کون روکے گا۔ اب میں کر سکتی ہوں۔''

''آپ اپنے شوہر نامدار کو بھول گئیں۔ اصل روکنے ٹوکنے والے۔'' بخت نے بروقت یاد دلایا۔

اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا۔ ''تم ملے ان سے۔۔۔''

''نہیں، سیدھا ادھر ہی آ گیا۔ روشنی ہی روشنی تھی جیسے چاندنی زمین پر اتری ہو۔ دیکھا تو آپ تھیں۔'' وہ اس کے سفید لباس کو سراہ رہا تھا۔

''تم انہیں پسند نہیں کرتے نا!'' اس نے اصل بات کہی۔

''آپ بھی کمال ہیں خاتون۔۔۔ غلط فہمی میں جیتی ہیں اور جی بھر کے جی لیتی ہیں۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتے اور وہ بھی ہمیشہ سے۔''

''بلاوجہ ہی وہم ہے تمہارا۔''

''مصدقہ اطلاع یہ ہے کہ پہلے وہ مجھے ناپسند کرتے تھے اور اب باقاعدہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔۔۔ اور میری انفارمیشن غلط نہیں ہوتی بھول گئیں ''بیسٹ آف لک، ود بخت'' سیاسی و سماجی حوالوں سے مستند ترین رائے رکھتا ہے۔ آپ کو پتا ہے لاسٹ ویک حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے خرانٹ بندوں کو بلایا تھا شو میں۔۔۔ وہ بعد میں کہتے پائے گئے۔ بخت شاہ کو ہپناٹائز کرنا آتا ہے۔ وہ، وہ باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ جو کبھی بھی نکلنی نہیں چاہئیں اور آپ کہتی ہیں۔ وہم ہے تمہارا۔'' وہ متبسم لہجے میں کہتے ہوئے اسے یقین دلا رہا تھا۔

''وہ ایسا کیوں کریں گے بخت۔۔۔'' اس نے بخت کی دلیل کو مان لیا تھا۔

''عدینہ۔۔۔ نہیں آئی۔'' وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

بشائر کے چہرے پر مایوس سی مسکراہٹ آئی۔ ''وہ میری تقریبات، مطلب میرے حوالے سے کب آتی ہے۔''

''اسے معلوم نہیں ہوگا، میزبانوں میں مامون صاحب موجود ہوں گے۔'' بخت نے نقطہ نکالا۔

وہ سر جھکا کر جوتے کی ٹو سے گھاس کو ٹھوکر مارنے لگی۔

''میں نے دادو کو تو فون کیا تھا۔مگر وہ گھر پر نہیں تھیں۔'' بشائر نے بتایا۔

''وہ بیمار ہیں اور کل ماموں، عدینہ کے ہمراہ انہیں لے کر ہاسپٹل گئے ہوئے تھے۔'' بخت نے اسے چونکا دیا۔

''ماموں نے مجھ سے ذکر نہیں کیا'' وہ از حد حیران تھی۔

''اب کیا کیا ذکر کیا جائے۔'' بخت کا انداز لاپروانہ تھا۔''رابعہ آنٹی تو ٹیسٹ وغیرہ کرواتی رہیں اور یہ دونوں پہلے آغا خان کی کینٹین کی فش اڑاتے رہے، بعد میں ہرے بھرے لان میں ٹہلتے پائے گئے۔اس سے دو روز پہلے انہوں نے سنی پلیکس میں ریس ٹو بھی دیکھی اور۔۔۔''

''تت۔۔۔تمہیں کیسے پتا چلا۔۔۔'' وہ شدید شاک کے زیر اثر تھی۔''تم کیا ان کا پیچھا کرتے ہو۔اپ ٹو ڈیٹ انفارمیشن۔۔۔مائی گاڈ جاسوس!'' اس کی پھٹی آنکھیں اور اس پر معصوم سوال۔

''ایک طرف بہن کا گھر۔۔۔دوسری جانب بے بس دل۔۔۔ہم سا مجبور کون۔'' وہ اتنے بڑے انکشافات کے بعد یکدم بے حد ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''او ہائے بخت آپ بھی یہاں ہیں۔۔۔'' ایک سیاسی پارٹی کی خاتون لیڈر بڑے حیرت بھرے جوش کے ساتھ چلائی تھیں۔۔۔دونوں چونک کر مڑے۔اپنی گفتگو میں ہر شے کو فراموش کر دیا تھا۔

''آپ تو کہیں جاتے نہیں پھر یہاں۔۔۔'' لیڈر کے لیے بڑی دلچسپی تھی۔بخت کو پروگرام میں انوائٹ کیا جا سکتا تھا۔

''یہ موصوفہ۔۔۔بہن ہیں میری۔'' بخت کے جملے نے بشائر کا دل پگھلا ڈالا، وہ ان سے معذرت کر کے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

''کیوں آجاتی ہے وہ یہاں۔کیا لینے کے لیے۔اب کیا بچا ہے جس کی فکر میں جب دل چاہا منہ اٹھا کر۔۔۔'' وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ تیز تیز بول رہی تھی۔

''کب آتی ہے روز۔۔۔کوئی ڈیڑھ ماہ بعد تو۔۔۔''

''اوہ۔۔۔'' اس نے ایک ہاتھ کمر پر لگایا اور دوسرے کو نچایا۔''تو آپ دن گن گن کر رکھتی ہیں۔''

''کون سی سگی دادی ہیں آپ۔جو فکر میں گھلتی ہیں محترمہ اگر اس طرح آئیں گی نہیں تو نمود و نمائش کیسے ہو گی اپنے جلوے دکھانے کی۔۔۔ابھی بھی بتانا ہو گا کہ انٹرنیشنل این جی او کی صدر بن گئی ہیں تو۔۔۔''

''اس نے تو ایسا کچھ نہ کہا بیٹی!'' رابعہ خاتون کی آواز نقاہت میں ڈوبی ہوئی تھی۔''کس چیز کی صدر بن گئی ہے، اللہ اسے خوشیاں دے اور اس کا دل ٹھنڈا کرے۔''

وہ دل سے دعا گو تھیں۔

''دادو۔۔۔!'' عدینہ کی برداشت جواب دے گئی۔''اب اور کون سی خوشیاں۔۔۔سب کچھ تو پا لیا۔بلکہ چھین لیا۔اب اور کیا ملے اسے کہ دل ٹھنڈا ہو ڈائن کا!''

غصے کی شدت سے وہ تیز تیز اونچا بول رہی تھی۔لفظ ٹوٹے پھوٹے تھے۔
''اولاد کے دکھ سے بڑا کون سا دکھ۔۔۔'' رابعہ خاتون کی آواز پست ہوگئی۔
''ہونہہ۔۔۔!'' عدینہ صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھ گئی۔اس کے نتھنے پھول رہے تھے اور آنکھیں شرر بار۔
''کبھی روبی شکیل کا جوڑا چڑھا کر آجائیں گی۔کبھی ایچ ایس وائے کے لان پرنٹ۔ میں خود بوتیک چلاتی ہوں۔۔۔کچھ اندازہ ہے ایک ایک جوڑے کی کیا قیمت ہوتی ہے۔وائٹ گولڈ میں ڈائمنڈ جڑی رنگز پہنتی ہیں۔ابھی گاڑی کا نیا ماڈل خریدا گیا ہے اور کیا چاہیے جو آپ آنکھوں میں آنسو بھر کے گڑگڑا کر اور خوشیاں مانگیں۔زمین پر جنت مل گئی۔حوا بن کر رہتی ہیں۔آپ نے کبھی میرے لیے تو خوشیاں نہ مانگیں ایسے آنسو برسا برسا کر۔''
وہ غصہ کی انتہا پر تھی۔جو منہ میں آرہا تھا بولے جا رہی تھی۔
''اور اولاد کا دکھ تو وہ زندگی بھر سہے گی۔اس کے کرموں کا پھل ہے۔جب اس نے اپنی نزاکت، وقار کے جلوے دکھا کے آنکھوں کی سوئیاں نکال لیں۔میں نے تو یہ سبق سیکھا ہے کسی آج کی ہو یا سالوں پرانی،اس کو جاگتے ہی رہنا چاہیے۔''
اس کا لہجہ دکھ سے چور چور ہو گیا تھا۔رابعہ خاتون کا دل مسلا گیا۔وہ تسلی کے لیے کون سے جملے ترتیب دیتیں۔
''اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بیٹی۔۔۔تمہارے دادا۔۔۔''
''دادا کا نام مت لیں۔۔۔'' وہ اچھل پڑی۔''آپ مان کیوں نہیں لیتیں اس کی موقع شناس فطرت کو۔۔۔اس نے باقاعدہ پلاننگ کی تھی دادو۔۔۔! آپ کو نہیں پتا ورنہ۔۔۔ہم تو بیڈروم کی کلر اسکیم چوائس کر رہے تھے اور باہر کی کرا کری۔۔۔اور آپ کو کیا یاد کرواؤں۔۔۔بکسا کھول کر تو آپ ہی جوڑوں کو دھوپ لگوانے لگی تھیں۔اللہ کرے زندگی بھر روئے۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔کوئی جادو کر دیا تھا اس نے۔۔۔ورنہ یہ وہی ماموں ہیں نا۔۔۔اور۔۔۔اور یہ کیا تھیلے کے تھیلے بھر کے لے آتی ہے، ماموں کی کمائی ہے۔وہ دے تو دے۔یہ کیوں اپنا پیر اوپر رکھتی ہے۔''
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔اس کے رونے میں بے چارگی، ناکامی، تکلیف کے سو پہلو تھے۔
رابعہ خاتون نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا کر چپ کروانے کی خواہش کو تھپکا۔وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور عظیم خان کے بعد بہت کمزور و بے بس۔بیماری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ان کے آنسو کنپٹی سے گزر کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔
اور بشائر جو رابعہ خاتون کے لیے شاپنگ کر کے آئی تھی۔اس میں سے ایک بیگ گاڑی میں رہ گیا تھا۔اس نے عدینہ اور رابعہ خاتون کے تمام مکالمے سنے تھے۔
رابعہ خاتون نے تو اسے یہی بتایا تھا کہ عدینہ گھر میں نہیں ہے جبکہ وہ تھی۔
بشائر رات کی پارٹی کے بعد بہت تھکی ہوئی تھی۔مگر رابعہ خاتون کی طبیعت پوچھنا سب سے ضروری تھا۔سو وہ پہلی فرصت میں ادھر آئی۔

اس نے بیگ دھیرے سے زمین پر رکھ دیا۔ وہ رات بہت خوش تھی۔ وہ رات ہی بہت ناخوش ہوئی تھی۔ ایک ادھورا انکشاف، پزل بکس کے چند حصے، جو ابھی جڑے نہیں تھے مگر مبہم اشارے ہی بتا رہے تھے تصویر بھیانک ہوگی۔

وہ ہمت کر کے بقیہ کڑیاں جوڑنے نکلی تھی۔ اور ادھر عدینہ کی زہر افشانیاں۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ اس پر لگائے الزامات میں کوئی صداقت نہ تھی۔

اس نے پانے کی خواہش ضرور کی تھی۔ مگر کوشش ہرگز نہیں۔ وہ تو بس ایسے ہی مل گیا۔

مگر کیسے اور کیوں۔۔۔

اُسے معلوم کرنا تھا۔

☆☆☆

ڈنر کے بعد غزل پروگرام تھا۔ فرشی نشست تھی سازندے اپنے ساز سیٹ کر رہے تھے۔ جب وہ بہت مطمئن حالت میں کچھ دوستوں اور W.N.S کے پرانے اراکین چیف کے ہمراہ بیٹھ گئی۔

"میں تم سے مل کر بہت خوش ہوں۔" بوڑھی ڈاکٹر رئیسہ نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔ انہوں نے زندگی کے چالیس برس اس ادارے کو دیے تھے۔ معذور بچوں کے حوالے سے ان کی خدمات اور تحقیق نے دنیا بھر میں انہیں عزت سے نوازا تھا۔

"تمہارا ہسبنڈ بہت اسمارٹ ہے اور تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگتے ہو۔" وہ دور مامون کو دیکھ رہی تھیں۔ "مجھے پتا نہیں کیوں بار بار یہ لگتا ہے کہ میں اس سے پہلے بھی کہیں مل چکی ہوں۔" ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ وہ مسکرا دی۔

"ہو سکتا ہے ڈاکٹر رئیسہ۔۔۔ میں آپ کو ان سے ملوا دیتی ہوں۔"

مگر مامون تھوڑی دیر بعد نکل گیا۔ بشائر کے ذہن سے بھی محو ہو گیا۔ سب غزلوں پر جھوم رہے تھے۔ جب ڈاکٹر رئیسہ نے اسے اپنے نزدیک بلا لیا۔ وہ بہت جوشیلی ہو رہی تھیں۔

"مجھے سب یاد آ گیا مسز بشائر!" وہ مسکرا رہی تھیں۔

"تم بہت لکی ہو جو تمہیں مامون جیسا شوہر ملا۔ اتنی محبت کرنے والا۔۔۔ مجھے یاد ہے یہ 2005ء تھا جب وہ مجھ سے ملا۔ اس کے پاس ایک جینٹک ہسٹری تھی۔ ویری ڈینجرس اور یہ پاگل ہو رہا تھا، بہت پریشان۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ مامون آپ کے پاس کیسے آ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہو رہا ہے آپ کسی کے شبے میں۔"

"تم اپنے شوہر کی کزن ہو نا۔"

"جی ہوں۔۔۔ مگر۔"

"دیکھو لڑکی! تمہارا شوہر اتنا گڈ لکنگ ہے کہ جو ایک بار دیکھ لے وہ ہمیشہ یاد رکھے۔" وہ ذرا خفا ہوئیں، میں نے اسے ڈاکٹر صوفیہ اسلام کے پاس بھیجا تھا۔

"اسے تم سے بہت محبت تھی۔ یہ رو دینے والا تھا کہ میں اسے بتاؤں کہ وہ بے فکری سے اپنی کزن

سے شادی کرے۔۔۔مگر ظاہر ہے مجھے وہ بولنا تھا جو کیس ہسٹری کہہ رہی تھی اور میرا جواب انکار تھا کہ وہ کبھی اپنی کزن سے شادی نہ کرے۔مگر وہ بہت پیار کرتا تھا تم سے۔۔۔میں شاک میں ہوں مسز مامون کہ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے تم سے شادی کی۔محبت کو اہمیت دی۔وہ جانتا تھا کہ۔۔۔تم سے شادی کی صورت میں وہ۔۔۔آئی ایم سوری۔مگر اس نے سب بھلا کر تم ہی سے شادی کی مائی گاڈ۔۔۔لوگ کہتے ہیں، اب افلاطونی عشق نہیں ہوتا مگر ہوتا ہے۔دیکھو نا تم اور وہ۔۔۔''وہ بہت خوش تھیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔مامون آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی۔''اسے اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

''مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''ایک جواب، ایک پچھتاوا۔

ڈاکٹر رئیسہ کی بوڑھی آنکھوں میں رشک تھا۔

اور کبھی انسان مر جاتا ہے مگر نہ اعلان ہوتا ہے نہ دفنایا جاتا ہے سرد خانے میں منجمد لاش کی طرح۔۔۔درمیان میں لٹکا۔

''اور مجھے یاد ہے۔۔۔وہ اپنی کزن کے حوالے سے اور۔۔۔''

''ڈاکٹر رئیسہ!''اس نے اتنی سختی سے جبڑے بھینچے کہ رگیں ابھر آئی۔''میں ان کی وہ کزن نہیں ہوں جس سے وہ شادی کرنا چاہتے تھے۔''اس نے دھما کا سا کیا۔

الجھے دھاگے کا ایک سرا۔۔۔مگر اسے ساری ڈور سلجھانی تھی۔اس نے صوفیہ اسلام سے ملنا تھا۔

☆☆☆

وہ آٹھ سال سال پہلے کے ایسے ہی مارچ کی بہار کے ہرے بھرے خوشبودار دن تھے۔جب سارے گھر کے لوگ موسم کے جوبن سے نظریں چرائے اپنی اپنی سوچوں کے اژدہام میں گم تھے۔خود میں مگن، خاموش اور اگر کہیں کلام تھا بھی تو مبہم دھیما، ادھورا۔۔۔سوچوں کی اکھاڑ پچھاڑ کا اتنا شور تھا کہ ایک دوسرے سے مخاطب ہونا بھی گویا سب بھول گئے تھے۔

عظیم خان ڈاکٹر کی ہدایت موجب واک کے لیے جاتے تو واپسی کا راستہ بھول جاتے۔رابعہ خاتون انتظار کی کوفت سہتیں اور بڑبڑاتیں وہ عدینہ کو ساتھ لگائے سرگوشیاں کرتیں۔پریقین لہجے میں تسلیاں دیتیں اور عدینہ وہ اپنے بناؤ سنگھار کو فراموش کیے گھٹنوں بالوں کی لٹوں کو انگلیوں پر بل دیتی رہتی۔خفا چہرہ۔

''میری جانب سے ہاں ہے راحیلہ امی۔۔۔مگر پلیز مجھے آنے دیں۔''بشائر نے دنوں کی سوچ و بچار کے بعد ایک روز کہہ دیا اور اس نے محسوس کیا''ہاں''کہنے کے پل تک کی ساری مشکلیں تھیں۔ہاں کہنے سے گویا رکی سانس بحال ہوگئی تھی۔مگر ول۔۔۔یوں لگتا جیسے دل بجھ گیا ہو۔ایک سناٹے کی کیفیت۔

اور ان سب سے الگ ادھر مامون تھا۔بشائر نے دیکھا۔وہ بہت چپ چپ رہنے لگا تھا اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ راتوں کو ٹہل ٹہل کر سگریٹ کے کش لیتا، لیٹ جاتا، بیٹھ جاتا۔دھوئیں کے مرغولے میں

چہرہ دھندلا دکھائی دیتا مگر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ، دھند کے پار گمبھیر تا تھی۔ پریشانی الجھن بے یقینی ہاں اور نہیں کی تکرار۔

اس کی نگاہیں۔۔۔عدینہ کے چہرے پر ٹک جاتیں۔وہ پلکیں جھکائے بنا اسے دیکھتا۔یہاں تک کہ آنکھیں جل اٹھتیں تو چونک جاتا۔وہ رابعہ خاتون کے چہرے پر بھی کچھ کھوجتا اور یہی نہیں۔بشائر نے اپنے ہلکے سے گمان کو مشاہدے کے بعد یقین میں ڈھالا کہ اکثر مامون کی نظریں اس کا پیچھا کرتیں۔ جانچتی، تولتی پرکھتی اکثر اس کے قدموں سے لپٹ جاتیں پتا نہیں کیوں۔

مامون کی شیو بڑھ گئی تھی۔شب بے داری نے آنکھوں کی سرخی کو نمایاں کر دیا تھا۔اس عالم میں بشائر کا دل پارہ بن جاتا۔کسی پل نہ ٹھہرتا۔

''ایک حتمی فیصلے کے بعد یہ بے ایمانی ہے بشائر سجاد!'' اس نے خود کو ڈپٹا۔''تم اللہ کے حکم کی نافرمانی کر رہی ہو کہ قطعی نامحرم شخص کو بے خودی کے عالم میں تکنا۔۔۔یہ گناہ ہے بشائر! وہ تمہیں پسند آ گیا اجازت تھی۔مگر وہ تمہیں مل نہیں سکتا۔وہ کسی اور کا ہے اور تم کسی اور کی ہونے جا رہی ہو۔۔۔تو اب یہ وارفتگی۔''

دل سیدھی شرافت سے مان ہی نہ رہا تھا سو اس نے اسے گناہ و ثواب کے ذریعے عقل دی۔

وہ اب یہاں سے جانے کو بے چین تھی۔اسے لاہور میں اپنا گھر یاد آنے لگا تھا۔اسے امی ابو بہن بھائیوں کی یادیں ہر پل ستا رہی تھی اور اسے بس اب جانا تھا۔

تب ہی آسمان میں دو سیارے ٹکرائے جیسے وہ بے یقینی کے سمندر میں غرق ہو گئی۔

''کک۔۔۔کیسے۔۔۔کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔آپ نے غلط سنا ہو گا راحیلہ امی۔'' وہ خوش نہیں ہوئی۔اس پر شادی مرگ بھی طاری نہ ہوئی شدید حیرانی نے چہرے کے نقوش کو بگاڑ دیا۔

''وہ۔۔۔تو۔۔۔وہ تو عدینہ۔سب جانتے ہیں۔''

''آپ نے غلط سنا ہو گا مائی گاڈ!'' وہ فون پر بھینچی آواز میں اتنی طاقت سے چلائی کہ گلے میں خراشیں پڑ گئیں۔

''ارے بے وقوف!'' راحیلہ امی نے اس کی نادانی پر سر پیٹا۔''اس نے صاف کہا کہ وہ تو بس دوست ہے۔بچپن سے ساتھ ہے۔بہنوں جیسی ہے بھئی۔''

''مامون نے یہ کہا۔۔۔'' وہ بھونچکی رہ گئی۔''راحیلہ امی! آپ مامون سے کبھی ملی نہیں۔آپ نے عدینہ کو نہیں دیکھا بلکہ آپ نے ان دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا'' اس نے پر اسرار لہجے میں بتانا شروع کیا۔''میں خود اتنے عرصے سے سب دیکھ رہی ہوں۔وہ تو جیسے ایک دوسرے کا سایہ ہیں اور آپ کہتی۔۔۔''

''احمق لڑکی!'' راحیلہ امی نے دانت پیس کر اس کی عقل پر ماتم کیا۔''وہ ساتھ رہے ہیں۔عدینہ اس کی عادت ہو گی۔اور احمق لڑکی! مرد کھوجی ہوتا ہے وہ کھوجتا ہے نت نئے جہان۔۔۔تمہارا لیا دیا انداز اسے اکساتا ہے۔مائل کرتا ہے۔قائل کرتا ہے۔جب ہی تو اس نے سیدھا راستہ اپنایا۔وہ عدینہ کے بارے میں سب کچھ جان چکا ہے۔نئی اور پرانی کتاب کا فرق سمجھو تم۔''

''تو جب کل کوئی کتاب پرانی ہوگی تب کوئی اور۔۔۔''

''یہ میں نے صرف مثال دی ہے۔'' راحیلہ بھنا گئیں۔ ''تم صاف بات کرو تمہیں اعتراض ہے تو بولو، میں جو اتنا فورس کر رہی ہوں تو تمہارے ابو کی وجہ سے۔ وہ مامون سے مل چکے ہیں اسے جانتے ہیں اور بہت پسند کرتے ہیں اور اس رشتے کی بابت جان کر وہ شان کو تو بھول ہی گئے۔ ہم عنقریب لاہور آ رہے ہیں اور کیا تم اسے ناپسند کرتی ہو۔ میں تو صرف کمپیوٹر پر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ویری ہینڈسم مین ۔۔۔ سامنے سے کیسا لگتا ہوگا۔''

''ہاں سامنے سے۔۔۔'' بشائر نے ہار مانی۔

☆☆☆

''عدینہ کا کیا پوچھنا۔۔۔'' بشائر شمسہ بیگم کے پاس آئی تھی وہ آٹھ سالوں بعد پہلی بار دہرا رہی تھی۔ اس نے کمرے کی ہر چیز اٹھا کر پھینک دی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے تر تھا۔ بکھرے بال اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ وہ نجانے کس قدر رو چکی تھی اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جو رابعہ خاتون کہہ رہی ہیں۔

''آپ نے تو کہا تھا آپ دادا جان کو منا لیں گی ہر صورت۔۔۔ اور آپ کہتی ہیں، مامون بشائر سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔۔۔ یہ کون بشائر!۔۔ "who is" وہ چیخ رہی تھی۔

''وہ تو کہیں کینیڈا جا رہی تھی نا۔ آپ اس سے کہیں، وہ بھی نہ مانے۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ اسی نے مامون کو پھانسا ہوگا۔۔۔ اور شمسہ آنٹی، دادو کہتی ہیں۔ دادا نے کہا۔ مامون نے صحیح فیصلہ کیا۔ آپ بولیں، میرے اپنے دادا۔۔۔''

''بیٹا مرد کے دل کا حال۔۔۔'' رابعہ خاتون کیا بولتیں وہ کیا بتاتیں کیا چھپاتیں۔

''میں کیسے رہ سکتی ہوں۔۔۔ مامون۔۔۔ میں نے اس کے علاوہ کچھ سوچا ہی نہیں۔ مجھے پتا ہی نہیں کہ دنیا میں اور بھی مرد ہیں۔ (اس کا رونا بہت تکلیف دہ تھا)

''وہ دنیا کا آخری مرد نہیں تھا۔'' میں نے کہا تھا۔

''کیا پہلا، آخری۔ وہ میری زندگی کا واحد تھا شمسہ آنٹی!'' وہ بے چارگی کی انتہا پر تھی۔

''بیٹا! یہ ایک حقیقت ہے کہ تم اور ہم اب کچھ نہیں۔۔۔ وہ بشائر کے۔۔۔''

''نہیں۔۔۔'' وہ چلائی۔ ''کون بشائر دادو۔۔۔ ہم ہی تھے ہم چار صرف ہم چار۔۔۔ جیسے اسکوائر کے چار کونے۔۔۔ آپ ہی نے تو مجھے اسکوائر کی ڈیفی نیشن یاد کروائی تھی۔'' اس نے رٹا سنا دیا تیزی سے۔

اس کی لبالب بھری آنکھیں اور رو رو کر بیٹھا گلا۔۔۔ وہ اتنی قابل رحم لگ رہی تھی کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی ہو۔

''میں جاؤں گی مامون کے پاس۔'' وہ سختی سے آنکھیں رگڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں پوچھوں گی ان سے کہ۔۔۔''

''نا بیٹی!'' رابعہ خاتون نے اسے روکا اور شانوں سے تھام کر اپنے ساتھ بٹھایا۔ جتنا انجان بن کر

وہ جا رہا ہے۔ تم اتنی ہی اجنبیت سے اسے رخصت کر دو۔ یاد رکھو، جان اور آن میں سے ایک چیز بچانی ہو تو آن بچانا۔۔۔اپنے پندار کی حفاظت۔۔۔"
"مجھے گہرائی تک۔۔۔ بلندی کی باتیں نہ سنائیں۔ میں منہ کے بل پستی میں گری ہوں اس نے مجھے کیوں چھوڑا دادو۔" وہ معصومیت سے چہرہ اٹھا کر پوچھ رہی تھی۔ میں نے اپنے آنسو چھپا لیے۔"
شمسہ بیگم کی آنکھوں میں آج بھی آٹھ سال کا دکھ بول رہا تھا۔
"آپ آٹھ سال بعد اس سوال کو لے کر آئی ہیں اور ہم آٹھ سال سے سوچ رہے ہیں کہ اس نے عدینہ کو کیوں چھوڑا۔" بخت اتنی لمبی نشست میں پہلی بار بولا۔ وہ بہت سنجیدگی سے بس اسے سن رہا تھا۔
"اور بشائر سے شادی کیوں کی۔" بشائر نے سوال کے جواب میں ٹوٹے لہجے میں سوال جڑ دیا۔
شمسہ بیگم اور بخت نے نظریں چرائی تھیں۔
(میں جواب ڈھونڈ لائی ہوں۔۔۔ بخت۔)
بشائر سجاد نے پہلی نگاہ سے دو دن کے وقفے تک مامون سجاد کو عجب سرخوشی کے عالم میں استحقاق سے سوچا تھا۔ تیسرے دن اس نے جان لیا کہ وہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی اور کا ہے۔ تب وہ وقت اس نے ملال میں گھر کے کئی کتراتے خود کو سمجھاتے گزارا۔
اور رشتہ طے ہونے کے بعد سے شادی کے دن تک وہ بے یقینی کے عالم میں قصداً ہی مامون کے چہرے کو کھوج نہیں پاتی تھی۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ اس کے دل میں اس شخص کی طلب اتنی شدید تھی کہ اس نے اسے بنا کسی مقابلے کے پالیا۔ وہ شخص اس کا ہو چکا تھا۔
"اور کیا میں اسے بتاؤں گی کہ میں کیسے پہلی نظر میں۔۔۔ او خدا، میں نہیں بتا سکتی ہاں۔ جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تب۔۔۔ لیکن میں اس سے پوچھوں گی ضرور کہ اس نے کب کیوں اور کیسے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اسے چن رہا ہے۔ واہ ایک احساس تفاخر۔۔۔ اچھا پہلے اس سے پوچھوں گی پھر میں بتاؤں گی کہ میں کیسے۔۔۔" مامون کے ساتھ خود کو دوبدو سوچنا۔ خود میں سمٹ گئی۔
اور گلاب کی خوشبو سے بوجھل خوابوں جیسی وہ شام۔۔۔ وہ اپنی تمام تر وجاہت اور ساحر آنکھوں کے ساتھ اس کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کے دل کی اتھل پتھل۔۔۔ دل حلق میں اٹک گیا جب تصاویر بنوانے کے شائق گھس گھس کر ان کے دائیں بائیں بیٹھ رہے تھے اور ایک وقت ایسا آیا جب ان کے پہلوؤں میں کوئی درز نہ رہی۔ اس کی قمیص کا گلا گہرا تھا اور نیچے ڈھلک رہا تھا سب کو لگا اس نے اپنا حنائی چوڑیوں، انگوٹھیوں سے بھرا ہاتھ گریبان کو سنبھالنے کے لیے سینے پر رکھا ہے مگر مشکل سے وہ واقف تھی دل کی بے ترتیب دھڑکن۔۔۔
اور ارمانوں بھری رات۔۔۔
اور نئے آغاز کی روشن صبح۔۔۔ اسے اب یاد آتا تھا۔
جیسے گھڑی کی سوئیاں جذباتِ کے بغیر آگے بڑھتی ہیں۔ زندگی کے وہ یادگار لمحے بس آئے اور گزر گئے تھے۔
کوئی اظہار نہیں تھا۔ بس "آغاز" تھا۔

ہاتھوں میں ہاتھ تو تھا مگر ''ساتھ'' نہیں تھا۔
گفتگو تو تھی مگر ''باتیں'' نہیں تھیں۔
اور وہ شادی مرگ کے جس عالم میں تھی۔ اس نے کبھی جذبات سے عاری مشینی رویے پر دھیان ہی نہ دیا۔ وہ کنیرڈ کی پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی۔ میچور۔
مگر تھی تو عورت نا۔۔۔ جس مرد پر پہلی نگاہ پڑتے ہی اسے خیال آیا تھا۔ کاش وہ اس کا ہو، کاش وہ اس کی ہو جائے۔ اور اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔
آسمان کی بلندیوں سے کھیت کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے، سبز رنگ کا قالین بچھا ہے اسی کھیت کو زمین پر جا کر قریب سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کتنا فاصلہ موجود ہے۔
اور وہ مامون ابصار کی سنگت میں ہواؤں ہی میں تو اڑ رہی تھی۔ اس کے پیر زمین پر کب تھے۔ جو فاصلہ ماپ سکتے۔
وہ اپنے بیڈ روم کو صبح سویرے تازہ پھولوں سے سجاتی۔ وہ خود خوشبوؤں میں بسی رہتی خوشبودار موم بتیوں کی لرزاں روشنی میں شام کا استقبال کرتی۔
اس نے بہت بعد میں اپنے اور مامون کے رشتے کے بارے میں جب سوچا تو دھیان آیا۔
اس کے بے ساختہ بے حد التفات پر اس نے کبھی سرد مہری نہیں دکھائی تھی۔ مگر پہل ہمیشہ اس کی جانب سے تھی۔ مامون ابصار نے محبت کے جواب میں محبت ہی دی تھی (تاوقتیکہ)۔
مامون نے کبھی اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا۔ وہ اسے بغور سنتا تھا۔ اس کی رائے کو بے حد اہمیت دیتا تھا۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ اسے گھمانے لے گیا ہنی مون کے لیے۔ وہ اسے اندھا دھند شاپنگ کرواتا۔ اس کی باتوں پر ہنس دیتا۔ اسے سنتا رہتا۔ مگر کبھی کبھی بشائر کو لگتا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مسلسل حزن آرکا ہے۔ اس نے کبھی پوچھنا چاہا تو اس نے بہلا دیا۔
''اس کا وہم ہے وہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔'' وہ کہتا بشائر چپ سادھ لیتی وہ نہ کہتی کہ وہ ان آنکھوں کے ہر رنگ کو پہچان لیتی ہے ان آنکھوں ہی نے تو۔۔۔
اور عون کے آنے کی خبر۔۔۔ وہ جھوم اٹھی۔ اس پہلو پر تو دھیان ہی نہ گیا۔ اس کا اور مامون کا بچہ۔۔۔ کہاں ہے بچہ۔ وہ قد آدم آئینے میں خود کو کھوجتی اور ایسے میں مامون کا رویہ۔۔۔ اف وہ اسے یوں ٹریٹ کرتا جیسے کسی نے کانچ کی نازک گڑیا اپنی ہتھیلی پر کھڑی کر رکھی ہو۔ بشائر حیران ہوتی۔ وہ خوش تو نظر آیا تھا۔ مگر وہ اس کی طرح حق دق نہ رہ گیا تھا۔ وہ جیسے منتظر تھا۔ اس کا کھانا پینا سونا جاگنا آرام۔۔۔
وہ ان دنوں اپنے بزنس کو بڑھا رہا تھا۔ کامیابیاں، دن رات کی محنت۔ سفر۔۔۔ مگر ان سب کے درمیان بشائر کے لیے وقت اور توجہ۔ وہ اس کی ہر حرکت پر گویا نگاہ رکھتا اور بشائر اس درجہ پروا پر خوشی سے پاگل۔۔۔ کبھی کبھی وہ مامون کے جنون پر حیران ہوتی بلکہ گھبرا جاتی۔
کبھی اسے لگتا۔ اتنے وقت، توجہ اور گفتگو کے باوجود مامون وہ کہہ نہیں پاتا جو کہنا چاہتا ہے۔ وہ مضطرب لگتا۔ گہری سوچ میں غرق۔۔۔
''آپ خالہ دادی کے گھر نہ جا سکنے سے پریشان ہیں نا۔''

"ایسا نہیں ہے۔" مامون نے انکار کیا۔
وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پہلے عظیم خان نے اور بعد میں رابعہ خاتون نے مامون کو منع کیا تھا وہ اب۔۔۔وہ اب ان کے گھر نہ آیا کرے۔۔۔یا کم از کم عدینہ کی موجودگی میں تو۔۔۔اسے شمسہ بیگم نے ایک ملاقات میں بتایا۔
اور شمسہ بیگم اور بخت۔۔۔
"تمہیں ہر طرح کی آزادی ہے بشائر۔۔۔مگر یہ حکم نہیں ہے تم۔۔۔بخت وغیرہ سے نہ ملو۔۔۔میرا مطلب ہے اس طرف کم جاؤ تو۔۔۔دراصل بخت عجب لاپرواسا، نکما خیالی باتیں کرتا لڑکا ہے، نان پریکٹیکل۔۔۔میں منع نہیں کر رہا تمہیں اور کچھ اس حال میں۔۔۔تم جانتی تو ہو کہ میں تمہارے اور بے بی کے حوالے سے۔"
بشائر بخت کے حق میں سو دلائل اور ہزار تعریفوں کے پل باندھ سکتی تھی۔ مگر مامون نے پہلی بار۔۔۔کسی بات پر ناگواری یا ہدایت دی تھی اور بے بی کے حوالے سے اس کا اتاولا پن۔۔۔وہ قطعاً برا مانے بغیر مان گئی اور پھر بعد میں۔۔۔
وہ اپنے بے پناہ مصروف شیڈول میں سے اس کے ہر اپائمنٹ کے لیے وقت نکالتا۔ وہ ہر الٹراساؤنڈ میں سونولوجسٹ کے کمرے میں اس کے ساتھ اندر جاتا۔ کرید کرید کر پوچھتا۔ نجانے کون کون سے ٹیسٹ اور ڈاکٹرز کی ایڈوائز اور بشائر اتنی محبت پر سرشار رہتی۔
اور وہ جان چکی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہوگا لیکن جب وہ اس کے ہاتھ آیا۔ اس کی خوشی کا عالم۔ وہ ہو بہو مامون ابصار تھا اس نے بشائر سے کوئی عکس نہ لیا تھا۔
خوشی، محبت۔ کاملیت۔ زندگی مکمل ہوگئی۔ ہیپی فیملی۔
وہ مامون کی اس درجہ پروا پر حیران رہتی تھی لیکن پھر سوچا بعض لوگ دورانِ حمل بہت محتاط ہو جاتے ہیں اور بعد میں ان کا رویہ نارمل ہو جاتا ہے سو مامون بھی۔۔۔لیکن مامون کے بعد چار ماہ تک رویے نے بھی اسے حیران رکھا۔ وہ اسے چھو چھو کر دیکھتا عمیق نگاہی سے۔۔۔ڈاکٹر۔۔۔حفاظتی ٹیکے۔ وٹامنز وہ بشائر کی خوراک کا خیال رکھتا۔ اسے خود اپنی زیرنگرانی دودھ کے گلاس پلاتا تاکہ بچہ ماں ہی کا دودھ پیے اور خوراک کی کمی کا شکار نہ ہو۔
اور بشائر مامون ابصار ایک بار پھر حیران رہ گئی۔ جب اتنی احتیاط کے ساتھ پرورش پاتا بچہ چار ماہ بعد بجائے سر اور نظر ٹھہرنے کے اس کا سر ڈھلک گیا۔ اس کی نظریں پلٹ رہی تھیں۔ اس کے منہ سے مسلسل رال سی بہنے لگی تھی۔
"کم عقل عورت! تمہیں نظر کیوں نہ آیا۔" وہ اتنی زور سے چیخا کہ در و دیوار ہل گئے اور وہ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ ششدر صوفے پر گر گئی۔
"میں۔۔۔مجھے نہیں پتا چل سکا۔ وہ منہ سے دودھ تو نکالتا تھا۔" وہ ناسمجھی کے عالم میں منمنائی۔
"تمہیں دودھ اور رال کا پتا نہیں۔" اس کی آواز میں توپ کے گولوں جیسی گھن گرج تھی۔ وہ ہمیشہ بچے کو یوں چھوتا تھا جیسے نازک شاخ پر لگی نو دمیدہ کلی۔۔۔مگر اس سمے وہ اسے یوں دائیں بائیں الٹ

پلٹ رہا تھا جیسے۔۔۔جیسے کوئی بے جان فالتو چیز ٹھیک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ فالٹ ڈھونڈنے کی عجلت اور۔۔۔اور پھر بعض سر پھرے ناکام ہو کر ایک ہاتھ مارتے ہیں اور خراب شے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین بوس ہو جاتی ہے۔ بشائر نے فوری خیال کے تحت اٹھ کر بچے کو سینے سے لگا لیا۔ خود میں بھینچ لیا۔

وہ ہراساں نگاہوں سے ہانپتے اور نجانے کیا کیا بولتے مامون ابصار کو تک رہی تھی۔ وہ نجانے کن جارحانہ عزائم سے اس کی جانب آیا۔ وہ چیل کی سی تیزی سے بچے کو خود میں سموئے بیڈ پر اوندھی ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے میچ رکھی تھیں۔ مامون ابصار نے ایک زوردار ٹھوکر بیڈ پر ماری اس نے لیمپ اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر مار دیا کرچیاں چھناک چھن۔۔۔آہ۔۔۔! وہ کمرے سے نکل گیا۔

بشائر نے تسلی کر کے کہ وہ جا چکا ہے اپنی سہمی آنکھیں کھولیں اس نے اپنے روتے بچے کو بغور دیکھا۔ بچے بیمار ہوتے ہی ہیں۔ آخر کیا ہو گیا تھا۔ وہ بچے کے کپڑے بدلوانے لگی۔ اسے پتا نہیں تھا وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کے کپڑے ملگجے تھے۔ ایک یاد، ایک خیال، ایک وہم۔۔۔ہاں وہ الٹی سیدھی چپل اڑستے باہر کو لپکی۔ اسے خود ہی ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ اکیلے ہی۔۔۔اس نے کسی اور سوٹ کا دوپٹا شانے پر ڈال رکھا تھا۔ اس کا ہیر کٹ بکھرا اجڑا تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر بچے کو بانہوں میں بھینچے وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بچے کے سر سے جڑے تھے۔ اس کے آنسو تو لیے میں جذب ہو رہے تھے۔

وہ پہلی بار بچے کے ہمراہ اکیلی باہر نکلی تھی اور واپسی کے تنہا سفر نے اسے یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ وہ اب آئندہ ہمیشہ۔۔۔ایسے ہی اکیلے۔

اس کے بچے کے ساتھ ایک عمل کا آغاز ہو رہا تھا ایب نارملٹی کا آغاز۔ اس نے نظریں پھیریں، اس کا سر بے قابو ہوا۔ اس کے ہاتھ پیروں نے کبھی توانائی نہ پکڑی۔ کیا کیوں کب کیسے۔۔۔۔ بشائر کو پھر ان سات سالوں میں یہ سب سوچنے کی مہلت نہ ملی۔

عون کے لیے باپ کی محبت ختم ہو چکی تھی۔

عون کے لیے ماں کی محبت شروع ہوئی تھی۔ جو کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتی۔

ماں کی محبت، زم زم کا چشمہ ہوتی ہے ایک بار جاری ہو گیا تو بس ہو گیا۔

فقط سات چکروں میں زمین کا دل پگھل جاتا ہے۔

دراصل زمیں بھانپ لیتی ہے، ماں ستر چکر لگا کر بھی نہ ناامید ہو گی اور نہ تھکاوٹ کی شکن اس کے ماتھے پر سجے گی۔

اور شروع کے چار سال بشائر نے اس کی صحت یابی کے خواب دیکھتے ہوئے تگ و دو کی اور آگے تین سال اس نے تسلیم کر لیا تھا۔

ماں بیٹے کا رشتہ مضبوط سے مضبوط ہو گیا اور میاں بیوی کا رشتہ۔۔۔

بچہ میاں بیوی کے رشتے کو مضبوط ترین کرنے کی زنجیر ہوتا ہے مگر شاید عون زنجیر تو تھا۔۔۔مگر زنگ آلود۔

عون ان دونوں کی خوشی تھا جسے انہوں نے خوب جی بھر کے منایا تھا۔

عون ان دونوں کا دکھ تھا جسے بشائر نے اکیلے سہا تھا۔ مامون نے ہاتھ کھینچ لیے تھے نا۔
عون کو ڑھ زدہ مریض کی طرح گھر کے کونے والے کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور مامون بھول گیا کہ اس گھر میں ایک تیسرا فرد بھی رہائش پذیر ہے۔
اسے تازہ دم کھلکھلاتی ٹک سک سے درست بیوی کی ضرورت تھی۔ کسی کمی کے بغیر اور وہ اس پر ذرا بھی کمپرومائز کے لیے تیار نہ تھا۔ مجبوری، دبی زبان کا انکار، اصرار سب بے کار۔۔۔ مامون نے نرس کا بندوبست کر دیا۔ وہ مامون کو دیکھے مگر اسے بشائر ویسی ہی چاہیے جیسی اس نے پسند کی تھی۔
دونوں اپنی جگہ اڑے رہے۔ بشائر کے لیے اول و آخر ترجیح عون تھا اور مامون کے لیے اپنا امیج تھا۔

وہ اتنا کٹھور، سنگ دل، سرد مہر آنکھوں والا بن گیا تھا کہ وہ اوپر اوپر سے مضبوط دکھائی دیتی مگر دل میں لرزتی۔ دونوں اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ پھر درمیانی راہ خود بہ خود نکل آتی۔ مامون نے عون کے حوالے سے بشائر کے معاملات میں دخل دینا بند کر دیا۔ وہ سیاہ و سفید کرے اس اجازت کے پیچھے۔۔ بشائر کو مامون کی ماننا پڑی۔ اسے ہمہ وقت ایک کامیاب بزنس مین کی بیگم کی طرح رہنا پڑتا۔ اپنے لباس، انداز تک اسے ہر شے مین ٹین رکھنی پڑتی۔ دوہری ذمہ داری نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ مگر مامون اسے کسی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہ تھا۔
ایک جانب عون دن بدن مزید تنزلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ زیادہ ڈیمانڈنگ دوسری جانب مامون کا بے لچک رویہ۔
وہ چھ سال سے دوسری بار ماں بننے کے لیے تڑپ رہی تھی مگر۔۔۔ مامون۔۔۔
شروع کی حیرانگی کے بعد اس نے جانا، عون مامون کے لیے باعث شرمندگی تھا۔ شاید باعث اذیت۔ وہ اس کی بیماری کا سن کر اپنے آپ میں مگن رہتا۔ اس کے جنون کے دنوں کی چیخ و پکار سے بچنے کے لیے اس نے نیچے جا کر سونا شروع کر دیا۔ وہ گھر میں ڈاکٹرز کی آمد و رفت دیکھتا مگر کبھی پلٹ کر نہ پوچھا ''کیا ہوا ہے سب ٹھیک ہے نا'' اور شروع کے کچھ سالوں کے بعد بشائر نے ذکر کرنا ہی کم کر دیا تھا یعنی کچھ بھی بتانا۔

وہ اپنا اور مامون کا رشتہ تو نجانے کب سے فراموش کر چکی تھی۔ ایک چھت کے نیچے رہتے دو اجنبی۔۔۔ دنوں گزر جاتے وہ ایک دوسرے کو مخاطب بھی نہ کر پاتے۔ ان دونوں کا یہ فاصلہ۔۔۔ گھر کے ملازمین کے سامنے تھا۔ ہاں وہ باہر کی دنیا کے سامنے بہت اچھا بن کر پیش ہوتے تھے ایک آئیڈیل جوڑا۔۔۔

اور پھر یہ خلا اس وقت بے پناہ بڑھ گیا جب عظیم خان کے انتقال کے بعد مامون کا ایک بار پھر کھلم کھلا رابعہ خاتون کی خبر گیری کے لیے جانا شروع ہوا۔ مامون نواسا تھا اور بوڑھی نانی کی فکر کرنا اس کا ہر لحاظ سے فرض تھا۔ رابعہ خاتون جو بہت بوڑھی، کمزور اور بیمار ہو چکی تھیں۔
اور یہیں سے عدینہ اور مامون کا رشتہ دوبارہ استوار ہوا۔
بشائر کے اپنے والدین کینیڈا شفٹ ہو چکے تھے۔ اس کے لیے رابعہ خاتون مائکہ تھیں۔ مگر عدینہ،

رابعہ خاتون کو سناتے ہوئے بہت اونچی آواز میں اسے بتا چکی تھی کہ وہ یہاں نہ آئے۔۔۔ رابعہ خاتون اس کے رشتے کے لیے بے پناہ فکر مند تھیں۔ مگر ادھر ایک ناتھی مسلسل۔ وہ اپنے شوق کے مطابق ایک چھوٹی سی بوتیک چلاتی تھی۔

مامون نے ہر حوالے سے اس کی مدد کا بیڑا اٹھالیا۔ وہ اسے میڈیا کے حوالے سے لانچ کر رہا تھا۔ اس کے بنائے ملبوسات معروف اینکرز استعمال کر رہی تھیں۔ اس سب کے پیچھے اہم ہاتھ مامون کا تھا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قربت، دوستی یا۔

کیا مامون پچھتا رہا ہے۔ کیا وہ مداوا کرے گا۔ عدینہ کا مسلسل تنہا ہونا اس بات کا غماز تھا کہ وہ آج بھی مامون سے۔۔۔ بلکہ مامون ہی سے کتنی محبت کرتی تھی۔

بشائر کو سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک روشن حقیقت، وہ خود گواہ تھی۔

اور دوسری روشن حقیقت تو یہ بھی تھی کہ وہ بھی مامون سے اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اتنی ہی محبت کرتی تھی۔ پہلی نگاہ کا پہلا بے بس احساس آج بھی زندہ تھا۔

پہلی نگاہ کی خوشی۔ پلٹ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش۔۔۔ آج بھی مامون کے چہرے کو نظر بھر کے دیکھنا اس کے دل کو خوشی اور فخر سے بھر دیتا تھا۔

لیکن اب اسے کچھ عرصے سے اپنی محبت کی زندگی پر شک ہونے لگا تھا۔ وینٹی لیٹر پر رکھی محبت۔ خاتمے کے اعلان کی منتظر۔۔۔ لیکن حتمی اعلان سے پہلے ماتم تو شروع نہیں کیا جا سکتا نا۔

مامون کیا کر رہا تھا۔ کیا کرنے والا تھا۔ کیا وہ۔۔۔ اونو۔۔۔"

عظیم خان کے انتقال پر عدینہ، مامون کو دیکھ کر جس سرعت سے اٹھی اور اس کے ساتھ لگ کر جس بے قراری سے روئی۔ عدینہ کے رونے میں بے اختیاری تھی۔ ارد گرد سے بے گانہ۔۔۔

کیا وہ صرف عظیم خان کی موت کو رو رہی تھی۔ بشائر نے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

اس نے مامون کو بھی دیکھا۔ ضبط گریہ نے ان ساحر آنکھوں کے فسوں کو بڑھا دیا تھا۔ وہ پورے قد سے کھڑا عدینہ کے سر کو تھپتھپا رہا تھا۔ اس کا خود پر کنٹرول تھا۔ وہ اپنے اندر کو چھپا لینے کے فن میں طاق تھا۔ بشائر کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔

رابعہ خاتون کی عدت کے دن۔۔۔ بشائر کوشش کرتی۔ وہ ہر روز چکر لگا سکے۔ مگر عون کے باعث یہ ممکن نہ تھا۔ وقفے بھی آتے۔ رابعہ خاتون عظیم خان کو روتیں یا پھر عدینہ کی فکریں بتاتیں۔

ان دونوں کا آمنا سامنا کم ہی ہوتا۔ عدینہ کے چہرے پر نفرت کا سیاہ رنگ اتنا ہولناک ہوتا کہ وہ نظر ملانے سے کترایا کرتی۔ عدینہ اس کا آنا سخت ناپسند کرتی۔ وہ اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ بشائر کے مخاطب کرنے پر اس نے اتنی تلخ روئی سے دھمکایا کہ وہ پھر دوبارہ ہمت ہی نہ کر سکی۔

"میں دادو کی مجبوری میں تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔ میرا مزید امتحان مت لو اور کوشش کرو کہ بات چیت تو دور۔۔۔ میں تمہاری شکل بھی نہ دیکھوں۔ بچپن میں مجھے سیاہ رنگ کے ایک کتے نے کاٹ لیا تھا۔ اس دن سے میں کتوں سے خوف کھاتی ہوں اور شدید نفرت کرتی ہوں۔ لیکن اس سے سو گنا زیادہ تم سے۔۔۔"

نفرت کے زہر سے بوجھل جملوں کی بوچھاڑ نے بشائر کو نیم جان کر دیا۔
وہ بشائر کی آمد کی خبر پاتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔ سامنا ہوتا تو نفرت سے پیر پٹختی، شعلہ بار نگاہ ڈال کے ہٹ جاتی۔ عدت کے بعد بھی رابعہ خاتون سے ملنے کے لیے بشائر کا جانا کم نہ ہوا۔ ہاں وقفے بڑھ گئے۔ مگر پھر اس نے دیکھا وہ گھر میں ہوتی نہیں تھی۔ شاید اپنی چھوٹی سی بوتیک میں۔
لیکن جلد ہی اسے پتا چل گیا۔ وہ کہاں ہوتی ہے۔
اسے کچھ دوستوں نے بتایا۔ مامون اور عدینہ۔۔۔
اسے ڈرائیور نے بتایا۔ کچھ بیگمات نے الرٹ رہنے کا مشورہ دیا۔
''بھلے سے کزن ہے۔ مامون اس کی ہیلپ کر رہے ہیں، اچھا کام کرتی ہے وہ۔۔۔ مگر حد کے اندر۔ مجھے تو کل فاروق صاحب نے بتایا کہ وہ اکثر ساتھ ہوتے ہیں بلکہ ایک بزنس لنچ میں بھی اکٹھے تھے۔'' مسز فاروق نے آنکھیں نچا نچا کر بتایا۔
فیشن ویک میں بھی وہ آگے کی چیرز پر تھی۔ اب وہ اتنی فیمس نہیں ہے۔ آگے کی جگہ مامون ہی کی وجہ سے ملی ہوگی۔ ٹیکسٹائل بزنس میں بڑا نام ہے۔'' مسز بالٹی والا نے ہاتھ ہلا ہلا کر کہا۔
وہ مسکرا مسکرا کر صفائی دیتی رہی۔
اسے بخت نے الرٹ کیا۔
''ہم نے آس کا دامن نہیں چھوڑا۔ آپ طنابیں ڈھیلی نہ کر دیجیے گا۔''
وہ ہنس کر ٹال گئی۔ لیکن پھر اس نے خود دیکھا۔ وہ دم سادھے دیکھتی رہ گئی۔
یہ تو وہی آٹھ سال پہلے کے مناظر تھے۔ وہی بے خبری، وہی اردگرد سے ناآشنائی۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ مسلسل بولتی عدینہ اور ہمہ تن گوش مامون۔
وہی منظر۔۔۔ ہاں مامون اب بہت توجہ سے اسے سنتا تھا اور نئی بات تھی کہ وہ اب عدینہ کے چہرے کو بہت غور سے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا تھا۔ کہیں کھو جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر۔۔۔ چہرے پر۔۔۔ حسرت۔ ہاں حسرت وملال کے لفظ کندہ ہوتے۔
وہ کیا شکوک وشبہات پالتی۔۔۔ وہ عون میں مگن تھی۔ وہ جیسے جیسے بڑھ رہا تھا اس کے مسائل میں اضافہ ہو رہا تھا۔
اور ایسے میں مامون کو وقت دیتی یا اس کی نگرانی کرتی، فکر پالتی۔ اسے اکثر یہ خیال آیا تھا کہ وہ اور مامون ایک دوسرے سے بہت دور جا چکے ہیں۔ ان کے رشتے میں اب کوئی رابطہ نہیں بچا تھا۔ وہ عقل مند، ہوش مند تھی۔ مگر وہ اب زندگی میں صرف عون کی ماں تھی۔ مامون آج بھی اس سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ کئی پارٹیز میں جب ہر موضوع زیرِ بحث آتا تو بیگمات مامون ابصار پر آ کر رک جاتیں۔ اس کی سحر انگیز شخصیت اس کی دولت، کامیابیاں، ہاہ۔۔۔ واؤ امیزنگ۔
اور ایسے میں کوئی حیرانی نہ ہوتی جو مامون ابصار کوئی قدم اٹھا لیتا اور کچھ سالوں سے ''کوئی قدم'' کا خدشہ بہت مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ عدینہ اور مامون کا ازسرنو جڑتا رشتہ۔ اس بار اسے زیادہ مضبوط محسوس ہوا تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں یہاں تک کہ ملازمین کی گفتگو۔

''آپ عدینہ سے بہت زیادہ خوب صورت ہیں اور آپ بیوی بھی ہیں۔آپ اتنی ڈھیلی کیوں ہیں اس معاملے میں۔'' سفینہ نے اسے جتایا تھا۔

عون نے اس کے دل کو بہت چھوٹا کر دیا تھا۔

عون ہی نے اس کے دل کو بہت بڑا کر دیا تھا۔

اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔

ماموں سے کہے گی۔وہ اس کھیل کو ختم کرے۔کیا وہ عدینہ کو اپنانا چاہتا ہے۔کیا وہ اس سے۔۔۔ اچھا تو ٹھیک ہے کر لے۔

اور اس دن کی بات۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو، مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

ایک اطلاع۔۔۔ایک اعلان۔۔۔پچھتاوا۔۔۔کیا، کیا نہیں تھا اس ایک جملے میں۔

اب کیا باقی رہ گیا تھا۔ہاں اس کا دل جو آج بھی ماموں کا اسیر تھا۔

ترستی زندگیاں۔۔۔چار ترستی زندگیاں۔

وہ خود پر بشائر۔۔۔ماموں۔۔۔عدینہ۔۔۔اور بخت۔۔۔ہاں بخت بھی۔وہ انتظار کو اعزاز کی طرح نبھا رہا تھا۔اسے کنارہ مل جاتا۔وہ راستہ چن لیتا۔اس میں کیا کمی تھی۔کل کا خیالی باتیں کرتا نوجوان آج ملک کا نامی گرامی تجزیہ نگار تھا۔اس کی رائے ایوان بالا کے در و بام کو ہلا دیا کرتی تھی۔کیا کمی تھی اس میں۔

لیکن اتنی تلخ حقیقت پسندی کے بعد بھی اس کی سوئی وہیں آ کر رک جاتی۔ایک جواب طلب سوال۔۔۔پراسرار سا۔ناقابل فہم سا۔ماموں ابصار نے بشائر سے شادی کیوں کی۔

نہیں۔۔۔یہ نہیں۔

ماموں ابصار نے عدینہ سے شادی کیوں نہ کی۔

اور آج اسے اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔جس نے اسے ششدر کر دیا تھا۔

بشائر سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی تم نتیجہ اخذ نہ کرسکی تھیں۔کیا کہہ کر پکارا جائے۔نادان، احمق، عقل کی اندھی، جسے سامنے پڑی حقیقت سے آشنائی نہ ہوسکی۔

''اور۔۔۔اور بخت بھی۔۔۔ہاہاہا۔'' وہ زہر خند ہنسی ہنس دی۔

''دنیا کے قابل ترین آدمی بنتے ہو بخت! پاتال سے ڈھونڈ کر لاتے ہو بھید کے موتی اور یہ اتنی ذرا سی بات کو نہ پکڑ سکے۔''

وہ شمسہ بیگم اور بخت کے سامنے بول بول کے تھک چکی تھی۔

کون سی بات۔بخت دم سادھے اسے مسلسل سن رہا تھا۔

''ہے ایک بات۔'' اس نے لہجہ پراسرار سا بنایا اور صوفے سے پیر نیچے اتارے۔

''کہاں جارہی ہیں آپ۔۔۔کیا ماموں کو دوسری شادی کی اجازت دینے۔'' بخت کے لہجے میں آنچ سی تھی۔بے یقینی اور آنکھوں میں ایسا نہ کرنے کی التجا۔

وہ ایک دم اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''میں ماموں کے پاس جا رہی ہوں اور میں اسے عدینہ سے شادی کرنے کا کہوں گی۔نہ صرف اجازت دوں گی، بلکہ فورس کروں گی۔''

اس نے ڈرامائی وقفہ دیا۔شمسہ بیگم پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔اچھل پڑیں۔

''لیکن تم دیکھ لینا۔۔۔وہ آج بھی عدینہ سے شادی پر راضی نہ ہوگا۔وہ ایک خود غرض، موقع پرست، خود پرست شخص تھا۔ہے اور رہے گا۔جو نفع ونقصان کو تولتا ہے۔تماشا دیکھنے چلو گے، اگر یقین نہیں ہے تو۔''

☆☆☆

وہ پیدل ہی بخت کے گھر سے نکل کر سڑک کے کنارے چلتی عظیم خان کے گھر تک پہنچی۔سالوں پہلے کی عظیم خان کی دی ہدایت موجب، پھر کبھی وہ ننگے سر اس راہ سے نہ گزری۔لہٰذا آج بھی دوپٹا سر پر ٹکا تھا۔مگر اس کا دوسرا پلو نہ جانے کب ڈھلک گیا اور اب وہ پیچھے پیچھے زمین پر گھسٹتا آ رہا تھا۔

کسی راہ گیر اجنبی کو بھی وہ شکست خوردگی کی مثال نظر آتی۔گرد و پیش سے انجان، سوچوں کے اژدھام میں گھری، افسوس، ناکامی، ٹوٹا دل، بھرے نین۔

عظیم خان اور رابعہ خاتون کا گھر عجب سناٹوں میں گھرا تھا۔ورنہ عظیم خان کے پرانے ریکاڈ اور رابعہ خاتون کی آوازیں، سب گئے وقتوں کا قصہ ہو گیا تھا۔

نارنجی رنگ کے شلوار قمیص میں عدینہ ننگے پیر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔اس کے ہاتھ میں شیشے کا برتن تھا۔رنگ برنگے کٹے پھل۔۔۔اس کے چہرے پر شادابی سی تھی۔

''عدینہ۔۔۔!''اس نے بے ساختہ پکارا۔

وہ چونک کر مڑی، بوکھلاہٹ میں کانٹا گرا اور ٹن ٹن کی آواز سے سیڑھیوں سے گرتا چلا گیا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے عدینہ!''

''لیکن میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''اس کا لہجہ زہر زہر تھا۔

''مت دیکھنا۔۔۔مگر مجھے سن لینا۔اس نے برا نہ مانا۔''عدینہ نے نفرت سے سر جھٹکا۔وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''میں تمہیں سن بھی نہیں سکتی۔۔۔کس گمان میں یہاں تک آئی ہو۔ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''میں اسی کی بات کروں گی جو ہمارے ''درمیان'' ہے۔''وہ تیزی سے سیڑھیوں تک آئی اور ہاتھ بڑھا کر ریلنگ پر ٹکے عدینہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔عدینہ نے چونک کر اسے اور پھر اس کی جسارت کو دیکھا۔وہ دل سے مسکرائی۔

''تم اسی طرح پیروں پہ بھی ہاتھ رکھ دو۔تو تب بھی میں تمہاری کبھی نہ سنوں۔''اس کے جملے سے ٹپکتی نفرت اور انداز کا جارحانہ پن، بشائر کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔

''اونہہ!''عدینہ طنزیہ ہنکارا بھرتی آگے بڑھی۔

''میں سچ بتانے آئی ہوں عدینہ۔۔۔! مامون نے تمہیں کیوں چھوڑا۔ جتنا تم نے اس سوال کو تلاشا ہے۔ اتنا ہی میں نے بھی۔۔۔ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈ لائی ہوں عدینہ۔'' اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ عدینہ مڑی نہیں، مگر رک گئی۔

''تم آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کے ساتھ جی رہی ہو۔ زندگی دو صورتوں میں ہی آسان ہو سکتی ہے یا تو آپ مکمل سچ جانتے ہوں یا مکمل انجان ہوں۔ آدھا سچ تو تیر نیم کش کی طرح ہوتا ہے۔ جو نہ جینے دیتا ہے، نہ مرنے، ہم دونوں اب تک اسی حالت میں جی رہی تھیں۔ میں خالی جگہیں بھر کے آ رہی ہوں تم بھی۔۔۔''

''مجھے لفظوں کے جال میں مت الجھاؤ۔'' وہ غرائی تھی۔

''تم ہوتی کون ہو میری فکر پالنے والی، زخم دینے والے ہاتھوں نے مسیحائی کا فن کب سیکھا۔'' وہ آگ لہجے میں بولی، اس کی آنکھوں سے بھی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

بشائر نے بے بسی سے ہونٹ کچلے۔ وہ کیسے اسے بتائے۔ وہ تو پل بھر کے لیے بھی رکنے کو آمادہ نہیں۔

''تم نے سچ کہا تھا عدینہ! قسم سے میں مامون پر پہلی نگاہ پڑتے ہی ہار گئی تھی۔ اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔''

اس نے اونچی آواز میں کہا۔ رابعہ خاتون آوازوں پر باہر آ گئی تھیں۔ وہ سن کھڑی رہ گئیں۔

''اوہ۔۔۔!'' عدینہ کے سخت تاثرات سے سجے چہرے پر زلزلہ پیدا ہو گیا۔

''مجھے عون۔۔۔ عون کی قسم۔۔۔ میں۔۔۔ میں عون کی قسم کھاتی ہوں۔ میں سچ بولوں گی بس ایک بار مجھے سن لو۔''

عدینہ لرز کر رہ گئی۔ ''عون کی قسم!'' وہ کسی ٹرانس کے عالم میں سیڑھیاں اتر آئی۔ تب ہی دونوں کی نگاہ رابعہ خاتون پر پڑی۔ بشائر کے بڑھنے سے پہلے اس نے آگے بڑھ کر رابعہ خاتون کو سہارا دیا اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی صوفے پر آ گئی۔

''لیکن میں دوسرے ہی روز اس سے دست بردار ہو گئی، یہ جان کر وہ۔۔۔ تمہارا ہے۔''

عدینہ کی آنکھوں میں پھیلی بے یقینی دیکھ کر وہ دکھ سے کرلائی۔

''اتنی بے اعتباری سے نہ دیکھو، میں نے عون کی قسم کھائی ہے۔'' عدینہ کے کھلتے لب آپس میں پیوست ہو گئے۔

''تمہاری مجھ سے نفرت جائز ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو ایسا ہی کرتی، ایسا ہی سوچتی۔''

وہ خاموش ہوئی، وہ الفاظ مجتمع کر رہی تھی۔

''میں تمہارے اور مامون کے رشتے میں کبھی نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ پتا نہیں اس نے مجھے ہی کیوں چنا۔۔۔ لیکن تم اتنا جان لو کہ میں نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی، مگر تم کبھی نہ ہوتیں، وہ تم سے کبھی شادی نہ۔۔۔''

''بکواس کرتی ہو تم۔'' عدینہ حلق کے بل چلائی۔ ''تم ہوتی کون ہو میرے عیب گنوانے والی اور تم

جانتی ہی کیا ہو مامون کے بارے میں۔۔۔تم۔۔۔''
وہ غصے کی شدت سے ہکلانے لگی۔اس کا سانس بے ربط تھا۔وہ لمبے لمبے سانس لینے کو رک گئی تھی۔
''میں واقعی کوئی نہیں تھی۔مگر اب میں ہوں اور میں واقعی مامون کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔مگر اب جان گئی ہوں۔''اس کے لہجے کا ٹھہراؤ ہنوز تھا۔وہ چیخنے ،لڑنے مرنے نہیں آئی تھی۔
''کیا جان گئی ہو۔۔۔کون سی الزام تراشیاں،قصہ ختم،تم تسلیم کر چکی ہو کہ تم نے مامون کو پسند کیا،تم نے اسے پھانسا۔۔۔''
''میں نے اسے نہیں پھانسا۔اس نے مجھے،اس نے ہم دونوں کو ٹریپ کیا۔اس نے تمہیں فقط اس لیے چھوڑ دیا کہ تم سے شادی کرنے کی صورت میں وہ ایب نارمل بچوں کا باپ بنے گا۔''
''بکتی ہو تم۔''عدینہ اتنی زور سے چلائی کہ خود ہی تکلیف میں گھر کے اپنا گلہ پکڑ لیا۔رابعہ خاتون کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔
''میں سچ کہہ رہی ہوں۔اس نے ایک ایک شے کا حساب لگایا۔اس کی ماں نے ایب نارمل بچوں کو جنم دیا۔کیوں دادو!دیا تھا نا۔''وہ رابعہ خاتون سے پوچھنے لگی۔''مامون کے والد،دادا جان کے سوتیلے بھتیجے تھے۔مگر باپ کا خون تو ایک ہی تھا نا اور دادا جان ہی کی تین بہنوں میں سے دو کے ہاں دو،دو بچے ایب نارمل پیدا ہوئے۔یہ جینٹک بیماری تھی۔کزن میرج کے سائیڈ افیکٹ،آپ نے سرسری لہجے میں،ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی بیٹی کے دکھ سنائے تھے۔میں نے آپ کے آنسو بھی پونچھے تھے۔مگر گہرائی میں کبھی جھانکا نہیں۔یقین کریں،میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ سسرال کے ظلم وستم شوہر کے ناروا رویے کے باعث تنگ تھی،دکھی تھی،بیمار تھی،میں نے کبھی غلطی سے بھی نہ سوچا کہ۔۔۔اور اگر سوچ بھی لیتی تو اتنی گہرائی میں کبھی نہ جاتی،میرے ساتھ زیادہ ظلم۔۔۔''
''مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔وہ کیسے مری۔بس خبر آ گئی تھی۔مجھے نہیں پتا ان سب۔۔با۔۔توں۔۔۔کا۔''رابعہ خاتون کی کپکپاتی خوف زدہ آواز ابھری۔بشائر نے دیکھا۔ان کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔
''یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔۔۔مگر باقی سب میں معلوم کر کے آئی ہوں۔مامون نے کبھی بتایا ہی نہیں۔اس نے تو۔۔۔''رابعہ خاتون کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔
بشائر نے بوڑھی ویران بہتی آنکھوں سے نظریں چرائیں۔اس نے عدینہ کو دیکھا،جو پہلی بار بھڑکے بغیر سن رہی تھی۔مگر نگاہیں ملنے پر اچھلی۔
''تو تم نے بھی تو۔۔۔ایب نارمل بچہ ہی پیدا کیا نا،تم نے کون سا۔۔۔''
''ہاں۔۔۔!''وہ طنزیہ ہنسی۔''میں نے بھی ایب نارمل بچہ جنم دیا۔یہیں تو مامون ابصار کو مات ہوئی تھی۔''
''تم سچ کہتی ہو۔مامون تم ہی سے محبت کرتا تھا۔عشق اور تم ہی کو اپنانا چاہتا تھا۔وہ ڈاکٹرز کے آگے رو پڑا کہ اسے اپنی کزن ہی سے شادی کرنا ہے۔کزن یعنی تم۔۔۔اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ

عدینہ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا۔ لاکھ ان کے خاندان میں جینٹک بیماریوں کی ہسٹری ہے۔ مگر وہ پھر بھی عدینہ ہی کو اپنائے گا۔ وہ پاگلوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر پوچھ رہا تھا۔ وہ پیش بندی معلوم [illegible] رہا تھا۔ ایسا کوئی راستہ یا علاج جس کے ذریعے وہ تندرست اولاد کو جنم دے سکیں۔ مگر ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، مگر ۹۹ فیصد چانس ہے کہ وہ بھی۔۔۔ آپ اتنا عشق کرتے ہیں تو ایک راستہ یہ بھی ہے کہ آپ۔۔۔ آپ کزن سے شادی کر لیں۔ مگر کبھی بچے کے بارے میں نہ سوچیں۔"

"واٹ!" وہ بوکھلا کر اچھل پڑا۔

"ہمارا کام ہے آپ کو گائیڈ کرنا، سچ سچ بتانا، ہم نے عمریں گزار دی ہیں، تحقیق و علاج میں۔ نارمل بے بی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر دوسرے کا بھی امکان رکھیں، باقی اللہ مالک ہے۔"

"اور کیا تمہیں آٹھ سال پہلے کے وہ دن یاد نہیں، جب دادا جان بیمار ہوئے اور رابعہ دادو نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا تو مامون یہاں نہیں تھا۔ وہ ان ہی دنوں ڈاکٹرز پہ ڈاکٹرز بدل کر رائے لے رہا تھا۔ میں نے بھی یادداشت پر زور دے کر کڑیاں جوڑی ہیں عدینہ تم بھی خیالوں سے باہر نکلو۔ وہ نہ جانے کہاں سے لوٹا تھا۔ چپ چپ، پریشان، اس کی شیو بڑھی رہنے لگی تھی۔ وہ راتوں کو ٹہلتا تھا۔ سب کے پوچھنے پر وہ جبراً نہ ہونے کا اعلان کر دیتا۔ مگر کچھ تو تھا ہی۔

وہ دوراہے پر کھڑا تھا۔ اسے تم سے محبت تھی، بے پناہ۔۔۔ مگر اس کو اولاد بھی چاہیے تھی۔ تندرست و توانا اولاد۔۔۔ نسل۔۔۔ نام۔۔۔ وراثت۔ اس نے محبت کو چھوڑ دیا۔ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ اسے مکمل صحت منداولاد چاہیے تھی اسے اپنا نام لیوا چاہیے تھا۔ اسے کسی دوسری لڑکی سے شادی کرنا تھی اور فوری دستیاب میں تھی۔"

وہ خود پر ہنسی۔ "اور میں پاگل۔۔۔

میں نے سوچا تھا کہ مامون جتنا شان دار۔ اس کے ساتھ اتنی ہی شان دار، طرح دار لڑکی ہونی چاہیے اور تم ویسی نہیں تھیں یا۔۔۔ مجھے لگی نہیں۔۔۔ میں نے سوچا، پہلے چونکہ مامون کے اردگرد کی واحد لڑکی تم تھیں۔ تو سارے فیصلے تمہیں مدنظر رکھ کر وہ کرتا گیا۔ لیکن ایک بہتر آپشن جب سامنے نظر آ گیا تو۔۔۔ میں نے "بہتر آپشن" خود کو کہا ہے۔"

وہ اپنے آپ پر ہنس دی۔ "تو اسے کبھی نہیں چاہیے کہ وہ کم تر پر اکتفا کرے۔ تم بہت اچھی تھیں عدینہ! مگر مجھے اس کے برابر کی نہیں لگیں۔ میری عقل۔۔۔"

گفتگو اس مرحلے پر آ گئی تھی کہ عدینہ سن رہ گئی تھی۔ بہت سارے اعتراضات کے باوجود وہ نہ جانے کیوں چپ سی رہ گئی تھی۔

"میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا دادو۔" وہ جیسے اچانک نڈھال ہو کر رابعہ خاتون کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

"آج میں اپنا دل کھول کر رکھنے کے لیے آئی ہوں۔ میں نے آج تک اپنے دکھ کسی سے نہیں کہے مگر میں خوش نہیں ہوں۔ میں بہت دکھی ہوں۔ عون جیسا بچہ آزمائش بن کر آیا۔ وہ اپنے پسندیدہ بندوں

ہی کو آزماتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اتنی ی ی پسندیدہ۔۔۔"

رابعہ خاتون کو جھٹکا سا لگا۔ سالوں پہلے کا یادداشت سے اوجھل ایک پل، ایک سوال سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ ان کا پورا وجود رعشہ زدہ ہو گیا، کانپتے ہونٹ اور جھر جھر بہتی آنکھیں۔

"اور کوئی بات نہیں۔ اللہ نے میرے لیے ایسی اولاد چنی ٹھیک ہے وہ بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔ میں بہت مضبوط ہوتی دادو! اگر ماموں کا ہاتھ میری پشت پر ہوتا۔ اس نے یوں قدم پیچھے ہٹائے۔ جیسے یہ سارا میرا دوش ہو۔ سائنسی توجیہہ پیش کروں تو عون ماموں کے باعث ایسا ہے۔ وہ تو سب جانتا تھا نا، مگر دادو! وہ کبھی میرے ساتھ کھڑا نہ ہوا۔ سالوں ہو گئے، اس نے عون کے کمرے میں جھانکا تک نہیں۔ دس عون جیسے بچے کھڑے کر دیے جائیں نا تو وہ عون کو پہچاننے بھی نہیں وہ نفرت کرتا ہے عون سے۔ شدید ترین، وہ اسے زہر کا انجکشن نہ دے دے مجھے یہ خیال آتا ہے۔ عون اس کے لیے باعث شرم ہے۔" وہ رونے لگی۔ مگر اس نے اپنی بات نہ روکی۔

"وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ عون اس کے سامنے آئے یا میں ہی اسے اس سے لاڈ کرتی نظر آؤں۔ آپ حیران ہو رہی ہیں نا۔ میرے گھر کے ملازمین واقف حال ہیں۔ وہ مجھے صاحب کے عتاب سے بچانے کے لیے جھوٹ سچ گھڑتے ہیں۔ وہ مجھے درست مانتے ہیں اور صاحب کو ظالم و جابر حکمران، مجھے اور عون کو مظلوم رعایا۔"

"وہ۔۔۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ میرا دل نہیں مانتا۔ وہ تو سالوں تک۔۔۔" رابعہ خاتون ڈھے گئیں۔

"وہ ایسا ہی تھا" وہ تیقن سے بولی۔ "اندر سے ایسا ہی تھا۔ مگر کیوں میں آج تک نہ سمجھ سکی۔ میرے لیے۔"

"تو اس کا مطلب ہے تمہارے دادا درست کہتے تھے کہ اس نے صورت ماں کی لی ہے۔ مگر وہ بنا بنایا باپ ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ بے یقینی سے کہتے کہتے بے بسی سے پوچھنے لگیں۔

"مجھے نہیں معلوم، دادا جان کیا کہتے تھے۔ میں نے تو بس اس کی صورت دیکھی اور گھائل ہو گئی اور آپ نے بتایا تھا نا کہ دادا جان، عدینہ اور ماموں کے رشتے کے مخالف تھے۔ ان کی زیرک نگاہی نے بھانپ لیا ہو گا کہ ماموں ابصار کا اندر کیسا ہے، میرے ساتھ ظلم ہوا دادو۔ میں۔۔۔"

"وہ۔۔۔ وہ آخری پل میں مان گئے تھے۔" اس کے جملے کو کاٹ کر رابعہ خاتون نے اٹک اٹک کر کہا۔ "میرے مجبور کرنے اور عدینہ کے ستے چہرے کو دیکھ کر وہ۔۔۔"

عدینہ اور بشائر ایک ساتھ اچھلیں۔

"میں یہ خوش خبری لے کر ماموں کے پاس گئی تو اس نے تمہارا نام لے دیا۔ فائنل۔"

"آ۔۔۔ آپ نے تو مجھے کبھی نہ بتایا۔" عدینہ کا چہرہ شدید حیرانی کے باعث بگڑ گیا۔

"کیا بتاتی۔۔۔ کہ دادا مان گئے اور اب ماموں نہیں مان رہا۔ میں نے تمہیں جھوٹ سچ ملا کر جواز بتایا تھا۔ پر۔۔۔ میں نے سوچا کہ تم یہ پوری بات جان کر کہ ماموں ہی نہیں مانا، کس قدر دکھی ہوتیں۔ میں نے تمہارے غصے کو بانٹ دیا تھا۔ آدھا دادو پر، آدھا بشائر پر، آدھا ماموں پر۔۔۔ وہ اس کے جنون سے گھبراتے تھے۔ وہ ماموں سے اعتدال کے خواہاں تھے۔ معاف کرنے کے، جبکہ ماموں۔۔۔

مجھے آج یقین آ گیا۔ وہ سچ کہتے تھے۔" وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ دکھ کی ان مٹ لکیریں۔

"چھوڑیئے رابعہ دادو۔ بات صرف یہ ہے کہ اصل ظلم میرے ساتھ ہوا کہ مجھے ایسا شوہر ملا جسے مجھ سے محبت نہیں تھی اور ظلم عون کے ساتھ ہوا کہ اسے مامون جیسا باپ ملا۔ عدینہ! تمہیں میرے اسٹائل نظر آتے ہیں۔ میرے بالوں کا اسٹائل میرے لباس کوئی مجھ سے پوچھے تو میں شاید دنوں ایک ہی جوڑے میں گزار دوں۔ تم کہتی ہو میں نے اپنا ہیر کٹ مین ٹین کر رکھا ہے۔ میری پیاری، نادان بہن! مجھے تو بڑھے ناخن کاٹنے تک کا ہوش نہیں۔ عون کا دکھ مامون کی بے اعتنائی مجھے ختم کر رہی ہے۔ اللہ کی قسم مجھے تو اب بھی نہیں معلوم کہ میں نے کون سے کپڑے پہن رکھے ہیں، شلوار قمیص یا اور رنگ شاید براؤن یا شاید پیلا۔"

رابعہ خاتون اور عدینہ نے بے ساختہ دیکھا۔ وہ مشہور ڈیزائنر کی لیٹسٹ کلیکشن کا ہلکا و گہرا جامنی سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ سفید اور سیاہ چھوٹے بڑے پھول۔۔۔ مگر وہ سوٹ ملگجا ہو رہا تھا۔ اس کے ایک کان میں ٹاپس تھا اور دوسرے میں نہیں۔

ہاں وہ شکست خوردگی کی تصویر تھی۔ ملال کی مثال۔۔۔ دکھ کا عنوان، اذیت کے مضمون کی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ کہنی رابعہ خاتون کے گھٹنے سے ٹکی تھی اور سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ پیر سن ہو گئے تو نہ جانے کب وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ اس کی نزاکت اب کمزوری دکھائی دیتی تھی۔ اس کی شخصیت کا وقار نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ وہ اس وقت فقط مٹی مٹی نظر آ رہی تھی۔ دھول، نادیدہ۔۔۔ پپڑی زدہ ہونٹ اور حلقوں کے گھیرے میں ویران آنکھیں، جورو، رو کر سوجی تھیں۔ مگر پھر بھی بول رہی تھی۔ مگر اب انداز بے حد دھیما سرگوشیانہ، مدھم، بلکہ خود کلامی رہ گیا تھا۔

ان دونوں کو لگا، وہ جیسے کہیں دور پہنچی ہوئی تھی۔ کسی اور ہی جہان میں اور تم مجھ پر رشک کرتی ہو۔ مجھے کہتی ہو کہ میں دکھانے، بتانے آتی ہوں۔ میرے پاس دکھانے کو صرف جھوٹ ہے اور بتانے کو صرف دکھ۔۔۔ ایک زمانے میں مامون میری خواہش تھا اور اب وہ کہیں نہیں ہے۔ میری ترجیحات پوچھتی ہو۔ میں چاہتی ہوں۔ عون بالکل ٹھیک ہو جائے۔ بھاگے دوڑے اچھلے کودے مگر یہ ہو نہیں سکتا۔ عون جیسے بچے کبھی آگے نہیں بڑھتے۔ وہ آگے پیر رکھ بھی دیں تو پڑتا پیچھے ہی ہے۔ میری زندگی میں عون کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ خواہش، خواب، امید، سب عون اور اگر کوئی میرے دل میں جھانکے۔۔۔ میں ماں بننا چاہتی ہوں۔ ایک تندرست بچے کی۔ مگر یہ بات مامون ہونے نہیں دے گا۔ میں سر پٹخ پٹخ ہار گئی۔ مگر اسے قائل نہیں کر سکی۔ تمہاری تو وہ بہت سنتا ہے نا عدینہ! کیا تم میری سفارش کر سکتی ہو، میں اللہ سے ہر وقت ایک تندرست مکمل بچہ مانگتی ہوں۔ تاکہ جب کل عون نہیں ہو گا، تو۔۔۔"

دونوں نے دہل کر اس کی صورت دیکھی۔

"میرے پاس کیا ہو گا۔ ہمارے رشتے میں اب کچھ نہیں بچا عدینہ۔۔۔! میں بقائمی ہوش و حواس مامون کو دوسری شادی کی اجازت دے دوں گی۔ لکھ کر دوں گی اور چلو میں لکھ کر نہ بھی دوں تو تب بھی جلد یا بدیر وہ کر بھی لے گا۔ تم بھی آگے بڑھ سکتی ہو۔ مگر جان لو، میں شرط لگا سکتی ہوں۔ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا اور ہاں ہو سکتا ہے، وہ ساری زندگی میرے ساتھ ایسے ہی آدھا، کانا رشتہ نبھاتا رہے۔ مگر تم اپنی

راہ کیوں کھوٹی کرتی ہو۔
تم خوش قسمت ہو عدینہ۔۔۔! جو ایک دھوکا باز، مفاد پرست انسان سے بچ گئیں۔ جس نے تمہیں گائے بکری کی طرح جانچا اور تم معیار پر پوری نہ اتریں تو آگے بڑھ گیا۔ مجھے اس نے خوب چھان پھٹک کر پسند کیا تھا۔ مگر بعض اوقات الٹی ہو جاتی ہیں سب تدبیریں۔
تم میں اور مجھ میں ایک ہی بات مشترک ہے۔ ہم دونوں صرف صورت پر عاشق ہوئیں۔ لیکن تم خوش قسمت ہو عدینہ تمہیں سچی محبت ملی۔ اور میں بدقسمت اپنی محبت پا کر بھی خالی ہاتھ۔ تمہیں بخت کا محبت بھرا دل کیوں نہ دکھائی دیا۔''
ایک موت جیسا سناٹا کمرے کی ہر شے سے لپٹ گیا۔
''میں سالوں تک تمہارے دادا سے جھگڑتی رہی کہ وہ الگ ہے جدا سا۔۔۔ وہ ویسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں۔ مگر مجھے آج پتا لگا وہ تو بنا بنایا ابصار تھا۔ دوسرا ابصار۔'' رابعہ خاتون کے اس ایک جملے میں ان کا سارا دکھ پنہاں تھا۔ انہیں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے سب کہہ دیا تھا۔
اور عدینہ۔۔۔!
کمرے میں دفعتاً ہلکی دبی سی سسکیاں ابھریں۔ یہ عدینہ کی آواز تھی۔ وہ کس کس چیز پر رو رہی تھی۔ بشائر کی سچائی پر۔ اس کے دکھ پر۔ رابعہ خاتون کی دل چیر دینے والی خود کلامی پر۔ یا اپنی محبت کی موت پر یا محبوب کی حقیقت پر۔
اتنی محبت کے دعوے دار نے جب راستہ بدلا تو اس کو بتانے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کبھی بدگمانی دور ہی نہ کی۔ کیا اس میں بھی جرأت نہ تھی کہ وہ اس سے صاف بات کہتا۔
وہ کس بات پر رو رہی تھی۔ کسی نے سوال نہ کیا۔ وہ یک دم اٹھ کر شاید اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی۔ جب بشائر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نظریں ملنے پر اس نے بیٹھے رہنے کا اشارہ دیا۔ اس کے انداز کی قطعیت نے عدینہ کو دوبارہ بٹھا دیا۔
''کب تک چپ چاپ کھڑے خود پر لگی دفعات کو سنتے رہیں گے۔ سامنے آ کر اپنی صفائی میں کچھ نہ کہیں گے۔ کوئی سچ، کوئی جھوٹ۔۔۔''
بشائر نے گردن موڑے بنا اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔ عدینہ اور رابعہ خاتون بری طرح چونکیں اور پچھلے گھنٹے سے دروازے میں کھڑا ماموں ابصار بھی اچھل پڑا۔
''سالوں پہلے اس سگریٹ کی خوشبو سے آشنائی ہوئی تھی۔'' بشائر نے یہ جملہ کسی سے کہا نہیں تھا۔ مگر اس کے لہجے میں خود اپنے آپ کے لیے ترحم تھا۔
ماموں ابصار حسب عادت اندر داخل ہونے سے پہلے طویل آخری کش لینے رکا تھا اور پھر رکا ہی رہ گیا۔
بشائر نے اپنا چہرہ گھما کر سوجی آنکھوں سے اس سنگ دل کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر شرمندگی یا خوف کے بجائے ایک عجیب سی تکلیف کا تاثر تھا۔ بے حد شدید تکلیف کا عالم۔۔۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کی ہتھیلیوں پر ٹکے تھے۔ اس کی نظریں زمین پر

پیوست تھیں۔
"کس قسم کی زندگی جی آپ نے مامون۔ کس قسم کے رشتے جی رہے ہیں آپ۔" اس کا لہجہ دکھ سے چور چور تھا۔
"نہ اچھے شوہر بنے۔ نہ اچھے باپ۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنسی۔ "ارے آپ تو اچھے محبوب بھی نہ بن سکے۔"

اس نے ایک جملے میں ساری داستان سمیٹ دی۔
پل بھر کی خاموشی کے بعد مامون نے نظریں اٹھا کر بشائر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ان میں بہت عجیب سا تاثر تھا، ناقابل بیان۔۔۔ بشائر نے کچھ چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔
"اتنی جلدی میرے عیب ختم نہ ہوں گے بشائر۔"
اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، ایک حتمی فیصلہ۔
"میں اچھا بیٹا بھی نہیں بن سکا تھا۔ بلکہ میں اچھا بھائی بھی نہ بن پایا۔"
بشائر سمیت عدینہ اور رابعہ خاتون نے چونک کر نظریں اٹھائی تھیں۔

☆☆☆

وہ گیارہ سال بعد ماں بننے جا رہی تھی۔ خوشی، خدشہ، دعا اس کے شوہر اور سسرال کے تحفظات حسب معمول تھے۔ مگر اس کا یقین پہلے سے بڑھ کر ایک ایب نارمل ذہنی و جسمانی معذور بچے کے بعد وہ اپنے خاندان کو ایک خوب صورت، صحت مند، توانا وارث بھی دے چکی تھی۔
اسے بیٹی کی خواہش تھی۔ مکمل خاندان، اس کے سجدے طویل ہونے لگے۔ وہ اس بار روحانی طور پر بہت پرسکون تھی۔ مگر بہترین خوراک کے باوجود، اس کے جسم کی ہر ہڈی بولتی، ہاتھ پیر سن ہو جاتے۔ ابتدائی مہینوں ہی میں اس کا اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ پیٹ کے نچلے حصے میں مسلسل ہلکا درد اور ورم کا احساس رہتا۔

اور درد کا نخرہ یہ تھا کہ وہ آرام کرتی رہے تو درد بھی آرام کرتا۔ وہ معمولی سے معمولی کام یا سیڑھیاں ہی چڑھ کر اور جاتی تو درد جاگ جاتا۔ مار ڈالتا اور اب اس کی سسرال میں پوزیشن مستحکم تھی۔ وہ اتنے بڑے افسر کی بیگم تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ خوب مزے سے پلنگ پر بیٹھ کر اس وقت کو گزارے اور اس میں کوئی مشکل بھی نہیں تھی۔
لیکن نہیں! وہ مونس کی ماں بھی تو تھی۔ جسے اس گھر میں اس کے علاوہ آج بھی کوئی نہیں پوچھتا تھا اور وہ بھی اس کے علاوہ کسی کو اپنے گرد برداشت نہ کرتا تھا۔ اس کا کمرا اوپر شفٹ کرایا گیا تھا اور اسے سیڑھیاں چڑھنا پڑتیں۔ اسے دن میں کئی بار اوپر نیچے ہونا پڑتا۔
گزرتے وقت نے مونس کو مزید تنزلی کی جانب بڑھایا تھا۔ آج تک اسے ماں ہی نے سنبھالا تھا۔ وہ کسی بھی نئی شکل کو دیکھ کر چلانے لگتا۔ اسے کھلانے، پلانے، کپڑے بدلوانے، نہلانے تک کے کام وہ ہمیشہ سے خود خوشی خوشی کیا کرتی تھی۔ مگر اب وہ بہت کمزور تھی اور تکلیف میں مبتلا۔۔۔ اس نے ملازمہ کو اپنے ساتھ زیادہ لگانا شروع کیا کہ وہ اس سے مانوس ہو جائے۔ اگر اس کا موڈ اچھا ہوتا تو وہ مان

جاتا۔ ورنہ وہ چیخ و پکار ہوتی کہ الاامان۔

ایک روز وہ چکر کھا کر بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے بتایا۔ بار بار کے ابارشنز نے انہیں اندر سے جیسے زخمی کر رکھا ہے۔ تو وہی زخم تکلیف دیتے ہیں۔ مکمل آرام اور احتیاط دوائیں باقاعدگی سے۔

اس کا حال بہت خراب تھا۔ وہ حوائج ضروریہ کی محتاجی سے بیٹھی تھی۔

ادھر مونس کے نعرے۔۔۔ وہ ملازمہ کے ہاتھ کہاں آتا۔ اس کے شوہر نے ایک آدمی کو بطور ہیلپر بھیج دیا۔ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ رہے سہے حواس بھی کھو بیٹھا۔ وہیل چیئر پر سر پٹختا۔ سامنے والا قابو میں آتا تو اسے پورے وجود کی طاقت سے کاٹ لیتا۔ ورنہ ناکامی کی صورت اپنے ہاتھ چبا ڈالتا۔ وہ ذرا سی بحالی کا احساس پاتے ہی ملازمہ کے سہارے اوپر آ گئی۔ اس سے لپٹ گئی۔ اس کا بچہ۔ اس کی آنکھوں سے سیل رواں بہتا تھا اور وہ بھی لپٹ لپٹ گیا۔ اس کے اندر سمانے کی کوشش اور وہ خود کو سنبھالتی یا اسے۔ وہ پندرہ سال کا تھا۔ قطعی ایب نارمل، لیکن ملازمہ اسے نہلاتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ اس نے بڑے حساب کتاب سے اس دن اسے نہلانے کا ارادہ کیا۔ جھاگ کے کھیل، ٹب میں تیرتی بطخوں کا کھیل۔ ملازمہ تولیہ کپڑے لیے الرٹ، اسے نہلانا مشکل کام تھا۔ مگر نمٹ گیا۔ لیکن یک دم۔۔۔ دھڑام۔۔۔ ڈھا۔۔۔ وہ نہ جانے کس طرح پھسل گئی۔

اسے کس طرح بچایا گیا۔ پتا نہیں۔ اس کے اندر پلنے والا بچہ بھی محفوظ رہا۔ مگر وہ بستر نشین ہوگئی۔ گرد و پیش سے بے گانہ درد سہتی۔

''مونس اچھا ہے نا۔'' وہ ملازموں سے پوچھتی۔

''تم بھائی کے پاس جاتے ہونا۔'' اس نے چھوٹے بیٹے سے پوچھا۔ ''اس کے ساتھ بال کھیلتے ہو نا۔'' بچہ ہاں میں جواب دیتا۔

مگر ایک روز کہہ بیٹھا۔ ''میں نہیں جاتا امی! اس سے بو بہت آتی ہے۔''

''بو۔ کیسی بو۔۔۔'' اس کے سر پر پہاڑ سا گرا۔

''پوٹی کی اور ابو نے اسے گنجا کر دیا۔ اس کے سر میں بہت جوئیں تھیں امی۔'' اس کے پیروں سے زمین کھسک گئی۔

وہ افتاں و خیزاں اوپر پہنچی تو بدبو کے بھبکے نے استقبال کیا۔ بھنبھناتی مکھیاں۔ آؤک اوو۔۔۔ اس کا کلیجہ منہ کے راستے ابلنے کو تھا۔

وہ اس کے بستر پر پہنچی۔ تو وہ خالی آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ ان میں پہچان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ صرف نو دن میں۔۔۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ وہ ماتھا چومنے کو جھکی تو اس نے یک دم اپنی حیوانی طاقت سے نہ جانے سر اٹھایا یا ہاتھ۔ اس کے پیٹ کے اندر بم دھماکا ہوا تھا۔ اس کی چیخوں نے درختوں کے پرندوں تک کو سہا دیا۔

اسے لے گئے۔ اس کے پیٹ میں پلتی بچی نے دم توڑ دیا تھا۔ مگر اس کی موت کا وقت ابھی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ گھر آ گئی۔ آپریشن کی تکلیف۔ وہ جنبش کرنے سے بھی قاصر تھی۔ اسے اردگرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس نے اپنی عیادت کے لیے آئے والدین کو بھی نہ پہچانا۔ اسے ایک ہی بات یاد تھی۔

''مونس کیسا ہے۔'' سب اس کی تشفی کرا دیتے وہ گھر والوں سے واقف تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے بھی واقف تھی۔

''تم بتاؤ سچ سچ!'' اس نے چھوٹے بیٹے کو پکڑ لیا۔

'''' وہ اچھا ہے امی۔'' وہ نظریں چرا رہا تھا۔

''جھوٹ نہیں بولتے۔''

''آپ بیمار تھیں نا۔۔۔ تو پہلے وہ بہت روتا تھا۔ شور کرتا تھا۔ پاگل ہو گیا تھا۔ امی اوہ سوری۔۔۔ سب کہتے تھے نا۔ لیکن پھر اس کے بعد چپ کر گیا۔ دراصل جب ابو اور چاچو نے اسے زنجیر سے باندھا نا تب۔۔۔''

''ہاہ!'' اس کی چیخ نکل گئی۔

اس کا پیٹ چرا پڑا تھا۔ ٹانکے کچے تھے۔ مگر وہ اوپر آ گئی۔

''آہ!'' اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مگر اس کی آنکھوں سے لہو ٹپکنے لگا تھا۔

''اس کا بچہ۔۔۔'' تن تنہا غلاظت میں لتھڑا، بے بس ولاچار، اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے اجنبی نگاہوں سے تکتے ننھے بچے کو خود میں سمو لیا، اسے چوم لیا۔ اس کی زنجیر۔ اس نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ اس کے اندر ہمت اور طاقت نہ جانے کہاں سے آ ئی۔ اس نے بیٹے کو نہلایا۔ کپڑے بدلوائے۔ اس نے خاموش بیٹے کو کھانا کھلایا۔ اس نے میلے کپڑوں کا ڈھیر کچھ کہے بنا ملازمہ کے حوالے کیا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا نا تمہیں صرف اپنے بھائی سے محبت کرنی ہے۔'' وہ چھوٹے بیٹے سے مخاطب تھی۔

''تو میں کرتا ہوں نا۔۔۔ میں نے کل بھی اسے I Love You کہا تھا اور فٹ بال کھیل کر دکھائی تھی۔ ٹام اور جیری بھی دیکھنے آیا تھا۔ مگر ادھر بہت بو تھی امی۔''

ہاں وہ اس کا بیٹا ہے اور اس نے اسے سنبھالنا ہے۔ اس نے سوچا تھا مگر یہ عزم اگلی صبح دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اس کے ٹانکے کھل گئے تھے۔ اس کا پیٹ کھل گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر سرجری کی ٹیبل پر تھی۔

اس بار وہ گھر لوٹی تو بے جان تھی۔ ختم، پانی کے گلاس کی بھی محتاج کروٹ بدلنے سے قاصر۔ اسے اوپری کمرے سے شور کی آوازیں آتیں۔ زنجیر کی آواز، گھر والوں کی بک جھک، مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ وہ خود ہوش و بے ہوشی کے درمیان زندہ تھی۔ اسے عجیب و غریب خواب ستاتے۔

اس کی دواؤں میں نشہ سا تھا۔ وہ گھنٹوں سوئی رہتی اور ہوش آنے پر بھی دماغ سن رہتا۔

''اللہ سائیں آپ کو صحت دے بی بی! کوئی غلطی ہو تو ماپھ (معاف) کر دینا۔''

''تم کہاں جا رہی ہو صغراں۔۔۔ مونس کو تمہاری ضرورت ہے۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ ذرا مجھے ٹھیک ہونے دو۔''

ملازمہ ہچکچائی۔ ''بڑی بیگم صاب نے تو خاموشی سے جانے کا بولا تھا۔ مگر بی بی! آپ کے بڑے

احسان تھے مجھ غریب پر۔۔۔مونس بابا کو میری اب کیا ضرورت۔"

"کیوں! کیا مطلب۔"

"اس کو تو۔۔۔اس کو تو صاب جی گاڑی میں ڈال کر، کہیں دور، بہت دور چھوڑ آئے ہیں۔ وہ بہت خطرناک ہو گئے تھے جی۔ زنجیر والا ہاتھ سر پر مار، مار کے اپنا ہی خون کر ڈالا۔ صاب کے ہاتھ پر کاٹ لیا جی۔ پوٹیاں لگ گئی تھیں۔ نہلانے دھلانے والا لڑکا بھی بھاگ گیا۔"

وہ لہولہان تھی۔ وہ بے جان تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ مگر قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ لڑے، جھگڑے، چلائے، کوسے یا پھر صرف پوچھے کہ بتادو میرے جگر گوشے کو کہاں چھوڑ آئے۔

"کہاں ہے میرا بچہ۔" وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر بمشکل کھڑی پورے جسم کی طاقت لگا کر چلا رہی تھی۔ "ارے ظالمو! کہاں ہے میرا بچہ۔"

وہ گرتی پڑتی سیڑھیاں چڑھی۔

ہاں۔۔۔وہ تو خالی دھلا دھلایا کمرا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

"وہ وہیں ہے جہاں اسے عرصے پہلے چھوڑ آنا چاہیے تھا۔" اس کے شوہر نے سگار کی راکھ کا جائزہ لیتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ وہ چیل کی سی تیزی سے جھپٹ پڑی۔

"ظالم انسان، کہاں چھوڑ آئے میرے بچے کو۔" وہ اس کے سینے پر زور، زور سے ہاتھ مار رہی تھی۔ اور شوہر کے خواب وخیال میں بھی یہ ری ایکشن نہ تھا۔

"میرا بیٹا لا کر دے۔" وہ حلق کے بل چلائی اور شوہر کا دھکا لگنے سے گر گئی، جوحق دق اس کو دیکھ رہا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہے یہ۔۔۔پاگل کی ماں پاگل۔" وہ گھر کے لوگوں سے مخاطب تھا۔ "لے جاؤ اسے۔" وہ اس پر پل پڑتا۔ مگر اس کا حال خراب ہو گیا تھا۔ ٹوٹا چشمہ، چرا گریباں، سفید بنیان جھلک رہی تھی اور چہرہ۔۔۔اف وہ بے دم ہو چکی تھی۔

"میرا مونس۔۔۔کہاں۔۔۔ہے۔۔۔کس۔۔۔حال میں ہوگا۔ وہ تو۔۔۔بھوکا۔۔۔مر۔۔۔جائے گا۔ وہ۔۔۔میرے۔۔۔علاوہ۔۔۔کسی۔۔۔سے کھانا۔۔۔کھاتا۔۔۔نہیں۔۔۔میرا۔۔۔مون۔۔۔اس۔۔۔میرا۔۔۔مو۔۔۔نس س س س۔۔۔"

وہ ہوش وخرد سے بے گانہ زمین پر پڑی تھی۔

"میرا۔۔۔مونس۔۔۔اللہ۔۔۔" اس کی پکار دل چیر دینے والی تھی۔

☆☆☆

وہ برسات کی ایک سیلن زدہ رات تھی۔ پتنگے اور جھینگر۔۔۔ہر شے نمی سے بوجھل اپنی اپنی سوچوں میں گم تھی۔ جان دار کیا، بے جان کیا۔ سناٹا روح میں اتر جانے والا اور اس کی سانس رک رک کر چلتی تھی۔

"تم سب سے زیادہ پیار کس سے کرتے ہو بیٹے۔"

بیٹے نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ وہ خوف زدہ تھا، سہا ہوا، پریشان، الجھن میں۔
''جواب دو۔۔۔ بیٹے۔۔۔''
''بب۔۔۔ بھائی سے کرتا تھا۔۔۔ بھائی سے کرتا تھا'' اس نے تیزی سے کہہ دیا۔
''تھا۔۔۔ کیوں بولا، اب نہیں کرتے۔''
''وہ اب۔۔۔ نہیں ہے نا، تو اس لیے تھا بولا۔''
''وہ ہے بیٹے! مونس ہے، بس اتنا نہیں معلوم کہ کہاں ہے۔''
''امی۔۔۔!'' وہ کچھ سوچتا ہوا جھجک کر بولا۔ ''امی۔۔۔! کیا ابو کبھی مجھے بھی چھوڑ دیں گے کہیں دور، ایسے گاڑی میں ڈال کر۔''
''نا۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم کو کیوں۔۔۔ تم تو طاقت ور ہو نا، تم اسٹرگل کر سکتے ہو۔ زندگی میں کبھی بھی کوئی تمہیں ہاتھ لگائے تو تم اس کا منہ توڑ دینا۔''
''تو طاقت ور تو بھائی بھی تھا۔ وہ بہت اچھل رہا تھا۔ شور کرتا تھا۔ مگر ابو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔''
''ہائے۔۔۔'' اسے جھٹکا سا لگا۔
''تم مجھ سے پیار کرتے ہو نا؟''
''کرتا ہوں۔۔۔ پہلے بھائی، پھر امی سے اور۔۔۔ پھر۔۔۔'' وہ باپ کا نام لیتے رکا۔ وہ خوف زدہ سا نظر آیا۔
''مجھ سے۔۔۔ پرامس کرو'' اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ بیٹے کے چہرے پر الجھن تھی۔ وہ خوف زدہ سا تھا۔ مگر اس نے ماں کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔
''تم نے اپنی پوری زندگی بھائی سے پیار کرنا ہے۔'' اس کے جملے ٹوٹنے لگے۔ ''تم نے اسے ڈھونڈنا ہے۔ ان لوگوں سے پوچھ لینا۔ مگر اسے ڈھونڈنا ضرور۔۔۔ تم اس سے پیار کرتے ہو نا'' اس نے یک دم خدشے میں گھر کے پوچھا۔
''کرتا ہوں۔۔۔ امی۔۔۔ کتنی بار۔۔۔ بتایا تو ہے۔'' وہ کچھ جھنجلایا۔
پھر ماں کو دیکھا تو تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''وہ میرا بھائی ہے امی۔''
سادہ سے جملے میں ایسی انمول یقین دہانی چھپی تھی کہ اس کے بے چین دل کو قرار آنے لگا۔
وہ ساری رات اسے بتاتی رہی تھی۔ سمجھاتی رہی تھی۔
''میں آپ کے ساتھ سو جاؤں۔'' اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔
''ہاں۔۔۔!'' اس نے اپنا بازو پھیلا دیا۔ ایک بازو آباد تھا اور دوسرا۔۔۔ اس کی سسکی کی آواز پر بیٹے نے نیند سے بوجھل آنکھیں اٹھائیں۔
''آپ روئیں مت امی!'' اس نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں پونچھنے کی سعی کی۔ میں آپ کو بھائی لا دوں گا۔ آئی پرامس۔ میں اسے ڈھونڈوں گا۔ مامون ابصار جھوٹ نہیں بولتا امی۔''
اسے خود پر بھروسا تھا۔

مریم نے آنکھیں موند لیں۔ پرسکون، ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆

''جب تک امی زندہ تھیں تو وہ مجھے بتاتی تھیں کہ میں بھائی سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں ان جملوں کو سبق کی طرح یاد کر چکا تھا۔ ان کے پوچھنے پر رٹو طوطے کی طرح بتا دیتا اور وہ خوش ہو جاتیں۔ طمانیت ان کے خوب صورت چہرے پر ہلکورے لینے لگتی۔ لیکن ---جب وہ---''

وہ رکا۔

''لیکن---لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی ان دونوں سے کس قدر محبت کرتا تھا، سچی محبت۔ ماں کی طلب بے چین کرتی تو میں ان کی قبر پر چلا جاتا اور بھائی کی---اس کا کونے کا اوپری کمرا نئے انداز میں ڈیکوریٹ کر دیا گیا تھا۔ خوب صورت سجا بنا، خوشبودار، اب اس گھر میں کوئی شور نہ تھا۔ کوئی بو نہ تھی۔ کسی کے نعرے نہیں تھے۔ کہیں زنجیر کی کھنک نہ تھی۔ زندگی سب کے لیے نیا آغاز لائی تھی۔ مگر میرے لیے زندگی ٹھہر چکی تھی۔

مجھے راتوں کو خواب دکھائی دیتے۔ مونس اور امی---امی اور مونس۔

میری زندگی سے قرار رخصت ہو چکا تھا۔ مجھے اپنا وعدہ یاد تھا کہ مجھے بھائی کو ڈھونڈنا ہے۔ مگر کیسے۔ واحد شخص میرا باپ تھا۔ ابصار احمد---اور---اور تمہیں بتاؤں میں ان سے، ان سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ مجھے بھی، وہ مجھے بھی ایسے ہی ایک روز کہیں چھوڑ آئیں گے۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ کمزور، بے بس، انجان۔ میں بہت چھوٹا تھا بشائر۔''

ماموں ابصار نے یک دم بولنا روک کر بشائر کو یقین دلانا چاہا اور وہ سر بھی نہ ہلا سکی۔

اس نے ماموں ابصار کی آنکھوں میں ہمیشہ خوب صورتی کو دیکھا تھا یا پھر قطعیت سردمہری، اجنبیت، لاپروائی، سختی، درشتی، حاکمیت۔

اس نے پہلی بار ان آنکھوں میں خوف دیکھا۔ دکھ دیکھا، ماتم دیکھا، بے بسی و بے چارگی۔

اس نے پہلی بار ان آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

ماموں ابصار بولتے بولتے کھو جاتا۔ وہ رو پڑتا۔ وہ بے بس بھیگی نگاہیں اٹھا کر جب یقین طلب انداز میں بشائر کو دیکھتا تو اس کا دل ٹھہر ٹھہر جاتا کہ وہ آگے بڑھ کر اس شخص کو اپنے سینے میں بھینچ لے۔

مگر وہ ششدر، ساکت، ہمہ تن گوش تھی۔

''میں اپنے باپ سے ڈرنے لگا تھا۔ میں خوف زدہ تھا اس شخص سے، وہ بہت ظالم شخص تھا، جس طرح اس نے میرے بھائی کو منہ پر ہاتھ رکھ کے ہائی روف میں ٹھونسا تھا۔ میں نے سوچا مجھے بڑا ہونا پڑے گا۔ طاقت ور اور دولت مند۔ تب میں پوچھوں گا اور مجھے گاڑی چلانا سیکھنا ہوگی۔ امی نے کہا تھا۔ ہر جگہ جانا بھائی کو ڈھونڈنے۔'' وہ کسی معصوم چار سالہ بچے کی طرح بولا۔

''میں منصوبہ ساز بن گیا بشائر---'' وہ زہر خند لہجے میں بولا ''میں منتقم مزاج اور دوغلا بن گیا۔ میں اچھا بیٹا بن کر رہتا تھا۔ مگر بہت برا تھا میں، منافق تھا۔

اور سترہ برس کی عمر میں مجھے لگا کہ میں طاقت ور ہوں۔ میرے مسلز اور مجھے گاڑی چلانی آ گئی

تھی۔ میں کالج میں گیا تھا نیا نیا۔ وہ علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ جائز ناجائز آمدنی اور جائیدادیں میرے نام بھی بہت کچھ تھا۔ میں نے اس دولت کا بھی حساب رکھا۔ ہاں اب وہ وقت آ گیا تھا کہ میں اپنے بھائی کے بارے میں پوچھوں۔

میں نے بہت سارے ری ایکشنز سوچ رکھے تھے۔ وہ شدید حیرانی کے بعد مجھے ٹال گئے۔ مگر اصرار پر یک دم بھڑک گئے۔

''مجھے بس بتادیں، وہ کہاں ہے۔''

''پاگل کہاں ہوتے ہیں۔ پاگل خانے میں نا۔''

''مجھے اس پاگل خانے کا پتا چاہیے۔ مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔ اس سے ملنا ہے۔''

''کیا کرنا ہے۔ واپس گھر لانا ہے۔'' وہ تضحیک آمیز انداز میں پوچھنے لگے۔

''یہ تو میں نے نہیں سوچا۔ مگر میں نے اپنی امی سے پرامس کیا تھا کہ میں بھائی کو ڈھونڈوں گا۔ آپ نے اس کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک۔''

''اوہ تو وہ پاگل کی بچی زہر گھول کر مری تھی۔ اس نے۔۔''

''اب پتا نہیں بشائر میں نے صحیح کیا یا غلط۔۔۔ وہ میری ماں کے بارے میں نہ جانے کیا، کیا بول رہے تھے۔ میں نے ان کا گریبان پکڑ لیا۔

''خبردار جو میری ماں کے بارے میں۔۔۔ آپ مجھے پتا بتاتے ہیں یا پھر میں۔۔۔''

اور وہ خوف زدہ ہو گئے۔ کھانسنے لگے۔ میرا جنون اور جارحیت کم ہونے والی نہیں تھی۔ انہیں سچ بولنا پڑا۔ وہ کسی ملازم کے حوالے کر آئے تھے اور آگے ملازم نے کہاں۔۔۔ اللہ جانے اور ملازم مر چکا تھا۔

میری ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے اس گھر کو چھوڑ دیا۔ بشائر! میں نانا جان کے پاس آ گیا۔

میری ماں نے اس رات مجھ سے تین باتیں کہی تھیں۔ بھائی کو ڈھونڈنا، خوب پڑھنا اور کامیاب انسان بننا۔ میں ایک میں ناکام ہوا تھا۔ لیکن باقی دو میں۔۔۔ میں نے مٹی کو ہاتھ لگایا تو وہ سونا بن گئی۔ مگر میں ماں سے کیا وہ وعدہ نہ نبھا سکا۔ جو اس نے اپنی زندگی کے آخری جملوں کے طور پر مجھ سے لیا تھا۔

میں نے باقی کی ساری زندگی ماں سے شرمندہ اور باپ سے نفرت کرتے گزاری۔ انہوں نے مجھے کہا کہ وہ یعنی مونس گھر میں رکھنے کی چیز ہی نہ تھا۔ یہ تو میری ماں کی ضد تھی۔ ورنہ ایسے بچے اسپیشل ہومز میں رہتے ہیں اور وہ بھی امیروں کے، غریب تو پھینک پھانک دیتے ہیں، کہیں ڈال آتے ہیں۔''

بشائر کی آنکھیں جھر جھر بہہ رہی تھیں۔ اسے مامون ابصار پر رحم آ رہا تھا۔

''اور نانا جان مجھے ناپسند کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے میں بنا بنایا ابصار احمد ہوں اور نانو کہتی تھیں،

نہیں، میں اپنی ماں جیسا ہوں، لیکن میں کیسا ہوں، مجھے آج تک پتا نہ لگا۔
ہاں میں بچپن سے پلان میکر تھا لیکن عدینہ سے محبت خود بخود ہو گئی۔ وہ چھوٹی سی گڑیا جیسی تھی، تنہا، اکیلی، باتوں کی شائق، سنگھار کی شائق اور وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی شکل امی جیسی تھی اور وہ پیاری یوں لگتی تھی کہ سجی بنی رہتی تھی۔ میں نے اپنی امی کو کبھی سجا بنا نہیں دیکھا۔''
بشائر نے چونک کر ماموں ابصار کی صورت دیکھی۔ کیا وہ آج سارے سچ کہہ دینے والا تھا۔
''بشائر صحیح کہتی ہے۔ میں نے عدینہ سے شادی اس لیے نہیں کی کہ میں ابنارمل بچوں کو دنیا میں لانا نہیں چاہتا تھا۔''
عدینہ کے کان میں یہ اعتراف انڈیل کر وہ سرعت سے اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔
سالوں بعد اپنی بیٹی کو روتی رابعہ خاتون نے بشائر کو تیزی سے پیچھے روانہ کیا کہ ماموں کی ذہنی حالت۔۔۔ کہیں خدانخواستہ۔ اور وہ سرپٹ بھاگی تھی۔
اور بشائر نے نکلتے نکلتے دیکھا۔ عدینہ کے دونوں ہاتھ سختی سے ہونٹوں پر جمے تھے۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ بے یقین آنکھوں سے گرتے آنسو گریبان بھگو رہے تھے۔ اسے شاید سکتہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پتھریلے چہرے کے ساتھ اندھا دھند گاڑی بھگاتا ماموں ابصار دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتا بیڈروم میں پہنچا۔ وہ کمرا مقفل کر کے نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ بشائر اتنی تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی کہ دوپٹا کہیں سیڑھیوں ہی میں گر گیا۔
وہ شاید اس کے اندر گھس آنے سے بے خبر تھا یا اس وقت اسے کسی بھی شے کی خبر نہ تھی۔ وہ دیوار پر سر مار مار کے رو رہا تھا۔ باآواز بلند۔
وہ خوف زدگی کے عالم میں کانپتی ٹانگوں کے ساتھ کھڑی اس کا جنون دیکھتی رہی۔
''میں اس سے بہت پیار کرتا تھا، بہت زیادہ۔'' بشائر کا دل کٹ گیا۔ عدینہ سے پیار کا ایسا والہانہ بے خود، جنونی اعتراف۔
''آپ اسے اپنا لیں ماموں۔۔۔ آپ اسے اپنا لیں۔'' وہ اسے سر پھوڑنے سے باز رکھنے کے لیے اس کی پشت سے لپٹ گئی۔
''میں بیچ میں نہیں آؤں گی ماموں۔۔۔ آپ اسے۔۔۔'' وہ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ یک دم گھوما اور اسے شانوں سے تھام لیا۔
''مجھے بہت بعد میں احساس ہوا، بشائر! کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ امی کے کہنے پر میں صرف جملہ دہراتا تھا۔ مگر میں مونس سے دل سے محبت کرتا تھا۔ بس احساس دیر سے ہوا۔ جب تک امی زندہ تھیں تو وہ مجھے بتاتی تھیں کہ۔۔۔''
''آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔'' بشائر بری طرح چونکی۔
''کس کی بات۔۔۔ میں صرف مونس کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے دنیا میں صرف اس سے محبت

تھی۔ میں صرف اس کے لیے رویا ہوں۔"

اس نے نظریں بشائر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ بشائر نے دیکھا۔ رونے سے سرخ بوٹی آنکھیں بالکل عون جیسی تھیں۔ اسے اس شخص پر ترس آ رہا تھا۔ اسے یہ شخص ظالم لگ رہا تھا۔ اسے یہ شخص مظلوم بھی لگ رہا تھا۔

وہ اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ بشائر کرسی پر ساکت ٹکی رہ گئی۔ شاور کی آواز لگاتار تھی۔

نہ جانے کتنا بہت سارا وقت گزر گیا، جب وہ دوبارہ اس کے سامنے والی کرسی پر آ کر ٹک گیا۔ گیلے بال ماتھے پر گرے تھے اور رویا، رویا چہرہ اس چہرے پر رعونت نہیں تھی۔ کوئی پرت نہیں۔ ایک سادہ چہرہ۔۔۔

"چائے منگواؤں۔" اس کی آواز رونے سے بھاری تھی۔ مامون نے کوئی جواب نہ دیا۔ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ارتکاز اتنا گہرا تھا کہ بشائر کو تپش کا احساس ہونے لگا۔

"اور بشائر سجاد۔۔۔! تمہاری ہمراہی۔۔۔" اس نے یک دم اسے مخاطب کیا۔ "کسی بھی انسان کے لیے زندگی کا سب سے بڑا فخر ہوتی۔ تم اتنی باوقار اور مکمل عورت تھیں۔ میں پہلی نگاہ میں تم سے متاثر ہوا تھا۔ تمہاری قامت، لہجہ اور آواز کا اتار چڑھاؤ، ذہین آنکھیں تم کسی بھی مرد کا خواب ہو سکتی تھیں۔"

وہ کہیں دور کھویا شاید اس پل کو دہرا رہا تھا۔ جب اس نے بشائر کو دیکھا تھا۔

"اور میرا بھی ہو جاتیں۔ اگر۔۔۔ اگر عدینہ نہ ہوتی۔"

بشائر نے پہلو بدلا۔

"وہ تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ کسی بھی لحاظ سے۔۔۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ سطحی، نخریلی، ظاہر پر جان دینے والی۔ ایک انٹر پاس لڑکی۔ مگر اس کا کیا کروں بشائر کہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ ساری دنیا سے زیادہ مجھے اس کی موجودگی میں کبھی کوئی عورت بھلی لگی ہی نہیں۔ بس دل تھا نا۔ ایک بار ٹک گیا تو ٹک گیا اور اسے چھوڑنے کا فیصلہ زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ تھا اور فیصلے پر کاربند رہنے کے لیے اس کی ہر امید کو توڑنے کے لیے مجھے فوری طور پر اس کو خود سے بددل کرنے، مایوس کرنے کے لیے شادی کر لینی چا[illegible] ایسے ہی کیا، خود اپنے آپ کو بھی پکا رکھنے کے لیے۔۔۔ کہیں میرا ہی دل دغا نہ دے جا[illegible]نے جھٹ تمہارا نام لے دیا۔ تم فوری طور پر دستیاب تھیں نا۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ بشائر کا دل جیسے کسی نے کانٹوں پر راہ گزر پر ڈال دیا۔ "تو آج یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ تم نے بشائر سے شادی کیوں کی۔"

"مجھے عدینہ کو مایوس کرنا تھا۔ وہ مجھ پر اتنا حق رکھتی تھی کہ اگر ایک بار، فقط ایک بار آنسو بھری آنکھوں سے آ کر میرے سامنے کھڑی بھی ہو جاتی تو میرے پائے ثبات میں لغزش آ جاتی۔ میں اس سے، اس آزمائش بھرے بے بس پل سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ تم بہترین تھیں ہر لحاظ سے۔۔۔ تمہاری

ذہانت، تمہارا شخصیت کا وقار، ٹھہراؤ، نظم میں نے ایک بار عدینہ ہی سے کہا تھا۔
بھلے شان نے وہاں کینیڈا میں بشائر کو نہیں دیکھا۔ مگر وہ خوش قسمت ہے کہ اسے اتنی شان دار لڑکی مل رہی ہے۔
اور سچ کہتا ہوں، دل میں عدینہ کی نقب زنی نہ ہوتی تو میں بصد احترام دیدہ دل وا کیے تمہارے لیے ہامی بھر لیتا، فخر کرتا، تم جیسی لڑکی کو پالینا ساری زندگی کی خوشی جیسا تھا۔''
بشائر کو پتا ہی نہ لگا، نہ جانے کب سے آنسوؤں کا ایک ریلا گالوں کو گزرگاہ بنا گیا۔
''تمہارا اس کا موازنہ کرتا ہوں کہ تم اور وہ۔۔۔ تو خود پر حیران ہوتا ہوں۔ اور حیرانی تو یہ بھی ہے کہ میں آج بھی اس کی جانب ملتفت ہوتا ہوں۔ میں تمہیں اذیت دے رہا ہوں۔ جانتا ہوں، مگر یہ دل آج بھی ملال میں جیتا ہے اور پچھتاووں کی مار سہتا ہے کہ اے کاش!''
''آپ اسے اپنالیں ماموں!'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔
''ماموں نے جیسے سنا نہیں۔'' وہ کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔
''تمہاری ہمراہی فخر تھی۔ قابل تعریف۔ میں نے تمہارے ساتھ زندگی کا آغاز ایمان داری سے کیا تھا۔ بس دل کا ایک کونہ تمہارے لیے نہ کھولا۔ اسے مقفل کر کے چابی کہیں دور پھینک دی کہ نہ تم کبھی جھانک سکو اور نہ میں جھانک پاؤں۔ نانا جان نے اور بعد میں نانو نے مجھے کہہ دیا کہ میں ادھر نہ آیا کروں یا کم از کم عدینہ کی موجودگی میں۔
میں عدینہ کو بھولا تو خیر کبھی نہیں، مگر بہل ضرور گیا اور پھر عون کے آنے کی خبر۔۔۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سب کچھ یوں ہی کا قصہ تھا۔ محبت، دل، لگاؤ، مجھے تو بس جیسے ایک وقت کا انتظار تھا۔
ہم ایک دوسرے کے قریب ہو رہے تھے۔ عون کے بعد اور زیادہ قریب۔ مجھے تم سے محبت ہونے لگی تھی۔ مجھے تم پر فخر ہونے لگا تھا۔ عون کے بعد اور زیادہ۔۔۔ اور عون کی بیماری کے بعد تو میں۔۔۔ حیران رہ گیا۔ تم تو بالکل میری ماں جیسی تھیں۔ اولاد سے محبت کرنے میں۔ مگر تم اس سے بہت مختلف تھیں۔ بہادر، بااختیار، ہار نہ ماننے والی۔ میری ماں مونس کو اپنی غلطی مان کے شرمندہ زندگی گزارتی رہی۔ وہ چھپ کر بیٹے سے لاڈ کرتی تھی۔ تم ببانگ دہل، کسی شرمندگی کے بغیر۔''
بشائر نے بری طرح چونک کر اس کی صورت دیکھی۔
''وہ بیٹے کا ذکر کرنے سے کتراتی تھیں۔ تم سینہ تان کر فخر کرتی تھیں۔
میرے بہت سے رویوں کے پیچھے وجوہات تھیں بشائر!
میری ماں اجڑے پجڑے حلیے کی ہراساں عورت تھیں۔ وہ بیٹے کے پیچھے بدحالوں میں گھومتی رہتیں۔ سب کی لعن طعن سنتیں۔ میں نے کبھی انہیں مکمل خوب صورت لباس میں نہیں دیکھا۔ الٹے پلٹے کپڑے، ان کے جسم سے بو آجاتی تھی۔ پھر سب لوگ انہیں باتیں سناتے۔ مجھے عدینہ کا بناؤ سنگھار بہت بھاتا تھا۔ کسی بھی اجڑے حال کی عورت دیکھ کر آج بھی میری حالت غیر ہو جاتی

ہے۔
مجھے وہم ہو گیا تھا جو عورت زندگی کی دلچسپیوں سے منہ موڑ لیتی ہے۔ ایک روز اس سے زندگی بھی منہ موڑ لیتی ہے۔
میرے باپ نے ان سے نفرت کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ ان کے لیے فقط باعث شرمندگی تھیں۔ وہ اتنی خوب صورت عورت تھیں کہ میں نے اتنا حسن کبھی نہیں دیکھا۔ مگر۔۔۔
تمہیں پتا ہے ان کے مرنے کے بعد میرے والد کی زندگی سنور گئی گویا۔ انہیں چلبلی، سجی بنی شوخ بیوی مل گئی۔ ان کی نئی فیملی لائف شروع ہو گئی۔ میں ڈرتا تھا۔ بشائر! کہیں میں تم سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤں۔ جیسے۔۔۔ عدینہ کے بعد تمہیں بھی۔۔۔ کھونا میرے لیے۔۔۔''
شدید ضبط کے باعث اس کی کنپٹی کی رگ پھول پچک رہی تھی۔ جبڑے بھینچے تھے۔
''مجھے عدینہ سے۔۔۔ میں تو آج تک اس بات کو تسلیم نہ کر سکا کہ میں اسے کھو چکا ہوں۔ وہ میری کبھی نہیں ہو سکتی وہ۔۔۔''
''آپ اسے اپنا سکتے ہیں مامون!'' اس نے اپنا گلا صاف کیا اور ذہن و دل بھی۔۔۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔
مامون نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اس کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ آ رکی۔ وہ جیسے اس پل کسی بڑے اذیت بھرے کچوکے لگاتے خیال کو جھیل رہا تھا۔ خاموشی کا ایک بھید بھرا پل آن رکا۔
''مجھے اسے اپنانا ہوتا تو چھوڑتا ہی کیوں۔''
''آپ اسے اپنا سکتے ہیں۔ میں بقائمی ہوش و حواس بہ رضا و رغبت اجازت دے رہی ہوں۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''کوئی تو بامراد رہے۔ کوئی تو دل بھر کے خوش ہو۔''
''میں اسے نہیں اپنا سکتا بشائر کبھی بھی۔'' وہ کرسی کی ہتھی پر ہاتھ مار کر بولا۔
''کیوں نہیں اپنا سکتے۔ جس شے سے بھاگ رہے تھے۔ جس کی پلاننگ کی تھی۔ جس سے بچنا چاہتے تھے۔ مجھ سے شادی کے بعد بھی۔۔۔ آپ کو وہی تو ملا نا'' وہ ذرا سا اونچا بولی۔ ''ایک عون۔۔۔ جیسا بچہ۔''
''میں نے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی۔'' وہ اتنی زور سے بولا کہ وہ تھرا اٹھی۔ ''ہاں مگر یہ سوچا ضرور تھا کہ ہمارے ہاں صحت مند اولاد جنم لے گی۔ مگر عدینہ کو اس لیے نہیں چھوڑا کہ اس سے شادی کی صورت بچے ویسے پیدا ہوں گے۔ میں نے اسے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ اولاد کے اس دکھ کو کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔ میں نے اپنی ماں کو اس غم میں روتے، گھلتے اور مرتے دیکھا تھا۔ میں نے عدینہ سے سچی محبت کی تھی اور میں اسے اس پریشانی میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا، نہیں دیکھ سکتا تھا جیسے میں نے اپنی ماں کو جھیلتا دیکھا۔
میں نے اسے صرف اس لیے چھوڑا تھا کہ وہ دکھ کے اس پہلو کو کبھی نہ دیکھے۔ اسے بچے بہت پسند

تھے۔ وہ اس پر کبھی راضی نہ ہوتی کہ ہم بس میاں، بیوی بن کر رہیں۔ میں نے عدینہ سے سچی محبت کی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا غم دے کر بہت بڑے غم سے بچانے کے لیے اسے چھوڑ دیا تھا۔ راستہ بدل لیا تھا۔"

اس نے بالآخر کہہ دیا، اصل سچ۔

"مامون۔۔۔!" بشائر ششدر رہ گئی۔ حیرت انگیز انکشاف نے اس کے نقش بگاڑ دیے تھے۔ آسمان سا ٹوٹا تھا سر پہ۔

"تو۔۔۔ ابھی۔۔۔ آپ آدھا سچ کیوں بول کر آئے۔ اسے پوری بات بتاتے نا۔" وہ بمشکل بولی۔ "وہ آپ سے نفرت کرے گی، آپ کو الزام۔۔۔"

"اس کے لیے اتنا ہی سچ ضروری تھا۔ مزید ایک لفظ بھی نہیں بشائر! میرا پورا سچ اس کے آگے کے روشن راستے کو تاریکی میں بدل دے گا۔"

"کک۔۔۔ کون سا روشن راستہ۔" اس نے عجلت میں بات کاٹی۔

"بخت۔۔۔ بخت شاہ!" مامون نے دھماکا کیا۔

"تو۔۔۔ آپ جانتے۔۔۔ جانتے ہیں۔" وہ بھونچکی رہ گئی۔

ہاں۔۔۔ ہمیشہ سے۔۔۔ عدینہ کو زندگی بھر اس ادھورے سچ کے ساتھ جینا ہوگا۔ وہ جتنی زیادہ مجھ سے نفرت کرے گی، اتنی ہی جلدی نئے راستہ پر قدم بڑھائے گی۔ اسے متنفر ہی رہنے دو۔ میں اپنی خودغرضی اور دل کے ہاتھوں اسے مزید بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ یہ طے ہے کہ مجھے اسے نہیں اپنانا تھا۔ بلکہ وہ میرے لیے تھی ہی نہیں اور پورا سچ یہ بھی ہے کہ تم ہو اور مجھے تم سے بھی محبت ہو چکی ہے۔ اتنی نہیں۔۔۔ مگر پھر بھی۔۔۔"

بشائر کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ سن رہ گئی۔ زندگی میں ایسا موڑ۔

اپنے اپنے خول میں اپنے حساب سے جیتے ایک دوسرے سے انجان لوگ۔۔۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے دو اجنبی۔۔۔ اس نے اس شخص سے محبت کی تھی اور نفرت نہ کرنے پر اپنے دل کو مجبور پایا تھا۔

وہ اس سے محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ آدھی ادھوری ہی سہی۔ مگر تھی تو۔۔۔

آج صبح ہی تو وہ اپنی محبت کا گلا گھونٹ۔۔۔ اسے کسی کو سونپنے چلی تھی۔ وہ مامون ابصار کی حقیقت بتا کر اسے شرمندہ کرنا چاہتی تھی یا ذلیل وخوار۔۔۔ وہ کیا کرنے چلی تھی۔

صبح وہ قابل نفرت لگ رہا تھا اور اب قابل رحم۔

ہاں اب اسے اس پر ترس آ رہا تھا۔ اس کے دکھوں پر رونے کی خواہش بے حال کر رہی تھی اور اگر آج یہ پل نہ آتا تو کیا وہ باقی کی ساری زندگی بھی ایک دوسرے کی سچائی سے انجان رہ کر گزار دیتے۔ اس شخص کا ایک ایک روپ، رویہ، ایک کے بعد ایک آنکھوں سے گزرنے لگا۔

کیسے گزارے یہ ماہ و سال۔۔۔ لباس سے جسم جیسی قربت رکھنے والا یہ رشتہ اور وہ جان نہ سکی کہ وہ

اس سے محبت کرنے لگا ہے اور اسے کھونے سے ڈرتا ہے۔ اور وہ جان نہ سکا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھی، ہمیشہ سے کس بندھن کو جی رہے تھے وہ دونوں۔
لاعلمی، بدگمانی، خیال، کیا، کیا تھا اس رشتے میں۔
''پتا ہے میں سائیکاٹرسٹ کے پاس بھی گیا تھا۔'' اس نے بشائر کی سماعت پر بم پھوڑا۔ ''میں آج تک اپنے اور عون کے رشتے کو سمجھ نہیں سکا۔ میں نے بہت سوچا۔ مگر خدا کی قسم میں نے کبھی اس سے نفرت نہیں کی۔ لیکن میں ہمیشہ ڈرتا رہا۔۔۔ کہ کہیں۔۔۔'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔
''میں اس سے نفرت کرنے نہ لگ جاؤں۔ سب کہتے تھے میں ابصار احمد جیسا ہوں۔ لیکن میں ان جیسا بننا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے خیال آتا تھا کہ اسے سامنے دیکھ کر میں بھی کہیں اپنے باپ کی طرح اس سے گھن نہ کھاؤں۔ اس سے اکتا جاؤں۔ یا۔۔۔ میں بھی اسے کسی روز گاڑی میں ڈال کے کہیں دور پھینک نہ آؤں۔۔۔ اور اس کا تو پھر کوئی بھائی بھی نہیں جو اسے ڈھونڈنے جائے گا۔ لیکن بھائی ہونے کی کیا بات۔ مونس کا تو بھائی تھا نا۔ مامون ابصار، وہ بھی اسے ڈھونڈ نہ پایا۔''
اس نے بچوں کی سی بے تابی سے بشائر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔
''میں نے اسے بہت ڈھونڈا بشائر، ہر جگہ، ہر شہر۔۔۔ سب وسائل خرچ کیے۔ مگر وہ۔۔۔ میں نے امی سے کہا تھا۔ میں اسے ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ لیکن میں نہیں ڈھونڈ سکا۔ میں۔۔۔ انہیں کیا جواب دوں گا۔ میں نے اسے کھو دیا۔''
اس کی خوب صورت آنکھوں میں مایوسی، تکلیف، شرمندگی، ناکامی کی ایسی دلخراش تحریر تھی کہ پڑھنے والی ہر آنکھ نم ہو جائے وہ کسی معصوم بچے کی طرح بشائر سے جواب کا متمنی تھا۔
کتنے شکوے تھے، کتنے ارمان، کتنے سوال اور کتنے حساب نکلتے تھے اس بے درد شخص کی طرف۔ مگر۔۔۔ ایک فوری خیال کے تحت اس نے وہ سارا گوشوارہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھ دیا۔
انہیں اپنے رشتے کی نئی شروعات رکھنی تھی۔ ایسا آغاز جس میں وہ ایک دوسرے کے غم گسار ہوں۔ باقی سب بعد میں۔۔۔ بشائر نے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے تھامے کھڑی ہو گئی۔
''آئیں میرے ساتھ۔'' وہ چونکا۔ مگر ہاتھ کھینچنے پر کھڑا ہو گیا۔
''کہاں؟''
''آپ آئیں تو۔۔۔'' وہ کمرے سے نکل پڑی۔ وہ کسی ٹرانس میں پیچھے کھنچا ہوا چلتا تھا۔ دونوں ننگے پیر تھے۔
عون کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ مامون کو دیکھ مسکرائی۔ مگر مامون کی آنکھوں میں خوف زدگی بڑھ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ بشائر نے اپنی گرفت سخت کی۔
''اوں۔۔۔ ہوں۔''

''بشائر! میں اندر۔۔۔نہیں جا سکتا۔'' وہ بے بس لہجے میں بولا۔''ہمارے گھر کے اس کمرے میں زنجیروں میں گنجے سر کا ایک بچہ تھا۔ وہاں بو تھی۔ وہ بہت خوف ناک آواز میں رویا کرتا تھا۔ وہ بھوکا تھا۔ اس کمرے میں گندگی تھی اور اندھیرا سیاہ۔''

مامون شدید خوف زدہ لگ رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر با آواز رو دیا۔ وہ بس اپنا ہاتھ چھڑوا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔

بشائر کا دل پھٹ جانے کو تھا۔ مگر بس یہی پل تھا ایک آغاز کا، یقین دہانی کا، ایک نئے رشتے کا۔ قابلِ رحم نظر آتا یہ شخص۔۔۔اس کا دل رو رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔وہ ایسے کمرے میں رہتا تھا۔ مگر جب میں اسے لے کر آئی نا۔۔۔تو میں نے اسے اپنے طریقے سے رکھا۔ آپ آئیں نا اندر۔'' اس نے ناب گھما دی۔

شام ڈھل چکی تھی۔ کمرے کی روشنیاں جل رہی تھیں۔

ہلکے نیلے، پیلے، جامنی اور سفید رنگ کے در و دیوار میں تازگی اور پاکیزگی تھی۔ ایئر فریشنر کی بھینی خوشبو نے ماحول معطر کر رکھا تھا۔ مگر پھر بھی تازہ گلابوں کے گلدستے سے پھوٹتی خوشبو نمایاں تھی۔

عون اپنے بیڈ پر نہیں تھا۔ وہ دیوار گیر ایکوریم کے بالکل ساتھ وہیل چیئر جوڑ کر بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ شیشے سے چپکا تھا اور ایکوریم کے اندر سے گہرے سیاہ اور مہرون رنگ کے امتزاج کی چھوٹے سائز کی خوب صورت مچھلیاں جیسے ہاتھ کو چوم رہی تھیں۔ پورا جھنڈ ہاتھ کے گرد اکٹھا تھا۔ ہولے ہولے منہ کھول کر سانس نکالتی، دم کو ہلاتی مچھلیاں۔

عون بہت پرسکون تھا۔ وہ گرد و پیش سے بے گانہ مچھلیوں پر ٹکٹکی باندھے بیٹھا تھا۔ اس کا انہماک اتنا تھا کہ اس نے بشائر کی آمد کا نوٹس نہ لیا۔ وہ اکثر ایسی بے گانی سی کیفیت میں بھی چلا جایا کرتا تھا۔ سفید ٹی شرٹ پر بلو لبی نیکر۔۔۔مامون کے لباس کا بھی یہی امتزاج تھا۔ عون کے بے حد سلکی بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ وہ گھٹنے موڑ کر عون کی وہیل چیئر کے سامنے بیٹھ گئی۔ مامون کا ہاتھ ابھی تک ہاتھ میں تھا۔ اسے تقلید کرنا پڑی۔

''یہ۔۔۔'' اس نے عون کا ہاتھ مامون کے ہاتھ میں دیا۔ گدگدا گورا نرم ہاتھ۔ مامون کی پکڑ میں جھجک تھی۔ بشائر نے اپنے ہاتھ میں عون کا ہاتھ رکھا۔ پھر اس پر مامون کا اور اپنے دوسرے ہاتھ کو اوپر رکھ کے بند کر دیا۔

''یہ مونس۔۔۔'' اس نے بتایا۔

''مگر۔۔۔یہ تو۔۔۔عون۔۔۔'' وہ ارد گرد سے بے گانہ تندرست بچے کو حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔

''اونہوں۔۔۔عون۔۔۔نہیں۔۔۔مونس۔۔۔یہ مونس ہے۔''

لیکن وہ ایسا نہیں تھا۔ وہ تو بہت کمزور تھا، بہت گندا سندا۔۔۔شور کرتا۔'' مامون کسی ٹرانس میں تھا۔

”ہاں۔۔۔ایسا ہی تھا۔مگر جب مجھے ملا تو میں نے اسے ایسا کر دیا۔“ وہ مسکرائی۔
”تمہیں کہاں ملا۔ جبکہ میں نے تو ہر جگہ۔۔۔“
”آپ کی طلب سچی تھی نا مامون۔۔۔اسے تو فرشتے کہیں اوپر لے گئے۔لیکن آپ کے لیے اسے دے گئے۔“
”تمہیں کیوں۔۔۔ڈھونڈ تو میں رہا تھا اور یہ تو عون ہے۔وہ مونس تھا۔“ وہ ماننے کو تیار نہیں تھا، بحث پر اتر آیا۔
”فرشتوں کو بھی لگا آپ ابصار احمد ہیں اور میں انہیں شاید مریم لگی ہوں گی۔“
”فرشتے بیٹا ہمیشہ مریم ہی کو دے کر جاتے ہیں مامون!“ اس کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز تھا۔اس نے بہت گہری بات کہی۔
”لیکن میں ابصار احمد نہیں تھا۔“ مامون اپنے ٹرانس سے ابھرا۔وہ جیسے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔جھٹکا کھا کر چونکا۔وہ بغور عون کو دیکھ رہا تھا۔بے یقینی سے۔
”مامون! آپ ابصار احمد سے نفرت تہ کریں ان حالات پر غور کریں تو آپ کو لگے گا کہ وہ بھی غلط نہیں تھے۔بس انہیں حالات کو ہینڈل کرنا نہ آیا۔انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی لیکن آپ ابصار احمد نہیں ہیں۔آپ مامون ہیں اور یہ عون، میں بشائر۔۔۔ہم بہت الگ ہیں پچھلوں سے۔“ اس نے اپنا گال عون کے گھٹنے پر ٹکاتے ہوئے سکون آمیز انداز میں آنکھیں موندیں۔
”مگر۔۔۔یہ تو عون ہے۔۔۔تو پھر مونس۔“ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
”یہی مونس بھی ہے تھوڑا ٹائم لگے گا۔آپ پہچان لیں گے۔“
اس نے یقین سے کہا۔عون کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔بشائر کی بھی۔اسے اس کمرے میں آ کر ہمیشہ سکون بھری نیند گھیر لیا کرتی تھی۔
مامون نے بے یقینی کے عالم میں اس کے چہرے کی طمانیت دیکھی۔عجیب بات تھی اس کے بے چین دل کو قرار سا مل رہا تھا۔نا قابل فہم سا سکون۔
”اچھا آپ فکر نہ کریں۔اللہ نے اگر ہمیں ایک اور بیٹا دیا تو ہم اس کا نام مونس رکھ لیں گے۔وہ نیند کی وادیوں میں کھونے والی تھی۔تھکاوٹ صبح سے اب تک کی یا آٹھ سالوں کی۔
مامون بری طرح چونکا۔وہ بشائر کی طلب سے واقف تھا۔”ایک اور بچہ۔۔۔“
”اور اگر وہ۔۔۔وہ بھی ایسا نکلا۔۔۔تت۔۔۔تو۔۔۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
بشائر نے نیند سے بوجھل پلکیں چونک کر اٹھائیں۔وہ مامون کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی دیکھ کر مسکرائی تھی۔وہ مامون کا ہاتھ چھوڑ چکی تھی۔اس نے اس کے زانو پر ہاتھ رکھا۔تسلی آمیز انداز میں تھپکا۔
”تو کیا ہوا۔ہماری اولاد ہوگا۔“ اس کے جملے میں بشاشت تھی۔مگر آنکھوں میں نمی سی چمکی۔اس نے اس بار بے فکری سے آنکھیں موندی تھیں۔

"ان اللہ علیٰ کل شی قدیر۔" وہ زیرلب بولی۔
اور اللہ بندے سے اتنے ہی کامل یقین اور بے فکری کا خواہاں ہوتا ہے۔
فیصلے کا اختیار اللہ کو سونپ دیا جائے تو اتنی ہی آسودگی ملتی ہے جتنی اس وقت بشائر کے چہرے پر تھی۔ مامون نے رشک سے اسے دیکھا۔ بعض باتیں دیر سے سمجھ میں آتی ہیں۔ مگر دعا مانگنی چاہیے کہ سمجھ میں آجائیں۔
دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں۔
کچھ وہ جو اللہ پر توکل کرکے زندگی گزارتے ہیں۔
اور کچھ وہ جو خدشات میں گھرے رہتے ہیں۔
گزر دونوں کی جاتی ہے۔
مگر۔۔۔
توکل کرنے والے کی روح و قلب اتنا ہلکا، بے وزن ہوتا ہے۔
جیسے ٹھہرے پانی کے سینے کے اوپر تیرتا پر۔
☆☆☆

سرسوں کا پھول

''نہیں آمنہ! کیا واقعی اینڈ میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے؟'' آمنہ کے ہاتھ میں دھلے کپڑوں کی بالٹی تھی۔ اس نے تھکان سے بوجھل سانس بھرتے ہوئے بالٹی زمین پر رکھی اور اس کا چہرہ دیکھا جہاں الجھن بھری لکیریں اور خوش امیدی جھلک دکھلا رہی تھی۔ بغل میں ''شعاع'' تھا اور سینے سے لگے ''خواتین'' میں انگلی پھنسائے وہ جواب کی منتظر تھی۔ آمنہ خاموشی سے کپڑے جھٹکنے لگی۔ وہ بہت زیادہ تھکی ہوئی تھی۔ پہلے سارا دن شہر جانے کی خواری، پھر بازار، پھر کالج میں فارم جمع کروانے کی پریشانی۔ گرمی نے جیسے سارے جسم سے نمک نکال دیا تھا۔ وہ آتے کے ساتھ ہی غسل خانے میں گھس گئی۔ پہنا ہوا جوڑا اور تربتر برقعہ ساتھ ہی دھوڈالا اور اب صرف سونے کی خواہش تھی۔

''بولو نا آمنہ! کیا واقعی اینڈ میں سب صحیح ہو جاتا ہے؟'' اس کے لہجے میں بے صبری تھی۔

''شٹ نگ ـ ـ ـ'' آمنہ نے پوری طاقت سے کپڑا نچوڑ کر جھٹکا۔

''اینڈ میں ''جو صحیح ہوتا ہے'' وہ ہو جاتا ہے۔'' اس نے اگلا کپڑا زور سے جھٹک کر رسی پر پھیلایا۔

''یہ کیسا جواب ہے۔ ہمیں کیسے خبر کہ جو ہوا، وہ صحیح ہے۔'' اس نے برا منہ بنایا۔

''اس کے لیے تھوڑے توکل، تھوڑی قناعت اور یقین کا سیرپ پینا پڑتا ہے۔ اچھی بری ہر بات مان لینا پڑتی ہے۔''

اس نے پیروں پر لگنے والی مٹی پر پانی بہایا اور اندر بڑھ گئی، وہ پیچھے پیچھے۔ شہروں کی نسبت ان چھوٹے گاؤں میں لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ یوں بھی بہت زیادہ تھا اور اب بھی جب لائٹ تھی تو وولٹیج بے حد کم۔ آمنہ نے چارپائی گھسیٹ کر بالکل پنکھے کے نیچے کی اور دھم سے لیٹ گئی۔ اس نے بھی تقلید کی۔

''بہت تھک گئی ہو؟''

''ہاں بہت۔'' وہ اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بغل میں دبا ''شعاع'' مانگا۔

"اس کی حالت کتنی خراب ہو رہی ہے۔ اخبار چڑھا لیتیں۔"
"مجھے قسط پڑھنے کی جلدی تھی۔ شام کو چڑھاؤں گی۔۔۔ اور تم بھی تو ذرا اچھی حالت کا لاتیں۔"
"اچھی حالت کا کہاں سے لاتی۔ اتنی مشکل سے ملا۔ چار دکانیں چھانٹیں، پھر یہ گلا سڑا ملا۔" آمنہ نے خفگی سے اپنی جدوجہد بتائی۔
"ساری دنیا پڑھ لیتی ہے، پھر ہمیں ملتا ہے پڑھنے کو۔ اسی لیے ہم دنیا سے ہمیشہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔" اس کے لہجے میں ملال گھل گیا۔
"تو کیا ہوا؟ کہانیاں ہی تو پڑھنی ہوتی ہیں اور کہانی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ سمجھیں؟"
"قسط وار کی بے چینی تو ہوتی ہے نا۔ کچھ سمجھیں؟" اس نے منہ بناتے ہوئے نقل اتاری۔ آمنہ نے ان سنی کر دی۔ اسے مطلوبہ کہانی مل گئی تھی۔
"دراصل آمنہ! ہم سب انجام جاننا چاہتے ہیں۔ دنیا کو کوئی خوف اس سے بڑا نہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ ہم آنے والے وقت سے اتنے ڈرتے کیوں ہیں۔ زندگی آگے کیسے رنگ دکھائے گی۔ کیا وہ پا سکیں گے، جو ہمیں چاہیے اور کیا وہ کھو جائے گا، جس کے بغیر ہم رہ نہیں سکتے۔"
"ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔" نرمی سے سمجھاتے ہوئے آخر میں آمنہ کے لہجے میں سختی آ گئی۔
"پتا نہیں کیسی بے چینی ہے میرے اندر۔ تمہیں پتا ہے میں ہمیشہ ایک ہنستی مسکراتی تحریر پڑھنا شروع کرتی ہوں۔ سب اچھا اچھا اور جیسے ہی کردار مشکل میں پڑتے ہیں میرے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگتی ہیں۔ حلق خشک ہو جاتا ہے اور پھر میں جلدی جلدی صفحے پلٹ کر اینڈ پڑھ ڈالتی ہوں۔ اگر سب ٹھیک ہو جائے تو پھر الٹی کہانی پڑھتی ہوں۔ تسلی ہو جانے پر، دوبارہ شروع سے۔۔۔"
وہ عجیب بے بسی سے بولی۔ آمنہ چارپائی پر اٹھ بیٹھی۔
"تم اپنے اندر اتنی برداشت، صبر و تحمل پیدا کرو، کرداروں کے ساتھ سفر کرو، ان کے دکھ سکھ محسوس کرو۔ تم میں برداشت اور صبر پیدا ہوگا، میرا دعویٰ ہے۔"
آمنہ تیقن سے بولی اور وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اب پتا نہیں آمنہ کے بتائے ہوئے اتنے سادہ علاج کو اس کا کرنے کا ارادہ تھا کہ نہیں، آمنہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ وہ بھی چت لیٹ کر پنکھے کو گھورتی رہی۔ نہ جانے کب آنکھ لگی۔

❁❁❁

"مُنوں۔۔۔ مُنوں کڑیے! کبھی میری ایک آواز بھی سن لیا کر۔" دادی جی غصے سے بھری لاٹھی ٹیکتی ان دونوں کے سر پر پہنچیں۔
آمنہ نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ اسے وہم سا ہوا تھا کہ دادی کی آواز ہے، مگر وہ زور و شور سے ہانڈی بھوننے میں لگی رہی۔
"یہ چیچ کے شور میں پتا نہیں لگا دادی جی! آپ بتائیں کیا بات ہے؟"
"بات۔۔۔ بات تو میں بھول گئی۔"

"تُو تو ہانڈی نہیں بھون رہی تھی نا۔ یہاں ویلی بیٹھی منجی توڑ رہی تھی نا۔ تجھے میری آواز نہ آئی؟"
"آئی تھی دادی جی! مگر میں نے سوچا، آپ آمنہ کو بلا رہی ہیں۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔
"ناں منوں! تجھے ہی بلاؤں گی۔ یہ تو ہانڈی بھون رہی تھی۔ دو ہی تو کڑیاں ہیں گھر میں۔ منوں وڈی تے چھوٹی منوں۔"
"تو میرا نام لیا کریں نا "یمنیٰ" مگر بس آپ کے منہ پر انیس سال سے چڑھا ہی نہیں۔ دو لڑکیاں اور ایک نک نیم یہ بھی منوں وڈی تے میں چھوٹی اگر آپ یمنیٰ نہیں کہہ سکتیں تو مانی کہہ دیں، مینا کہہ دیں، یمی کہہ دیں، مگر مجھے منوں نہ کہا کریں پلیز دادی جی!" اس نے تیز تیز کہتے ہوئے آخر میں ہاتھ جوڑے اور لہجہ بالکل دھیما کر لیا۔
آمنہ نے بھنے گوشت کی ہانڈی نیچے اتاری۔ بڑی والی جلتی لکڑی نکال کر پانی کا چھینٹا دیا راکھ اور سفید کوئلوں پر دودھ کی پتیلی رکھ دی۔ دادی کی دوائی کا وقت ہونے کو تھا۔ دودھ تھوڑی دیر بعد نیم گرم ہو جاتا۔
"یمی تو آئس کریم ہوتی ہے۔ میں نے کھائی ہے میٹھی اور ٹھنڈی۔ واہ! مگر آپا تم تو الٹ ہو۔ کڑوی اور گرم۔۔۔ جلتا کوئلہ۔" اس کے چھوٹے بھائی شہباز نے جلتی پر تیل چھڑکا۔
"کڑوی اور گرم۔۔۔ ٹھہرو شہباز!" اس نے اردگرد نگاہ کی۔ پاس سبزی کی ٹوکری رکھی تھی۔ ٹماٹر، پیاز، لہسن اور بڑی بڑی ہری مرچیں۔ "ہوں۔" اس نے اگلے پل بارہ سال کے بھائی کو قابو میں کیا اور اس کی بچاؤ کی ساری کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے اس کے ہونٹوں اور دانتوں پر مرچ رگڑ دی۔ آمنہ کے بیچ بچاؤ اور دادی کی لاٹھی کے حرکت میں آنے سے پہلے وہ شہباز کا کام تمام کر چکی تھی۔
"ہائے! میں مر گیا۔ ہائے میں گیا۔ ہائے میری اماں! ہائے منوں باجی! میں گیا۔" وہ تڑپ رہا تھا۔ کچھ سچ کچھ جھوٹ۔
"وے تیرا ککھ نہ جاوے منوں! ویر دی دشمن۔ ہائے کیسے میرا پوترا تڑپ رہا ہے۔"
"مکر کر رہا ہے! دادی مکر۔۔۔" اس پر خاک اثر نہ ہوا۔ آمنہ آگے بڑھی۔ پتیلی کا کچا دودھ شہباز کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے بھی صحرائی پیاسے کی طرح گٹ گٹ چڑھا لیا۔ آستین سے منہ صاف کیا۔ اب وہ آمنہ کی دی ہوئی شکر منہ میں بھر رہا تھا۔
"ویر سر دا دوپٹہ، عزت، مان اور تو اس کی دشمن، حق ہا، کڑیے!"
دادی جی ازحد حیرت سے اس کی لاپروائی کو تک رہی تھیں۔ "نی تجھے ایک بار بھی بھائی کا خیال نہ آیا؟ کیسے مرچ مل دی؟" دادی کو غصے سے زیادہ حیرت تھی۔
"ہاں! مل دی اور آئندہ اس کے منہ میں بھر دوں گی، جو مجھے تنگ کیا تو۔۔۔ میں نہیں ہوں کسی کی بہن وین۔۔۔" وہ تنتناتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ شہباز نے مزید شکر مٹھی میں بھری اور باہر کو لپکا۔ دادی نے پلو سے بندھا پانچ کا سکہ بھی دیا تھا۔
آمنہ نے دادی کو پانی کا گلاس دیا۔
"آپ کہنے کیا آئی تھیں دادی جی؟" اس نے ان کی طبیعت کے پیشِ نظر دھیان بٹانا چاہا۔

"نی کڑیے! کہنا کیا، سب بھول بھال گئی اس کڑی کے سیاپے میں۔ لیکن تُو تو بتا، یہ اتنی غصے میں کیوں ہے؟" دادی نے آمنہ کو رازدارانہ انداز میں گھورا۔

"وہ دادی جی!" آمنہ ہکلا گئی۔

"وہ۔۔۔ وہ اباجی کے ساتھ وہاں جانا چاہتی ہے۔"

"وہاں، کہاں؟" دادی نے نا سمجھی سے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہاڑی۔" اس نے رخ پھیرتے ہوئے اٹک کر بتایا۔

"ہاں! تو میں بھی تو یہی کہنے آئی تھی۔ سب بھلا دیا۔ بلاذرا اسے۔۔۔ اے منو! اے گل سن کڑیے!" پھر اس کی تنبیہ یاد آئی۔ "یمی بیٹی! دھی رانی! چلی جانا اپنے تائے کے ساتھ۔ ادھر آ میرے پاس۔" آمنہ بھی موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ یمنیٰ کا منہ سوجا ہوا تھا۔

"تو چلی جا اپنے تائے کے ساتھ۔ پہلے زمانوں میں تو ایسی گل بات پسند نہیں کرتے تھے مگر اب یہ نیا زمانہ۔۔۔ جا تُو بھی دیکھ آ۔ اب تجھے کچھ غصہ کر کے سمجھاؤں تو تیری ماں اللہ بخشے یاد آتی ہے کہ سوچے میرے پیچھے میری بچی کا خیال نہیں کیا۔"

"دیکھ پتر!" میں ایک واری دیکھ آئی۔ اپنی تسلی کر لی۔ مجھے تو سب اچھے لگے ہمارے جیسے ہی لوگ ہیں سفید پوش، عزت دار۔ منڈا بھی چنگا ہے۔ اونچا لمبا، چوڑی کاٹھی۔۔۔ گھر بار سب چنگا، جا تُو بھی دیکھ لے، اگلے شہر میں رہتے ہیں۔ ہاں! مگر یہ نہ پتا لگے تُو خاص انہیں دیکھنے آئی ہے۔ کہہ دینا، پھپھی سے ملنے آئی تھی اور ادب لحاظ سے رہنا۔ چنی سر پہ بکل مار کے رکھنا، منڈا بھی دیکھ لینا، مگر بس سلام دعا۔ بھلے سے تیرا پنویا (بہنوئی) بننے جا رہا ہے پر بیٹے! جس کا خصم اس کا رشتے دار۔ سلام دعا کرنا، نظر سے نظر ملا کر بات نہ کرنا تے نہ ہی ہنسی مذاقاں۔۔۔"

"اتنی ہدایتیں، میں جاتی ہی نہیں۔"

"نیں تے فیر نہ سہی۔" دادی نے زیادہ زور سے لاٹھی ماری۔ آمنہ بے بسی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

❁❁❁

"آمنہ! بہت خوش قسمت ہو۔" اس نے وہاڑی سے آنے کے بعد کوئی دسویں بار آمنہ کو بتایا۔ آمنہ اپنی فطری متانت سے مسکراتی رہی۔ "اب تمہاری جان چھوٹ جائے گی اس کچے چولہے سے۔ پاتھیوں اور بالن سے، وہاں یہ بڑے بڑے اسٹیل کے چولہے لگے ہیں۔ سنگ مرمر کا سلیب صاف ستھرا، پھر ہم ہوں گے اور یہ کالک۔۔۔"

"تمہیں بھی یہ سب مل جائے گا۔" آمنہ ہمیشہ سے خوش امید تھی۔

"کیا خبر؟" اس نے راکھ میں چھپا دہکتا کوئلہ تنکے کی مدد سے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اب پھونکیں مار مار کر اس کے گہرے ہلکے ہوتے رنگ کو دیکھ رہی تھی۔ رنگ بدلتی روشنی اس کے چہرے پر دمک رہی تھی۔

"اوں ہوں! پھر وہی بے یقینی کی باتیں۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔" آمنہ نے تنبیہ کی۔

"اب وعظ مت شروع کرنا۔ تم بھی گھنی ہو، آخر کب یہ پوچھو گی کہ وہ کیسے تھے؟"

''مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے بتا جو دینا ہے خود سے۔''
''لو! میں اب بالکل نہیں بتاتی۔'' یمنیٰ نے بھی عہد کیا پھر تھوڑی دیر بعد سب بھول بھال کر شروع ہو گئی۔
''مجھ سے اچھی طرح ملے، پھر کہنے لگے، ہم نے تو سنا تھا، لڑکی اکلوتی ہے۔ سالی کے بغیر ہی زندگی گزرے گی مگر۔۔۔ مجیداں تائی پاس بیٹھی تھیں، اب انہیں اردو کہاں بولنی آتی ہے۔ بڑی مشکل سے منہ بگاڑ کر دانت جما جما کر بولیں۔ ''وے پتر! یہ سالی والی کا نام نہ لینا۔ یہ تو خیر سے چاچے کی دھی ہے۔ تیری اپنی چار بہنیں ہیں اور انہوں نے بھی سالیاں بننا ہے، غلط رواج ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ سنوں، وہ کیا کہتے ہیں سالی، تے آدھے گھر والی۔ ناں سالی پتو یا دے ادھے کار کو سنبھالے گی تو اس کا گھر سنبھالنے اس کی ماں جائے گی؟ خبردار!''
اتنے بڑے اونچے لمبے عظیم بھائی ایسے چپ ہوئے کہ پھر اللہ حافظ بھی اماں کی بغل میں منہ دے کر کہا۔ اس پر وہ بولیں۔ ''اب کدھر منہ چھپا کر کھڑا ہے۔ بہن پہلی واری کار آئی ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ۔ رخصت دے۔ اور انہوں نے ایسے ہاتھ رکھا جیسے میرے سر میں کرنٹ چلتا ہو، پھر مجیداں تائی نے مجھے سو روپیہ دیا اور پتا ہے میں نے کیا کیا؟''
''مجھے کیا پتا، کیا کیا۔''
''تم کو پتا ہو بھی نہیں سکتا کنجوس بی بی آمنہ عرف وڈی منوں! اس نے بیگ کھولا جس میں نئے نکور تازہ اسی مہینے کے شمارے تھے۔
''ارے واہ!'' آمنہ کی بھی چیخ نکل گئی۔ ''لاؤ ایک میرا۔''
''اوں ہوں۔۔۔ پہلے تم چائے بناؤ گی۔ پھر ہم مزے سے چھت پر جا کر پڑھیں گے۔''
''یمنیٰ! میں نے ابھی چولہا ٹھنڈا کیا ہے۔'' اس نے مجبوری بتائی۔
''دوبارہ گرم کرو۔ سلنڈر پہ بنالو۔'' اس نے آسان حل پیش کیا۔
''گیس ختم ہو گئی ہے۔''
''ہائیں!'' یمنیٰ کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ ''تو تم نے منگوائی کیوں نہیں؟''
''ابھی مہینہ ختم ہونے میں چار دن ہیں، میں نے سوچا گزارا کرلوں۔ ابو پر بوجھ پڑے گا۔''
''اب یہ چار دن کیسے گزریں گے۔'' اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ اسی دیہاتی کلچر کی پیدائش تھی، مگر اس سب سے بری طرح متنفر۔ اس نے ڈائجسٹ ڈھیلے ہاتھ سے چھوڑ دیے۔ چائے پینے کی بہت زیادہ عادت تھی اور سلنڈر کا استعمال وہ اسی مقصد کے لیے کرتی تھی۔ جب دل چاہا اٹھ کر بنالی۔
''اچھا! موڈ خراب نہ کرو، بنا رہی ہوں چائے میں۔'' آمنہ نے لپک کر جگ سے پتیلی میں پانی ڈالا۔ ماچس سے کاغذ کے ڈھیر (جو اس مقصد کے قریب رکھا رہتا تھا) میں سے کاغذ کو آگ لگائی پھر پاتھی اندر رکھ دی۔ چوتھی پانچویں پھونک میں چولہے میں آگ لگ چکی تھی۔ اس نے بہت لگن سے چائے تیار کی۔
''مجھے اس چائے کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔'' یمنیٰ نے بے چارگی سے کہا۔

"پورے وہاڑی میں تو گیس نہیں آئی، مگر تمہارے سسرال والے محلے میں ہے۔" یمنیٰ نے اپنے تئیں خوش خبری دی۔ آمنہ پھیکی مسکراہٹ سے ملکے دھویں کو ہوا میں تحلیل ہوتا دیکھتی رہی۔

"تمہارے جانے کے بعد میں خود بھی بھوکی مروں گی اور سب کو بھی ماروں گی۔" اس نے چائے کا کپ ختم کرنے کے بعد اعلان کیا۔

"سر پر پڑے تو سب آجاتا ہے۔" آمنہ نے یونہی کہا۔ یمنیٰ ورق پلٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے گہری نگاہ سے آمنہ کا چہرہ دیکھا، پھر گمبھیر لہجے میں بولی۔

"اور میں یہی نہیں چاہتی کہ میرے سر پر ان چاہی چیزوں کا بوجھ پڑے"

❁❁❁

"آمنہ۔۔۔! آمنہ۔۔۔!" وہ اسے پکارتی چھت پر آگئی جہاں آمنہ کپاس کی چھٹیوں (سوکھی شاخیں) کو توڑ توڑ کر چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر رہی تھی۔ اباجی سال چھ ماہ کا حساب رکھ کے اکٹھی خرید لیتے، پھر چھت پر جمع کر دیتے۔ رہائشی علاقے میں گھستے ہی گھر کی چھت پر ڈھیروں ڈھیر نظر آتیں مضبوط شاخیں اباجی کلہاڑے سے توڑ دیتے۔ بوقت ضرورت آمنہ بلکہ یمنیٰ بھی ہزار باتیں سناتے ہوئے کلہاڑا چلا لیتی تھی۔ گیس نہ ہونے کے باعث بازار سے سوکھا بالن خریدا جاتا۔ مٹی کا تیل بہت مہنگا پڑتا تھا، گوبر کی پاتھیاں بھی خریدی جاتیں اور سلنڈر بھی رکھے ہوئے تھے۔ اب جس کو جس طرح سہولت محسوس ہو۔

❁❁❁

دادی جی نے دو پیٹیاں بھر کے رکھی تھیں آمنہ کے جہیز کے لیے۔ نہ جانے کتنے زمانوں پرانی چیزیں تھیں ان میں۔۔۔ کوئی سات نسلوں پرانا سامان بھرا ہے ان میں دادی کی۔ دادی کے ہاتھوں کے کڑے، گول تکیے، سفید تکیے پر مور اور مور کے نیچے پنجابی کا شعر۔۔۔ آمنہ کے جہیز کی اہم چیز، پھر دادی جی کی اپنی شادی کا بغیر استعمال شدہ سامان پھر آمنہ کی امی کی بے شمار چیزیں۔ یمنیٰ انہیں آثارِ قدیمہ کہتی۔

"میں تو کہتی ہوں ہم اپنا ذاتی میوزیم کھول لیتے ہیں۔ نسل در نسل سے محفوظ و برقرار جہیز کا سامان، دیکھنے کی چیز اور ایسا منحوس سامان جو بس سفر ہی کرتا رہا، استعمال ہونا جس کے نصیب ہی میں نہیں۔ بدبو آتی ہے ٹرنک سے اور تم پاگل اس بڈھا کی باقیات کو لے کر سسرال جاؤ گی؟ تمہیں خود بھی تمیز نہیں۔ وہ اتنے موٹے کپڑے کی بیڈ شیٹ جس پر سوؤ تو کروٹ بدلنے ہی سے جسم کا روواں اتر جائے۔"

آمنہ ہنستی رہی وہ دادی جی کی ہاں میں ہاں ملانا فرض سمجھتی تھی۔

اس کے نزدیک یہ سب چیزیں بے کار اور ناقابلِ استعمال تھیں۔ اس لیے وہ اپنے ہاتھوں کے ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے اجرت پر کام کرتی، پھر جو پیسے ملتے اس سے آمنہ کے جہیز کے لیے چیزیں خرید کر رکھتی جاتی۔ اس نے خود سے اونی پھندنوں والا مسٹرڈ اور سرخ بے حد خوب صورت بیڈ روم سیٹ بنا رکھا تھا، اور دادی جی تو کیا، آمنہ تک کو خبر نہ ہو پاتی کہ وہ اپنی ذاتی پیٹی میں کیا کیا بھرتی رہتی ہے۔

آمنہ، دادی جی کے ساتھ مل کر گھر چلاتی تھی وہ فطرتاً کنجوس واقع ہوئی تھی۔ بہت ناپ تول کر پیسہ خرچ کرتی اور کچھ پیسہ بھی کم تھا، ضرورتوں کے لیے ناکافی، پھر آسائش اور تعیش تو بہت دور کی سوچ تھی۔ گھر اور باہر کے سو بکھیڑے تھے۔ پیسہ آنے کے راستے کم اور جانے کے بہت زیادہ تھے۔ دادی جی عمر

کے اس دور میں تھیں جہاں خوراک سے زیادہ دوائیاں کھائی جاتی ہیں۔ کھانے سے پہلے دوائی، کھانے کے بعد دوائی اور گزشتہ دو سال میں یمنیٰ کی امی کا گردوں کی بیماری میں مبتلا رہنا، ان کا جگر بھی جواب دے گیا۔ ان کے علاج پر پہلے جمع جتھا لگا، پھر ادھار اور آخر میں خود بھی نہ رہیں۔

وہاڑی، میلسی، بورے والا، لودھراں، جنوبی پنجاب کے اس حصے میں گردے اور جگر کے امراض بہت زیادہ تھے۔ پانی ابال کر پینا، فلٹر کرنے کا سب سے آسان اور سستا ذریعہ کہا جاتا ہے، مگر گیس نہ ہونے کے باعث عورتیں اپنا ''بالن'' کبھی بھی اس عیاشی کے لیے بال (جلا) نہیں سکتی تھیں۔ بس آخری پل گردے واش کرواتے ہوئے جان دے دیتیں۔ اس خطے میں ذرائع روزگار بھی بے حد محدود اور کم تھے۔ نئی فیکٹریاں اگر کہیں تھیں بھی تو وہاں چند افراد ہی کھپ سکتے ہیں پھر یہاں کے لڑکے کافی عرصہ آوارہ پھرنے کے بعد بڑے شہروں کا رخ کر لیتے، جہاں مواقع میسر آجاتے تھے اور پڑھ لینے والے پھر بہت زیادہ پڑھ لیتے کہ بڑے شہروں سے واپسی کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ہر گھر میں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو ہر ماہ آنے والے منی آرڈر کے انتظار میں سو ضرورتوں سے دامن بچاتے ہیں۔ پردیس کا دکھ بھی اور بدلے میں مایوسی اور نا امیدی۔ ان کے گھر کی داستان بھی سب کے جیسے تھی۔ یہ میلسی کا کھیتوں کے کنارے بنا محلہ تھا جو شہری دیہاتی کلچر کا امتزاج تھا۔ کم آمدنی والوں کے گھر پسماندہ تھے اور ذرا جو چار پیسے آگئے تو کھیتوں کے درمیان کوٹھی کھڑی کر لی۔ شہر ترقی کر رہے تھے مگر غربت گاؤں کو مزید پسماندگی کی طرف لے گئی۔

نئی آبادیاں بن گئی تھیں۔ خوب صورت بڑے بڑے گھر، چوڑی کھلی سڑکیں، بازار۔۔۔ اور شہر کو مزید پھیلنا ہی تھا۔ کھیت ختم کر کے نئی ہاؤسنگ اسکیمیں بن رہی تھیں اور دھڑا دھڑ بک رہی تھیں۔ نئی کالونیاں، مسجد، اسپتال، اسکول، پارک اور دیگر ایسی للچا دینے والی پیشکشوں کے ساتھ۔

آمنہ، یمنیٰ کا گھر پرانے علاقے میں تھا۔ مین روڈ کے اطراف میں کھیت تھے جن کے درمیان میں چلتی سڑک درختوں سے ڈھکی تھی اور جس پر موٹر سائیکل اور رکشے چلتے تھے۔ کبھی کبھار لوڈنگ گاڑیاں کہ کولڈ اسٹور اور منرل واٹر کی فیکٹریاں بھی تھیں، قرین قیاس یہی تھا کہ شہر آگے کی جانب پھیلتے پھیلتے جب پیچھے دیکھے گا تو ان کا چک بھی شہر میں شامل ہو جائے گا، مگر ابھی تو یہ چک ہی تھا اور یمنیٰ کو یہ سب بہت برا معلوم ہوتا تھا۔

وہ چاہتی تھی، اس اتنے بڑے اصطبل کو بیچ کر شہر کے بیچ بازار سے نزدیک کوئی چھوٹا مگر اچھا گھر خرید لیا جائے۔ لیکن اس میں سب سے پہلے جذباتی طور پر دادی رکاوٹ تھیں کہ پُرکھوں کا گھر دادا جی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کمرے، رشتے داروں سے بڑھ کر پڑوسی۔

''ارے کڑیے! صبر کر۔ تیرے بھائی جواں ہوں گے بنائیں گے اسے حویلی جیسا تو صبر کر لے۔''

دادی جی اس کے کوسنوں اور مطالبات کے جواب میں خواب دکھاتیں۔

''ہونہہ! حویلی چھوڑ محل بنا لیں۔ میرے کس کام کا۔ اس میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہیں گے۔'' اور اپنے منہ سے اپنے مستقبل کا ایسا کھلا تذکرہ دادی جی کے تلوؤں تک کو آگ لگا جاتا۔

''بے شرم بے ہدایتی۔''

''اس میں بے شرمی کس بات کی۔ میری شادی نہیں کریں گی کیا؟ وہ مجھ سے اتنے چھوٹے ہیں۔ مجھے تو آپ نے سال دو سال میں باہر کر دینا ہے۔''

''ہائے! میں مرگئی شرم دا گھاٹا (شرم کی کمی) اگر جو کسی کے کانوں میں پڑے، توبہ توبہ۔۔۔'' دادی جی گال پیٹتیں۔ یمنیٰ بڑی بے فکری سے خلاؤں میں تکتی۔

''دادی جی! اسے کہیں ہم اچھا گھر بھی بنالیں گے بالکل اس کی پسند کا اور اسے کہیں جانے بھی نہیں دیں گے۔ تسلی رکھے۔'' آمنہ نے موقع شناسی کا مظاہرہ کیا۔ دادی جی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''تے ہور کی، بالکل ٹھیک۔''

''کیا مطلب میری شادی نہیں کرنی؟'' وہ خوف سے اچھل پڑی۔

''کرنی ہے، کیوں نہیں کرنی۔ میں کوئی زمین دار ہوں جو تجھے گھر بٹھا کر تیری ''پتی'' قبضے میں کرنی ہو۔ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ سب کی کروں گی۔ پر تجھے اسی حویلی میں رکھوں گی، میرے سب سے پیارے پوترے کی ووہٹی بنا کر۔ تو ہی مالکن ہوگی۔ گھر کی دھی بھی تو نا لے نوں بھی۔'' دادی جی کے لہجے میں شکر گھل گئی۔ وہ تصور کی آنکھ سے جو دیکھ رہی تھیں۔

یمنیٰ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی، ''خبردار۔۔۔! خبردار! جو ایسا سوچا بھی تو۔۔۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا اور یہ۔۔۔ تم نے۔'' وہ آمنہ کی طرف مڑ کر غرائی۔

''تم نے دادی جی کے کان بھرے ہیں نا آمنہ! تم میرے ہاتھوں۔۔۔'' اس نے دھلے کپڑوں کا ڈھیر آمنہ پر الٹ دیا۔ وہ چارپائی پر منہ کے بل گری۔ آمنہ کی ہنسی دادی کی پوپلی ہنسی سے مل جاتی۔ یمنیٰ پیر پٹختے، رستے میں پڑی چیزوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے آگے بڑھ جاتی۔

دادا جی کے بنوائے ہوئے تین کمرے، ایک دادی جی کا، دوسرا اسٹور، تیسرا لڑکیوں کا۔ بعد میں تایا جی نے بھی دو کمرے بنوائے تھے۔ جب تک تائی جی اور یمنیٰ کی امی زندہ تھیں، وہ ان کے لیے تھے اور اب خالی ویران۔۔۔ کبھی یمنیٰ کا لاہور پڑھنے والا بھائی اعجاز آتا تو وہ رہتا اور جب چھ چھ ماہ بعد اعزاز چھٹی پر آتا تو ایک کمرا اسے مل جاتا، مگر وہ زیادہ تر دادی جی کے ساتھ ان کی چارپائی پر وقت گزارتا یا پھر آمنہ کے ساتھ اس اونچے چبوترے پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہتا جو کچن کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ آمنہ اور اعزاز کی پسندیدہ جگہ تھی اور یمنیٰ کو شدید ترین چڑ بلکہ اپنے اس اوپن کچن سے نفرت تھی۔

''یہ ہمارا کلچر ہے یمنیٰ!'' آمنہ نرمی سے سمجھاتی۔

''ہونہہ! اچھی چیز ہے نہیں تو اس بری کو کلچر کہہ کر گلے میں باندھ لو۔'' وہ ہٹ دھرمی سے کہتی۔

''اردگرد سب کے گھر ایسے ہی ہیں۔'' آمنہ بولتی۔

''سب خوش ہیں، کوئی ایسے ناک بھوں نہیں چڑھاتا۔ کچھ بنا بھی لیں تو سلنڈر والا چولہا ہی رکھا جا سکتا ہے، وہاں لکڑی یا پاتھی تو جل نہیں سکتی۔ دھوئیں سے مرجائے پکانے والی اس لیے یہاں کھلے میں بناتے ہیں۔ دھواں اڑ جاتا ہے۔ تم کوئی بچی ہو یا پہلی بار یہ سب دیکھ رہی ہو جو میں تمہیں کھول کھول کر سمجھاؤں۔'' آمنہ آخر میں خفا ہو جاتی، مگر آگے بھی یمنیٰ تھی۔

"ہاں! تمہیں یہی سب نظر آئیں گے۔ ماسی زرینہ کا گھر نظر نہیں آتا اور اس آڑھتی شوکت کا۔" اس کے منہ سے آگ بھرے جملے نکلے۔

"اللہ کے لیے مُنوں!" آمنہ بھی غصے میں بھر گئی۔ "ماسی زرینہ کے گھر تین بیٹوں کی دبئی کی آمدنی ہے۔ وہ شہر لاہور میں جا کر گھر بنا سکتی ہے۔۔۔ اس سے بھی بڑا، وہ تو ساس سسر کے منہ یہاں بیٹھے ہیں۔۔۔ اب ان کی آنکھ بند کہ تب۔۔۔ اور آڑھتی شوکت، اس کی زمین داری اور پھر کاروبار۔۔۔ ہم ان سے کیا مقابلہ کریں۔ اباجی کی آمدنی کل دس ہزار۔ تمہارے ابا، کبھی کام کیا کبھی نہیں، بیمار بندے پھر سر پر چڑھا قرضہ، اعزاز کی ساری تنخواہ اس ہاتھ آتی ہے، ادھر نکل جاتی ہے اوپر سے اعجاز کی پڑھائی پر اتنا پیسہ خرچ ہو رہا ہے۔ شہباز ابھی چھوٹا ہے۔ دادی جی ہر بار ڈاکٹر کے چکر میں سب کسر نکال دیتی ہیں۔ اوپر سے میری شادی تیار۔ میرے بس میں ہو تو اسی حلیے میں جو جیسے کی بنیاد پر چلی جاؤں، مگر ہمارا کلچر۔۔۔ جہیز کی ایک ایک چیز وہاں سسرال میں جا کر ڈھیروں چارپائیاں بچھا کر اس پر سجانی لازمی ہوتی ہے۔ زیور، کپڑا، برتن، بستر، شلوار میں ڈالنے والے ناڑے تک کو سرخ ڈبے میں سجایا جاتا ہے۔ میں تو سوچ سوچ کر خود کو مجرم سمجھتی ہوں کہ اباجی اور دادی جی یہ سب کہاں سے کریں گے۔ فرنیچر اور کھانا اس کے علاوہ اور اس پہ قیامت کی مہنگائی اور تم اتنی سمجھ دار، عقل مند اور یہ سامنے کی کھلی باتیں جان بوجھ کر اگنور کرتی ہو۔ خود بھی پتی جلتی ہو اور ہمیں بھی جلاتی ہو۔ خوامخواہ۔"

آمنہ عموماً اتنی لمبی بات نہیں کرتی تھی، مگر آج اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔

آمنہ اس کے تایا کی اکلوتی بیٹی اور اس سے پانچ سال بڑی تھی، مگر دونوں کی بہت دوستی تھی، محبت تھی۔ آمنہ ماں کی طرح اس کا خیال رکھتی۔ وہ بھی اسے اتنا ہی احترام دیتی۔

آمنہ کی امی اس کے بچپن ہی میں دوران زچگی فوت ہو گئیں۔ پیدا ہونے والی بچی بھی ڈیڑھ ماہ بعد ختم ہو گئی۔ یمنیٰ کی امی نے جٹھانی کے دونوں بچوں آمنہ اور بڑے اعزاز کو اپنے بچوں کی طرح پالا، کوئی باہر کا بندہ جان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو بھائیوں کی اولادیں ہیں۔

آمنہ نے میٹرک کیا تھا۔ یمنیٰ کی امی کی بیماری کے بعد وہی گھر کو سنبھالتی رہی۔ یمنیٰ کی امی نے چھ سال بستر پر گزارے۔ آمنہ نے دن رات ان کی خدمت کی۔ دو سال پہلے وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں تو آمنہ نے پرائیویٹ انٹر کا فیصلہ کیا اور اب اس کے فائنل پیپرز بھی ہو گئے تھے۔

یمنیٰ کی الگ کہانی تھی۔ وہ پڑھائی میں بہت تیز تھی اور شوقین بھی مگر میٹرک کے بعد دو سال پہلے ماں کی شدید بیماری اور پھر انتقال نے اسے توڑ پھوڑ دیا۔ ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ اب یہ تیسرا سال تھا۔ آمنہ کے بھی انٹر کر لینے کے بعد وہ کسی حد تک مائل ہوئی تھی تو اب ساتھ جانے کا مسئلہ تھا۔ ساتھ کی واحد لڑکی فریدہ آگے نکل چکی تھی۔ پرائیویٹ کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ پتا نہیں کیا ٹھان کر بیٹھی تھی۔ دادی چاہتی تھیں، وہ پڑھائی شروع کر دے۔ اس سے اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑے گا، حالانکہ عنقریب آمنہ کی شادی کے بعد انہیں گھر میں تنہا رہنا پڑتا۔ اسے ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اباجی صبح کے منڈی جاتے تو شام کے بعد لوٹتے۔ ادھر یمنیٰ کے ابو جی دھاگا بنانے کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ وہ بھی صبح سویرے نکلتے تو پھر رات کے کھانے پر ہی پہنچتے۔ شہباز صبح سائیکل پر میلسی کے گورنمنٹ اسکول جاتا۔ تین

بجے کے بعد واپسی۔ ایسے میں آمنہ کی شادی کے بعد یمنیٰ کا کالج ناممکن سی چیز تھا، مگر دادی جی فیصلہ کیے بیٹھی تھیں کہ سعیدہ کے ساتھ یمنیٰ کو بھی داخلہ لے لینا ہے۔ خالی ذہن شیطان کا گھر۔
یمنیٰ اس ساری صورت حال سے واقف تھی۔ دل کے کسی خانے میں یہ خیال بھی تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی زندگی سدھار سکتی ہے، مگر دادی جی کو اکیلا چھوڑ نا۔۔۔ دادی جی نے کہا بھی کہ وہ اپنی ہم عمر سہیلیوں کی ڈیوٹی لگا دیں گی کہ گھنٹے گھنٹے بعد ہر سہیلی ان کے پاس بیٹھے گی اور میراثیوں کی نوں (بہو) کو باقاعدہ پیسے دیے جائیں گے۔ وہ تین سے چار گھنٹے دادی جی کے ساتھ رہے گی اور کھانا وغیرہ پکائے گی، مگر سوچنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ پھر پکانے کے لیے کسی کی بھی خدمات لی جاتیں، اسے پیسے بھی دینے پڑتے۔ دادی جی صاف کہتیں۔
''کڑیے! تُو کالج جائے یا نہ جائے، آمنہ کے بعد میں نے بھوکوں ہی مرنا ہے، یہ مجھ سے لکھوالو۔ لوگ پوچھیں گے، بڈھی کیسے مری؟ کہہ دینا چار دن سے روٹی نہیں ملی۔ تو سن لے آمنہ!''
آمنہ کانوں کو ہاتھ لگاتی ''توبہ توبہ۔''
یمنیٰ واک آؤٹ کر جاتی۔ دادی اپنے بیان پر ڈٹی رہتیں۔
''نا! اس میں توبہ کس بات کی۔ پہلے اس نے مجھے سو باتیں سنانی ہیں۔ گیس نہیں ہے، مجھے چولہا پسند نہیں، مجھ سے آگ نہیں جلتی۔ پھر شرما شری اٹھ بھی گئی تو جتنی دیر میں اس نے چلا بالنا (چولہا جلانا) ہے میں نے بجھ جانا ہے۔''
آمنہ کی زور سے ہنسی نکل جاتی۔ وہ اٹھ کر انہیں بانہوں میں بھر لیتی۔
''نہ دادی جی! یمنیٰ دل کی بری نہیں ہے۔ ابھی کم عمر اور ناسمجھ ہے اور آپ کی خاطر تو وہ آگ میں کود سکتی ہے اور آپ۔۔۔''
''آگ میں کود سکتی ہے۔ ہونہہ پہلے آگ جلا تو لے۔۔۔ اس کے ساتھ کی کڑیوں کے دو، دو بچے ہیں، اس کا حال دیکھو۔'' وہ آمنہ کو یاد دلاتیں۔
''تو آپ میری شادی بھی کر دیتیں اس کے ساتھ ہی تو میں دو کی جگہ چار بچے پیدا کر لیتی۔ دو دو کی جوڑیاں۔ اب بغیر شادی کے ان کا مقابلہ تو کر نہیں سکتی۔'' یمنیٰ تن فن کرتی اندر آئی۔
''توبہ۔۔۔ توبہ! تیرا بیڑا اتر جائے (تیری کشتی پار لگے) یمنیٰ۔۔۔ یمنیٰ!'' دادی جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پہلے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی، مگر یہ مشکل تھا، سو پہلے اپنے تکیے کے پاس رکھا دوائیوں کا تھیلا اس کی سمت پھینکا، پھر تختی اور آخر میں اپنی لاٹھی۔
آمنہ کی ہنسی۔۔۔ اس کا سانس رک رہا تھا۔ یمنیٰ کو بھی اپنے جملے کا احساس ہوا۔ آمنہ اسے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے دادی سے لپٹی انہیں پُرسکون کر رہی تھی۔
دادی جی ارد گرد نگاہ کر کے اور چیزوں کی تلاش میں تھیں۔ نیچے پڑے جوتے اٹھا کر اسے مارنا چاہتی تھیں مگر آمنہ کی گرفت سخت تھی۔ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئیں۔

❀❀❀

''تم نے کس کو خط لکھا ہے۔۔۔ یہ کراچی میں کون رہتا ہے۔۔۔ اور تم اسے کیسے جانتی ہو۔۔۔؟

کون ہے یہ؟'' شہباز کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ وہ کچن کے چبوترے پر کھڑا خط لہرا لہرا کر دادی جی کو متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ دادی جی کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ آمنہ آٹا گوندھ رہی تھی۔

''میں نے خوامخواہ تمہیں پکڑا یا، ابا جی کو ہی دے دیتی۔'' یمنیٰ نے چیل کی طرح اچھل کر اس کے ہاتھ سے خط لے لیا۔

کراچی والا خط دادی جی کے لیے بھی شک میں مبتلا کرنے کا باعث تھا، مگر دادی جی نے لمحے میں دو باتیں سوچیں۔ پہلا آمنہ کا مسکراتا مگن چہرہ، انہیں آمنہ پر خود سے زیادہ اعتبار تھا اور دوسرے خط ایسا ویسا ہوتا تو یمنیٰ بھائی یا باپ کے ہاتھ کیوں پوسٹ کرواتی، سو سب ٹھیک ہے۔

وہ دوبارہ اپنی دوائیوں والی تھیلی میں مگن ہو گئیں۔

''میں ابا جی کو بتاؤں گا۔'' اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

''سو مرتبہ۔۔۔ بلکہ یہ خط اب ابا جی ہی پوسٹ کریں گے۔ سمجھے تم!'' یمنیٰ نے خط لہرایا۔

آمنہ آٹا گوندھ کر فارغ ہو گئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ فریج تھا نہیں، اسے تین ٹائم آٹا گوندھنا ہوتا۔ شہباز رات کے ہلکے خمیرے آٹے کے پراٹھے کے ساتھ انڈا اور چائے کے دو کپ پی کر اسکول کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ابھی ابا جی اور چاچا جی کو جانا تھا۔ اس نے مرغیوں کو باہر نکالا اور ساتھ تین انڈے بھی۔ انڈے پالینے کی خوشی سے چہرہ ہر روز دمکتا تھا۔

آمنہ نے ہری پیاز دو انڈوں میں ملا کر آمیزہ بنایا اور یمنیٰ کو اشارہ کیا کہ وہ اندر کمرے میں رکھے سلنڈر پر آملیٹ بنا کر لے آئے۔ وہ بھی فرماں برداری سے اندر گھس گئی۔ پھولا پھولا ہرا سفید آملیٹ، دہی کا پیالا، رات کی بھنڈیاں، لسوڑھے کا اچار اور پراٹھا چائے۔ ابا جی، دادی جی ابو جی آمنہ اور یمنیٰ نے ناشتا کیا۔

یمنیٰ نے اپنا خط نکال کر ابا جی کو دیا اور انہیں خواجہ اینڈ سن کے خواجہ کی طرح یاد کروایا بلکہ رٹوایا کہ خط کس طرح لیٹر بکس میں ڈالنا ہے۔

''سمجھ گئے نا ابا جی!''

''پتر! سمجھ گیا۔ ہر ماہ عزاز کو خط ڈالتا ہوں۔ مجھے خط ڈالنا آتا ہے۔'' وہ بھولا منہ بنا کر بولے۔

آمنہ ہنس دی۔ یمنیٰ جھینپ گئی۔ آمنہ کے منہ سے چائے پھوار کی صورت گری اس نے جلدی سے پلو ہونٹوں پر رکھا تھا۔

فریدہ اپنے اسکول کی استانی کے تین سوٹ کڑھائی کے لیے دے گئی تھی۔ یمنیٰ نے ہفتے میں پورے کر دیے، گیارہ سو روپے ملے۔ اس نے ہزار کا نوٹ پیٹی میں غائب کیا۔ سو روپے ڈائجسٹ کے لیے فریدہ کو دیے۔ خدا خدا کر کے دس تاریخ کے بعد شمارے ملے۔ اس نے جوش بھرے انداز میں ورق پلٹے۔ ایک بار دیکھا، دو بار، سہ بار۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ میلسی ہی کے علاقے سے کسی اور قاری کا خط شامل تھا، مگر دونوں جگہ اس کے خط نہیں تھے۔ وہ شدید ترین مایوسی اور بعد میں غصے کا شکار ہو گئی۔ ہر ہر شے پر غصہ نکالا۔ عملاً قولاً۔۔۔ زیادہ کم بختی آمنہ اور شہباز کی آئی۔ آمنہ کو اس کی ساری بھڑاس سننی پڑی اور شہباز حساب کے سوال کی غلطی پر اسے خوب کوٹا گیا۔

"مجھے پتا ہوتا تم نے ایسے ڈرامے کرنے ہیں تو میں تمہیں خط لکھنے ہی نہ دیتی۔" آمنہ چڑ گئی۔
"اتنے پیارے خط میں نے لکھے۔ تعریفیں ہی تعریفیں۔۔۔ پھر بھی۔۔۔" اس نے ناک چڑھائی۔
"تم پاگل ہو۔۔۔ کوئی کام کی بات پوچھتیں۔ الٹا پلٹا خط لکھا ہوگا۔" آمنہ نے شکوہ کیا۔
"تمہارا ذکر بھی کیا تھا کہ آمنہ ہمیشہ پرانے شمارے لا کر دیتی تھی اب میں خود نئے خریدوں گی۔ دادی کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ منع تو کرتی ہیں مگر سختی سے نہیں، لیکن ہم ان کے سامنے پڑھتے نہیں۔۔۔ پہلے ہماری پھپھو سلطان بی بی پڑھتی تھیں۔ ان سے آمنہ کو لت لگی اور آمنہ سے مجھ کو۔"
آمنہ ہنس پڑی۔ "سارا محلہ تو ہو گیا، تم نے مرغیوں اور وہ ہماری مرجانے والی بکری کا ذکر نہیں کیا؟"
"کہا تھا کہ دادی کی بکری نے فوت ہونے سے پہلے فرحت اشتیاق کے ناول کی پوری قسط چبادی تھی۔ پھر میں نے اسے ڈنڈے سے مارا تھا۔ پورا ناول پڑھ لیا ہے۔ وہ قسط آج تک نہیں پڑھی۔"
آمنہ کی ہنسی میں شدت آگئی۔ "مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ تم نے کیسا خط لکھا ہوگا۔۔۔ اور وہ شائع کیوں نہ ہوا۔"
یمنیٰ اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔۔۔ پھر شہباز کا اسکول بیگ لیے باہر نکلی، پھر چھت کی جانب۔
"اب کیا کرنے لگی ہو؟" آمنہ نے آواز دی۔
"نیا خط لکھنے لگی ہوں۔" اس نے اونچی آواز میں کاغذ لہرایا۔
"یا اللہ رحم!" آمنہ یہی کہہ سکی۔

❀❀❀

وہاڑی سے پھپھو سلطان بی بی آئی تھیں۔ اس بار وہ اہم مشن پر تھیں۔ آمنہ کی تاریخ پر تبصرہ ہونا تھا۔ کمیٹی کب کھلے گی۔ لسٹ بنائی تھی کیا کیا خریدنا باقی ہے، کس کو کیا دیا گیا اور اب کیا ملے گا۔
پھپھو دادی کے کانوں میں گھس کر "اُدھر" کی تیاریاں بتا رہی تھیں۔ دراصل یہ رشتہ پھپھو نے اپنے شوہر کے تایا زاد بھائی عظیم سے کروایا تھا۔ وہ وہیں پھپھو کی سسرال وہاڑی میں جوائنٹ فیملی میں رہتا تھا۔ ابھی سال پہلے ہی انہوں نے بیچ میں دیوار کر کے اپنا الگ بڑا گھر بنایا تھا۔ عظیم چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ تائی مجیداں نے پھپھو کی پندرہ سالہ شادی شدہ زندگی دیکھ رکھی تھی۔ صبر، شکر، تحمل، برداشت، ہر مشکل گھڑی میں خاندان کے ساتھ، سب سے بنا کر رکھنے والی اور آمنہ پھپھو کا پرتو تھی۔
وہ دو سال پہلے بڑے مان و محبت سے رشتہ لے گئیں۔ اب آمنہ کی نند کی رخصتی میں آمنہ کا ولیمہ تھا۔ دیر آمنہ کی نند کے سسرال کی جانب سے تھی اور اب وہاں بھی ہلچل تھی۔
شام کو دادی کی دونوں بڑی پیٹیاں کھولی گئیں۔ یمنیٰ کو اس موقع پر عموماً غصہ چڑھتا تھا، مگر وہ بھی سنجیدہ بنی اوپر چڑھ کر پیٹی میں گھس گئی۔ اب وہ سامان نکال کر چارپائیوں پر پھپھو کو دیتی جا رہی تھی۔ دادی جی لاٹھی ٹیکتی خود دروازہ پر اندر سے تالا ڈال کر آئی تھیں۔ آمنہ کی امی کے جہیز کی شنیل والی آتشی گلابی رضائیاں، سفید سبز دھاری والے کھیس، ہاتھ کی بنی رنگ برنگی دریاں، گدے البتہ نہیں تھے۔ دادی

جی کے جہیز کے دیسی روئی کے تکیے پڑے تھے۔ پھپھو سامان چھانٹ کر الگ کر رہی تھیں۔ ایک چارپائی پر سلور اسٹیل کا پتیلیوں کا سیٹ، اعزاز کا لایا ہوا ہاٹ پاٹ سیٹ، کولر، اسٹیل کے برتن آمنہ کی امی کے جہیز کے تھے بلکہ بیشتر سامان انہی کا تھا۔ وہ خوب اچھا جہیز لائی تھیں پر یہاں سسرال میں دادی کی پوری گھر گرہستی تھی۔ ان کا سامان پیٹی ہی میں رہا۔ اب آج نکل رہا تھا۔

''سلائی مشین اور واشنگ مشین آمنہ کے نانکے دیں گے۔'' دادی جی نے بیٹی کو بتایا۔ پھپھو مطمئن ہو گئیں۔

''اس کے ماموں کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ آپ جب مرضی کی تاریخ رکھو۔ میں اگلے مہینے بھجوا دوں گا۔'' شام تک سارا سامان نکلوا کر دیکھ لیا گیا۔ بہت کچھ موجود تھا۔ بہت کچھ لینا تھا۔

''یہ چیزیں زیادہ ہیں۔ یہ الگ رکھ دو۔ تمہارے کام آئیں گی۔'' دادی نے دوسری چارپائی کی چھوٹی ڈھیری کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ ہاٹ پاٹ کے سیٹ ڈبل ہو گئے ہیں۔ یہ رضائیوں کے فالتو کور ہیں اور اسٹیل کے جگ گلاس یہ بھی تمہارے لیے۔'' یمنیٰ کا چہرہ تن گیا۔

''مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔'' وہ آمنہ کی پیٹی کو تالا ڈال کر کھینچ کر بولی۔

''اچھا! چلو چھوڑو۔ اعزاز کو بھی یہ سب نہیں چاہیے۔'' پھپھو نے دادی جی کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بھی کھل کر مسکرائیں۔

''اور مجھے اعزاز بھی نہیں چاہیے۔'' یمنیٰ نے دوسری پیٹی کا ڈھکن یک دم چھوڑ دیا۔ دھڑک، ڈھا۔ کنڈیاں اندر کی جانب بند ہو گئیں۔ یمنیٰ جھاڑن چارپائی پر گولا بنا کر پھینکتے ہوئے باہر نکل گئی۔ دادی جی نے بڑی پریشان نگاہوں سے پھپھو کے حیران اور آمنہ کے شرمندہ چہرے کو دیکھا۔

❁❁❁

''جس طرح اللہ نے رزق پانی باندھ رکھا ہے۔ اتنا اس وقت اس جگہ سے، نہ قسمت سے کم نہ زیادہ جو لکھا ہے وہ مل کر رہے گا۔ اسی طرح مجھے لگتا ہے اللہ نے منظر بھی باندھ رکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کو اتنی خوشی اتنی تراوٹ اتنی وسعت ملنی ہے نہ زیادہ نہ کم۔

یہاں تاحدِ نگاہ ریت ہے۔ صرف دو رنگ، مٹی ریت کا مٹیالا رنگ جو دھوپ میں سونے سے زیادہ لشکارے مارتا ہے، پھر آسمان جو کبھی اتنا نیلا ہوتا ہے جیسے کسی نے سفید چادر کو نیل دے دیا ہو، پھر دھوپ بڑھتی ہے اور سارا نیل اڑ جاتا ہے، ڈب کھڑیا آسمان دن بارہ بجے تو کبھی آسمان کی طرف دیکھنا ہی نہیں کہ اس وقت سورج خود سے آنکھ ملانے کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ ہم سب سر جھکا کر ہاتھوں کے چھجے سے آنکھوں کو ڈھانپے بظاہر احترام میں لیکن سورج سے ڈرتے چلتے جاتے ہیں۔ آپ کو صحرا میں رہنا ہے تو سب سے پہلے سورج کی حاکمیت کو ماننا ہوگا۔ میلسی ایک گرم میدانی علاقہ ہے۔ تم سے یہاں کی گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ اس صحرا کی گرمی کو دیکھو تو تم میلسی کی گرمی کو ٹریلر کہو گی۔ فلم

روز ہم دیکھتے ہیں۔ تم نے پوچھا میں نے اتنی اچھی باتیں کرنی کہاں سے سیکھ لیں۔ کہیں سے نہیں۔ صحرا کی تنہائی آپ کو سوچنا سکھا دیتی ہے۔ میں تو پھر بھی بارہ جماعت پاس ہوں۔ تم ہمارے باورچی بمشکل مڈل پاس بندوق خان کا خط پڑھو تو عش عش کر اٹھو۔۔۔ مستنصر حسین تارڑ اور تمہاری وہ راحت جبین کی منظر نگاری بھول جاؤ گی۔ اس نے اپنی بیوی کو خط لکھا۔ بدلے میں اس نے پیر بابا سے بنوا کر تعویذ اور پانی بھیج دیا کہ ''خوچہ بندوق خان پر صحرا کی چڑیل کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ایک بھی سیدھی بات نہیں کرتا۔ پھول، خوشبو، ہوا، بادل اور رنگ۔ سات صفحوں کا خط لکھ دیا۔ یہ نہ بتایا کہ چھٹی لے کر کب آئے گا۔ بیٹی کا نام تک نہ بتایا کہ کیا رکھنا ہے۔۔۔ تم کو صحرا بہت پسند آ گیا ہے۔ ام نے صحرا خان ہی نام رکھ دیا ہے۔'' اور فون بند۔ بتاؤ جب بندوق خان کا علمی قد وہاں تک پہنچ گیا (جہاں اسے کبھی نہیں پہنچنا چاہیے تھا) تو ہم تو پھر عشق گزیدہ ہیں۔ کبھی میرا کوئی خط اسے بھی پڑھوا دو شاید قطرہ قطرہ پتھر میں سوراخ کر دے۔ اسے بتاؤ کہ میں دن میں سورج سے تو آنکھ نہیں ملا پاتا، مگر ساری رات چاند میرے لیے ٹی وی بن جاتا ہے، جس میں اس کا ہر سین لائیو ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے اور تمہیں پتا ہے، صحرا کا چاند تمہارے گھر کے چاند سے بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ جب چاند کی طرف مسلسل دیکھو تو وہ پھیل کر سارے آسمان کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اب تم سوچو میں کتنی بڑی یمنیٰ روز دیکھتا ہوں (ہاہاہا) اجازت دو میں چھٹیاں بچا کر رکھ رہا ہوں۔ اپنی جگہ سب کو بھیج چکا ہوں۔ اب تم شادی کر لو۔۔۔ یہاں سے تمہارے لیے کچھ لانا مشکل ہے۔ میلے میں گیا تھا۔ ایک چولستانی کڑھائی والی چادر لی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کا لباس گھاگھرا چولی ہے۔ حسبِ معمول اس خط کو بھی چاندنی رات میں چاند کی روشنی میں لکھ رہا ہوں یقین نہیں آیا؟ کر لو یار۔۔۔ تم اس منظر کو تجربہ نہیں کر سکتیں، میں نے کہا نا۔۔۔ منظر اور تجربے بھی ہر شے کی طرح نصیب سے ملتے ہیں۔

دادی اور چاچو کی صحت کا بہت خیال رکھو۔ اعجاز کو بھی خط لکھا ہے۔ شہباز کی پڑھائی کا دھیان رکھو۔ میں اسے فوج کا اعلیٰ افسر بنانا چاہتا ہوں۔ ابا جی کو سلام اور ان سے کہنا، میں بہت دور سہی، مگر ہمیشہ ان کے ساتھ ہوں۔ تمہارے لیے ڈھیروں پیار۔ اسے بھی دینا۔۔۔ مگر بھائی میں صرف تمہارا ہوں (یاد رہے۔)

اللہ نگہبان

تمہارا بھائی اعزاز مطلوب

آمنہ کے چہرے کی ہلکی مسکراہٹ پھیل کر پورے جسم پر حاوی ہو گئی اس نے طمانیت کا سانس

بھرتے ہوئے خط کو اعزاز کے گزشتہ خطوط کے ڈھیر میں سلیقے سے جما کر رکھا اور دزدیدہ نگاہوں سے یمنیٰ کو دیکھا وہ بظاہر ڈائجسٹ پڑھنے میں مگن تھی مگر آمنہ جانتی تھی، اعزاز کا خط پڑھتے ہوئے جو جو رنگ اس کے چہرے پر آیا تھا، یمنیٰ سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک بار اعزاز کا خط پڑھنے سے انکار کیا تھا۔ ''پڑھنے کے لیے اور بہت کچھ ہے۔'' آمنہ نے دوبارہ کہا نہیں کہ ہر چیز اپنے وقت پر خود بخود ہو جاتی ہے۔

❁❁❁

بقرعید کے ساتویں دن شادی رکھ دی گئی تھی اور اب تیاریاں زوروں پر تھیں۔ یمنیٰ کو شاپنگ کرنا تھی اور سب سے اہم، آمنہ سے چھپا کر کرنی تھی۔ سو وہ فریدہ اور سعیدہ کو لے کر صبح صبح بازار چلی گئی۔ شام گئے جب دادی جی ہول ہول کر آدھی رہ گئیں، وہ لدی پھندی گھر لوٹیں۔ یمنیٰ نے کسی کو بھی دکھائے بغیر پیٹی بند کر دی۔

''پتا نہیں کون سی الم غلم چیزیں خرید لائی ہے۔ پتا نہیں اس نے کون سے چاند تارے خریدے ہیں۔''

آمنہ مسکراتی رہی۔ اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔

''اعجاز آجائے تو گھر پہ سفیدی پھیر دے۔'' وہ چارپائی پر چت لیٹی اونگھ رہی تھی۔ جب دادی جی لاٹھی کے سہارے گھر کی دیواریں دیکھتے ہوئے آمنہ سے رائے طلب کر رہی تھیں۔

''جی دادی جی۔۔۔ اعجاز کے دوست بھی ساتھ مل جائیں گے۔''

''مگر اس سے فرق کیا پڑے گا۔ گھر کو سفیدی کی نہیں، صفائی کی ضرورت ہے۔ اس اینٹوں کے ڈھیر کو ہٹوالیں آپ ذرا۔۔۔ گھر کی پہلی بیٹی کی شادی اور چونا پھیر لو۔۔۔ ہونہہ!'' وہ سوتی بنی لیٹی تھی۔ لڑاکا انداز میں اچھل کر بولی۔ آمنہ نے لمبا طویل سانس بھرا۔

''ایک نئی بحث شروع۔''

''کس بات کی اینٹیں۔ خیر سے بنیادیں ڈال رکھی ہیں۔ کمرے بنائیں گے۔ ذرا آمنہ سے فارغ ہو لیں۔'' دادی جی پرعزم تھیں۔

''ہاں! پہلے امی کی بیماری سے فارغ ہوئے۔۔۔ پھر ابو جی بیمار ہیں۔ پھر فراغت کا انتظار۔۔۔ پھر آمنہ کی شادی۔۔۔ پھر ذرا مقدمہ جیت لیں۔۔۔ اور آپ مجھ سے لکھوالیں مقدمہ کبھی جیت ہی نہیں سکتیں آپ۔ حق دار کو حق دیں، وہ بھی خوش۔۔۔ ہمارے مسئلے بھی حل ہوں۔''

یمنیٰ کی ساری دن کی تھکاوٹ زبان کے رستے نکلی۔ دادی جی کو مانو بچھو نے ڈنک مارا۔

''تیرا بیڑہ تر جائے منوں۔۔۔ نہ مجھے بار جا کے دشمن لبھنے (ڈھونڈتے) کی کیا لوڑ (ضرورت) ہے۔ ہائے وے ربا۔ کون سے حق دار۔۔۔ کیسے حق دار۔۔۔ ہائے ہائے!'' دادی نے سینے پر دوہتڑ مارے۔

''دادی جی! آرام سے۔۔۔ آرام سے۔'' آمنہ لپک کر انہیں روکنے آئی۔

''تو میں کون سا غلط کہہ رہی ہوں آج ہو یا پچاس سال بعد، فیصلہ یہی ہوگا۔ میں نے تو آپ کو فتویٰ

بھی سنایا تھا، اخبار سے پڑھ کے۔'' یمنیٰ ڈٹی رہی۔

''ہائے! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ منوں! پانی دے۔'' دادی جی کی زبان سوکھ رہی تھی۔ آمنہ گلاس بھر پانی لائی اور یمنیٰ کا پیر بری طرح کچلا۔ خاموش رہنے کی التجا۔۔۔

''ہٹو ظالم۔۔۔'' وہ پیر سہلانے لگی۔ آمنہ نے یمنیٰ کو چھت پر بھیجا اور دادی جی کو سہلانے لگی۔ وہ چھت پر لیٹی تھی۔ پہلے تو نیچے سے آتی دادی جی کی آوازیں اور ہزار بار کا دوہرایا قصہ سنتی رہی، پھر آنکھ لگ گئی۔

''ابو جی اور ابا جی دونوں تمہیں بلا رہے ہیں اور غصے میں ہیں۔ اللہ کے لیے چپ رہنا۔ کہہ دینا غلطی ہو گئی۔'' رات گئے آمنہ اسے اوپر لینے آئی۔

''اچھا! آتی ہوں۔ تم چلو۔۔۔'' وہ آنکھیں مسلتے جمائیاں روکتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''تمہاری باتوں سے امی جی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے تم بچی ہو یمنیٰ!'' ابو جی مدھم مگر سخت لہجے میں بولے۔

''میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ سب لوگ جان بوجھ کر نظریں چراتے ہیں تو چراتے رہیں۔'' وہ ڈٹی رہی۔ ''مجھے نہیں پسند یہ کھنڈر مکان۔۔۔ ساٹھ مرلے کا گھر اور یہ صرف چار کمرے، دادا جی کے زمانے کے بنے ہوئے۔ پلاٹ متنازعہ ہے۔ دس سال پہلے یہ بنیادیں ڈالی تھیں۔ ایک ایک اینٹ بھی رکھتے تو عالی شان گھر بن جاتا۔ اب یہ حال ہے کہ ایک کیل بھی نہیں لگا سکتے۔ دس سال سے فیصلہ نہیں ہوا۔ ساری آمدنی مقدمے پر لگا دی۔ بلاوجہ کی پھٹیک (ٹینشن)۔ مجھے شرم آتی ہے ایسے گھر میں رہتے ہوئے۔ کوئی آ جائے تو میں تو سامنے بھی نہیں آتی۔ کھودی مٹی کھوتے لگ گئی (کنویں کی مٹی کنویں پر لگ گئی)۔'' اس کی آواز بھرا گئی، آنکھوں میں نمی بھی آ گئی۔

بات تو سو فیصد درست تھی۔ ابا جی مکمل اور ابو جی آدھے متفق تھے، مگر دادی کو کون منائے۔

''جاؤ! اپنے کمرے میں سو جاؤ۔'' ابو جی دھیمے لہجے میں بولے۔ دونوں آگے پیچھے نکلیں۔

''تعریف کروں تو تم بڑی بہادر ہو۔۔۔ اور برائی کروں تو صاف بات ہے تم بہت بدتمیز ہو یمنیٰ!'' آمنہ نے اللہ جانے تعریف کی یا تنقید۔۔۔ یہ کچھ نہ بولی۔

''وقت گزرتا ہے تو ہر چیز بدل جاتی ہے۔ تم اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو، تمہیں بھی سب اچھا مل جائے گا۔'' آمنہ پرامید لہجے میں بولی۔

''بات یہ ہے آمنہ! کہ تم ایسی باتیں کر سکتی ہو۔۔۔ تمہارا راستہ آگے روشن ہے۔۔۔ مجھے تم سب مل کر مزید تاریکی میں دھکیل دو گے۔ میرے منہ سے زہر ہی نکلے گا۔'' وہ خار لہجے میں بولی۔ آمنہ حق دق رہ گئی۔

''تم اتنا برا سوچتی ہو یمنیٰ؟'' وہ بہت دیر بعد بولی۔

''اس سے بھی زیادہ برا۔'' وہ بے نیازی سے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

''تم پریشان مت ہو۔ تمہاری مرضی کے بنا کچھ نہیں ہو گا۔ تم اپنا رستہ خود چننا۔'' وہ بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

❀❀❀

اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو یمنیٰ ٹھیک کہتی ہے۔ غربت کسے اچھی لگتی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم اوروں سے بہت اچھے ہیں، اپنے سے اوپر دیکھنے سے پہلے نیچے دیکھیں تو دل ہمیشہ ٹھکانے پر رہے، اب یہ جو ساری لڑائی تمہیں بتائی ہے، میں اس کی وجہ سمجھتی ہوں۔ یہ اس دن بازار گئی۔ اسے بڑے بڑے دروازے والے خوب صورت پکّے ماربل والے گھر بھاتے ہیں۔ بازار کی چیزوں کو دیکھتی ہے تو نہ خرید سکنے کا احساس بے بسی میں ڈھل کر رلاتا ہے، لڑواتا ہے۔ ابھی اس میں بچپنا ہے۔ اسے اپنا یہ ماحول، کلچر، رہن سہن کچھ پسند نہیں۔ یہ اس ماحول سے فرار چاہتی ہے۔ اس دن تو اس نے یہاں تک کہہ دیا ''کاش! پھپھی کی تائی ساس میرا رشتہ ہی مانگ لیتیں۔'' بعد میں بہت شرمندہ ہو کر معافی مانگتی رہی۔ اسے شاید تمہاری ذات پر تو کوئی اعتراض نہ ہو مگر اسے تمہارا ساتھ قبول کرنے سے جو زندگی گزارنی ہوگی، وہ اسے قطعاً قبول نہیں۔ برملا کہتی ہے۔ اعزاز! میرے بھائی! تم کچھ کرو بلکہ تم ہی کچھ کر سکتے ہو، دادی تمہاری بات سمجھتی ہیں۔ تم انہیں منا سکتے ہو۔ یمنیٰ بالکل غلط بھی نہیں ہے۔

یہ بات صاف اور سیدھی ہے کہ دادی جی دادا جان کی دوسری بیوی تھیں اور ان کے پہلے بیوی سے بیٹے یعنی تایا یعقوب دادا جی کی اولاد ہیں اور اس گھر میں ان کا بھی ابا جی اور چاچو جی کے برابر حصہ ہے مگر دادی جی دینے کو تیار نہیں۔ سیدھا سیدھا حل ہے۔ یہ سارا پلاٹ بیچ کر انہیں ان کا حصہ دیں اور ہم کہیں دوسرا گھر لے لیں جب تک ہم انہیں دیں گے نہیں، یہاں عمارت بنانا ممکن نہیں۔۔۔ مگر دادی امی حق تسلیم نہیں کرتیں۔

سالوں پہلے ہم نے جب گھر بنانا شروع کیا تو تایا آ گئے کہ میرا حصہ نکالو اور پھر جو مرضی بنالو۔ اس وقت کی ڈلی بنیادیں واقعی کھنڈر کا نقشہ لگتی ہیں۔ دراصل یمنیٰ کو رونا یوں آتا ہے کہ تم سے شادی کی صورت میں اسے اس کھنڈر میں زندگی گزارنی ہوگی۔ اتنی تلخ باتیں کرتی ہے کہ حد نہیں۔ تمہاری محبت بھی اسے رام نہیں کر سکتی۔

اب تم ہی کچھ کرو ایک اچھا خوب صورت گھر ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے وہ حق بجانب ہے۔ اب تم اتنی زیادہ محبت کا دعوا کرتے ہو۔ ثبوت پیش کرو۔۔۔ لوگ دودھ کی نہریں نکال لیتے ہیں۔ تاج محل بنا دیتے ہیں تم سے دو کمرے اور ایک کچن نہیں بن سکتا۔ تمہیں خط لکھا تو دل ہلکا ہوا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔

تمہاری بہن

آمنہ مطلوب

اللہ نگہبان

❁❁❁

یمنیٰ سارے گھر میں خوشی سے گھومتی پھر رہی تھی۔ ''میں بن پتنگ اڑ جاؤں رے۔'' وہ گنگنائی۔

''میں تار والی ڈور سے کاٹ دوں گا۔ وہاں گندے نالے میں جا کر گرو گی۔'' شہباز نے خط اٹھایا۔

''پراں ہو۔۔۔ سارا مزا خراب کر دیا۔'' یمنیٰ بدمزا ہو گئی۔ آمنہ ہنستے مسکراتے دوبارہ اس کا لکھا خط پڑھ رہی تھی جو کوئی ساتویں کوشش میں شائع ہو گیا۔ ڈائجسٹ کی مندرجات پر تبصرہ، پسندیدہ مصنفہ کی تحریر کی فرمائش، اپنا مختصر سا تعارف۔۔۔

آمنہ کو بھی بڑا مزا آیا۔ خط میں اس کا بھی ذکر تھا۔

''یمنیٰ! میری شادی کا احوال لکھنا۔'' اسے یونہی خیال آیا۔

''دماغ خراب ہے، تمہاری شادی کا احوال بھی کوئی احوال ہوگا۔ چندے کا جہیز، ٹانگوں کی سلائی مشین اور واشنگ مشین۔ دادی جی نے اپنا سو مرتبہ کا دھلا کاسنی سفید سوٹ پہن لینا ہے۔ نہ مووی، نہ فوٹو سیشن، نہ بیوٹی پارلر کا میک اپ، نہ تصویریں۔۔۔ کون پڑھے گا دلچسپی سے؟''

''تم ایسے سوچتی ہو منوں؟'' آمنہ کی آواز بھرا گئی۔

آمنہ ڈائجسٹ چھوڑ کر یک دم کمرے کی سمت بھاگی۔

''یا اللہ!'' شہباز نے حیرت سے اپنی بے حد نرم خو، صلح جو، تحمل سے لبریز بہن کو دیکھا، وہ کچھ سمجھا تو نہیں مگر یہ پتا لگ گیا کہ یمنیٰ باجی نے کوئی ''انتہا'' کر دی ہے۔ اس نے یمنیٰ کو گھورا اور کمرے کی جانب بڑھا مگر یہ کیا دروازہ بند۔

''تم بہت بری ہو چھوٹی منوں۔۔۔ تم سب کو ناراض کرتی ہو۔۔۔ میں بتاتا ہوں دادی امی کو۔'' خود یمنیٰ کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ٹھک ٹھک۔۔۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ بجایا۔

'دروازہ کھول دو منوں۔۔۔ اللہ کی قسم زبان پھسل گئی۔ قسم سے معاف کر دو۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ جڑے ہیں۔ سچ بڑی غلطی ہو گئی۔ میری توبہ۔۔۔'' یمنیٰ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

شہباز اچھل کر دیوار سے ٹنگ گیا۔ روشن دان سے جھانکا۔ آمنہ چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بہہ رہا تھا۔ ہر حال میں مسکراتی آمنہ کو یوں روتے دیکھنا شہباز کے لیے کڑا امتحان تھا۔ اس نے یمنیٰ سے انتقام لینے کا منصوبہ فوراً بنایا۔

''نہیں کرو منوں! باجی! نہیں کرو۔۔۔ قسم اللہ کی۔۔۔ نہیں کرو۔۔۔ مر جاؤ گی تم۔۔۔ دوپٹا کا پھندا نہیں بناؤ۔ پنکھے سے لٹکنے میں بہت مشکل ہوگی۔ تمہارے پاس تو اسٹول بھی نہیں ہائے میری باجی۔۔۔''

''کیا کہہ رہا ہے شہباز۔۔۔ کیا کر رہی ہے آمنہ۔۔۔؟'' یمنیٰ کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ اس نے پوری شدت سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔

''خودکشی حرام موت ہے، اگر بچ گئی نا تو بھی ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں گے۔ تمہارا تو دوپٹا بھی کچا ہے۔ یہ ابا جی کی سرمئی دھوتی کا پھندا بناؤ آپا! ہاں اس بکسے پر کھڑی ہو جاؤ۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے، مگر سن لو ذرا

میرے بیگ سے کاغذ پنسل لے کر لکھ دو، یہ سب یمنیٰ کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے کر رہی ہو۔"

"کک۔۔۔ کک۔۔ کیا شہباز۔۔۔! اندر کود کر دروازہ کھول۔ ہائے آمنہ۔۔ آمنہ ایسا نہ کر۔۔۔" یمنیٰ حلق کے بل چیخی۔

شہباز جو کچھ "دیکھ رہا" تھا، اس کی کمنٹری مسلسل کر رہا تھا۔ یمنیٰ دھڑ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم کی ساری جان نکل گئی۔ "آمنہ! میں مر جاؤں گی۔ اللہ کے لیے تم ایسی تو نہیں تھیں۔ ہائے! میں منحوس ہوں سب کی دشمن۔ آمنہ میری زبان پر کوئلہ رکھ دے مگر ایسے نہ کر۔۔۔ ہائے!"

شہباز نے چٹخارا لیا۔ "تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے چھوٹی منوں!" وہ دھڑام کر کے نیچے کودا۔ "اب یہاں بیٹھ کر بین کرو۔ میں لوگوں کو بلاتا ہوں۔ میں اکیلا لاش اتار نہیں سکتا۔" وہ بڑی ذمہ داری سے کہہ کر باہر کو لپکا۔

"ہائے آمنہ!" یمنیٰ حلق کے بل چیخی۔ "دادی جی۔۔ دادی جی۔۔۔ ہائے میں مر گئی۔" وہ چکرا کر زمین پر آ رہی۔

اتنی دل دوز دل خراش چیخوں پر آمنہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پورے وزن کے ساتھ دروازے سے چپکی یمنیٰ دروازہ کھلتے ہی آمنہ کے پیروں پر گر پڑی۔ ہوش و حواس سے جدا ہونے سے پہلے اس نے آمنہ کا متورم چہرہ حیرت سے دیکھا تھا۔

"اب مزا آیا؟ ایسا ہوتا ہے میرا انتقام۔" شہباز منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ یمنیٰ کے سر پر گومڑا ابھر آیا تھا۔ فرش بڑی زور سے لگا تھا۔

"میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا کہ لوگ اس لیے شادی کا احوال لکھتے ہیں کہ اپنی دولت و امارات رہن سہن کی شو مار سکیں۔ میں نے تو ہمیشہ مختلف کلچر اور رسم و رواج جاننے کے لیے مزے لے کر اس سلسلے کو پڑھا۔"

رات یمنیٰ کے بہت زیادہ منانے کے بعد آمنہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مگر تم نے کبھی کسی غریب غربا کی شادی کا احوال پڑھا ہے؟" یمنیٰ نے اعتراض اٹھایا۔

"نہیں پڑھا۔" آمنہ نے اعتراف کیا۔

"مگر تم یہ تو دیکھو! شادی بیاہ کے معاملات میں لوگ ہر قیمت پر بہت اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر چیز کو بہتر سے بہتر دکھانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ بچتیں، لین دین، ادھار، سب اس موقع کے لیے رکھا جاتا ہے، پھر یہ موقع اتنی محنتوں کے بعد بہت اچھا بن کر سامنے آتا ہے۔ ہمارے گھر کی شادی بھی اتنی اچھی ہی ہوگی۔" آمنہ نے تفصیلی جواب دیا۔

"نہیں ہو سکتی کبھی بھی۔" یمنیٰ قطعیت سے بولی۔

"اچھا! تمہاری شادی ہم اس طرح کریں گے کہ وہ سب لوازمات ہوں جو تمہارے خیال میں ڈائجسٹ کی شادی میں ہونے چاہئیں، پھر میں تمہاری شادی کا احوال لکھ بھیجوں گی۔" آمنہ نے ہنستے ہوئے اپنا آئیڈیا بتایا۔

''بہت خوب۔۔۔'' یمنیٰ کی ہنسی استہزائیہ تھی۔

''تمہارے تو پھر کچھ خواب، ارمان پورے ہو ہی رہے ہیں۔ ادھر سے نہ سہی، ادھر سے تو کھلا ہاتھ اور کھلا دل ہے۔ میرے لیے تو ایسا کوئی چانس دور دور تک نہیں۔ تمہیں سب مل رہا ہے۔ تم اتنی خوش امیدی کی باتیں کر سکتی ہو۔۔۔ میں نہیں۔۔۔'' اس نے حتمی کہا۔ آمنہ کے پاس جواب تھا مگر اب اس نے دو بدو جواب دے کر سمجھانے کی کوشش ترک کر کے ''عملی اقدام'' اٹھانے کا سوچا تھا، سو خاموش رہی۔

تمہیں ہمیشہ آدھا گلاس بھرا دکھائی دیتا ہے جبکہ۔۔۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اپنی اپنی سوچ، وسعت نظر کی بات ہے۔'' آمنہ کا موڈ پھر خراب ہونے لگا۔

''اچھا! تم اتنی بے حال میں مست الست ہو تو چلو!'' یمنیٰ نے ہتھیلی پر مکا مارا ''ایک بات تو بتاؤ۔۔۔ یہ جو یہ یہاں آخری صفحات پر۔'' اس نے ڈائجسٹ کے ورق پلٹے ''آپ کا باورچی خانہ'' نامی سلسلہ تھا۔ ''تم اس میں شرکت کر سکتی ہو؟''

آمنہ نے صفحہ کو بغور دیکھا۔ یمنیٰ چیلنج دیتی طنزیہ نگاہوں سے آمنہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ آمنہ نے لمحہ بھر سوچا۔ یمنیٰ کو یہ لمحہ بھر کی طوالت بھی کھلی۔ وہ اس کے ہار جانے کا اعلان کرنے ہی والی تھی۔

''بالکل کر سکتی ہوں۔'' آمنہ بھرپور اعتماد سے بولی۔

''میں اس کچن کی بات کر رہی ہوں۔'' یمنیٰ نے ہاتھ لہرا کر کچن چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارے ''ہونے والے'' کچن کی نہیں۔''

''میں بھی اسی کچن کی بات کر رہی ہوں۔ میں اس سلسلے میں عنقریب خط لکھوں گی۔'' وہ بے حد پرعزم لہجے میں قطعیت سے گویا ہوئی۔

''شائع ہوگا؟'' گہرے طنز نے یمنیٰ کے لہجے اور چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔

''اوں!'' آمنہ سوچ میں پڑ گئی۔۔۔ یمنیٰ کا چہرہ اور سخت ہو گیا۔

''ہنڈرڈ پرسنٹ شائع ہوگا۔۔۔ شرط لگا لو۔'' آمنہ نے ہتھیلی پھیلائی۔

یمنیٰ متزلزل تھی۔ ''مجھے یقین نہیں۔ ڈائجسٹ میں سب اچھا بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ وہاں دیہاتی کچن کی گنجائش کہاں۔''

''شہری زندگی شاید تیس فیصد ہے اور یہ ہمارا دیہاتی کلچر ستر فیصد۔۔۔ اور یہی ہمارا اصل ہے۔ اب میں تمہیں لکھ کر دکھاؤں گی اور شائع ہوگا۔۔۔ بلکہ تم بھی لکھو۔۔۔ پھر دیکھتے ہیں۔'' آمنہ نے جواباً اسے چیلنج دے دیا۔

''مجھے منظور ہے۔''

❀❀❀

یمنیٰ کو مسلسل احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ وہ جتنا زیادہ پرسکون رہ کر اپنا فیشل مکمل کرنے والی تھی، دماغ اب اس سے ڈبل کھول رہا تھا۔ دراصل اس نے آمنہ اور اپنے لیے ایک

بیوٹی پلان ترتیب دیا تھا، جس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس نے آمنہ سے برتن دھونے کی ڈیوٹی لے لی۔ بالن کی کوئی بھی قسم ہو خواہ لکڑیاں، پاتھیاں، چھٹیاں یا اور کچھ بھی، یہ سب پتیلیوں کو نیچے سے کالا سیاہ کر دیتے ہیں، پھر انہیں دریائی ریت سے خوب رگڑ رگڑ کر مانجھنا پڑتا ہے تو ایسے میں ہاتھوں بالخصوص ناخنوں میں جو کالک بھرتی ہے، وہ پھر مستقل ہی رہ جاتی ہے۔ انگلیوں کے جوڑ سیاہ پڑ جاتے ہیں سو دلہن کے ایسے ہاتھ بہت برے لگتے۔ اس لیے آمنہ کو سب سے پہلے اس ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیا اور دوسرے نمبر پر صحن میں جھاڑو دینے سے کہ پیر خراب ہوں گے اور چہرہ گرد آلود ہوگا۔ وہ فریدہ کے ساتھ جا کر شہر کی سب سے مستند دکان سے ماسک، کریمیں، لوشن اور ایسی دوسری ڈھیروں چیزیں لے آئی تھیں اور بہت ماہرانہ انداز میں روز آمنہ پر اور بعد میں تھوڑی بہت خود پر آزماتی۔ شہباز کے لیے بھی مٹی ملا منہ، کبھی پیلا منہ اور کبھی بدرنگا منہ بڑی حیرانی اور دلچسپی کا باعث تھا۔ ایسے میں بہنیں آنکھیں بند کر لیتیں اور چہرے پر ایک بھی تاثر نہ آنے دیتیں۔

''شہباز اسی وقت دلچسپ سے دلچسپ لطیفے سناتا جو بندے کو اندر تک ہلا دیں ہنسا ہنسا کر۔

اب اس وقت شہباز اسکول جا چکا تھا۔ دادی جی دوائی کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ آمنہ کپڑے دھو رہی تھی۔ گھر میں اور کوئی تھا نہیں۔ پھر اسے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی اسے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ اسے چہرے پر باقاعدہ تپش محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے جھٹکے سے آنکھوں پر دھرے کھیرے اٹھائے۔ نم پلکیں کھلتے ہی سامنے موجود شکل دیکھ کر وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر پہلے حیرت پھر شرمندگی، پھر ناگواری کے تاثرات نے مڈ ماسک کو لکیر لکیر کر دیا۔

''پہلے خیال آیا، سرخ سوٹ میں وہ چہرہ بھی سرخیاں چھلکاتا ہوگا، پھر گلابی رنگ دھیان میں آیا۔ اس کے گال بھی کچھ ایسے ہی ہیں، پھر دھیان سیاہ رنگ پر گیا، وہ کوئلے میں ہیرے کی مانند دمکتی ہوگی۔ بارڈر سے نکلا ہوں تو دروازہ کھولنے تک دنیا کے سارے ہلکے گہرے رنگ آزما کے دیکھ لیے۔ کوئی تمہارے شایانِ شان نہیں لگا، پھر سوچا وہ تو ہر حال میں اچھی لگتی ہے، چلو خیر! میری ایک سوچ کی تو نفی ہوئی کہ تم کبھی بری لگ نہیں سکتیں۔ پہلی نظر پڑنے پر میں نے اپنی چیخ جس طرح روکی ہے، میں جانوں یا میرا اللہ جانے۔'' اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی سہم طاری کر لیا۔

یمنیٰ نے طویل سانس بھری اور اتنے جذبوں بھرے جملوں کے جواب میں اس نے اپنے تاثرات بمشکل روکے۔ ایک گہری سرد نگاہ ڈالتے ہوئے وہ سامنے لگی ٹونٹی پر جھک گئی۔ اس نے نلکے سے دو، تین چلو پانی حلق میں بھی اتار لیا۔ تولیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے اس نے دیکھا، وہ سامنے چارپائی پر ڈھیر کریموں کے نام اور کاغذ پر یمنیٰ اور آمنہ کے ہاتھ سے لکھے طریقہ استعمال اور فائدے و نقصانات پڑھ رہا تھا۔

''تعزیراتِ پاکستان میں ایک دفعہ کا اضافہ یہ بھی ہونا چاہیے، حسینوں کا اقدام قتل کے منصوبے بنانا، یہ سب۔'' اس نے ڈھیر کریموں کی جانب اشارہ کیا۔ ''ان پر بھی دفعہ لگنی چاہیے، کمزور دل بندے ان کے استعمال سے پہلے ہی جان بلب ہوتے ہیں۔ ان کے استعمال کے بعد تو گنجائش ہی نہیں رہتی۔'' اس کے نکھرے چہرے کو اپنی سرخ تھکان زدہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ دل سے مسکرایا۔

"آمنہ۔۔۔آمنہ! ادھر آؤ، تمہارا بھائی آ گیا ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولی اور سامان بیگ میں بھرنے لگی۔

"آمنہ۔۔۔آمنہ! ادھر آؤ، تمہاری بہن نے آدھا کام کرلیا ہے۔ یہ اتنا تو مان گئی ہے کہ میں صرف تمہارا بھائی ہوں۔" اس نے یمنیٰ جتنی اونچی آواز میں اسی کے لہجے میں پکارا۔

"ہیں سچ!" آمنہ جھاگ لگے ہاتھوں کے ساتھ بھاگی آئی۔ اب پتا نہیں اس نے حیرت کا اظہار کس بات پر کیا تھا۔ بھائی کے آنے پر یا یمنیٰ کے بے ساختہ جملے پر۔ وہ اعزاز سے لپٹ گئی، اس کے بالوں پر جھاگ مل دی۔ اعزاز نے اس کے بالوں پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ آمنہ اور اعزاز کی محبت اور دوستی، بہت خوب صورت تھی۔ یمنیٰ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کتنے کمزور ہو گئے ہو۔" آمنہ نے تفکر سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اور کتنے کالے بھی۔" یمنیٰ نے استہزائیہ بھرا ٹکڑا لگایا اور بیگ سمیت اندر بڑھ گئی۔ اعزاز کا بے ساختہ قہقہہ۔۔۔اندر تک سنائی دیا۔

❀❀❀

ابو جی صبح صبح منڈی جا کر اعزاز کی پسند کی تمام چیزیں لے آئے تھے۔ وہ سات ماہ بعد ڈیڑھ ماہ کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس نے اپنی چھٹی بچا بچا کر رکھی تھی کہ آمنہ کی شادی سے کم از کم مہینے پہلے پہنچ جائے اور سب کام سنبھالے۔ یہ اس کی بارڈر پر دوسری مرتبہ کی پوسٹنگ تھی۔

اسے پڑھائی کا بہت شوق تھا، مگر یمنیٰ کی امی کے آخری چار، پانچ سال بیماری کے باعث معاشی لحاظ سے بہت مشکل تھے۔ یمنیٰ کے ابو جی گٹھیا کے مرض کے باعث سردیوں میں بالکل ناکارہ ہو جاتے تھے۔ اکیلی آمدنی ابا جی کی، وہ ابا جی کے ساتھ مل گیا، مگر بجھا بجھا رہتا، یہ اس کے خواب نہیں تھے۔ وہ تو بہت اعلا مقام پر بابو صاحب والی نوکری کرنا چاہتا تھا۔

یمنیٰ کی امی کی وفات کے بعد خود ابا جی نے کہہ دیا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرے، مگر اب اعزاز کے لیے یہ مشکل تھا۔ اس نے یوں ہی شغل شغل میں رینجرز میں درخواست دے دی۔ حوالدار بھرتی ہو گیا۔ نو ماہ ٹریننگ ہوئی اور پہلی پوسٹنگ بارڈر کی تھی، صحرا خشک، بے رنگ، بے دل، مگر اعزاز کو زندگی کا یہ روپ بہت بھایا۔ اس نے آمنہ کو بتایا۔

"شدید ترین گرم لُو کے تھپیڑوں کے درمیان جب آپ اونٹوں پر گشت کرتے ہیں، جب راتوں کو رائفل تھامے اندھیرے میں عقابی نگاہوں سے ہیولے تلاشتے ہیں، ایسے میں دماغ یاد کرواتا ہے تمہارے اس طرح آنکھیں مل مل کر جاگنے کے باعث اٹھارہ کروڑ بے فکر سو رہے ہیں۔ سمجھو لہو کی جگہ بجلی دوڑنے لگتی ہے۔ نس نس بھڑک جاتی ہے۔ اس انتہائی سخت زندگی پر غالب آ جانے والا یہ فخر اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ سب بھول جاتا ہے۔ ہم نگہبان ہیں، ہماری بے خواب آنکھیں کتنی آنکھوں کو خواب دیکھنے پر مائل کرتی ہیں۔ یہ احساس دنیا کے ہر احساس سے خوب صورت ہوتا ہے۔"

اور گھر کے سب افراد کو لگتا ہے کہ اعزاز کے لیے شاید یہی بہترین شعبہ تھا۔ وہ انگوٹھی میں نگینے کی مانند فٹ بیٹھ گیا تھا، مگر جب جب وہ چھٹی پر آتا۔ اس کی حالت دیکھ کر آمنہ پہلے دکھی ہوتی، پھر ہنسے چلی

جاتی۔

"جذبے نے تمہارے دل و دماغ کو سختی بخشی ہے، طاقت دی ہے، مگر اعزاز! مان لو، تمہارا جسم اب تک اس سختی کا عادی نہیں ہوا۔"

وہ اس کی حالت دیکھ کر تاسف کا اظہار کرتی، اعزاز کو طعنہ تیر کی طرح لگتا ہے۔ وہ تڑپ کر رہ جاتا۔

"جذبہ جوان رہنا چاہیے، جذبہ جسم کا محتاج نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت جعفر طیار سیدھا بازو کٹنے پر الٹا استعمال نہ کرتے اور الٹا بازو کٹنے پر تلوار دانتوں میں نہ پکڑ لیتے۔ جذبہ زیادہ اہم ہوتا ہے جسم نہیں۔"

اس کا انتہا مدلل جوش بھرا جواب سن کر سب کے سب ہکا بکا رہ گئے۔ آمنہ کی آنکھیں یکا یک آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے اعزاز کا ہاتھ اپنے گال سے لگایا۔ اباجی اور ابوجی کی آنکھوں میں تفاخر در آیا، اور تو اور یمنیٰ بھی دم بخود تھی۔ دراصل آمنہ کا تجزیہ بظاہر غلط نہیں تھا۔ وہ جب جب چھٹی پر آتا اس کی حالت دیدنی ہوتی۔ رنگ کالا سیاہ، دھوپ سے چہرہ جل جاتا۔ اس کی پوسٹنگ صحرا میں تھی، جہاں موسم کی سختیوں اور دیگر سہولیات میسر نہ ہونے کے باعث خاصی ابتر صورت حال تھی۔ ایسی صورت حال میں وہاں کے پیدائشی رہائش بھی بڑی دقتوں سے زندگی گزارتے تو پھر رینجرز کے یہ جوان جو ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے تھے بڑی مشکلوں سے خود کو ان موسموں کا عادی بناتے۔

شروع شروع میں اعزاز کے لیے بھی بہت مشکل تھی۔ مگر اس نے وہ دو سال بہت ہمت سے گزار دیے کہ یہ عمل نوکری کا حصہ تھا اور پہلی پوسٹنگ بارڈر کی ہی ملا کرتی ہے۔ مگر قسمت خراب تھی یا کیا؟ وہ دو سال پورے کر کے جب ونگ میں واپس لوٹا تو یہاں اس سے غلطی ہوگئی، سزا کے طور پر دوبارہ ایک دوسرے صحرائی بارڈر پر جو پہلے سے زیادہ مشکل اور نا قابل برداشت تھا، بھیج دیا گیا۔

گھر والوں کے لیے یہ جھٹکا زور کا تھا۔ بالخصوص آمنہ کے لیے اور درپردہ یمنیٰ کے لیے، اسے اپنی آنے والی زندگی بالکل تاریک دکھائی دینے لگی۔ دراصل یہ ایک خاموش معاہدہ تھا کہ یمنیٰ کی شادی تایا زاد آمنہ کے بڑے بھائی اعزاز سے ہوگی۔ شروع شروع میں جب یمنیٰ اس حقیقت سے آشنا ہوئی تو نہ اسے خوشی ہوئی نہ ناگواری، مگر وقت کے ساتھ ساتھ مایوسی بڑھتی گئی۔

آمنہ نے اس کے ہاتھ میں پہلے خوابوں کی ریشمی ڈوریاں تھمادیں کہ اعزاز کی ترقی ہوگی، وہ حوالدار سے سب انسپکٹر بنے گا۔ ونگ میں واپس آئے گا تو بیٹ مین ملے گا، اسے تمام سہولیات حاصل ہوں گی۔

یمنیٰ نے ریشمی ڈور کھینچ کر تھان بنا کر خود سے لپیٹ دی۔ اس چادر کا پہلا چھید اس کے سامنے آیا، جب پھپھو سلطان بی بی نے آمنہ کا رشتہ اپنے سسرال میں طے کیا اور اس کی ہونے والی ساس کو بہت خوشی و طمانیت سے بتایا کہ "یمنیٰ کا رشتہ گھر ہی میں طے ہے۔ گھر کی بیٹی گھر ہی میں رہے گی، اعزاز کی تو مختلف جگہ پوسٹنگ ہوتی رہے گی، پھر وہ ہفتہ پندرہ دن بعد آیا کرے گا تو کوئی فکر ہی نہیں۔ آمنہ کے جانے کے بعد پیچھے گھر کا کوئی مسئلہ نہیں، یمنیٰ ہوگی، وہی باپ، بھائی، دادی۔"

یمنیٰ منہ کھولے حیرت سے پھپھو کے جملے سنتی رہی، یہ منصوبہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔

''یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔'' یمنیٰ نے پیشانی مسلی۔ شادی نئی زندگی شروع ہونے کا نام ہے تو میرے لیے یہ کیسی نئی زندگی، یہی گھر، یہ ٹوٹے پھوٹے در و دیوار، یہ اینٹوں کا اونچا نیچا فرش۔

یہی نواڑی پلنگ اور کبھی کبھار نکالے جانے والی چادریں اور کمرے کا آسمانی چونا، یمنیٰ کا حلق خشک ہو گیا۔

اسے اپنے پڑوسیوں کی شادی یاد آئی جو ایسے ہی چاچے تائے کی اولادوں کے بیچ ہوئی تھی۔ اچھا ریشمی جوڑا، تھوڑا بہت سرخی پاؤڈر اور ایک کمرے سے دوسرا کمرا، زندگی شروع ہونے سے پہلے ختم۔ اس کے اندر احتجاج سر اٹھانے لگا، اس نے ساری بھڑاس جا کر آمنہ پر نکالی۔ وہ حیرت زدہ سی سنتی رہی۔

''ایسا نہیں ہو گا یمنیٰ! تم تسلی رکھو، زندگی ہمیشہ آگے بڑھتی ہے، تمہیں تمہاری قسمت کی ہر شے مل کر رہے گی۔''

''مگر اعزاز کے ساتھ نہیں۔'' اس نے بدلحاظی سے آمنہ کی بات کاٹی۔

''تمہیں اعزاز پسند نہیں؟'' آمنہ کی مدھم آواز بوجھل ہو گئی۔

''اعزاز کا کیا سوال، میں نے زندگی کے دس سال بے خبری اور دس سال آنے والے اچھے وقت کی آس میں گزار دیے۔ دادی نے ہر بات پر کہا، اپنے بندے دے کار (شوہر کا گھر) جا کے ارمان پورے کرو۔ میں غریب تو یہی سب دے سکتی ہوں۔ پہلے ہمیں بتایا کہ عورت کی زندگی میں بندے دا کار، ہی سب کچھ ہے۔ وہی منزل مقصود ہے، تو پھر مجھے ایسا بندہ (شوہر) ہی نہیں چاہیے، جب یہیں رہنا ہے، یہی سب کرنا ہے تو پھر دم چھلا، ساتھ کیوں لگاؤں؟''

''تم خود کو خوش نصیب نہیں سمجھتیں یمنیٰ! کہ تم کچھ چھوڑ نا نہیں پڑے گا۔ وہی گھر، باپ، بھائی نگاہوں کے سامنے، ماں سے بڑھ کر محبت دینے والی دادی جی، میرا تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایک شہر سے دوسرا شہر، نئے لوگ، نیا ماحول، الگ مزاج سسرال اور شوہر برا مل گیا تو قصہ ہی ختم۔ بھول جاؤ پچھلوں کو اور ہر لحاظ سے اچھا بھی مل جائے تو تب بھی اتنی دور سے روز، روز کون لڑکی اپنی گرہستی چھوڑ کر آسکتی ہے۔ یہاں دو، دو گھنٹے کے فاصلے پر رہنے والی بیٹیاں آخری لمحوں میں پانی کا گھونٹ پلانے نہیں آسکتیں۔ وہ سرائیکیوں کی بیٹی نسیماں بھول گئیں، بی این جی ہڑتال تھی، وہ دس سواریاں بدلتی جب روتی پیٹتی پہنچی۔ جنازہ گلی میں رکھ کے دو منٹ کو باپ کا منہ دیکھا جنازہ آگے نکل گیا۔ وہ وہیں مٹی میں لوٹنیاں لگاتی رہی۔ بین ڈالتی رہی۔ یمنیٰ! میں نے تو اس وقت دعا کی کہ خدایا! ایسا حال دشمن کو بھی نہ دینا اور تم۔۔۔''

یمنیٰ کے چہرے پر حیرانگی کے ساتھ شرمندگی آرکی، اس نے آمنہ کی باتوں کو گہرائی سے جانچا تو ملال کے رنگ بھی شامل ہو گئے۔ اس نے سچ مچ اس پہلو سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ آمنہ کے متورم چہرے کو دیکھتے ہوئے نظریں جھکا گئی، اس نے حلق تر کرتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''جو باتیں تم نے کہی ہیں، وہ سب درست، مگر منوں! میں بھی تو غلط نہیں۔۔۔'' یمنیٰ کی آواز بھرا

گئی۔"مجھے بھی یہ سب لوگ بہت پیارے ہیں۔
تم سب لوگ۔۔میری زندگی میں اس کے علاوہ اور ہے کیا۔ مجھے ایک پیارا سا خوب صورت گھر، آسائش، تعیش نہیں چاہیے۔ بس ضرورتیں صحیح طرح بغیر رکاوٹ پوری ہو جائیں۔ مجھے اپنی چادر کا اندرازہ ہے۔"اس کی آواز گم ہو گئی۔ آمنہ نے بڑھ کر اسے سینے میں بھینچ لیا۔

❁❁❁

آمنہ ڈھیروں ساگ پھیلائے بیٹھی تھی۔ یمنیٰ برتن دھو کر آئی تو آمنہ کے کانوں سے اعزاز کا فون اور اس میں لگی ہینڈز فری نکال اپنے کان میں ٹھونسی اور دادی کے پیروں کے پاس نیم دراز ہو گئی اور مزے سے گانا سننے لگی۔
"تیرا ہونے لگا ہوں، جب سے ملا ہوں۔"
اعزاز نہا کر باہر نکلا۔ اس نے ٹراؤزر پر نئی سفید بنیان پہن رکھی تھی۔ گیلے بال تولیے سے خشک کیے اور شانوں پر تولیہ پھیلائے آمنہ کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پورا پورا دن باتیں کر کے گزار دیتے تھے، پتا نہیں کون کون سی۔
"اب رنگ ذرا نارمل ہوا ہے۔" آمنہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔
"ہوں، جلن بھی کم ہے۔" اعزاز نے آنکھوں کے پاس گالوں کی ہڈیاں تھپتھپائیں۔
"یہ جس طرح کا ساگ تم بنا رہی ہو، اس کا سارا آئرن تو ختم ہو جائے گا پک پک کے۔"
"تمہارے لیے اسپیشل پالک بنائی ہے۔ ایک پیاز گلابی کر کے لہسن، ادرک ڈالا، دو ٹماٹر پھر دھلی ہوئی پالک کاٹ کر ہانڈی کے اندر اور ڈھکن بند۔ بس پانچ منٹ رکو۔ روٹی یمنیٰ ڈال دیتی ہے۔" آمنہ نے تفصیلی تسلی کرائی۔
"ہاں تو ٹھیک ہے نا، ذائقہ بھلے اچھا نہیں لگے گا، مگر آئرن بہت زیادہ ملے گا۔ تم لوگ بھی ہفتے میں دو چار مرتبہ ایسا سالن کھا لیا کرو تو کبھی خون کی کمی نہ ہو۔"
"ہمارے ملک میں عورتوں میں خون ہوتا ہی کہاں ہے۔ وہ تو سارا مرد چوس جاتے ہیں۔" آمنہ نے قہقہہ لگایا۔ "پہلے ابا کا ڈر، پھر بھائی کا، پھر بندے کا اور آخر میں جوان پتر بھی آنکھیں دکھاتے ہیں۔"
"ہمارے گھر میں ایسا کون سا مرد ہے؟ بولو!" اعزاز اتنے غلط الزام پر بھڑک ہی تو گیا۔
آمنہ کی ہنسی بے قابو ہو گئی، دادی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ پیر لمبے کرنے لگیں تو یمنیٰ پائنتی پر تھی۔
"نا! تو ادھر لمی پے گئی ہے (لیٹ گئی ہے) ادھر ڈھیروں ساگ کون بنوائے گا۔ اٹھ بہن کے ساتھ لگ جا۔"
یمنیٰ تک آواز ہی نہ پہنچی۔ وہ اگلے گانے پر جھوم رہی تھی۔
"وے سب توں سوہنیا۔"
اعزاز نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا، دونوں پیروں کی انگلیاں تھرک رہی تھیں، سر بھی ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ آ رکی۔
اعزاز نے اپنے تئیں آمنہ سے نگاہیں بچا کر اس دلدار چہرے کو آنکھوں کے رستے دل میں جذب

کیا۔ مگر آمنہ کو سب خبر تھی۔ ایک اقرار کی انتہا پر تھا اور دوسرا انکار کی، ان کے درمیان پُل آمنہ ہی کو بننا پڑتا۔ دادی جی نے دوسری اور تیسری بار یمنیٰ کو کوسا اور چوتھی بار اپنا پیر اس کے پیر پر زور سے دے مارا۔

''ہائے۔۔۔کون کون؟'' یمنیٰ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

''اب تو اندھی کے ساتھ بوڑی (بہری) بھی ہوگئی ہے۔ نہ ادب، نہ لحاظ، میں نے کتنی آوازیں ماریں۔'' دادی جی کا غصہ۔

''لیکن میں نے تو آواز ہی نہیں سنی۔'' یمنیٰ نے حیرت سے سب کو دیکھا۔

''چل ساگ بنوا لے، نیستی کڑی!''

یمنیٰ چپل پیروں میں پھنساتی چبوترے پر چڑھ آئی۔ ''میں نے آواز ہی نہیں سنی۔''

''یہی تو دکھ ہے، تم آواز سنتی ہی نہیں۔'' جواب اعزاز نے دیا۔ وہ بہت میٹھی نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ اس نے فوراً ان سنی کر دی۔

''لاؤ ابھی کتنا باقی ہے۔'' اس نے پتے الگ کرنے شروع کیے۔ اعزاز سرسوں کے ساگ میں سے پھول اکٹھے کرنے لگا۔

آمنہ اٹھ کر آگ جلانے لگی۔

اعزاز نے پیلے چھوٹے چھوٹے پھولوں کا بہت مختصر سا گلدستہ بنا لیا اور یمنیٰ کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے، اسے نہیں کاٹتے ساگ میں۔۔۔'' یمنیٰ نے جھنجھلا کر کہا۔

اعزاز نے ایک نظر پھولوں پر اور دوسری اس کے چہرے پر ڈالی۔ ''یہ محبت ہے اور بہت زیادہ ہے۔'' اعزاز کی آنکھوں میں محبت کا جہان آباد تھا۔

اس کا پھولوں والا ہاتھ ابھی بھی آگے تھا۔ یمنیٰ کی پلکیں لرز گئیں۔ وہ قطعاً نہیں لینا چاہتی تھی۔ مگر مستقل سرخ جذبے چھلکاتی آنکھیں دیکھ کر غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ اعزاز نے ایک پل رک کر اس کا چہرہ جانچا، پھر سرعت سے نیچے اتر گیا۔ وہ چارپائی پر ٹکا موبائل اٹھا کر چارجنگ پر لگانے لگا۔ آمنہ روٹی لیے آ گئی۔

''یمنیٰ کی بچی! تمہیں ساگ چننے کو کہا تھا، تم پھول چننے لگیں۔'' اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پھولوں کی سمت اشارہ کیا۔

''یہ محبت ہے اور بہت زیادہ ہے۔'' یمنیٰ اتنا دھیمی بولی کہ آمنہ کے خاک پلے نہ پڑا۔ یمنیٰ نے دزدیدہ نگاہوں سے اعزاز کو دیکھا، وہ فون پر نمبر ملا رہا تھا۔ گیلے بال ماتھے پر سوکھ چکے تھے۔ تولیہ کندھوں پر۔۔۔ یمنیٰ کے ہاتھوں میں پھولوں کا گچھا تھا۔ ہاتھ سینے سے لگا ہوا تھا اور پھول ٹھوڑی کو چھو رہے تھے۔ اس کی سماعتوں پر ایک جملہ مسلسل دستک دے رہا تھا۔

❀❀❀

آمنہ اور اعزاز بہت [illegible] سے کھچڑی پکا رہے تھے۔ کبھی دونوں چھت پر دھیما، مگر زور و شور سے مگن کسی موضوع پر چھڑے ہوتے، اعزاز فون پر نمبر ملاتا اور نہ جانے کہاں کہاں باتیں کرتا۔ پھر ایسی ہی ایک نشست میں تایا ابا اور ابو جی شامل ہوئے۔ سلطان بی بی پھپھو سے بھی ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ یمنیٰ

کے کان کھڑے تو ہوئے، مگر پھر اس نے اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھتے ہوئے سارے تجسس پر مٹی ڈال دی۔

اعزاز کے آجانے کے بعد یمنیٰ اکیلے پن کا شکار ہو جاتی تھی کہ آمنہ کی ساری توجہ اس کی جانب مبذول ہو جاتی تھی۔

اس دن آمنہ کے ہاتھوں میں پھرتی تھی۔ اس نے ساگ بنا کر دیسی گھی کا بگھار لگایا۔ مرغی کا گوشت بھونا، ساتھ الائچی کے تڑکے والا سویوں کا زردہ، یمنیٰ خود ساختہ غصے و ناراضی کا شکار تھی کہ آمنہ منہ سے کچھ پھوٹتی کیوں نہیں۔ اس کے ہلکے سے حیرت کے اظہار پر آمنہ نے بڑی طمانیت سے کہا۔

''تم بس دیکھتی جاؤ۔'' سو اب دیکھتی جا رہی تھی۔

اعزاز بہت پر جوش سا اندر آیا، ساتھ قاری صاحب اور ایک بڑے پاک باز چہرے والا نوجوان تھا۔ ہاتھ میں کچھ کتابیں، یمنیٰ کے ہاتھ سے ٹماٹر زمین پر گر کے اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔

''کہیں یہ لوگ میرا نکاح تو نہیں پڑھا رہے اعزاز کے ساتھ؟'' اس کے دل نے زور، زور سے دھڑکنا شروع کیا۔

''میری شادی بس سادگی سے ہوگی، مگر ایسے۔۔۔'' اس کے حلق میں گولا اٹکا۔ اعزاز کمرے سے نکلا تو وہ وہیں خالی چنگیر لیے مجسمہ بنی کھڑی تھی۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' اعزاز نے انگلیوں سے اس کا سر ہلایا۔

وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ ابا جی کی آواز پر اس نے گھوم کر دیکھا۔

ابو جی کے ساتھ قدم سے قدم ملائے، تایا یعقوب تھے۔ دادی جی کے سوتیلے بیٹے، اسے سب سمجھ آگیا۔ وہ اپنے خیال پر شرمندہ ہوئی اور بڑی ہلکی پھلکی ہو کر پیار لینے تایا جی کے سامنے جا پہنچی۔

''جیتی رہ، جیتی رہ! اوئے تو وڈی ساری ہوگئی۔'' انہوں نے بڑی محبت سے دونوں ہاتھوں سے جیسے اس کی مانگ سنواری۔

''اور تو اتنی لمبی ہوگئی اور اتنی ہی پتلی۔ اوئے کوئی دودھ لسی، کوئی دیسی گھی کے پراٹھے۔''

اب وہ آمنہ کے دبلے پتلے سراپے کو دیکھ رہے تھے۔ آمنہ نے سر آگے کر دیا۔ انہوں نے اس کے بھی بال سنوار دیے۔

''آئیں تایا جی! آپ اندر چلیں۔'' اعزاز دادی جی کے کمرے کی سمت ان کی رہنمائی کرنے لگا۔

''تو اتنے دنوں سے تم دونوں یہ کر رہے تھے؟'' وہ آمنہ کی سمت گھومی۔

''ہاں تو۔۔۔'' آمنہ نے چائے کا پانی رکھا۔

''مگر کیا فائدہ۔۔۔ کیا تایا یعقوب دستبردار ہو جائیں گے؟'' اس نے چبا چبا کر کہا، وہ لڑاکا انداز میں کمر پہ ہاتھ ٹکائے کھڑی تھی۔

''نہیں، دادی جی انہیں حصہ دے دیں گی۔'' آمنہ نے گویا دھماکا کیا تھا۔ یمنیٰ اچھل پڑی۔

''وہ تو کہتی تھیں میرے مرنے پر ہی ایسا ہوگا۔''

''تو تمہارے خیال میں دادی جی نے مزید کتنا جی لینا ہے۔ اعزاز نے یہی سمجھایا ہے۔ ان کی خوشی

کی خاطر مقدمے پر پیسے خرچ ہوئے اور جب وہ دادی جی کے پہلے بیٹے ہیں۔ اسی گھر میں پیدا ہوئے ہیں تو ان کا شرعی و قانونی حق ہے۔ دادی جی کی ضد فضول ہے اور یہ اتنا بڑا پلاٹ مردہ جسم بنتا جا رہا ہے۔ تایا جی مقدمہ واپس لیں گے۔ دادی ان کا شرعی حق دیں گی، قاری صاحب کے ساتھ ان کا بیٹا ہے، ایک اسلامی قانون بتائیں گے، دوسرے پاکستان کا قانون، ابھی فیصلہ ہوگا۔"

آمنہ کا ہوم ورک پورا تھا۔

"وہ جو دادی جی کہتی ہیں کہ یعقوب کے پاس اتنی جائیداد ہے جانور، زمین، گھر بار۔ ماں کی طرف سے ملا ہوا، اور دادی جی بیوہ اور کمزور مالی حالت۔"

"وراثت میں یہ سب نہیں ہوتا۔ یہ تو ان کے باپ کا ترکہ ہے نا۔" آمنہ چائے کپوں میں بھرنے لگی۔

"تو کیا ہم حصہ لگا کر انہیں حساب سے پیسے دیں گے؟" یمنیٰ کی حیرت دو چند ہوگئی۔

"نہیں! ہم یہ پلاٹ بیچ دیں گے۔" اس نے جیسے یمنیٰ کے سر پر بم پھوڑا۔

"کیا۔۔۔؟ دادی کا پتا ہے تمہیں۔۔۔؟"

اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اس کی صورت تکنے لگی۔

"دادی مان گئی ہیں۔ پھپھو اپنا حصہ لینا نہیں چاہتیں مگر تایا جی نے کہا، وہ بہن ہے۔ اس کے آگے تین بیٹیاں ہیں۔ آگے زمانہ مشکل ہے، حق چھوڑنا فرائض چھوڑنے کی راہ پر لے آتا ہے۔ یہ گھر اس حساب سے بکے گا کہ تایا یعقوب اور پھپھو کو پیسے مل جائیں گے اور ہم لوگ مل کر یہاں رہیں گے۔ اگر ساتھ والے پڑوسی جو اتنے سال سے احاطہ خریدنا چاہتے ہیں، خرید لیں آدھا پلاٹ۔۔۔ ابھی تو بات نہیں کی اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سارا پلاٹ بکے گا اور اعزاز کہتا ہے پھر ہم مین شہر میں بھلے تھوڑا چھوٹا، مگر اچھا گھر لیں گے۔"

آمنہ کے چہرے پر مستقبل کا بہت خوب صورت خواب دکھائی دے رہا تھا۔

وہ منہ کھولے سب سن رہی تھی۔

"منہ بند کرو۔۔۔ پاگل لگ رہی ہو۔۔۔ اعزاز۔۔۔ اعزاز بھائی! چائے لے جائیں۔" وہ اٹھ گئی، یمنیٰ کا منہ ابھی تک نیم وا تھا۔

❁❁❁

شام تک سب طے ہوگیا، ساری منہ زبانی کارروائی مکمل۔ تایا یعقوب اللہ حافظ کہہ کر کمرے سے باہر آگئے۔ یہاں آمنہ، یمنیٰ اور شہباز بیٹھے بھنے چنے کھا رہے تھے۔ وہ دوبارہ چارپائی پر ٹک گئے۔ دادی جی دل گرفتہ اور ملول دکھائی دیتی تھیں۔ وہ دل سے یہ چاہتی تھیں کہ یعقوب اپنا حصہ چھوڑ دیں مگر وہ باپ کا ترکہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دادی جی روایتی سوتیلی ماں نہیں بنی تھیں کہ یعقوب زیادہ تر اپنے ننھیال رہا اور جب کبھی ملنے بھی آیا تو گھڑی دو گھڑی کے مہمان کی طرح۔۔۔ سو وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی تھیں کہ یہ پلاٹ ان کا اور ان کی آل اولاد کا تھا۔

آج اعزاز کی بدولت یہ ایک بالکل ناممکن کام ہوگیا تھا۔ اس نے بتایا۔

"آپ کے گزر جانے پر عدالت خود فیصلہ دے دے گی۔ قبضہ بھی دلوائے گی۔ ابا جی اکیلے کیسے یہ سب دیکھیں گے۔ ابو جی میں اتنی ہمت نہیں۔ وہ بیمار بندے، میری پوسٹنگ نہ جانے کہاں ہو۔ اعجاز دور کالج میں، شہباز چھوٹا۔۔۔ اکیلی یمنیٰ۔ گھر میں عدالت پولیس بھیجے گی۔" اس نے بڑا ڈراؤنا منظر پیش کیا۔

"اور دادی! آپ سچ کہیں تو وہ حق دار ہیں۔ ان کے باپ کی زمین ہے یہ۔۔۔ اور آپ کو بتاؤں، یہ تو آپ کے سامنے کا بیٹا ہے۔ اگر آج کہیں سے کوئی دوسرا دعوے دار آئے کہ جی میں میاں عبدالکریم کا بیٹا ہوں، بیٹی ہوں اور یہ ثابت کر دے تو وہ بھی حق دار ہوگا اور شریعت اسے حق دے گی۔"

پھر وہ مولوی صاحب اور ان کے وکیل بیٹے کو لایا۔ مولوی صاحب نے وراثتی تقسیم کے ایسے ایسے مسائل بیان کیے کہ دادی جی کو لگا ان کا حساب کتاب قبر میں جانے سے پہلے شروع ہوا چاہتا ہے۔

❁❁❁

گھر بھر میں رونق ہی رونق تھی۔ خوشبو، زرق برق کپڑے، مہمان ہنسی خوشی، طمانیت۔ اعجاز لاہور سے آ گیا تھا اور رواج کے مطابق کل شہباز کے ساتھ جا کر پھپھو کو لے آیا تھا۔ ان کے آنے ہی سے اصل رونق آئی تھی۔ اتنے دنوں سے شادی کے حوالے سے کام ہو رہے تھے مگر اب گھر واقعی شادی والا گھر لگ رہا تھا۔

صبح جہیز کا سامان جانا تھا۔ یمنیٰ نے اپنی ذاتی چھوٹی پیٹی کھولی تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سب کچھ مکمل ہو گیا تھا۔ ہر چیز جو ضروری تھی، آ گئی تھی۔ شیشے کے جگ گلاس جن پر گولڈن پھول تھے۔ شیشے کا آئس کریم اور فروٹ سیٹ، سوپ سیٹ، فریدہ کے بھائی سے بہاولپور سے منگوایا جانے والا گرے نان اسٹک پتیلیوں کا سیٹ، بہت خوب صورت گل دانوں کی جوڑی جن کے پھول اصلی لگتے تھے۔ ٹشو بکس اور ڈسٹ بن سیاہ اور براؤن، رنگین بیڈ شیٹ جنہیں بنانے میں یمنیٰ ماہر تھی۔ ایک بہت پیارا سلک کا سیاہ اور سرخ سوٹ جو بتیس سو کا بہاولپور ہی سے آیا تھا۔ سب سے نیچے جیولری بکس میں آرٹی فیشل جیولری کا سیٹ تھا۔ وہ کہیں سے بھی آرٹی فیشل نہ لگتا تھا۔ نازک گلوبند، چھوٹی چھوٹی جھمکیاں جن کی کٹوریوں پر سرخ نگ لگے تھے، دو خوب صورت چوڑیاں۔۔۔

آمنہ سحر زدہ ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ سب وہ چیزیں تھیں جنہیں آمنہ نے اپنی تمام تر قناعت پسندی، صبر و شکر والی فطرت کے باوجود دکانوں پر رک رک کر بار ہا دیکھا تھا۔ جگ گلاس کا سیٹ اس نے پانچ بار قیمت پوچھ کر چھوڑا تھا۔ "سوپ سیٹ بہت پیارا ہے، مگر ہم تو سوپ بناتے نہیں۔"

"تمہیں پسند ہے تو تمہارے جہیز میں رکھ دیں گے۔" یمنیٰ نے تسلی دی تھی۔

"ارے چھوڑو! میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔" آمنہ نے یمنیٰ کا بازو پکڑ کر اسے دکان سے باہر دھکیلا تھا۔

"جب برتن ہوں گے تو سوپ بھی بنانے کو دل چاہے گا، ہم تو یہ لیں گے بھائی یہ کتنے کا ہے؟"

یمنیٰ آمنہ سے بازو چھڑا کر دوکان دار کی سمت گھومی۔

"پانچ ہزار کا۔"

"کیا؟" یمنیٰ لڑکھڑا گئی۔۔۔ پھر اس نے باقاعدہ ہاتھ رکھ کے منہ بند کیا۔
اور آج وہی سوپ سیٹ سامنے تھا۔ لشکارے مارتی چیزیں جن کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ آمنہ نے کسی معمول کی طرح ہاتھ بڑھا کر سوپ کا پیالا اور چمچ پکڑ لیا۔ اس پر انگلیاں پھیریں۔ اگلے پل وہ یمنیٰ سے لپٹی پھوٹ کر رو رہی تھی۔
"تم۔۔۔ تم۔۔۔ نے۔۔۔ اتنی مہنگی چیزیں، تم نے۔۔۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پہلے دادی جی کچھ سمجھیں نہیں۔ پھر ان کی بوڑھی آنکھوں سے بھی قطرے بہنے لگے۔
"تھوڑے آنسو بچاؤ۔ رخصتی کے وقت رونا" وے بابلا ہائے!" اس نے ہو بہو نقل اتاری۔
پھپھو نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر چپت رسید کی۔
"تم بڑی گھنی ہو۔" پھپھو نے احتیاط سے گل دان ڈبّے میں رکھے۔
"گھنی نہیں، چالاک مکار۔۔۔ یہ سب میں نے اس لیے کیا کہ کل کو تم میرے لیے اس جیسا بلکہ اس سے بڑھ کر کرو۔" اس نے اپنے بارے میں انکشاف کیا۔
"تم۔۔۔ تم۔۔۔" آمنہ ایک بار پھر زور و شور سے رونے لگی۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔
"ہائے اللہ! یہ تم بار بار جھپّیاں (گلے ملنا) کیوں ڈال رہی ہو۔ ارے ہٹو! میرا دم نکل گیا۔" یمنیٰ چلائی۔ خود کو مشکل سے چھڑا کر دادی جی کے پلنگ پر ڈھے گئی۔
"اللہ تجھے اس سے بھی بڑھ کر دے گا۔ یاد رکھنا۔۔۔" دادی جی نے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔
یمنیٰ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ آمنہ اس کے لیے کیا تھی۔ وہ الفاظ میں نہیں بتا سکتی تھی اور کاش وہ۔۔۔ وہ سب کر سکتی جو وہ سوچتی تھی۔ اس کی تو اتنی ہی بساط تھی بس۔

❀❀❀

صبح بڑی گہما گہمی تھی۔ آج آمنہ کا سامان جانا تھا۔ ایک بڑا بکسا اور بیگ چھوڑ باقی سامان کے لیے لڑکے والے آ گئے تھے۔
"دادی جی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں پونچھتیں، پھر آمنہ کو لپٹا لپٹا کر روتیں۔ "دیکھ دھیے! تیری ماں اللہ بخشے ہوتی تو نہ جانے کیا کچھ کرتی پر میری تو اتنی ہی اوقات، سمجھ بوجھ۔۔۔ کوئی شکوہ ہو، کوئی ناراضی تو اپنی بوڑھی دادی کو معافی دینا۔" دادی جی نے آمنہ کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔
آمنہ کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔ "توبہ توبہ دادی جی! کیوں میری آخرت خراب کر رہی ہیں۔" اس نے بندھے ہاتھوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پے در پے بوسے دیے۔ یمنیٰ نے پیچھے سے آ کر دادی جی کو جکڑ لیا۔ شانوں سے گردن نکال کر جھریوں بھرے گالوں پر بوسہ دیا۔

❀❀❀

"ہم سب نے کوشش کر لی ہے۔ وہ اٹھتے ہی نہیں۔" حرا اور نمرہ نے یمنیٰ کے سامنے آ کر ہار مان لی۔
"تم یہ پانی ان پر ڈال دو۔" یمنیٰ نے بھرا جگ حرا کی جانب بڑھایا۔

''میں؟ نہیں۔۔۔مار یں گے وہ۔''
''تو آپ خود ڈال کر آئیں نا۔۔۔امی ہمارے کپڑے نکال رہی ہیں اور ہماری جیولری بھی۔ ہم نے وہ دیکھنی ہے یمنیٰ باجی۔۔۔'' دونوں نے اپنا مسئلہ بیان کیا اور بھاگ گئیں۔ چاروناچار یمنیٰ کو اٹھنا پڑا۔
''اتنی دیر سے آوازیں دے رہے ہیں سب، اٹھتے کیوں نہیں۔۔۔منڈی جانا ہے۔ ابو جی انتظار کر رہے ہیں۔'' اوندھے لیٹے اعزاز نے کہنیوں کی جھری سے یمنیٰ کو دیکھا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔
''میں اب جا کر ابو جی کو بھیجوں گی۔۔۔تم تو سنتے ہی نہیں۔''
''مجھے گالیاں دینی بھی آتی ہیں۔'' وہ سابقہ انداز میں بولی۔
''تمہارے منہ سے تو وہ بھی پھول بن کر جھڑیں گی۔'' وہ بہت شوق سے اچھل کر بیٹھ گیا۔
''دو۔۔۔دونا۔''
یمنیٰ جبڑے بھینچے چپ چاپ اعزاز کا چہرہ دیکھتی رہی۔
''بلکہ وہ جورات کو ٹپے گا رہی تھیں۔ وہ کون سا ''نی ایک پھُل موتیا دا مار کے جگا سوہنیے۔'' اس کا مطلب ہے تمہارے قول و فعل میں تضاد ہے۔'' وہ بڑی دلچسپی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔
''پھول ماروں تو جاگو گے؟'' یمنیٰ نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔
''بالکل! کیا تم میرے لیے ایسا کرو گی؟'' اعزاز نے للچائی ہوئی نگاہ سے اس کا چہرہ دیکھا۔
''کیوں نہیں۔ تم آنکھیں بند کر کے لیٹو، میں ابھی آئی۔۔۔''
وہ مڑ گئی۔ اعزاز نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دروازے کو دیکھا جہاں چند لمحے پہلے روشنی ہی روشنی تھی۔
اس نے موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ باہر ہوتا شور بتا رہا تھا کہ سب جاگ گئے ہیں۔
اعزاز کے موبائل پر دوست کا میسج تھا۔ وہ پڑھنے میں مگن ہوا جب دھڑ دھڑام اس پر جیسے تاک کر پتھر پھینکے گئے۔ وہ بری طرح چونک کر کھڑا ہو گیا۔ سفید کھلے کھلے۔۔۔گوبھی کے چھوٹے بڑے چار پانچ پھول اس کے سر اور شانوں سے ٹکرانے کے بعد زمین پر اور چارپائی پر پڑے تھے۔ یمنیٰ سینے پر ہاتھ لپیٹے بڑی طمانیت بھری مسکان سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''اب تو کوئی حسرت نہیں رہی۔ اب تو اٹھ جاؤ گے نا۔''
''تم۔۔۔تمہیں تو میں۔۔۔'' وہ جارحانہ عزائم لیے اس کی جانب لپکا، مگر وہ ہوشیار تھی۔

ولیمہ بارات کے دو دن بعد رکھا گیا تھا کہ آمنہ کو بیاہ کے لانے کے اگلے دن اس کی نند کی مہندی ہوئی کہ بہن نے بارات میں شرکت کرنی تھی۔
یہاں کا ایک ناقابل فہم رواج یہ بھی تھا کہ بارات کے ساتھ درجنوں لوگ آتے، لیکن لڑکے کی ماں نہیں آتی، مگر دادی جی نے بصد اصرار اکلوتے بیٹے کی بارات کے ساتھ ماں کو آنے کی تلقین کی تھی۔
دوسرا رواج یہ تھا کہ ولیمہ کے دن لڑکی والے نہیں جایا کرتے تھے۔ صرف وہی دو چار افراد جو کلاوہ

لے کر آتے، وہی شرکت کرتے سو یمنیٰ، اعجاز، اعزاز، شہباز اور ابا جی آئے تھے، یمنیٰ نے جب پہلے آمنہ کے گھر کو دیکھا تھا تب بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی، مگر اس بار تو شان ہی جدا تھی۔ گھر کو مزید ڈیکوریٹ کیا گیا تھا، خصوصاً اوپری پورشن نیچے بنے دو بڑے کمروں کے اوپر ایک کمرا بنایا گیا تھا اور اٹیچ باتھ روم، سفید اور گرے ٹائلز اور فرنیچر جو اعزاز نے یہاں آ کر پھوپھا جان کے ساتھ پسند کیا تھا۔ سیاہی مائل براؤن ڈبل بیڈ تھری ڈور الماری، تھری پارٹ ڈی ڈیوائیڈر، ڈریسنگ ٹیبل، میرون اور ڈارک براؤن ویلوٹ کے صوفہ سیٹ کو دیکھ کر تو یمنیٰ کی آنکھیں خیرہ ہی ہو گئیں۔ یہ تو اس نے صرف ڈراموں میں دیکھ رکھے تھے۔

یمنیٰ، آمنہ کے کمرے میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی کہ دونوں نند بھاوج بیوٹی پارلر تیار ہونے گئی تھیں۔ یمنیٰ رشک آمیز انداز میں ہر شے کو سراہ رہی تھی جب دلہنوں کے آنے کا غلغلہ مچا۔ آمنہ کی نند سرخ شرارے اور آمنہ گہرے میرون شرارے میں بے پناہ حسین لگ رہی تھیں۔ یمنیٰ کے گلے لگ کر وہ زور و شور سے رو دی۔

''اتنی بری طرح رو رہی ہو۔ سب ٹھیک ہے نا؟'' یمنیٰ نے خدشات میں گھر کے پوچھا۔

''ہاں! سب ٹھیک ہے۔ میں ترس گئی تمہاری شکل دیکھنے کے لیے سب اتنا یاد آ رہے تھے۔ دو دن اتنی مشکل سے کاٹے ہیں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ یمنیٰ ہنس دی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔ دلہن شرارے میں ہی اچھی لگتی ہے۔'' یمنیٰ کے لہجے میں ستائش ہی ستائش تھی۔

جب ہی عورتوں کا گروپ دلہن دیکھنے کے لیے اندر آ گیا، یمنیٰ ذرا دور کھسک گئی۔

واپسی کے لیے دو کاریں کرائے پر لی گئی تھیں۔ ایک میں ڈرائیور، ابا جی اور لڑکے تھے۔ دوسرے میں پھپھو، آمنہ، یمنیٰ اور دولہا صاحب۔ اعزاز نے بیک ویو مرر یمنیٰ پر سیٹ کر رکھا تھا۔ وہ اتنے لمبے سفر سے تھکی ماندی آنکھیں موندے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ یک دم شدید احساس ہوا کوئی اسے گھور رہا ہے۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی تو اس نے سامنے دیکھا۔ اعزاز کی بولتی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ جیسے اس کے ایک ایک نقش کو آنکھوں کے رستے دل میں اتار رہا تھا۔ اس نے اسے گھورا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نامعلوم نتائج کی دھمکیاں دیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے باقاعدہ جتا کر آئینہ مزید سیٹ کیا۔ یمنیٰ بل کھا کے رہ گئی۔ اعزاز نے وکٹری کا نشان دکھا کر اس کے آج کے روپ کو سراہا۔ ہلکے اور گہرے نیلے امتزاج کا سوٹ وہ شہر سے خرید کر لایا تھا۔ یہی کام رنگ کے فرق (سبز اور گلابی) آمنہ کے لیے بھی تھا۔ تھکا ماندہ حسن، کاجل آنکھوں سے بہہ نکلا تھا، صبح کے سنورے بال اب لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف میں بکھرے پڑے تھے۔ دوپٹا گلے سے لپٹا تھا اور سیاہ چادر سر سے گر کر شانوں پر ٹکی تھی۔ یمنیٰ نے دانت بھینچ کر چادر سر پر ٹھہرائی۔

نگاہوں میں شوق کا جہان آباد کیے مسلسل دیکھتا شخص۔ قصداً کوششوں سے دل کو لاتعلقی کی راہ پر لگایا تھا، وہ بے قابو ہونے لگا، وہ تو ہمیشہ سے بہت سنجیدہ مصروف بندہ تھا، مگر یہ کبھی کبھار کی شوخی۔ یمنیٰ کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔

اس طرح گاڑی میں یہ پہلا سفر تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح سب کی موجودگی میں وہ اسے تنگ کرے گا۔ یمنیٰ نے چادر دائیں گال سے گزار کر دادی جی کی طرح دانتوں میں پکڑی۔ اعزاز ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ یمنیٰ نے اکلوتی آنکھ سے اسے بغور دیکھا۔ سوا ماہ کی چھٹی گزارنے کے بعد اس کی رنگت نارمل ہوگئی تھی اور صحت بھی بہتر ہوگئی تھی۔ گالوں کی ہڈیوں پر، جو ابھری ہوئی تھیں، اب گوشت چڑھ گیا تھا۔ ماتھے پر پڑے بال ہوا سے ہل رہے تھے۔ اس کے مضبوط ہاتھ مشاقی سے اسٹیئرنگ کو گھما رہے تھے۔

"اتنا تو آمنہ ٹھیک کہتی ہے۔ اس کا بھائی لاکھوں میں نہ سہی، ہزاروں میں ایک تو ہے ہی۔" اس نے بے خیالی میں تسلیم کیا۔

اپنے محلے کا موڑ مڑنے سے پہلے قریبی گھر کا بچہ اپنی ٹرائی سائیکل پر سامنے آ گیا۔ اسے بچانے کی خاطر ان کی گاڑی زوردار چکر کھا گئی، اعزاز کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ ذراسی غلطی بچے کے لیے جان لیوا تھی۔ پھپھو اور آمنہ ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔ اعزاز نے رومال سے ماتھا اور چہرہ پونچھا۔

"ایکسیڈنٹ بچا کر رکھو۔ سال بعد ونگ میں آنے کے بعد کرنا تاکہ دو سال مزید پکے ہوں۔" یمنیٰ نے سارے سفر کا بدلہ لے لیا۔

عظیم بھائی جناتی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ پھپھو نے زیرِ لب استغفراللہ پڑھی۔ آمنہ نے اس کے بازو میں چٹکی کاٹی۔

اعزاز نے آئینہ میں اس کا چہرہ دیکھا، وہ بہت گہری نگاہ سے جیسے اسے اندر تک پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یمنیٰ نے نظریں پھیرلیں۔ گھر آنے پر گاڑی سے نکلنے پر یمنیٰ کو دفعتاً احساس ہوا، اعزاز خطرناک حد تک سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ گہری سوچ کی لکیریں ماتھے پر نمایاں تھیں۔ وہ لب بھینچے بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

❖❖❖

آج بہت سرد رات تھی۔ ابو جی گٹھیا کے درد کے باعث تقریباً مفلوج ہو کر رضائی میں شام ہی سے گھس گئے تھے۔ دادی جی پر کھانسی کا شدید دورہ تھا۔ شہباز ابا جی کے ساتھ ٹی وی پر خبریں سن رہا تھا۔ یمنیٰ کچن چبوترے پر لکڑیوں کی آگ جلائے، برتن دھونے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی۔ آمنہ دس دن رہ جانے کے بعد کل ہی واپس لوٹی تھی۔

اعجاز تو شادی کے پانچویں دن ہی چلا گیا تھا۔ کل سے ایک روٹین لائف شروع ہوتی تھی۔ یمنیٰ کچھ اداس تھی۔ آج اعزاز بھی جانے والا تھا۔ سامنے چارپائی پر اس کے بیگ دھرے تھے۔ سب گھر والے سرِ شام ہی کھانا کھا چکے تھے۔ اعزاز کسی کام سے گیا تھا۔ یمنیٰ اس کے لیے روٹی ڈال کر فارغ ہوئی تھی۔ اس نے گاجر، مٹر، آلو کا سالن کٹوری میں نکالا۔ ساتھ دیسی گھی لگی گرم روٹیاں تھیں۔ اعزاز چوکی گھسیٹ کر چولہے کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ یمنیٰ نے وہیں رخ پھیر کے برتن دھو لیے۔

دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار اس دن کے جملے نے اٹھا دی تھی اور اب وہ دیوار پروان چڑھ کر اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے بھی گئے۔ بس ایک مکمل لاتعلقی

اور خاموشی۔ اعزاز خاموشی اور رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ پیلے بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔
یمنیٰ نے نئی لکڑی ڈال کر چائے کا برتن رکھا۔ دو انڈے بھی دھو کر پانی میں ڈال دیے۔ انڈے، چائے ساتھ ساتھ تیار۔۔۔
یمنیٰ آگ پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ شعلوں کا کھیل، رنگ ہی رنگ، نیلے، پیلے رنگ۔۔۔ جلتی لکڑی کی خوشبو میں قہوہ کی خوشبو اور رات کی ٹھنڈک کی مہک۔ اعزاز روٹی کھا چکا تھا۔ وہ شعلوں کا رقص دیکھنے لگا۔ اس کی خاموشی یمنیٰ کو بے چین کر رہی تھی۔ اس نے تو بس اس دن تپانے کو جملہ کہہ دیا تھا اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا ردِعمل ظاہر کرے گا۔
''منوں۔۔۔!'' یمنیٰ چونک کر اعزاز کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ شعلوں ہی کو دیکھ رہا تھا۔ یمنیٰ کو شک ہوا کہ کیا اسے وہم ہوا ہے یا واقعی اسے پکارا ہے۔
''کیا وہ اس دن کا تمہارا جملہ، تمہارے دل کی خواہش تھا؟ کیا تم واقعی یہی چاہتی ہو کہ میں دو سال مزید اور آنے والے بہت سارے دو دو سال صحرا میں گزاروں، جہاں انسان محبت تو محبت، نفرت تک کو بھول جاتا ہے۔ خود کو بھول جاتا ہے۔'' اس کی نگاہیں شعلوں پر اور لہجہ بے تاثر تھا۔
یمنیٰ سٹپٹا گئی۔ وہ تو بچ نکل جانے پر خوش تھی۔ اعزاز کی نگاہوں کی خفگی اور مچلتا سوال شرمندہ کرنے کو کافی تھا۔ ستم در ستم اس نے براہِ راست جواب مانگ لیا۔
''اب کیا کہوں۔'' یمنیٰ متزلزل تھی۔
اس نے نو ماہ ٹریننگ کے بعد دو سال بارڈر پر گزارے، پھر ونگ میں واپس آیا۔ حوالدار سے سب انسپکٹر بننے کی دعائیں ہی شروع ہوئی تھیں کہ اس سے آن ڈیوٹی جانے انجانے میں غفلت میں ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بندہ شدید زخمی ہو گیا۔ سزا کے طور پر اعزاز زیادہ مشکل سرحدی صحرائی علاقے میں بھیج دیا گیا۔
یمنیٰ نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ ''نہیں! وہ تو اس دن تم نے اتنا تنگ کیا سارا رستہ، غصہ میں بس یوں ہی کہہ دیا۔'' وہ سچائی سے بولی۔
''کیا واقعی؟''
''ہاں۔'' وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ اعزاز کے خوابوں اور خواہشوں کی ڈور پل بھر میں آسمان کو چھونے لگی۔
یمنیٰ نے تین کپ چائے اندر پہنچائے اور اعزاز کے آگے کپ رکھا۔ انڈے اس کے ٹفن میں رکھے۔
اعزاز خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ وقتاً فوقتاً چیزیں سمیٹتی یمنیٰ کو بے یقینی سے دیکھ لیتا۔
یمنیٰ نے لکڑی نکال کر اس پر پانی کا چھینٹا دیا اور اپنے پیر چولہے کے سامنے پھیلا دیے گرمائش کے لیے۔
''زادِ راہ کے لیے کچھ نہیں دو گی؟'' خالی کپ کو اٹھاتی یمنیٰ کا ہاتھ اس کے سلونے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس نے بری طرح چونک کر ہاتھ کو دیکھا۔
''آلو کے پراٹھے ہیں، چکن دہی ڈال کر بھونی ہے، انڈے دو ہی تھے۔ تھرمس میں دودھ پتی بھر

دی ہے۔" اس نے آنکھوں سے بیگ کے پاس رکھے ٹفن کو دکھایا۔
اعزاز زور سے ہنس پڑا۔
"تمہیں یقین ہے کہ میں نے یہی پوچھا ہے؟" اس نے ٹفن کو دیکھا۔ یمنیٰ اسے دیکھ کے رہ گئی۔
"کوئی جملہ، کوئی بات، کوئی پیغام جو اتنی سختیوں میں آرام کا باعث ہو، جو دل و جان کا رشتہ قائم رکھے۔" اس نے جذبوں بھرے لہجے میں اس کا چہرہ کھوجا۔
"کسی جراثیم کش صابن سے ہاتھ دھونا اور شربت فولاد استعمال کرتے رہنا، ستو بھی رکھ دیے ہیں" یمنیٰ نے بڑی ذمے داری سے ہدایت دی۔ اعزاز کا جان دار قہقہہ سناٹے کو چیر گیا۔
"تم بڑی چیز ہو، یمنیٰ محبوب! تم پر تو نام کا بھی اثر نہیں۔" وہ جست لگا کر چبوترے سے اتر گیا۔
اندر کمرے میں جا کر سب کے گلے ملا، پیار لیا، پھر واپس ادھر آیا۔
"اب یہاں کیوں بیٹھی ہو، سردی لگ جائے گی، اندر رضائی میں چلو۔" وہ اسی طرح پیر چولہے کے نزدیک کیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے سینک رہی تھی۔
"ہاتھ سینک رہی ہوں۔" اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ اعزاز چبوترے کے نزدیک آ گیا، ایک پیر اوپر رکھ دیا، چہرہ یمنیٰ کے چہرے کے نزدیک کیا اور چولہے کے اندر جھانکا۔ لکڑی کب کی نکال چکی تھی۔ سفید سفید راکھ، کہیں نہ کہیں کوئی چنگاری چھپ دکھلا جاتی تھی۔ شدید سردی میں بھی یہاں گرمائش سی تھی۔
"یہ دم توڑتی چنگاری اتنی گرمی دے رہی ہے تو یہاں۔۔۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔
"یہاں تو پورا آتش فشاں دہکتا ہے، مشکل ہے کہ آنچ نہ پہنچی ہو۔" وہ بہت گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا گمبھیر لہجے میں تیقن سے بولتا چلا گیا۔ یمنیٰ نے کچھ گھبرا کر ہاتھ اور پیر سمیٹ لیے۔ چند پل اسے تکتے رہنے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔
"اچھا سر! گڈ بائے، رب راکھا۔"
وہ الٹے قدموں گھوم گیا، یمنیٰ بے ارادہ کھڑی ہو گئی۔
"رب راکھا۔" وہ آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ اسے یاد تھا، آمنہ اسے اسی طرح دعاؤں کے حصار میں رخصت کرتی تھی۔

❁❁❁

وہ گہری نیند میں تھی۔ جب اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو بارش کا شک ہوا۔ وہ پیروں میں چپل پھنسا، برق رفتاری سے باہر کو لپکی۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ ٹپ ٹپ بادلوں کی گرج چمک۔۔۔ اس نے گہرا طویل سانس لے کر مہک اندر اتار لی۔ شہباز تقریباً گلیوں میں بھاگتا پھر رہا ہوگا۔ کچے چولہے پر توی ڈھک دی تھی۔ (بڑا توا جس پر بیک وقت چار سے چھ روٹیاں بنائی جاتی ہیں) اوپر پلاسٹک شیٹ، مرغیوں کو بھی بند کر کے پلاسٹک شیٹ ڈربے پر ڈال دی تھی۔
یمنیٰ کو پتا نہیں چلا، کب آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہنے لگی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ بارش جو خوشی اور رحمت کا دوسرا نام ہے، دل کو اندر سے خالی اداس، بے قرار کر دیتی تھی۔ وہ دور تک دیکھنے کی خواہش

میں بے حال ہورہی تھی۔ دور تک دیکھ لینے والی آنکھ شاید کوئی اور ہوتی ہے۔ مجھے یہ کیوں لگتا تھا کہ میں رہٹ کا بیل ہوں، جو گھنٹی کی آواز کو کل دنیا سمجھ کر چلتا رہتا ہے۔ آمنہ کہتی ہے یہ بے یقینی دراصل اللہ کی رحمت سے مایوسی ہے، دل کو ہر وقت مستقبل کے خوف سے ہولائے رکھنا، ایمان کی کمزوری ہے، مگر میرا دل چاہتا ہے، میرے پاس جادوگرنی کا شیشہ آجائے اور میں بس پل بھر یہ دیکھ لوں کہ کیا ہوگا، کیسا ہوگا، مگر یہ تو خدائی ہے، بندہ خدا تو نہیں ہوسکتا پھر خدا سے اتنا نزدیک ہوجائے کہ اس پر انکشافات کا دروازہ کھل جائے اور میں تو خود اپنے آپ سے بھی قریب نہیں۔

وہ مایوسی سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

اندر شاید فون بج رہا تھا۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا۔

''میں آمنہ۔۔۔ تمہیں پتا ہے کتنی بارش ہورہی ہے۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ یمنیٰ کا دل خوشی سے بھر گیا۔

''تو یہ کون سی بات ہے، یہاں بھی بارش ہورہی ہے۔۔۔ چھوٹو کہاں ہے؟'' یمنیٰ نے اشتیاق سے نوزائیدہ بچے کے بارے میں پوچھا۔

''وہ اپنی کاٹ میں سو رہا ہے، سب پکوڑے سموسے کھا رہے ہیں، جلیبیاں لائے ہیں، مگر میرے لیے کچھ نہیں، بہت سوچ کر امی نے دودھ جلیبیاں دی ہیں، مگر میں اس چکر میں ہوں ایک پکوڑا تو مل جائے۔''

یمنیٰ طمانیت سے مسکرائی۔

''تم دو پکوڑے کھاؤ، ایک میرے نام کا بھی۔''

''تم بنالو نا یمنیٰ!'' آمنہ نے مشورہ دیا۔

''کیسے بنالوں، ایک تو میں اکیلی ہوں۔ دوسرے سارا چولہا، ہر شے بھیگ گئی ہے۔ اب برسات میں تو سلنڈر ہی استعمال ہوگا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ اکیلے کچھ مزا نہیں آتا۔'' وہ مدھم ہوگئی۔

''فریدہ کی طرف چلی جاؤ۔'' آمنہ کو اس کے موڈ کا اندازہ ہورہا تھا۔

''نہیں دادی جی سو رہی ہیں اور شہباز دروازہ بند کرکے گیا ہے۔ اچھا چھوڑو، بارش کا مزا تو لے لیا ہے، اب گھر سمیٹنا باقی ہے، کیچڑ کیچڑ ہوگیا ہے۔'' یمنیٰ ارد گرد دیکھتے ہوئے متاسف ہوئی۔

''رہنے دو! خود ہی سورج نکلے گا تو سوکھ جائے گا، تم بلاوجہ مشقت مت کرنا۔'' آمنہ نے ہدایت کی۔ ''یہ بتاؤ کب آؤ گی؟ تیاری کرلی ہے؟'' آمنہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں! پوری تیاری ہے۔ دادی جی منے کے لیے کچھ نہ کچھ بنا رہی ہیں، خرید رہی ہیں۔''

''اچھا پھر فون رکھتی ہوں، تم بھانجے کے لیے پیارا سا نام سوچ کے آنا۔'' آمنہ کی آواز کی کھلکھلاہٹ صاف محسوس ہورہی تھی۔

بارش رک گئی تھی، بجلی چلی گئی تھی، وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے مسلسل آمنہ ہی کو سوچے گی۔ رواج کے مطابق اسے زچگی کے لیے یہاں آنا تھا۔ مگر پھر اس کی ساس اور خود آمنہ نے منع کردیا۔ تائی مجیداں نے دھوم دھام سے ساتویں روز عقیقہ کا اعلان کیا تھا اور ان سب کو جانا تھا۔

یمنیٰ دو سال پہلے ہی یہاں آئی تھی اور اب عقیقہ کی تقریب کے اختتام پر سب آمنہ کے بڑے سے کمرے میں بیٹھے تھے۔

آمنہ کے سر پر سرخ زرتار دوپٹا تھا اور وہ دلہن سے زیادہ روپ سنبھالے کچھ نقاہت سے نیم دراز تھی۔ یمنیٰ بہت دل گرفتہ تھی۔ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی وہ یہاں نہیں تھی، ذہن و دل میں خیالات کی یلغار تھی، جنہیں بڑی کوشش سے چہرے پر آنے سے روک لیا تھا۔ آمنہ جو اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ دو، تین بار اسے گہری نگاہ سے جانچ چکی تھی۔ مگر بند ناک اور بھاری آواز نے اس کے راز کو ڈھانپ لیا۔

کہاں تو آمنہ خود اور وہ بھی یہ سوچ رہی تھی کہ وہ دس بارہ دن رہے گی، مگر اب وہ اس ماحول سے، اس گھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی، وہ پھپھو کے گھر منتقل ہوگئی کہ اچھا نہیں لگتا وہ اس طرح بہن کے گھر رہے۔

پھپھو کا گھر آمنہ کے گھر کے عین سامنے تھا۔ یہ وہاڑی کا شہری علاقہ تھا۔ جیسے کراچی یا لاہور کا کوئی علاقہ تمام تر سہولیات سے آراستہ۔

یمنیٰ بس ایسی ہی زندگی چاہتی تھی، اسے ماسی کا گھر بہت پسند تھا، مگر یہ۔۔۔ آمنہ کا گھر۔۔۔ جب اس نے پہلے دیکھا تھا تو اچھا تھا۔۔۔ بہت پیارا، عظیم کا کاروبار اچھا تھا، مگر وہ اتنی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا، اندازہ نہ تھا۔ عقیقہ والے روز لوگ کہہ رہے تھے۔

''آمنہ کا نصیب بہت زور آور ہے، تو کیا میرا نصیب ماٹھا ہے، میرے لیے بس وہی سب لکھ رکھا ہے۔'' اس نے دکھتے سر کو ہاتھوں پر گرا لیا۔

''لیکن اب دوسرا راستہ بھی نظر آ گیا ہے۔۔۔ تو کیا مجھے اس پر قدم رکھنا چاہیے۔'' وہ تذبذب کا شکار تھی۔

بات صرف یہ تھی کہ آمنہ کی شادی میں تایا یعقوب کے چھوٹے لاڈلے بیٹے ظہور نے یمنیٰ کو پسند کر لیا۔ چھ ماہ کا عرصہ لگا، اسے اپنی ماں کو منانے میں کیوں کہ وہ اپنی بھانجی بیاہنا چاہتی تھی۔ تایا جی نے خوشی کا اظہار کیا، وہ ایک روز مدعا لے کر حاضر ہوئے۔ آمنہ ان دنوں آئی ہوئی تھی اور یہ بھی کوئی ہفتہ پہلے کی بات تھی کہ وہ دونوں بازار گئیں، واپسی میں غضب کی گرمی۔ آمنہ تو آمنہ، یمنیٰ کا بی پی بھی لو ہونے لگا۔ سارا پسینہ بہہ نکلا اوپر سے رکشہ ندارد۔ آمنہ بے دم سے درخت کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ یمنیٰ گھبرا گئی اگر آمنہ کو کچھ ہو گیا۔

تب ہی ایک چھوٹی سفید گاڑی ان کے پاس سے گزری اور پھر فوراً واپس ہوئی۔ یمنیٰ نے لمبے لمبے سانس لیتی آمنہ کو دیکھا اور دو قدم پیچھے ہوگئی۔ ڈرائیور انہیں پہچان چکا تھا۔ وہ بڑے مسرت آمیز انداز میں چہکا۔

''آمنہ باجی! آپ۔۔۔'' آمنہ نے بھی مندی آنکھوں سے اسے پل بھر میں پہچان لیا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟''

یمنیٰ نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ تایا یعقوب کا بیٹا ظہور تھا۔

''چلیں آپ لوگ میرے ساتھ۔ ایسی حالت۔۔۔ میرا مطلب ہے اتنی گرمی میں گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے آمنہ کو آگے اور یمنیٰ کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اندر اے سی آن تھا۔ آمنہ نے بے دم ہو کر سیٹ کی بیک سے ٹیک لگالی۔ دوزخ سے جنت میں آنے کا احساس تھا۔ وہ پہلی بار اے سی والی گاڑی میں بیٹھی تھی۔

''اب تمہاری طبیعت ٹھیک ہے آمنہ؟'' اس نے آگے ہو کر آمنہ کا چہرہ دیکھا۔

''ہاں! ٹھیک ہوں بس۔۔۔''

گاڑی پانچ منٹ بعد ہی ایک نئی کالونی میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ بہت اچھی اسکیم کی کالونی تھی۔

''یہ تم ہمیں کہاں لے آئے؟'' آمنہ حیرانی سے بولی۔

''یہ میرا گھر ہے۔ آپ یہاں کھانا کھائیں گی۔ تھوڑا آرام کریں گی، پھر میں آپ کو گھر چھوڑوں گا۔ آپ کو شاید علم نہیں آج سال کا گرم ترین دن ہے۔''

''لیکن۔۔۔؟'' آمنہ نے یمنیٰ کی شکل دیکھی، مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ گھوم گھوم کر چاروں جانب دیکھ رہی تھی۔ ظہور باہر نکلا۔ اس نے خود ہی بڑے سیاہ گیٹ کو کھولا، پھر انہیں لیے اندر بڑھا۔ دائیں جانب کار پارکنگ اور بائیں جانب احاطے میں ننھے ننھے پھول پودے تھے۔ یہ بیس مرلے پر بنا نیا گھر تھا۔ تازہ پینٹ کی خوشبو۔۔۔ یمنیٰ نے کبھی خواب میں بھی یہ سب نہیں دیکھا تھا۔ وہ بچ مچ منہ کھولے بچوں کی طرح ہر شے کو حیرانی سے تکے جا رہی تھی۔

ظہور فریج میں سے موسم کے سارے پھل اور جوس کے ڈبے نکال لایا۔

''ابھی تو یہی خدمت کرسکتا ہوں۔'' وہ جھینپا۔

''تو تمہاری گھر والی؟'' آمنہ ڈھیلی بیٹھی تھی۔

''وہ تو ابھی نہیں ہے۔'' ظہور نے گہری نگاہ سے یمنیٰ کو دیکھا۔ پھر آمنہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آمنہ الرٹ ہو گئی۔۔۔ وہ بچی نہیں تھی۔ اس نے یمنیٰ پر نظر کی، صاف پتا چل رہا تھا۔

''ہمیں گھر چھوڑ آؤ۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا سیب چھوڑ دیا۔

''ابھی سے۔۔۔ آپ کچھ کھائیں تو۔۔۔'' وہ اچھل پڑا۔ یمنیٰ نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں رکنے کی استدعا کی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بس گھر جا کر آرام کروں گی۔'' آمنہ کھڑی ہو گئی۔

''آپ پہلے یہ سیب ختم کریں، پھر میرا گھر بھی تو دیکھیں نا۔'' وہ مُصر تھا۔

''میں آپ کا گھر دیکھ لوں؟'' یمنیٰ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''جی۔۔۔ جی ضرور۔۔۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''اباجی نے سالوں پہلے یہ پلاٹ بک کروایا تھا۔ پھر ابھی دو سال پہلے میری ملازمت یہاں ہو گئی تو میں نے سوچا، کرائے کے گھر سے بہتر ہے، میں اپنا گھر بنالوں۔'' اس نے تائیدی انداز میں یمنیٰ کو دیکھا اس نے بھی فوراً اسے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ کیا کام کرتے ہیں؟'' یمنیٰ کا اشتیاق ہر بات سے عیاں تھا۔
''میں یہاں بینک میں ہوں۔'' یمنیٰ متاثر ہوگئی۔ آمنہ کو بھی اچھا لگا مگر اسے خطرے کی بُو آرہی تھی۔

دانے کی تلاش میں نچلی پرواز کرتا کبوتر، یمنیٰ۔۔۔ اور اگلا وہ جال لے کر تو بیٹھا ہی تھا۔
یمنیٰ دنوں ظہور کے گھر، گاڑی، عہدے، کالونی کی تعریفیں کرتی رہی۔
اور جب تایا یعقوب نے آکر یمنیٰ کا نام لیا تو گویا دھماکا ہی ہوگیا۔ ''دیکھو جی! بات صاف کروں گا۔ اس کی ماں اپنی کوئی بھانجی بھتیجی لانا چاہتی ہے مگر اب اس نے یمنیٰ کا نام لیا ہے۔ پھر ہم بھائیوں کا رشتہ اور مضبوط ہوگا۔''
دادی جی بالکل چپ۔ آمنہ خطرناک حد تک سنجیدہ اور ابا جی اور ابو جی خاموش تھے۔
''آپ نے صاف منع کیوں نہیں کیا؟'' ان کے جانے کے بعد آمنہ چلّائی۔ ''صاف صاف کہتے یمنیٰ اور اعزاز۔۔۔''
''تُو غصہ نہ کر بیٹی! جہاں کڑی ہو، ایسے رشتے آتے ہیں، پھر وہ ہمارا بھائی ہے۔ اس نے تو بس بات کان میں ڈالی ہے۔ میں فوراً منہ پھاڑ کے کہتا تو صاف لگتا سوتیلے ہیں۔ اس نے ہماری سنی کب؟ اپنی سنا کر چلا گیا۔ اب آئے گا تو کہہ دیں گے۔'' ابو جی نے بڑے سبھاؤ سے کہا۔
''ہاں کڑیے! غلط تو بھی نہیں اور تیرا باپ بھی نہیں۔'' دادی جی نے تائید کی۔ آمنہ صبح و شام بڑبڑاتی رہی۔ وہ اعزاز سے فون پر بات کرنے کو بے قرار تھی، مگر سگنل کا مسئلہ تھا۔
یمنیٰ اگلے دن فریدہ کے گھر گئی تو اس کی غیر موجودگی میں ظہور آیا۔ وہ دادی کے لیے ڈھیروں پھل، بکرے کا گوشت اور جوس لایا تھا۔ یمنیٰ لوٹی تو آمنہ اسے باقاعدہ کوستے ہوئے چیزیں ٹھکانے لگا رہی تھی۔
''تم سب لوگ اپنی رائے اپنا فیصلہ سنا رہے ہو۔ جس کا مسئلہ ہے اس سے بھی تو پوچھو۔'' یمنیٰ نے آم کاٹتے ہوئے سرسری لہجہ اپنایا۔ ''کس کا مسئلہ؟'' آمنہ نے ڈپٹ کر استفسار کیا۔
''میرا۔۔۔ مجھ سے بھی تو کچھ پوچھ لو۔''
''تم سے کیا پوچھیں۔۔۔ اور تم کہو گی کیا؟'' آمنہ کا نقشہ بگڑا۔
''ہوسکتا ہے، مجھے کچھ کہنا ہو۔'' وہ بہت طمانیت سے آم کی قاش کھانے لگی۔
آمنہ کے دل پر جیسے ہاتھ پڑا۔۔۔ ''تمہیں احساس ہے کہ تم نے کیا کہا ہے؟'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔
''کچھ غلط تو نہیں۔۔۔''
''اعزاز کو بھول گئیں؟''
''یاد رکھنے کو ہے ہی کیا؟''
یہ ان دونوں کی زندگی کی سب سے زوردار جنگ ہوئی تھی۔

❁❁❁

”میں یہ نہیں رکھ سکتی۔ یہ میرے کس کام نہیں آئیں گے۔“ یمنیٰ نے شاپر بیڈ پر الٹ دیا۔ سفید بارڈر والے کھلے پائنچوں کا پاجامہ۔۔۔ آسمانی اے لائن شرٹ، شرٹ جس کے کنارے زمین تک گرتے تھے۔ ہم رنگ دوپٹا۔۔۔

”اس میں کیا برائی ہے۔ عام سا کاٹن کا سوٹ ہے۔ عظیم لائے تھے لاہور سے، سرخ رنگ میں میرے لیے، میں نے تمہارے لیے بعد میں منگوایا۔“

”مجھے کوئی بھی نہیں چاہیے۔ ہمارے کچے پکے گھر میں ایسے کپڑے نہیں چلتے۔“

”میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تمہارے لیے پسند کیا ہوگا۔“

”مجھے تمہاری کسی پسند کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے لیے کچھ اور پسند کرتی ہو، میرے لیے کچھ اور۔۔۔“

”یقین کرو، دونوں سوٹ ایک جیسے ہیں، بس رنگ کا فرق ہے، تم وہ لے لو۔ ایسی کیا بات ہے۔“ آمنہ الماری کی جانب بڑھنے لگی۔

”رہنے دو آمنہ! مجھے نہ یہ چاہیے، نہ وہ اور نہ کچھ اور۔۔۔ تم اپنے لیے وہ سب پسند کرتی ہو اور میرے لیے یہ سب۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کمرے میں گھوم گئی۔ اشارہ اس کمرے کی ہر شے کی جانب تھا۔ آخر میں اس نے سفید پھولوں والی بے پناہ خوب صورت اور نج چھت پر نگاہ کی۔

”خود لائٹ جانے پر یو پی ایس چلاتی ہو۔ اے سی کمرے میں سوتی ہو، امریکن کچن میں ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھ کر حکم چلاتی ہو اور میرے لیے تمہارے پاس پاتھیاں اور پٹھیاں ہیں۔ تم اپنے گھر میں ماربل پر وائپر پھیرتی ہو اور میں مٹی میں توڑی ملا کر فرش لیپوں۔ یہ تمہاری چوائس ہے میرے لیے۔۔۔ تم اپنے۔۔۔“

”تم ایسا سوچتی ہو یمنیٰ؟“ آمنہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

”یہ سب میں نے پسند کیا۔۔۔ یہ تو مجھے مل گیا۔ عظیم کرتے ہیں یہ سب۔۔ میں تو وہی آمنہ ہوں۔“

”تو جب مجھے ملنے لگا ہے تو تم رخنہ ڈال کر کیوں کھڑی ہو؟“ وہ زہر خند لہجے میں اونچی آواز سے بولی۔

”تم واقعی۔۔۔ یہ تم بول رہی ہو یمنیٰ؟ تم اتنی سطحی۔۔۔“ آمنہ کی آواز دکھ سے بوجھل ہو گئی۔

”پینے کے لیے فریج کا ٹھنڈا پانی۔۔۔ بٹن کھول، بند کر کے کھانا بنانے کی خواہش۔۔۔ ایک پکا فرش جس کو دھو کر کرسی ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ چند آرائشی گل دان، کچھ جھولتی بیلیں، پلستر والی صاف دیوار پر سفید بے داغ چونا۔ یہ سطحیت اور مادیت ہے؟ یہ تو جائز ضرورتیں ہیں جو تمہارے بھائی کے ساتھ رہ کر کبھی پوری نہیں ہوں گی۔ اگر مجھے ایک روشن راستہ مل رہا ہے تو تم کیوں رکاوٹ ڈالتی ہو؟ او ہاں! کہیں تم یہ تو نہیں سوچتیں کہ میں تمہارے برابر آ جاؤں گی تمہاری ہم پلّہ۔۔۔“

”خدا کی قسم یمنیٰ! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم۔۔۔ تم ایسا بھی سوچ سکتی ہو۔“ آمنہ منہ پر دوپٹا رکھ کر رو پڑی۔

"اگر تم مجھے واقعی چھوٹی بہن سمجھتیں تو میرے لیے اچھا سوچتیں، مگر تم۔۔۔ میری تو ماں بھی زندہ نہیں۔ آج اگر وہ ہوتی۔۔۔" اسے اپنا پرانا جملہ یاد آگیا۔ "تم صرف اپنے بھائی کا سوچتی ہو۔"

"یمنیٰ! بس کرو۔" آمنہ نے اپنے پورے جسم کی طاقت سے تھپڑ اس کے گال پر دے مارا۔ "بے شرم بدلحاظ! بیس سال کی زندگی اور اتنا زہر۔۔۔ میں تو ہر شے کو جوڑ رہی تھی۔ آنے والے وقت کو دیکھ رہی تھی۔ واقعی تو اس قابل ہے ہی نہیں کہ اعزاز جیسے بے لوث محبت کرنے والے شخص کی زندگی میں شامل کی جائے، چار چمکتی دیواریں اور ایک سجی چھت۔۔۔ چھت کبھی سیمنٹ سے نہیں بنتی۔ وہ اعتماد کی ہوتی ہے۔ جس کے پیچھے تو لپک رہی ہے، وہ بچپن کی منگیتر کو چھوڑ کر تیری طرف آرہا ہے اور وہ مکان جو بظاہر خالی تھا یہاں کوئی عورت مستقل نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً جو آتی ہیں۔ ہم نے اس دن جانے انجانے میں جا کر بہت بڑی غلطی کی۔۔۔ جس، جس نے دیکھا، نہ جانے کیا سوچا ہوگا اور اگر تمہیں یہی سب چاہیے تو جاؤ، لے لو۔ میرے بھائی کی محبت سنبھالنے کے لیے تمہارا دامن بہت تنگ ہے اور پیالے میں گنجائش برابر ہی چیز سما سکتی ہے۔ تم چلی جاؤ یہاں سے۔"

آمنہ نے ہاتھ لہرا کر اسے دروازہ دکھایا، جو گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ اور سن رہی تھی۔ آمنہ دونوں ہاتھ منہ پر جمائے اپنے رونے کی آواز کو روکنے کے لیے بے حال ہو رہی تھی۔

❋❋❋

اعزاز لوٹ آیا تھا۔ دادی جی اس کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ آمنہ کے بارے میں دادی کے منہ ہی سے سنا۔ وہ دو چار روز میں آنے والی تھی۔ اس کا بچہ ڈیڑھ ماہ کا ہو چکا تھا اور اسے اب لمبے قیام کے لیے آنا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ابو جی کے گٹھیا کو آرام تھا سو وہ کام پر جاتے تھے۔ شہباز کا اسکول بدل دیا گیا تھا، اور پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ تھا۔

تایا یعقوب یہاں پیغام ڈال کر خود عمرہ کرنے سعودیہ گئے ہوئے تھے اور بعد میں وہاں رہائش پذیر بیٹی کے ہاں رہ رہے تھے۔ ابا جی نے کہہ دیا تھا کہ یمنیٰ کے لیے اعزاز ہے۔ اعزاز اور ظہور دونوں گھر کے بچے ہیں، مگر یہ بات پہلے سے طے ہے۔

تایا یعقوب نے تسلیم کیا، مگر مصیبت یہ تھی کہ ظہور ہر دس بارہ دن بعد ظہور پذیر ہو جاتا۔ وہ بڑی تابع داری سے دادی کے پلنگ پر بیٹھ جاتا اور زمانوں پرانے قصے سنتا۔ ڈھیروں کھانے پینے کے تھیلے لاتا۔ یمنیٰ نے پہلی بار چاکلیٹس اور پزا کھایا۔ شہباز کو اس کے آنے سے خوشی ہوتی تھی۔

"یہ بڑی گاڑی میرے بھائی کی ہے۔" وہ کسی بچے کو نزدیک نہ آنے دیتا۔ ابو جی اور ابا جی نے اسے گھر کا بچہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کر رکھا تھا اور وہ بھی بہت شرافت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ یمنیٰ اس کے آگے پیچھے چائے پانی رکھتی۔ نہ جانے یمنیٰ کے کس انداز سے ظہور نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے ماحول سے متنفر ہے، فرار چاہتی ہے۔ وہ اسٹیج کا آخری فنکار ہے اور جس کے حصے میں صرف ایک اختتامی ڈائیلاگ ہے، مگر نتیجہ خیز۔۔۔ سارے ڈرامے کا نچوڑ وہ ایک جملہ ہے۔ وہ اسے بظاہر بہت سرسری انداز میں اپنی باتیں بتاتا۔

"گھر میں یہ کام کروا رہا ہوں۔ ٹائلز کا رنگ بہتر نہیں تھا۔ میں نے بدلوانے کا سوچا ہے۔ یمنیٰ!

کون سارنگ اچھا لگے گا؟ تم نے تو دیکھا تھا۔'' یمنیٰ کی آنکھوں میں لش لش کرتا گھر دوڑ جاتا۔
وہ گم صم اس کی شکل دیکھتی۔ وہ جیسے اپنے پھیلائے کھیل کو سمیٹ چکا تھا۔ اصلیت جان کر پیچھے ہٹ گیا تھا، مگر نہیں۔۔۔ وہ سنار تھا اور دھیرے دھیرے چوٹ مار رہا تھا۔
یہ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے سے گتھم گتھا ایک دوسرے کو ہرانے کے در پہ تھے۔ سورج کی پسپائی کا لمحہ بس آیا چاہتا تھا، جب صبح سے بے خبر سویا اعزاز اپنی بے پناہ سرخ آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مار مار ٹھنڈا کرنے کے جتن سے فارغ چبوترے پر آ گیا۔ اس کی دراز قامتی کمزوری کے باعث زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بخار میں مبتلا رہا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں اور اس کی جھلسی ہوئی رنگت شب دیجور کو شرماتی تھی۔ وہ چوکی گھسیٹ کر چولہے کے نزدیک آ گیا۔
یمنیٰ نے مدعا جان کر آگ سلگائی۔ کھچڑی اور یخنی گرم کر کے اس کے سامنے رکھی۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھی، جب ظہور چلا آیا۔ وہ بہت اچھا تازہ فروٹ کیک لایا تھا۔ اعزاز کھڑے ہو کر گلے ملا۔ موڑھا لا کر دیا، مگر وہ چوکی گھسیٹ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ یمنیٰ نے چائے کا پانی چڑھایا۔ ظہور بہت با اعتماد تھا جبکہ اعزاز پرسکون اور محتاط۔۔۔ وہ بہت خوش دلی سے گفتگو میں شریک تھا۔
''بس سزا ختم۔۔۔ حوالدار سے سب انسپکٹری مل گئی ہے۔ اب ونگ میں جوائننگ ہے۔ ابھی تو چھٹی پر آیا ہوں۔ رپورٹ کرنی ہے مگر بخار آ گیا۔'' اس کی آواز میں نقاہت تھی۔
''بہت مشکل زندگی ہوتی ہے یہ پولیس، فوج کی۔ ہمارے عیش ہیں، نائن ٹو فائیو کی جاب، پھر فارغ۔'' اس نے تکبر سے ہاتھ جھاڑے۔
''فوجی اتنی مشکل زندگی نہ گزارے تو بینک چھوڑ ایک موچی جوتا بھی نہ گانٹھ سکے۔ فوجی اپنا سکون تیاگ کر نائن ٹو فائیو کو ممکن بناتا ہے۔ مشینوں کے پہیے پیٹرول سے نہیں، اپنے محافظوں کا خون پینے کے بعد چلتے ہیں۔''
اعزاز نے بے حد سکون سے طمانچہ رسید کیا۔ اس نے آنکھیں چندھی کر کے اعزاز کو بغور دیکھا۔
''تم ناراض ہو گئے یار۔۔۔!''
''نہیں۔۔۔ ہمیں سکھایا جاتا ہے اور ہم نے اپنے تجربے سے تسلیم کیا ہے۔'' وہ بہت سادگی اور یقین سے بولا۔
یمنیٰ خاموش رہی۔ اس نے آگ ٹھنڈی کرتے ہوئے ایک نظر دونوں کو دیکھا۔ ظہور نے سفید کلف لگا سوٹ، سنہری چوڑی گھڑی باندھ رکھی تھی۔ چمکیلے جوتے، کپ پکڑے اس کے ہاتھ بہت صاف، گداز اور چمکیلے تھے۔ یمنیٰ کو بخوبی اندازہ ہوا کہ وہ روئی کی طرح نرم ہوں گے۔ دوسری طرف اعزاز تھا۔ اس کی انگلیوں کی گانٹھیں سیاہ ترین تھیں، نسیں نمایاں ابھری ہوئی۔۔۔ ظہور کا ہاتھ گوشت سے پُر تھا جبکہ یہاں جیسے پنجے پر تھیلی چڑھا کر کس دی ہو۔ یہ جفاکش مضبوط نگہبان ہاتھ تھے۔ پتا نہیں کیوں اپنی تمام تر منفی سوچوں سے پرے یمنیٰ کو سیاہ ہاتھ قابلِ اعتبار لگے تھے۔

❀❀❀

پشت جڑے بچوں کی طرح وہ ساتھ ساتھ تو تھیں مگر ایک دوسرے سے منہ موڑے۔ ننھے عدیم

نے سب کو اتنا مصروف کر دیا تھا کہ یہ نظارہ ماسوائے اعزاز کے کوئی نہ دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا اور یمنیٰ کو ضرورتاً مخاطب کرتا جیسے کچھ ہوا نہیں۔ آمنہ کو اعزاز کو لمبے لمبے خط لکھنے کا جنون تھا اور ہر بات زیر زبر پیش کے ساتھ اس کے علم میں تھی۔ اس نے آمنہ کے شرم دلانے پر بہت سکون سے کہا۔

''میں سخت جان ہوں۔ پہاڑ توڑ کر دودھ نکال سکتا ہوں، مگر پہاڑ سے سخت چیز دل ہوتا ہے۔ لعل اور انگارے ایک ہی طشت میں رکھے ہوں تو ناسمجھ ہاتھ بڑھانے میں غلطی کر جاتے ہیں۔''

''تو تم مانتے ہو، وہ انگارے پکڑے گی؟'' آمنہ بھونچکی رہ گئی۔ ''تم اسے روکو گے نہیں؟''

''نہیں۔ وہ ہم سے متنفر ہو چکی ہے۔ ناراضی گرہ کی طرح ہوتی ہے۔ بندہ کھولتے کھولتے کھول لیتا ہے۔ شک قینچی ہوتا ہے، کاٹ دیتا ہے۔ میں زبردستی کا قائل نہیں۔ ظہور فطرتاً فلرٹ ہے۔ اسے ہر چیز فرمائش کرنے پر مل گئی ہے۔ وہ یمنیٰ کو بھی چیز سمجھ کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اخبار میں اشتہار دینے جا رہا ہوں۔ ماسی پڑوسن کے بیٹے نے جب تک دبئی سے آنا ہے، پھر سودا کرنا ہے، دیر ہو جائے گی۔ میں پورا پلاٹ بیچنے کی بات کروں گا، پھر جو حصہ ملے قسمت۔ اب فیصلہ کر لیا ہے تو عملدر آمد بھی تو کرنا ہو گا نا۔''

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آمنہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دور چھت پر یمنیٰ کے کھلکھلانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ آمنہ کے بیٹے سے کھیلتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

''اعزاز ٹھیک کہتا ہے۔ وہ ہم سے متنفر ہو چکی ہے۔ اے اللہ! تُو دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے۔ ایسا کچھ کر دے کہ سب ٹھیک ہو جائے۔''

وہ گڑگڑا کر اللہ سے مدد مانگنے لگی۔ ''اگر ایسا ہی رہا تو پہلے مرحلے پر اس نے انسانوں پر سے اعتبار کھویا۔ اگلے پر توکل بھول جائے گی، یعنی آگے پھر گڑھے ہی گڑھے ہیں۔ یا اللہ! اسے یقین دلا دے کہ ہم وہی ہیں اس کا بھلا چاہنے والے۔ اس سے محبت کرنے والے اے اللہ!''

❀❀❀

''ہمارے گھر میں پسند ناپسند سے زیادہ گھر والوں کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ دادی جی دل کی مریض ہائی بلڈ پریشر اور معدہ گڑبڑ ہے۔ ابا جی کو شوگر ہے، چاچو کو گٹھیا ہے تو باقی بچے ہم تین افراد۔ طوعاً و کرہاً وہی کھاتے ہیں جوان سب کے حساب سے پکے، جیسے آٹے میں نمک نہیں ڈلتا، جبکہ ہمارے لیے پھیکی روٹی مشکل ہے اور فریج چونکہ نہیں ہے اس لیے آٹے کو گوندھ کر بھی نہیں رکھ سکتے سو وہی کھاتے ہیں، کریلے بہت بنتے ہیں، ٹھنڈی تاثیر کی چیزیں نہیں بناتے کہ چاچو کو تکلیف ہوتی ہے۔ گنجائش نہ ہونے کے باوجود بکرے کا گوشت بنتا ہے جی۔ مسالہ جات بھی ہلکے رکھتے ہیں، تیل کم۔ پسند ناپسند، غذائیت ان سب سے بڑھ کر پرہیز اہم ہے۔

اچانک مہمان والی بات مشکل ہے۔ دادی جی کی ملنے جلنے والیاں، ہمسائی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آتی رہتی ہیں۔ گرمیوں میں نمکین لسی اور سردیوں میں ایک ایک کپ چائے۔ ہاں مگر کھانے والے مہمان اگر آئیں تو سب سے

پہلے ہم گیس کا چولہا استعمال میں لاتے ہیں۔ روٹین کا کھانا لکڑیوں، پاتھیو (گائے کے گوبر سے بنتی ہیں) پر بنتا ہے نا۔ مرغی کا سالن، پھر توی رکھ کے میں اور یمنیٰ جلد از جلد روٹیاں ڈالتے ہیں۔ توی آپ کے قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاؤں تو ایک بڑے سائز کا توا ہوتا ہے جس میں یمنیٰ آگ ڈالتی جاتی ہے۔ میں توے پر دو دو روٹیاں، پھر یمنیٰ گز بھر لمبے چمٹے کو توی کے نیچے گھسا گھسا روٹیاں سینکتی جاتی ہے۔ مہمان کو مرغی کا گوشت کھلاتے ہیں۔ ترکیب تو کوئی خاص نہیں۔ سیدھا سیدھا مرغی کا گوشت دہی ڈال کر گاڑھا مسالا بنا کر بھون لیں۔ دوسرے ڈونگے میں کلو دہی، بعد میں گرما گرم چائے۔ وہ اس سادہ خوراک پر بھی نقد بیس روپے سے لے کر سو روپے تک دے کر جاتے ہیں۔ دعاؤں کا مول اب کیا لگاؤں، البتہ بعض مہمانوں کو جو جیسے کی بنیاد پر جو دال دلیہ ہو، پیش کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے مہمان بھی کھانا پکنے کے انتظار کے اپنے گھر میں عادی ہوتے ہیں، سو وہ صبر شکر سے انتظار کرتے ہیں بلکہ اگر عورتیں ہوں تو وہ ہانڈی بھوننے میں مدد کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتی ہیں۔ پتا نہیں لگتا مہمان کون سی والی ہیں۔

کچن کی صفائی کا اہتمام۔ دراصل ہمارے گھر میں باقاعدہ کچن نہیں ہے۔ (آپ حیران نہ ہوں۔ ہمارا کچن پاکستان کے تمام دیہاتی کچنز کا نمونہ ہے۔ یہ زمین سے ڈیڑھ فٹ اونچا ایک چبوترہ ہے جسے مٹی اور توڑی (سوکھا بھوسا) ملا کر لیپ دیا گیا ہے یہاں مٹی کے دو چولہے لگے ہیں۔ جن میں لکڑی جلائی جاتی ہے یا دوسری چیزیں۔ یہاں مستقل کچھ نہیں رکھا جاتا۔ ہم کھانا بناتے وقت سب سامان اٹھا کر لاتے ہیں اور کام مکمل ہوتے ہی کپڑے سے پونچھ کر ڈبے واپس اندر۔ دراصل اڑتی کالی راکھ ہمارے منہ اور کپڑوں سمیت ہر شے پر پڑتی ہے۔ برتن کھرے میں نلکے کے نیچے بیٹھ کر دھوتی ہیں اور خشک کر کے ٹوکرے میں الٹے جما دیتی ہیں، پھر ململ کے کپڑے سے ٹوکرا ڈھک دیتی ہوں۔ جب بھی لیپا ہوا فرش خراب ہو جائے تو مٹی ڈلوا کر بھائیوں سے بنوا کر میں خود ہی فرش لیپ لیتی ہوں (جیسے شہر میں مزدور سیمنٹ کے فرش پر نیرو پھیلاتے ہیں۔ یہ فرش دو دن میں استعمال کے قابل ہوتا ہے اور اس میں جھاڑو پھیر دی جاتی ہے) یہاں کی صفائی کے لیے سب سے ضروری ہے کہ چولہوں سے راکھ لازماً نکال کر پھینک دی جائے تاکہ نئی لکڑی کی جگہ بن سکے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا ڈھک کر رکھی جاتی ہیں برتن چونکہ کالے بے پناہ ہوتے ہیں تو انہیں مانجھنا اہم ترین کام ہے۔ مٹی بہت اڑتی ہے۔ چولہے کھلے صحن یا کھلی چھت پر بھی بنائے جاتے ہیں اس لیے کہ دھواں کھلے میں پھیل جائے۔ بند کچن

میں خواہ چمنی ہو، دھواں بھر جاتا ہے۔ البتہ اسٹور میں جہاں میں نے سلنڈر لگو ارکھا ہے (چائے یا جھٹ پٹ کاموں کے لیے) اس کی صفائی بہت دل لگا کر کرتی ہوں۔ سلنڈر کو صاف ستھرا اور احتیاط سے رکھنا ضروری ہے ورنہ یہ پھٹ جاتے ہیں۔

چونکہ دادی جی نے مرغیاں پال رکھی ہیں تو انڈا لازمی ہے۔ ابلا ہوا، تلا ہوا (جلا ہوا) ساتھ پراٹھے اور اچار۔ گھر پر دادی کے ہاتھ کا بنا ملی جلی سبزیوں کا اچار نہ صرف ناشتے بلکہ ہمارے ہر کھانے کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ شروع میں اچار میں صرف کیری، مرچ، لسوڑے اور مرچیں ہوتی ہیں مگر بعد میں اس میں کریلے، گوبھی، گاجر اور پھلیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ جب بھی بھائی چھٹیوں پر آئیں تو حلوہ بناتی ہوں اور سفید چنے کا سونف والا سالن۔ گرمیوں میں لسی اور چائے بھی لازمی ہے۔ مجھے اور یمنیٰ کو آنکھ کھلتے ہی چائے چاہیے۔

باہر کھانا کھانے کا کوئی تصور نہیں۔ جب ہم بازار شاپنگ پر جاتے ہیں تو پہلے سموسے، پھر چھولے، دہی بھلے اور بعد میں ایک ایک ٹھنڈی بوتل۔ کبھی کبھار فالودہ بھی کھا لیتے ہیں۔ ہاں ایک بار پھپھو کی فیملی کے ساتھ ہیڈ سلام پر پکنک پر گئے تھے۔ تلی ہوئی مچھلی کھائی تھی۔ بہت زیادہ مزے دار تھی۔

موسم کو مدِ نظر رکھتی ہوں۔ لیکن شدید بارش میں جب چولہے بھیگ جاتے ہیں، تب ہم پکوڑوں کے بارے میں سوچتے رہ جاتے ہیں۔ دو دن بعد جب سورج ہر شے سکھا جاتا ہے تو یمنیٰ اور چھوٹا بھائی شہباز یاد دلاتے ہیں کہ ہم نے پکوڑے نہیں بنائے، پھر ہم تینوں دھوپ میں چولہے کے پاس بیٹھ کر پکوڑے کھاتے ہیں اور تلافی کرتے ہیں۔ ہاں! برسات میں گڑ والے چاول بناتے ہیں۔ البتہ گرمیوں میں رائتوں سے کام چلاتے ہیں۔ آلو کا رائتہ، کدو کا رائتہ، بینگن کے بھرتے پر دہی کی تہہ جماتے ہیں۔ دوپہر میں اگر روٹی کھائی جائے (شدید گرمی میں دل نہیں کرتا) تو رائتے بلکہ میں اور یمنیٰ روٹی ہاتھ پر رکھ کے اچار رکھ کے کھا لیتے ہیں۔

ایڈیٹر صاحبہ! محنت بغیر کوئی کام اچھا نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں تو کھانا پکانا ایک مشقت طلب کام ہے۔ مسالے پیسنے کے لیے مشینیں نہیں ہیں۔ کونڈی ڈنڈا، چاٹی میں لسی بنانا اور پھونکنی سے آگ جلانے کی مشقت۔۔۔ آنکھوں اور ناک سے خوب پانی نکلتا ہے۔

میں بھائی اعزاز کے لیے سردیوں میں گاجروں کے حلوے اور گرمی میں کدو کا حلوہ ضرور بناتی ہوں۔ کدو کھیت سے منگواتی ہوں۔ میرے پاس شہری اچھی نئی ترکیبیں تو نہیں، بس یہی لکھ رہی ہوں۔ ابھی چند دن پہلے بنایا تھا۔

کدو :پانچ کلو(کدوکش کرلیں)
(کچھ لوگ باریک کاٹ کر بعد میں گھوٹنے سے
گھوٹ لیتے ہیں)
چینی :دو کپ
گھی دیسی :ایک کپ بھرا ہوا
کھوپرا :ایک کپ (کدوکش کیا ہوا)
الائچی :پانچ دانے
ملائی :دو پیالی
بادام میوے: آپ کی اپنی مرضی ہے

کدو بہت پانی چھوڑتے ہیں، اس لیے پاس کھڑے رہ کر پانی خشک کریں۔ اب ملائی ڈال دیں۔ الائچی کے ہمراہ اور آدھی رات تک پکنے دیں (میں ایسے ہی پکاتی ہوں) صبح اذانوں کے وقت گھی اور چینی ڈال کر بھوننا شروع کریں۔ پانی خشک ہو کر گھی اوپر آجائے، خوشبو آپ کے پڑوسیوں کے گھر جائے گی۔ (آپ کی پڑوسن چھت سے جھانک جو رہی ہے) بس، حلوہ تیار۔۔۔ مغزیات ڈال کر پیش کریں۔ اس حلوے کو بہت محنت سے بھونا جائے گا۔

کچن ٹپ تو شاید میرے پاس نہ ہو مگر گنے کا رس نکلنے کے بعد بچنے والا پھوک زبردست ایندھن ثابت ہوتا ہے (یہ شہری قارئین کے لیے بے کار ٹپ ہے) ہاں! دو تین آئیڈیے ہیں۔ گوشت کے نام پر گوشت آلو ہی بنتے ہیں۔ مرغی آلو شوربہ، گائے کا شوربہ، تو میں یہ کرتی ہوں کہ ایک دن پیاز براؤن کر کے مسالا بنا کر گوشت ڈالتی ہوں۔ ایک دن سب کچھ اکٹھا ڈال کر بعد میں گھی ڈال کر بھون لیتی ہوں۔ ذائقے میں بہت فرق پڑتا ہے کبھی شوربے میں صرف پسا ہوا گرم مسالا چھڑکتی ہوں۔ اگلے دن ہرا دھنیا اور اس سے اگلی بار ذائقہ بدلنے کو ہانڈی اتارنے کے بعد شوربے میں سوکھی میتھی ہاتھ سے مسل کر چھڑک دیتی ہوں۔ اس طرح ایک ہی سالن مختلف ذائقوں میں بدل جاتا ہے۔

دادی جی کی سخت ہدایت پر ہم سر ڈھک کے کھانا پکانے کے عادی ہیں اس لیے کبھی بال آنے کی شکایت نہیں ملی۔ آپ بھی ایسا کریں۔

ایڈیٹر صاحبہ! میری بہن نے مجھے چیلنج کیا ہے ''آپ کا باورچی خانہ'' میں میری کچن کی کہانی شائع نہیں ہوسکتی بلکہ میں بھیج بھی نہیں سکتی کہ بتانے کو ہے ہی کیا، مگر میں خود تسلیم کرتے ہوئے، اپنی چیزوں کو بخوشی اپناتے ہوئے حرف بہ حرف سچ لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ میرا دیہاتی بیک گراؤنڈ میرے لیے شرمندگی کا باعث نہیں کہ اسے لوگوں سے چھپاتی پھروں۔ امید ہے اتنے بہت سارے

الگ الگ ماحول والے کچن میں آپ سب کو میرا کچن پسند آیا ہوگا۔ شکریہ۔
آمنہ مطلوب میلسی موضع

نیچے آمنہ کی تصویر تھی، جو اعجاز نے اس کی شادی سے کچھ روز پہلے کیمرا ٹرائی کرتے ہوئے کھینچی تھی۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے مسکرا رہی تھی۔

یمنیٰ نے ناک سکیڑی۔ اسے پتا چلا۔ اس کے بہتے آنسو ٹھوڑی سے گرتے گریبان کو بھگو چکے تھے۔ اس نے پلکیں جھپکیں تو دو قطرے ڈائجسٹ کے ورق پر گرے۔ اس نے سرعت سے ہاتھ پھیر کر خشک کرنے کی سعی کی۔ باہر آج پھر ظہور آیا بیٹھا تھا۔ اعزاز، شہباز، آمنہ اور دادی جی وہ پھونکنی استعمال کرتے ہوئے کھانستے کھانستے کبھی زور زور سے ہنس پڑتی۔

یمنیٰ دوپہر سے اپنے پسندیدہ ناول کی قسطیں پڑھنے کمرے میں بند تھی۔ ڈائجسٹ بند کرتے ہوئے یونہی اسے شائبہ ہوا کہ وہاں آمنہ جیسی لڑکی کی تصویر ہے۔ اس نے دیکھا، وہ آمنہ ہی کی تصویر تھی اور پھر۔۔۔

❀❀❀

آمنہ ٹھیک کہتی تھی۔ اسے خود سے جڑی ہر شے سے پیار تھا، فخر تھا۔ اس کے لیے کوئی چیز شرمندگی کا باعث نہیں، جو چھوٹی چھوٹی چیزیں یمنیٰ کے لیے زندگی موت کا مسئلہ تھیں، وہ آمنہ چٹکیوں میں اڑا دیا کرتی تھی۔

اسے چیلنج کرتے ہوئے یمنیٰ کے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ اول آمنہ کبھی ہمت ہی نہیں کر سکے گی کچھ بیان کرنے کی اور اگر کیا بھی تو لپیٹ لپاٹ کر (اگلی نے کھول کھول کر بخیے ادھیڑے تھے، مگر بہت خوشی و فخر سے)

دوئم اسے یقین تھا کہ ایڈیٹر کاغذوں کا گولا بنا کر پھینک دیں گی اور پھر وہ آمنہ کو تن کر کہے گی۔ اصل میں تمہیں خود شرمندگی ہے کہ کیا لکھوں کیا چھپاؤں۔ کہنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اگر یہ طرزِ زندگی اتنا قابلِ فخر ہے تو تم نے لکھا کیوں نہیں۔ اور دیکھو! تم نے لکھ لیا۔ ایڈیٹر پاگل نہیں تھیں کہ اسے شائع کرتیں۔ مگر اس کے دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ایڈیٹر نے سلسلے کے اختتام پر بریکٹ میں تعریفی جملہ لکھا تھا۔ (قارئین! ہمارے ملک میں ستر فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ان کے مسائل اور زندگی گزارنے کے اسٹائل سے کتنے ناواقف ہیں۔ بہن آمنہ مطلوب کا یہ باورچی خانہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ملک کی بیشتر آبادی کی نمائندگی کی ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ کو پسند آیا ہوگا۔)

''تو کیا واقعی میں غلط ہوں؟'' وہ کنپٹیاں مسلنے لگی۔ اور یہ تو یقین ہے کہ یہ آمنہ نے شادی کے بعد اپنے گھر سے بیٹھ کر لکھا ہے، کیوں کہ تصاویر تقریباً ایک ماہ بعد آئی تھیں اور اعجاز خود دے کر آیا تھا۔ وہ یادداشت کو ٹٹولنے لگی۔

''تو کیا میں ہر بات میں غلط ہوں؟'' وہ محاسبہ کر رہی تھی۔ ''اور۔۔۔ اور میں نے آمنہ کو کتنا غلط کہا۔ کتنی بدتمیزی کی اور وہ ایک لفظ نہیں بولی۔ کیا وہ واقعی مجھے اپنی بہن اور عدیم کی جگہ سمجھتی ہے اور اتنا تو

میں مان ہی سکتی ہوں کیوں کہ میرے اپنے سامنے کی مثالیں ہیں۔ چاچے، تائے کی بیٹیوں کا آپس میں اٹ کتے داویر ہوندا ہے (اینٹ کتے کا بیر) حسد، غصہ، نفرت اور آمنہ کو مجھ سے کیا فائدہ ہے؟ اس بات میں کوئی کلام نہیں۔ اعزاز کے لیے آمنہ جس لڑکی پر ہاتھ رکھے، اگلے سر کے بل دینے آجائیں۔''

شادی کے بعد جب محرم میں آمنہ رہنے آئی تو دادی جی بچوں کو کوس رہی تھیں جوان کے پلنگ پر اچھل اچھل کر اسے ڈھیلا کر گئے تھے اور اب ان کی کمر دکھتی تھی۔ آمنہ نے دبکے کے کام سے بوجھل دوپٹا تار پر ڈالا اور آستینیں چڑھا کر منجھی کسنے لگی۔ ایک ٹانگ زمین پر دوسری پلنگ کے اوپر۔ وہ اپنا پورا زور لگا لگا کر مگن تھی۔

پھر جانے سے پہلے وہ یمنیٰ کے ساتھ بیٹھ کر چھٹیوں کا ڈھیر ٹھکانے لگواتی رہی۔ جب شادی شدہ عملی زندگی میں قدم رکھا تو تب بھی وہ لپک لپک کر ادھر آئی اور جاتے وقت ہچکیوں سے روتی۔ اس کے گھر میں گرمی شروع ہوتے ہی اے سی لگ گیا تھا۔ عظیم کا کاروبار ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ وہ یہاں لائٹ جانے پر لکڑ فین (لکڑی کا پنکھا) دھیرے دھیرے جھلتے ہوئے نیند میں جاتی۔ پھر گرمی لگتی تو ہڑ بڑا کر دوبارہ پنکھی جھلتی، پھر نیند کا غلبہ، پھر ہڑ بڑا کر اٹھنا۔

اس کے کسی انداز سے نخرہ یا اتراہٹ نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی موجودہ زندگی قناعت، صبر و شکر اور توکل کا انعام بھی تو ہو سکتی تھی۔

یمنیٰ نے بارہا سوچا کہ وہ خواب جو اس نے خود سے ہی چھپا کر دل کے نہاں خانوں میں غائب کر رکھے تھے۔ وہ عملی تعبیر بن کے آمنہ کو کیسے مل گئے۔ ''اگر مجھے یہ سب مل جاتا تو۔۔۔ تو شاید میں آپے سے باہر ہو جاتی۔''

اس نے پہلی بار اپنا صحیح تجزیہ کیا۔ ''چھوٹا بچہ اپنی ماں کے بھروسے پر جب ٹھہر ٹھہر کر چلنے لگتا ہے تو اسے اپنے چلنے سے زیادہ یقین ماں کے ہاتھ کی پکڑ پر ہوتا ہے کہ وہ گرنے لگے گا تو کوئی فکر نہیں، ماں ہے نا اور ماں بچے کو کبھی گرنے نہیں دیتی اور ماں کے پیار سے ستر گنا زیادہ پیار اللہ اپنے بندے سے کرتا ہے تو پھر میں اگر اس پر بھروسا کر کے ڈرتے لڑکھڑاتے اس کا ہاتھ تھام کر قدم بڑھاتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھے گرنے دیتا۔ میری نیت کا کھوٹ، یقین کی کمی، میری بے سود سوچیں، میرے شکوک سے پرے، اللہ اپنا کردار نبھاتا۔ وہ میرا ہاتھ کبھی نہ چھوڑتا۔ وہ مجھے کبھی گرنے نہیں دیتا۔ خود احتسابی کا یہ عمل۔۔۔ سامنے بلیک اینڈ وائٹ تصویر۔ باہر سے آتی زندگی سے بھرپور، طمانیت سے لبریز پُر اعتماد ہنسی کی آواز۔۔۔

اس کے دل و دماغ پر چھایا کہر، بے خبری کی چادر جیسے سرک رہی تھی۔ ''میں۔۔۔ میں اور بس میں۔۔۔ میں تنہائی اکیلے پن کا نشان۔۔۔ ''میں'' کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ ''ہم'' بہت سارے ہوں تو دنیا بدل دیتے ہیں۔ نہ میں کسی کے ساتھ کھڑی ہوئی اور نہ کسی کو کھڑا ہونے دیا اور آمنہ نے اپنے دونوں بازو پھیلائے ہوئے تھے اور ان کے حلقے میں وہ دادی جی، ابو، چچا، بھائی، بہن اپنے گرد و پیش کے ہر بندے کو لیے کھڑی تھی۔ اللہ مجھ اکیلی کو دیکھیں گے جبکہ میں ناشکری ہوں اور اللہ کو یہ پسند نہیں۔

وہ آمنہ کو دیکھیں گے، وہ ہر قیمت پر آمنہ کو دیکھیں گے جو سب کے لیے فکر مند ہے۔ جو گھر کے چھتے سے اترا اصلی کم یاب شہد دادی سے چھپا کر پڑوس کی ایک آنکھ سے اندھی بکری کی آنکھوں میں اس

امید پر لگا دیتی تھی کہ شہد سے بینائی تیز ہوتی ہے۔

وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ پاؤں اوپر کر لیے اور بازوؤں کے حلقے میں سر گھسا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس کا جسم جیسے جھکڑوں کی زد میں تھا۔ وہ پھر جیسے رو رو کے تھک گئی۔ نہ جانے کتنی دیر سے کرسی پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ چارپائی پر لیٹ گئی۔ دوپٹا پھیلا کر سراپا ڈھانپ لیا، اس کی اتنی لمبی غیر موجودگی باعث تشویش نہیں تھی۔ وہ اب کل شام آنے والی فون کال کا سوچ رہی تھی جو ظہور کی بڑی بہن نجمہ کی تھی۔

''ہم نے تو یہی سنا تھا کہ تمہاری اور اعزاز کی بات طے ہے، بلکہ ابا جی نے آکر کہہ دیا، ظہور کا رشتہ جہاں طے ہے، وہیں شادی کی تاریخ لو، مگر وہ کہتا ہے کہ تم ہی سے کرے گا۔ کیا تم نے کوئی امید دلائی ہے؟''

وہ بہت سادہ مگر الجھن بھرے انداز میں پوچھ رہی تھیں، مگر امید دلانے والے جملے پر یمنیٰ اچھل پڑی۔

''کیا مطلب۔۔۔؟ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟''

''وہ کہتا ہے۔ یہ بڑوں کا فیصلہ ہے مگر یمنیٰ کو پسند ہیں۔''

''ہم۔۔۔ میری ان سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ مہمان بن کے آتے ہیں۔ ہمارے گھر میں اور کوئی ہوتا نہیں تو دادی جی خوش ہوتی ہیں۔ ہم انہیں عزت دیتے ہیں بس۔'' یمنیٰ کی حیرانی دو چند تھی۔

''دیکھو یمنیٰ! میں نے تمہیں کوئی دس سال پہلے دیکھا تھا، تب تم چھوٹی بچی تھیں۔ اب ظاہر ہے جوان لڑکی ہو۔ میں یہاں اتنی دور سعودیہ میں ہوں، مگر مجھے علم ہے، ماموں کی بیٹی جو ظہور کی منگ ہے، گوری چٹی آٹھ جماعت پاس، مگر بہت موٹی لڑکی ہے۔ یہ کہتا ہے مجھے موٹی عورتیں پسند نہیں۔ وہ پینڈوؤں کی طرح بولتی ہے۔ دیہاتی پن ہے اس کے اندر۔ ارے بھئی! جب دیہات میں رہے گی تو دیہاتی پن بھی رہے گا۔ تمہاری تعریف کرتا ہے۔ تم بہت اسمارٹ ہو۔ دبلی پتلی۔ اس نے میرے دیور سے کہا، اس کا فیگر قیامت ہے۔ تم کیا گلے میں دوپٹا ڈال کر گھومتی ہو؟''

''کک۔۔۔ کک کیسی باتیں کرتی ہیں؟'' یمنیٰ کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے غیر ارادی طور پر خود سے لپٹے دوپٹے کو مزید لپیٹا تھا۔

''وہ کہتا ہے، یمنیٰ اپنے ماحول سے متنفر ہے۔ وہ اعزاز کو پسند نہیں کرتی۔ بلکہ وہ تو یہ بار بار کہتا ہے، اعزاز اس قابل ہی کہاں کہ اسے یمنیٰ جیسی لڑکی ملے۔''

اس نے بمشکل اپنے غصہ کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات اتنے سالوں کی خود ساختہ لڑائی کے بعد کی صلح ہم سب کو اچھی لگی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر دادی کو ان کا آنا ڈھارس دیتا ہے۔ وہ تنہائی کا شکار، بولنے کی شوقین عورت ہیں اور آپ کے گھنے میسنے بھائی نے اس چیز کا فائدہ اٹھایا۔ نمبر دو ایک بندہ روز روز آئے گا تو بات کرنی پڑتی ہے۔ اب جب وہ کوے کی طرح کان کھائے گا کہ یہ اور وہ۔۔۔ میرا گھر ایسا میرا گھر ویسا تو دل چاہے نہ چاہے، رائے تو دینی پڑے گی۔ میں نے تو بھائی سمجھ کر گھر میں گھسایا تھا، مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اس طرح بہنوں کی کمر نا پتا پھرے گا۔ ہم بہنیں تو دادی کے حکم کے مطابق چوبیس

گھنٹے ایسا لگتا ہے جیسے نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ اس نے تو اتنی آر پار ایکسرے جیسے ڈیلے کہاں سے فٹ کروا لیے یا پھر بچپن سے گھر میں اپنی بہنوں کے بازو، کمریں ناپنے کا عادی ہے؟"

نجمہ باجی کو یوں لگا جیسے کان کے ساتھ موبائل کی جگہ تیز گرم استری لگی ہو۔

"آپ بتائیں گی تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ میں نے ریکارڈنگ کا بٹن آن کر لیا تھا۔ یہ تحفہ میں اسے خود دوں گی۔ اللہ حافظ۔"

اس نے تو یہ سوچ رکھا تھا کہ اس کی سوچیں اس کی دسترس میں ہیں۔ ان پر کسی اور کی رسائی نہ ہوگی۔ "یا میں اتنی ہلکی ہوگئی ہوں یا اگلا اتنا گھاگ تھا کہ اس نے اتنے اندر کی بات جان لی۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں کہا کہ میں کیا حاصل کرنا چاہتی ہوں، کیا چھوڑ دینا۔"

سر دکھ گیا مگر اس سوال کا جواب نہ ملا۔ اسے خبر نہیں تھی، گفتگو قد آدم آئینہ کی طرح ہوتی ہے۔ نہ صرف معنی بتاتی ہے بلکہ تشریح بھی کرتی ہے۔ کلام، انعام کی طرح ہوتا ہے جیسا کہا گیا، ویسا پا لیا۔ جب ہم کسی ایک چیز کے بارے میں مسلسل سوچتے ہیں تو دراصل اپنی ذات کی چادر میں چھید کر دیتے ہیں۔ لاکھ چھپائیں مگر اندر کہیں نہ کہیں سے جھلک دکھلا ہی جاتی ہے۔ سوچیں قلعے کی طرح ہوتی ہیں اور زبان اس قلعے کی سب سے کمزور اینٹ۔۔۔ یہ جگہ چھوڑ دیتی ہے، پھسل جاتی ہے، سربستہ راز اس زبان کی لغزش سے زبان زد عام ہو جاتے ہیں۔

اس کے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں چھپی سوچوں، خیالات تک ظہور کی رسائی اسی زبان کے طفیل ممکن ہوئی تھی۔

وہ خوب ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو کر کچن چبوترے تک چلی آئی۔ اعزاز چارپائی بُن رہا تھا۔

"ڈائجسٹ پڑھنے میں اتنی مگن تھیں، آئے گئے کا پتا نہیں۔"

ظہور نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا۔ یمنیٰ نے چادر میں خود کو محفوظ محسوس کیا۔

"آمنہ نے آپ کو چائے پانی پوچھ تو لیا۔" اس نے جیسے اوقات بتائی۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ محظوظ ہوا۔

"سورج ڈھلنے کے بعد کون چارپائی بُنتا ہے؟" اس نے اعزاز کو مخاطب کیا۔ اس کے ہاتھ سے گولا چھوٹ گیا۔

"ساری صبح بنائی تھیں بس اب یہ دو ہی رہ گئی ہیں۔" شہباز نے جواب دیا۔ "یہ میری چارپائی ہے۔ میں آج اس پر ہی سوؤں گا۔"

"یہ اتنے ڈھیر سارے آم۔۔۔؟" وہ ٹوکرے کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ میں لایا ہوں۔ خریدنے کی ضرورت ہی نہیں۔ دوست کے باغ کے ہیں۔ ذرا چکھو، ایسا ذائقہ کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔" وہ پر یقین تھا۔ یمنیٰ نے ہاتھ بڑھا کر آم ہونٹوں سے لگا لیا۔

"نہیں، آپ کی غلط فہمی ہے۔ یہ آم تو بہت ہی کھٹا ہے۔" اس نے آم ہاتھ سے رکھ دیا۔ آمنہ کا پیڑے بناتا ہاتھ رک گیا۔ یمنیٰ کا انداز جارحانہ تھا۔

"دو۔۔۔ دوسرا ٹرائی کرو۔" یمنیٰ نے فوراً عمل کیا۔

''یہ کڑوا ہے۔'' اعزاز اور شہباز تعجب سے دیکھ رہے تھے۔
''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' ظہور نے لپک کر خود ٹرائی ماری۔
''یہ۔۔۔ یہ تو بہت لذیذ اور میٹھے آم ہیں۔'' اس نے حیرت سے یمنٰی اور پھینکے جانے والے آم دیکھے۔
''ضروری نہیں کہ جو چیز آپ کو لذیذ اور میٹھی لگے، وہ دوسروں کو بھی لگے۔'' اس کا انداز جتاتا ہوا کچھ بتاتا ہوا تھا۔
''اٹھو آمنہ! میں روٹی بنا لیتی ہوں۔'' آمنہ نے اپنے ہاتھ دیکھے، وہ سارے پیڑے بنا چکی تھی۔
''جاؤ تم۔'' وہ سر پر کھڑی تھی۔ آمنہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ اب یمنٰی اور ظہور آمنے سامنے تھے۔ درمیان میں چولہا۔۔۔
''میرے پاس جو فون ہے وہ دراصل دادی جی کا ہے۔'' یمنٰی نے بغیر کسی تمہید کے ظہور سے بات کرنی شروع کر دی جو نا قابل فہم نگاہوں سے یمنٰی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ (کیا یہ مجھ سے فون گفٹ مانگنا چاہتی ہے۔ دل خوش فہم کی امید)
''تو جب بھی ان کا فون آئے تو ہم ریسیو کر لیں تو ریکارڈنگ کا بٹن دبا دیتے ہیں کہ بعد میں لاکھ بتانے پر بھی وہ پھر۔۔۔'' آگے کیا ہوا؟'' جیسے سوال کرتی ہیں۔ کل بھی میں نے نجمہ باجی کا فون سنتے ہی یہی کیا، مگر اس کا سننا آپ کے لیے بھی دلچسپ ہوگا۔''
اس نے موبائل اس کی جانب بڑھایا۔ ظہور نے فون کانوں سے لگا لیا اور دو منٹ بعد چولہے کی آگ زیادہ رنگ بدل رہی تھی یا ظہور کا چہرہ، فیصلہ بہت مشکل تھا۔ لال، نیلا، پیلا رنگ۔۔۔ آگ کی لپیٹیں توے سے باہر بے خوف ہو کر سانپ کی طرح زبان ہلاتی تھیں اور جس طرح چولہے کے پیچھے والی سیاہ ترین ہو جاتی ہے، فون کان سے ہٹاتے ہوئے ظہور کا چہرہ ایسا ہی تھا۔
وہ دفعتاً کھڑا ہو گیا، تھپ تھپ، یمنٰی پیڑے کو ہاتھ پر جھلا رہی تھی پھر اس نے دھپ کر کے اسے توے سے چپکا دیا، ظہور تیزی سے نیچے اترا۔
''ان بہت خاص آموں کو بھی لیتے جائیں۔ ہم اس ذائقے کے عادی نہیں۔'' وہ اونچا بولی۔
اعزاز جوان دونوں کی مدھم گفتگو کے دوران جبڑے بھینچے اپنی ساری بے بسی و بے چارگی منجی کسنے میں لگا رہا تھا۔
''ظہور! ظہور! رکو۔۔۔'' کہتا پیچھے لپکا۔
''جانے دو اعزاز! وہ کبھی نہ آنے کے لیے گیا ہے۔''
یمنٰی کی مطمئن اعتماد سے پُر آواز نے اس کے قدم روکے۔ وہ کچھ نہ سمجھا۔ یمنٰی کی روٹی غبارے کی طرح پھولی پھولی تھی۔ اس نے چمٹا مار کر اسے پھاڑ دیا، پھس۔۔۔ اعزاز کو لگا، یمنٰی اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ سچ مچ یا اعزاز کو لگا۔

❀❀❀

چاند تماش بین تھا اور اس پر ستم پیدائشی گونگا۔۔۔ کاش وہ ہلکے پیٹ کی بی جمالو مائی جیسا ہوتا اور

ادھر کی خبر ادھر پہنچاتا تو کیوں اور کیسے کے سارے مسئلے حل ہو جاتے۔ اعزاز چھت پر چار پائی ڈالے چت لیٹا چاند کو گھورے جا رہا تھا۔ اسے لگا، یہ کوئی دوسرا چاند ہے اور چار سال سے زائد عرصہ تک محرم و ہمراز چاند دوسرا، جو اس کے حالِ دل سے بخوبی واقف تھا۔ جو اس کی ساری بے قراریوں اور بے تابیوں کے جواب میں اپنی ٹھنڈک اور روشنی سے تسلی کرواتا تھا۔

نیچے آمنہ بچے کو شانے سے لگائے لوریاں دے رہی تھی۔ پتا نہیں، سارا دن بڑا بیبا بچہ رہنے والا عدیم رات کو گلا پھاڑ پھاڑ کر کیوں روتا تھا۔

''چندا ماما دور کے، بڑے پکائیں بور کے، آپ کھائیں تھالی میں، عدیم کو دیں پیالی میں۔'' بچہ اور گلا پھاڑتا۔ یمنیٰ نے فون آمنہ کی جانب بڑھایا۔

''فارغ ہو تو یہ ریکارڈنگ سن لینا۔۔۔ اور مناسب لگے تو اعزاز کو بتانا۔'' وہ چھت کی جانب بڑھی۔

آمنہ نے تعجب سے فون کو دیکھا۔

اعزاز کو وہ ایک دم اپنے پیروں کے پاس کھڑی دکھائی دی۔ ایسا خوابوں میں تو بار ہا ہوا تھا مگر۔۔۔ اعزاز نے پلکیں جھپک کر یقین کیا تو فوراً اٹھ بیٹھا اور پاؤں نیچے کر کے جوتا ٹٹولنے لگا۔ ایک پیر مل گیا دوسرا۔۔۔

یمنیٰ نیچے جھکی، شاید جوتا پکڑنے جو آگے ہو گیا تھا، مگر نہیں۔ وہ دوزانو اس کے عین سامنے بیٹھ گئی۔ اعزاز نے الجھ کر اس کی صورت دیکھی جو اپنے ہاتھ میں پکڑی سرخ پوٹلی اس کی جانب بڑھا رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' اعزاز نے ہاتھ بڑھانے سے گریز کیا۔

''یہ تو تم بتاؤ گے؟'' اس کا انداز جھجک آمیز تھا۔ اعزاز نے پوٹلی لے کر ایک لمحے میں کھول دی۔ اندر بساند بھرا بہت تھوڑا سا پیلا بُرادہ تھا۔

''یہ۔۔۔ یہ کیا چیز ہے؟'' تحیر نے آنکھیں پھیلا دی تھیں۔

''یہ محبت تھی جو شاید اب نہیں رہی۔'' یمنیٰ کی آواز میں نمی گھل گئی۔ حلق میں نمک بھی آ گیا تھا۔ اعزاز کی آنکھوں میں ایک چمکیلی صبح لوٹ آئی۔

''تم نے انہیں ابھی تک سنبھال کر رکھا ہے؟''

''تو کیا تم نے پھینکنے کے لیے دیے تھے؟'' وہ ڈپٹ کر بولی۔

''تم کیا کہنے آئی ہو یمنیٰ؟'' اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔

''تم کیا سننا چاہتے ہو اعزاز؟'' اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ ہمت بندھاتا ہوا تھا۔

''تو تم وہ کہو گی جو میں سننا چاہتا ہوں۔'' اس کے بے یقین جملے میں امید اور جذبے گھل گئے۔

''میں وہی کہنے آئی ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں یقین سے بولی، مگر اس کی آنکھیں امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ وہ چہرہ اٹھائے اس کے چہرے کو ڈھٹائی سے تکے جا رہی تھی۔

ہار جانے کا خوف دنوں میں ہولاتا ہے، مگر پھر وقتِ آخر جب تمام کشتیاں جلا دی جائیں تو محض بے خوفی کا سہارا فتح سے ہم کنار کرتا ہے۔ وہ ''ہاں'' اور ''نہ'' دونوں سننے کے لیے خود کو تیار کر کے آئی تھی،

پر دل کی کیا کرتی جو بس ہاں کا متمنی تھا۔
''میں اب بھی وہی ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر مکان کا حوالدار یا چلو اب انسپکٹر کہہ لو۔'' اس نے یاد کروانا ضروری سمجھا تھا۔
''مگر میں اب وہ نہیں ہوں۔'' وہ انکشاف کرتے ہوئے اس کے گھٹنے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ رکھتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔
''اس تبدیلی کی وجہ؟'' اب وہ چہرہ اٹھائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
''موسم بدلتے ہیں تو منظر بھی بدل جاتے ہیں۔ چیزیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔''
اعزاز پورے قد سے کھڑا ہوا اور لمحہ بھر میں رومال ہوا میں لہرا دیا۔ پیلا بُرادہ کہاں اڑا کہاں گرا پتا بھی نہ چلا۔ یمنیٰ کے دونوں ہاتھ بے ساختہ ہونٹوں پر جا رکے اور آنکھوں میں تحیر تیرنے لگا۔ سامنے کا چہرہ بے تاثر تھا، مگر انداز فیصلہ کن۔ اس کا دل حلق میں آ کر دھڑکنے لگا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی تو تب رکی جب چھت کی چھوٹی دیوار کمر سے لگی۔
یہ رات دس بجے کے بعد کا وقت تھا، اندھیرا ہر شے کو نگل چکا تھا، اس پر مستزاد لائٹ چلی گئی۔ مگر چاند کی روشنی میں دور بہت دور کسی مسجد کے مینار پر لگے سبز اور پیلے برقی قمقمے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے سمندر کے بیچوں بیچ ڈولتی کشتی کو اچانک ساحل پر روشن مینار نظر آ جائے۔
اعزاز نے سرخ رومال بھی چارپائی پر پھینک دیا، یمنیٰ کو خبر نہیں ہوئی، کب گال گزرگاہ بنے اور آنکھوں سے نکلتا پانی گردن تک روانی سے بہنے لگا۔ اسے جواب مل گیا تھا۔ یمنیٰ نے اپنی آواز گھونٹ لی۔ اسے کیوں پتا لگے کہ وہ رو رہی ہے۔
اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے پیر مَن مَن کے لگے تھے، مگر اب یوں لگتا تھا ٹنوں وزنی لوہے کی گیندیں بہت چھوٹی زنجیر کے سہارے اس کے پیروں سے بندھی ہیں۔ وہ جنبش بھی نہیں کر پا رہی۔ اعزاز دو قدموں میں اس کے عین سامنے بے حد قریب آ رکا۔ یمنیٰ نے سانس روک لی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا۔
''تت۔۔۔ تم نے۔۔۔ پھول پھینک دیے۔ میں۔۔۔ میں نے ایسے ہی سنبھال کر رکھے۔''
دکھ اتنا شدید تھا کہ شکوہ ہونٹوں پر آ گیا۔ اس کی آواز نے بھید کھول دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ اعزاز نے شہادت کی انگلی اس کی مانگ پر رکھی اور ناک سے گزارا ٹھوڑی تک لے آیا۔ اب وہ آنسو صاف کرنا چاہتا تھا۔ یمنیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔
وہ زور سے ہنس دیا۔۔۔ اس کے آنسو اور تیزی سے بہے۔ آمنہ اسی وقت اوپر آئی تھی۔ اعزاز کا جان دار قہقہہ سن کر وہ رک گئی۔
''تم جاؤ آمنہ! ابھی تمہارے ڈائیلاگ نہیں شروع ہوئے۔'' وہ رخ موڑے بنا بولا۔
''لیکن وہ۔۔۔''
''تم جاؤ'' وہ دہاڑا۔ آمنہ نے سرپٹ دوڑ لگا دی۔ اعزاز نے یمنیٰ کے اطراف دونوں ہاتھ دیوار پر جما دیے تھے۔

''وہ سارا بُسا ہوا بے رنگ بُرادہ۔۔۔ ہونہہ! میں تمہیں نئے پھول لا کر دوں گا۔ یہ بہت سارے۔۔۔ روزانہ۔۔۔ صبح، دوپہر، شام۔''

اس کا لہجہ متبسم تھا۔ یمنیٰ نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھنا چاہا۔

چاند نے کسی الہڑ دوشیزہ کی طرح ذرا سا چہرہ نکال کر نیچے دیکھا۔ کہانی کا یہ انجام اسے بھی اچھا لگا۔ وہ گونگا تھا، اندھا نہیں۔ سب جانتا تھا۔ ٹھنڈی میٹھی نرم روشنی میں دو سائے۔

''ہٹو پیچھے۔ کوئی دیکھ لے گا۔'' یمنیٰ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا۔

''مگر میں نے تو ابھی کچھ کیا ہی نہیں۔ کوئی کیا دیکھے گا؟'' وہ اچانک دھکا لگنے سے پیچھے ہوا۔ بے چارگی سے پوچھنے لگا۔ یمنیٰ کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

''کٹ! یہ سین لائٹ آنے پر یہیں سے شروع کریں گے۔ مجھے تمہارے چہرے کے رنگ نظر ہی نہیں آ رہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔ یمنیٰ کی رکی ہنسی پھر شروع ہو گئی۔ فضا میں پٹاخوں کی شدید ترین آوازیں گونجنے لگیں۔ دو دن بعد شب برأت تھی۔ بہت سارے بچوں نے ایک ساتھ پٹاخے پھوڑے تھے۔ پانچ چھ اناری گولے آسمان پر بہت اوپر جا کر پھٹے۔ آسمان ایسا ہو گیا، جیسا سیاہ چادر پر کوئی چمکیلی رنگ برنگی افشاں چھڑک دے۔ یمنیٰ گردن اٹھائے آسمان کو دیکھنے لگی۔

''کتنا خوب صورت منظر ہے۔ میں نے ایسا کبھی پہلے نہیں دیکھا۔'' وہ سب کچھ بھول بھال بچوں کی طرح ایڑیاں اٹھا کر اوپر دیکھ رہی تھی۔ بچے باقاعدہ پلاننگ سے آتش بازی کر رہے تھے۔

ایک کے بعد ایک۔۔۔ اعزاز نے یمنیٰ کا چہرہ دیکھا۔ یہ آتش بازی اور پٹاخوں کی آوازیں۔۔۔ بہت کم تھیں۔۔۔ بہت کم۔۔۔ ان سے۔۔۔ جو اعزاز کے دل میں ہو رہی تھیں۔

محبت بڑھ سکتی ہے
محبت مل بھی سکتی ہے
تم کاسہ تھام کے رکھنا

''اب میں اوپر آ جاؤں؟'' آمنہ نے نیچے سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہاں ہاں آمنہ! جلدی آؤ۔ دیکھو تو کتنا مزا آ رہا ہے۔''

یمنیٰ نے دونوں ہاتھ لہرا کر اسے اوپر بلایا۔ آمنہ کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہی نتیجہ معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے سرعت سے قدم بڑھا دیے۔

❁❁❁

سیدھی سڑک

سورج آگ کا گولا تھا۔ ہر ذی روح اس کی تپش سے بچاؤ کا سامان کیے اپنے اپنے ٹھکانوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ اکا دکا بڑی ہی مجبوری کے عالم میں نکلنے والے بھی سایہ دار منزل کی تلاش میں تیز قدموں سے مسلسل بڑھتے ہی جاتے تھے۔

ایسے میں سورج کی تلملاہٹ عروج پر تھی، بلند و بالا عمارتوں میں لگے ٹھنڈے پنکھے، اے سی، گرم تارکول پر پھسلتی قیمتی گاڑیاں اپنے اندر بہاروں سی خوشبو اور ٹھنڈک لیے ہوئے تھیں۔

انسانوں کی کی گئی ترقی اور تجربات گویا سورج کے منہ پر طمانچہ ہے۔ وہ جل کر سڑتا تھا اور سڑ سڑ کے کلستا تھا۔

مگر آج تو جیسے وہ اگلی پچھلی تمام کسر نکال دینا چاہتا تھا اور اس کے اس شدید جارحانہ، منتقمانہ رویے کا باعث وہ شخص تھا جو مئی کے اس شدید ترین گرم دن میں ہر شے سے غافل تھا۔ وہ موسموں سے لاپروا نظر آتا تھا۔ وہ گرد و پیش سے انجان تھا۔ (کیا اتنی شدید کھال پگھلا دینے والی گرمی اس پر ذرا بھی اثر نہ ڈال رہی تھی) اس مصروف ترین شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر شاید کوئی اس سے واقف نہیں تھا، مگر سورج تو اس پر اس وقت سے نظر کیے ہوئے تھا جب وہ گرتا پڑتا اندھا دھند چلنا شروع ہوا تھا۔

وہ مجذوب نہیں تھا نہ دیوانہ پاگل، ایک خوش شکل، خوش لباس دراز قد جوان۔۔۔ لیکن صبح سے مختلف گلیوں، چوراہوں، سڑکوں، فٹ پاتھوں کی خاک چھان کر پہلی نگاہ میں وہ پاگل ہی دکھائی دے رہا تھا۔

صبح وہ نیلی جینز پر سفید چیک کی بے داغ شرٹ میں تھا۔ جوتے قیمتی اور چمک دار تھے۔ مگر اب اس وقت جینز پر چکنی مٹی کی تہہ اتنی زیادہ تھی کہ اسے جھاڑا جاتا تو دھول کا مرغولہ سا اٹھ جاتا۔ سفید شرٹ کی رنگت کب کی بدل چکی تھی اور جوتوں کا حال سب سے خراب تھا۔

دھول میں اٹے آگ جیسے تپے جوتے۔

ان جوتوں کے اندر پیروں کے لیے ایسی گرمائش تھی جیسے بھاپ سے بھرا ککر۔۔۔

مگر وہ شخص اتنا لاپروا کیسے تھا، اتنا بے حس۔۔۔اور حیرانگی کا باعث، ایسے موسم میں جب ہر شخص حدت سے اللہ کی پناہ مانگتا چل رہا تھا وہ بے نیاز سا کیوں دکھائی دے رہا تھا۔

اس وقت وہ چلتے چلتے معروف شاہراہ کے دوشاخے تک آ گیا۔ ایک جانب باڑ لگا کر حد بندی کر دی گئی تھی یہاں کوئی عظیم الشان پروجیکٹ زیرِ تعمیر تھا۔ دوسری سڑک کا اختتام ڈیزرٹ کا آغاز تھا۔ وہ صبح سے منزل کا تعین کیے بغیر نکلا تھا اور اب بھی اس کا چلنا صاف بتا رہا تھا کہ وہ بس اندھادھند چلتا ہی جا رہا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ دماغ جسم کو واحد پیغام چلنے ہی کا دے رہا ہے کہ بس چلتے رہو۔ باقی تمام حسیات کے لیے سگنلز ناکارہ ہو چکے تھے۔

وہ ایک دم سیمنٹ کی بینچ پر ٹک گیا اور یہ تھکاوٹ کی انتہا پر بیٹھنے کی خواہش نہیں تھی وہ بس بیٹھ گیا۔

سیمنٹ کی بینچ اتنی گرم تھی جیسے تندور۔۔۔مگر وہ پھر بھی یکسر انجان تھا۔ عجب خالی الذہنی کا عالم۔

جیسے چابی دی ہوئی مشین۔۔۔چلتی رہے۔ چلتی رہے۔

مشین جو قوتِ فیصلہ نہیں رکھتی۔۔۔جو سوچنے سمجھنے سے ماورا ہوتی ہے لیکن!

وہ شخص مشین نہیں تھا۔

وہ جیتا جاگتا انسان تھا۔

جو مسلسل سوچ رہا تھا۔ ذہن و دل میں اتنی کشمکش کا عالم یوں تھا جیسے دانے بھونتی مائی کے کڑاہے میں دانے اچھلتے ہیں۔ ذرا سا سیک پہنچتے ہی بساط بھر تڑپتے، اچھلتے اور پھر دوبارہ کھولتی ریت کے اندر اس کا وجود چنے کا دانہ تھا اور سوچیں ایک کڑاہا، ہر بار سیک لگنے پر پوری طاقت سے اچھلتا اور دوبارہ اسی کھولن کے اندر کروٹے کے وار سہتا۔

جتنی تپش اور آگ "اندر" تھی، مئی کے اس تپتے سورج کی اس کے آگے کیا مجال۔

"احساس کی بارآوری کہیں بہت اندر ہوتی ہے، ایک بار کونپل پھوٹ جائے تو سرد و گرم سب سہنا آ جاتا ہے۔"

وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

✿✿✿✿

سفید گھاگھرے پر سلور اور سیاہ پھول بنے تھے، کالی مردانہ اسٹائل کی بٹنوں والی شرٹ، گیلے بالوں میں ہاتھ چلاتی رینو نہانے کے بعد بھی فریش نہ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور جلن کے باعث وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سختی سے آنکھیں میچ لیتی تھی۔ وہ ڈھیلے اور کسی قدر ڈولتے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

اس کا چہرہ بے حد فریش تھا۔ سیاہ خواب ناک گھنی پلکوں والی آنکھوں میں بڑی طمانیت اور آسودگی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی آرام دہ حالت میں ریموٹ کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کا آبنوسی حسن، وہ سنگِ سیاہ سے تراشی مورت جیسی تھی۔

رینو نے گھڑی دیکھی اور "رات" کو یادداشت میں ٹٹولا۔ (پھر بھی اتنی پُرسکون؟) وہ اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی تو وہ بری طرح چونکی۔ اپنی سحر پھونکتی آنکھیں اٹھا کر رینو کے چہرے پر گاڑیں۔ رینو

نے ایک بھرپور نظر اس کے سراپے پر ڈالی۔اس کی رنگت
سانولی، گہری سانولی، مگر بے داغ چکنی جلد جیسے سیاہ مشکی گھوڑ
"اتنی نکھری ستھری۔۔۔رات تو تم بھی۔۔۔؟" اس
سوال مکمل کیا۔"سونے نہیں جانا؟"

"نہیں۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"ہاہ۔۔۔!" اس نے طویل لمبی سانس بھری۔"رات بڑی ہی عجیب

"ہم جیسوں کی رات عجیب خواہ کتنی بھی ہو حیران کن بات نہیں۔ہاں بہرحال نہیں ہونی چاہیے۔" رینو نے جملہ کاٹ کر تیزی سے بہت پتے کی بات کی۔

"ہاہاہاہا!" وہ سمجھ کر نزاکت سے ہنستی چلی گئی۔"غریب" واقعی نہیں رہی۔وہ پوری پے منٹ کر کے گیا ہے۔"

"مردنا رمل تھانا۔۔۔" رینو نے آنکھیں نچائیں۔وہ جواباً کچھ نہ بولی، مگر رکتی ہنسی ایک بار پھر درو دیوار سے سر پٹخنے لگی۔

"تمہیں سہارنا اسے اپنے بس سے باہر لگا ہوگا۔" رینو کا لہجہ حتمی تھا۔صبح تک ٹھہرا یا رات کو ہی۔۔۔" اس نے آنکھیں نچائیں۔"رفو چکر ہو گیا؟"

"فوراً تو نہیں۔۔۔مگر چلا گیا۔ایک دم اٹھا اور گیٹ سے باہر۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"تم نے روکا نہیں؟ کیا کوئی داؤ بھی نہیں چلا؟" رینو از حد حیران تھی۔وہ ان سب لڑکیوں کے ڈھیر کا انمول موتی تھی۔شکل صورت، قد، آواز، ادائیں، ہر رنگ میں رنگ جانے والی۔وہ ہر کسی کے آگے پیش کیا جانے والا مال نہیں تھا۔خاص الخاص لوگ۔۔۔روتوں کے ساتھ روتی، ہنستوں کے ساتھ ہنستی، شاعر ٹکر جاتے تو کیا گلی کوچے کے شاعر اور کیا بڑے بڑے ادبی نام اسے سب ازبر تھا۔

سیاست پر گفتگو کرو یا ریاست پہ، دین پر بات کرو یا لادینیت پر۔۔۔وہ آنے والے کے لیے "سانحہ" بن جاتی تھی۔جیسے مرضی ڈھال لو اور اس فخر میں جھومو کہ وہ اسی کی ہو چکی ہے۔مگر صرف آدھی رات سے صبح صادق تک۔اس کا بہروپ اس کے اصل پر کبھی غالب نہ آیا۔

وہ جو تھی۔۔۔وہ۔۔۔وہی تھی۔

"کیوں داؤ چلاتی؟ میں کبھی کسی کو مجبور نہیں کرتی اور روکتی بھی کیوں کہ "ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں۔"

وہ سریلی بھی بے حد تھی۔"جبکہ وہ پوری پے منٹ میز پر دھر گیا تھا۔" وہ ہنس دی تھی۔رینو نے اس کی ادائے بے نیازی کو رشک سے دیکھا۔

"لگتا ہے پہلی بار اس رستے پر آیا تھا، بھٹک تو نہیں گیا تھا۔جانا کہیں اور پہنچا کہیں اور۔۔۔"

"ناں۔۔۔نہیں۔۔۔وہ تمہارے میاں "رنگیلے" کے ساتھ آیا تھا۔" اس نے ریموٹ سے آواز نکالی۔بگ اسکرین پلازمہ پر بپاشا کی گونگی اداؤں کو زبان مل گئی۔

''جگر ما بڑی آگ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے دوبارہ نہیں آنے کا۔۔۔'' رینو کھڑی ہوگئی۔ ساری خلقت آرام کی رات گزار کر مشقتوں بھرا دن گزارنے کے لیے بے دار اپنی اپنی منزل پر گامزن تھی جبکہ اس ''گھر کی لڑکیاں'' رات گزار کے اب آرام کی طلب میں ٹوٹے جسموں کو لیے بستر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

رینو کے جملے پر وہ جو بڑی دلچسپی اور انہماک سے بپاشا کو دیکھنے لگی تھی بری طرح چونکی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی عجیب سی مسکان آرکی۔

''یہ کیسے کہہ دیا۔۔۔'' اس نے گردن پیچھے ڈھلکائی اور اپنی ہنسی کا مزا لیا۔ ''نہیں آئے گا۔۔۔ ضرور آئے گا، بہت جلد آئے گا۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ کیونکہ جگر ما بڑی آگ ہے۔'' وہ گنگنائی۔

رینو اسے دیکھ کر رہ گئی۔ چندرا غلط دعوا نہیں کرتی تھی۔

❁ ❁ ❁ ❁

''او بجنا! ویسے تو تم پورے پکے مرد ہو۔ مگر وہ کہتے ہیں نا ہر بندے کے اندر ایک کنڈھی (گرہ) ہوتی ہے۔ یہ نفل ماننا، روزے رکھنا، منتیں ماننا، بڈیوں (عورتوں) کا کام ہے۔ ہمارے پنڈ میں سارا سال ہی ''عبادتیں'' چلتی ہیں۔''

''منتیں مانتی ہیں، چڑھاوے چڑھاتی ہیں، میری مج کے کٹا (بھینس کا بچہ) ہوا تو ننگے پیر بابے ڈھکن شاہ کے مزار تک جاؤں گی۔ بکری نے اکٹھے چار بچے دیے تو سات روز تک بچوں کو کھیر بنا کر کھلاؤں گی اور بڈیوں کی عبادتیں نہیں مکتیں۔۔۔ ان کے تو روزے بھی سارے سال چلتے ہیں۔ رکھے ہوئے روزے تے چھڈے (چھوڑے) ہوئے روزے۔۔۔'' ظفر نے ایک ہی سانس میں اپنے مخصوص بے فکرے کھلے ڈلے انداز میں اسے حسب معمول نئی بات ہی بتائی۔ پھر اپنی ہی بات کا اتنا مزا آیا کہ جی بھر کے ہنسنے لگا اور وہ روزہ رکھنے کے باعث نقاہت لیے چپ بیٹھا تھا ہنس دیا۔

''اوئے ہوئے اتنی زخمی دل گیر مسکراہٹ۔۔۔ مگر پھر بھی قاتل مسکراہٹ۔۔۔'' اس نے حسب معمول لوفرانہ انداز میں مگر سچی تعریف کی۔

''میں یہ سوچتا ہوں جگر! کہ تیری یہ مسکان مجھ مرد کے دل پر ایسی دھار مارتی ہے تو وچاری کڑیوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اوئے بڑے بڑوں کا پتا پانی کردے اور آنکھوں میں تیرتا اداس رنگ۔۔۔ بھئی واہ۔۔۔''

''تم کہیں جا رہے تھے ظفر۔۔۔!'' اس کی لن ترانیوں کو روکنے کے لیے اس نے یاد کروانا ضروری سمجھا۔

''او یار! ہم کچھ کھا رہے تھے ایسے مزے کا کباب پراٹھا لایا تھا کہ دونوں یار مل کر کھائیں گے، مگر تیرے روزے کا سن کر بھوک ہی اڑ گئی۔ یہ پڑی ہے تھیلی، افطاری کر لینا۔'' اس نے یاد آنے پر میز پر دھری تھیلی اٹھا کر دکھائی۔

''میں تو کھا لوں گا مگر تم تو کھاؤ نا۔''

''یار! تیرے روزے کا سن کر اپنی تو شرم کے مارے بھوک ہی اڑ گئی۔ سچ تو بڑا ہی نیک بندہ ہے،

نمازیں ساری۔۔۔او بلکہ تُو تو وہ صبح دس بجے والی بھی پڑھ رہا تھا ایک دن۔۔۔ایسا کر۔۔۔مجھ جیسے نافرمان کے لیے بھی دعا کر دے۔ ہمارا تو بچپن سے یہ حال رہا کہ بے بے سحری بناتی تھی تو دو پراٹھے چوری سے اٹھا کر کارنس کے برتنوں میں چھپا دیتے، پھر دن میں کھاتے۔ سحری، افطاری روزے داروں سے ڈبل کھاتے۔ اپنا بندوبست پہلے ہی کر لیتے۔ تُو میرے لیے دعا مانگ لے یار کہ میں بس نیک ہو جاؤں۔۔اور زیادہ ناں سئی تھوڑا ہو تا ہی۔۔۔'' ظفر کا اندازِ گفتگو شروع ہی سے ایسا تھا کہ مقابل کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ بے ہودہ سے بے ہودہ جملہ بھی انداز کی سادگی اور برجستگی کے باعث ناگوار نہیں گزرتا تھا اور کچھ ظفر کو بھی جملوں کے اخلاق و کردار کا ادراک نہیں تھا جو دل میں آگیا تڑتڑ سامنے والے کی سماعتوں پر برسا دیا۔

بے سوچے سمجھے جو کچھ بولتا جاتا۔ جملے کے اختتام پر مقابل ہنسے نا ہنسے وہ خود ہی لوٹ پوٹ ہوتا رہتا۔ پٹھے پر ہاتھ مارتا۔ ہنسی سے بے حال ہوتا اور پیٹ پکڑ کے گدے پر دہرا ہو جاتا۔ جملے کو سن کر مزا نہیں آیا یا برا لگا، مگر اس کا یوں بے حال ہونا اگلے کو بھی ہنسنے پر مجبور کر لیتا۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ دل کھول کر ہنس دیا۔

''تو پھر کرے گا نا میرے لیے دعا۔۔۔؟'' ہنسی رکی تو اسے دھیان آیا۔

ظفر مناسب قد، تھوڑے بھاری جسم کا صاف صاف پینڈو بندہ تھا۔ حالانکہ نیلی جینز جاگرز، چیک کی شرٹ پر جیکٹ اس نے تو بالوں کو بھی تھوڑا اسنہرا ڈائی کر رکھا تھا۔ گلے میں سونے کی چین ہاتھ میں اسٹیل اور سونے کے بریسلیٹ۔۔۔پتھروں والی انگوٹھیاں۔۔۔اپنے حساب سے وہ ایک بے حد اپ ٹو ڈیٹ ماڈرن تھا۔ شوخ رنگوں کی شرٹس۔

''میں دعا تو ضرور کروں گا، مگر ظفر! خالی دعا سے کام نہیں چلتا، پہلے نیک عمل کرتے ہیں پھر اس کی قبولیت کی دعا۔۔۔اگر عمل ''قبولیت'' پالے تو رجسٹر میں نیکی خود بخود درج ہو جاتی ہے۔ رجسٹر آدھا بھی بھر جائے تو ٹھپہ لگ کے سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے کہ بندہ نیک ہے۔

ابھی تم کہاں جا رہے ہو۔ مغرب ہونے ہی والی ہے، یہ کباب پراٹھا اکٹھے کھائیں گے اور بعد میں نماز۔۔۔تم اپنے لیے ہدایت کی دعا خود مانگنا۔۔۔اللہ کچھ معاملوں میں ڈائریکٹ ڈیل کرنا پسند کرتے ہیں۔''

''یہ تو نے ایسی گلاں کہاں سے سیکھیں۔ ایسی باتیں تو کتابوں میں نہیں لکھی ہوتیں۔ پڑھائی تو نے اے سی ٹیکنیشن کی کی ہے، بلے بھئی بلے۔۔۔۔''

''یہ پڑھنے پڑھانے کی نہیں غور کرنے کی باتیں نہیں۔ غور کریں تو خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پھر چائے کا پانی رکھ رہا ہوں تمہارے لیے بھی ڈال دوں؟'' وہ کچن کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا یعنی کیا وہ اس کے ساتھ افطار کرے گا۔

''یار! تیری باتوں نے میرے دل پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، مگر بات یہ ہے کہ میں نے کسی کو ملنے کا وقت دیا ہے اب وعدہ کر کے مکر جاؤں تو یہ بھی تو گناہ ہے نا؟'' وہ بڑی معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''وعدہ خلافی۔۔'' اس نے دونوں کانوں کو باری باری چھوا۔۔۔''توبہ توبہ! لیکن میرا وعدہ ہے،

آکر عشاء تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ چار جنگ پر لگا اپنا مہنگا موبائل چیک کیا۔

''اوہو اتنی دیر ہو گئی۔ کسی کو انتظار کروانا بھی تو گناہ ہے نا؟'' اس نے ایک اور جواز بتایا وہ مسکراہٹ کا گلا گھونٹ کر کیتلی میں پانی ڈالنے لگا۔

''ویسے تیرے پاس روزے کھولنے کے لیے کھانا پانی تو ہے نا۔۔۔ کہ میں کچھ لا کر دوں؟'' ظفر کو نکلتے نکلتے دھیان آیا۔

''میرے پاس سب کچھ ہے۔ تم جاؤ۔۔۔ اب تو فون بجنے بھی لگا ہے۔'' اس نے فون کی جانب اشارہ کیا۔

جلتی بجھتی لائٹ۔۔۔ ظفر چونکا۔ پھر نمبر دیکھا۔

''اوہو۔۔۔ وہی ہے یار'' اس نے کچھ جھینپ کر کہا۔

''تم جاؤ۔۔۔ وہی کو اور انتظار نہ کرواؤ''

ظفر قہقہہ لگاتا باہر نکل گیا اور وہ وضو کرنے کے ارادے سے واش روم کی جانب بڑھا۔

✡ ✡ ✡ ✡

چچا جان کے کھنکھارنے کی آواز جیسے ہی اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

''اللہ چچا جان مغرب پڑھ کر بھی آ گئے اور میں ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔'' اصدق اس کی گود میں سر رکھ کر مزے سے نیم دراز تھا۔ اس کے اچھل کر کھڑے ہونے سے اس کا سر گدے پر جا لگا تھا۔

''حد کرتی ہو یار۔۔۔ چچا جان مغرب پڑھ کر بھی آ گئے۔'' اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔ ''میرے والد بزرگوار ہی آئے ہیں، کوئی چھاپا نہیں پڑ گیا تھا۔ سارا موڈ خراب کر دیا۔ اتنے مزے سے لیٹا تھا میں۔۔۔''

''چھاپا واپا کچھ نہیں ہے وہ نماز کے لیے جاتے ہوئے کہہ گئے تھے واپس آئیں تو سب تیار ملیں اور تب آپ نے کہا، راستے میں انہیں اتنے دعا سلام والے لوگ ملیں گے کہ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا بڑا وقت ہے تیاری کے لیے۔۔۔ اب بڑے وقت یا چھوٹے کا پتا نہیں، مگر وہ لوٹ آئے ہیں۔''

''تم نے ان کا قرضہ دینا ہے جو ایسے ہکلانے لگی ہو؟''

''ہکلا اس لیے رہی ہوں کہ آپ تو تیار بیٹھے ہیں بس جوتے ڈالے اور ریڈی۔۔۔ اور چچا جان نے منہ سے کچھ نہیں کہنا، سبز چائے کے چار گھونٹ چڑھائیں گے دو منٹ میں اور جا کر گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتے، مگر میرے ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور ابھی تو میں نے بال بھی ڈرائی نہیں کیے۔'' اس نے کوفت سے اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ساتھ ساتھ وہ ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں سے مختلف اشیاء نکال نکال رکھتی جا رہی تھی۔

''تو اچھا کیا نا۔۔۔ ڈرائی نہیں کیے۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ بھیگے بھیگے گیلے گیلے۔'' اصدق بیڈ سے اٹھ آیا، ایک موٹی نم لٹ ہاتھ میں اٹھا کر اوپر اٹھائی اور سونگھ کر لمبی سانس بھری۔

''اف اللہ!'' وہ بری طرح جھنجلائی، جھٹکے سے لٹ کھینچی۔

''سارے میرے کپڑے بھیگ گئے۔'' اس نے آئینے میں اپنی پشت دیکھی، سیاہی مائل سبز

جارجٹ کی قمیص نچڑنے والی ہورہی تھی۔
''تیرے بھیگے بدن کی خوشبو سے لہریں بھی ہوئیں مستانی۔۔۔'' اصدق نے لمبی تان کھینچی اور اس کے قریب سرک آیا، مگر وہ الرٹ تھی۔ دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جما کر اسے الٹے قدموں پیچھے سرکایا۔ بیڈ پر بٹھایا۔
''خبردار! جواب یہاں سے آپ ہلے۔۔۔ اور میرے قریب تو غلطی سے بھی مت آنا۔'' اس نے ڈرائر مشین گن کی طرح لہرا کر دکھایا۔
''اف ظالم۔۔۔'' وہ جھوٹ موٹ کا سہما۔

نگاہوں سے قتل کر دو، نہ ہو تکلیف دونوں کو
تمہیں خنجر اٹھانے کی، ہمیں گردن جھکانے کی

وہ مصنوعی سخت تاثرات کے ساتھ گردن موڑے بال سکھا رہی تھی۔ شعر سن کر بے ساختہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی نے اصدق کے قہقہے کو بے قابو کیا۔ وہ کہنی کے بل تسلی سے نیم دراز ہوا۔
''اصدق! آپ یہاں سے چلے جائیں۔ سچ میں کچھ الٹا سیدھا کرلوں گی۔ آنکھ میں لپ پنسل یا لپ پر آئی پنسل۔۔۔'' اس نے مجبوری بتائی۔ ''پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''
''او یار! ہمیں جانے کا کیوں کہتی ہو۔ ہم نے تو اب چلے ہی جانا ہے۔'' اصدق نے بات کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب اور سرخی کی لہر آرکی۔ ملال اور بے بسی۔۔۔ مجبوری اور ناکامی سی۔۔۔
وہ پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔ سو اس نے قصداً بات کا رخ موڑا۔ وہ جلدی جلدی گلے میں نیکلس ڈال رہی تھی کانوں میں آویزے۔۔۔
''کیسا لگ رہا ہے یہ سیٹ۔۔۔؟''
''بس مجھے اپ سیٹ کر رہا ہے۔۔۔'' اصدق نے اس کے سجے بنے سراپے کو دل میں اتارا۔
سبز سوٹ، سبز نگوں سے مزین نازک سا سیٹ میرون لپ اسٹک نے ہونٹوں کے کٹاؤ کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں اسے تکتا ہی رہتا، لیکن دروازہ کھلا اور چھ سالہ جڑواں فائق اور شائق اندر داخل ہوگئے۔
''داداجان گاڑی میں بیٹھ گئے ہیں پاپا۔۔۔ آپ کو بلا رہے ہیں مما'' دونوں جتنی تیزی سے اندر آئے تھے اسی طرح باہر نکل گئے۔
''فائزہ بھابھی! آجایئے بہت دیر ہوگئی ہے۔'' کھلے دروازے سے آصفہ کی آواز آئی۔ ''ابو جان گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں۔ تایا جی اور تائی اماں بھی۔۔۔''
''دیکھا۔ سب چلے گئے ہیں بس ہم ہی رہ گئے ہیں۔ آپ کی وجہ سے ہوئی ہے دیر۔''
''لو میری وجہ سے کیوں؟'' وہ اپنی پرملال سی کیفیت سے نکلتے ہوئے آئینے میں بالوں پر برش چلانے لگا۔
''اس لیے کہ سب جانتے ہیں میں تیار ہونے میں کبھی دیر نہیں لگاتی اور مجھے کبھی آوازیں دینی نہیں

پڑتیں یہ تو آپ کی وجہ سے۔۔۔'' وہ خفگی سے جتا رہی تھی۔
''ہاں ہاں۔۔۔ دل چھوٹا نہ کرو کل صبح چھ بجے اٹھ کر ڈرل کے لیے پی ٹی ماسٹر کی طرح سیٹی بجانا شروع کر دینا سب کہیں گے فائزہ وقت کی بڑی پابند ہے۔۔۔ ہم تو پانچ بجے نکل ہی جائیں گے۔ ہونہہ۔۔۔!'' اصدق کی جان جل کر خاک ہوگئی۔ فائزہ دل کھول کر ہنس دی۔
''اور یہ ناعمہ آپا ہر بار دعوتیں کیوں رکھ دیتی ہیں۔ آنے کی دعوت۔۔۔ پھر جانے کی دعوت۔۔۔ انہیں میرے جانے کی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ دعوت رکھ کر جشن مناتی ہیں۔'' وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ الٹی سے الٹی بات۔۔۔
''یا اللہ!' فائزہ نے کرسی پر گر کے سر ہاتھ پر گرالیا۔
''سال بعد آپ آتے ہیں۔ یہی تو ہوتے ہیں مل بیٹھنے کے موقع۔۔۔ یادگار پل۔۔۔''
فائزہ اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے چڑچڑے پن سے اسے ٹوک دیا۔
''میرے لیے وہی پل یادگار ہوتے ہیں جب میں اور تم۔۔۔ تم اور میں۔۔ باقی سب۔۔۔'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔
''اور دیکھو، کھانا کھاتے ہی اٹھ جانا۔ یہ نہیں کہ لمبی نشست جما کر بیٹھ جاؤ۔ کہہ دینا مجھے پیکنگ کرنا ہے۔''
''لیکن میں تو ساری پیکنگ کر چکی ہوں۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ لیکن جیسے ہی نگاہ اصدق کے چہرے پر گئی تو وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا گئی۔
اصدق نے اس کا بازو دبوچا اور اسے خود سے قریب بالکل سامنے کھڑا کر لیا۔ دیوار گیر کلاک کو دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے اسے بھی کہا کہ وہ گھڑی دیکھے۔
''ساڑھے سات ہو چکے ہیں اور دس گھنٹے۔۔۔ صرف دس گھنٹے بعد میں نے سال بھر کے لیے چلے جانا ہے اور میں یہ سارے پل صرف تمہارے ساتھ بتانا چاہتا ہوں۔۔۔ صرف میں اور تم۔۔۔ تم کہتی ہو۔۔ پیکنگ کر چکی ہو۔'' اس کے لہجے میں کرچیاں سی تھیں۔
''سو۔۔ سوری۔۔۔ وہ بس میرے منہ سے نکلا یوں ہی۔۔۔ میں تو بتا رہی تھی کہ میں نے پیکنگ کر لی۔''
''میرا دل پیک کر دو نا۔۔۔ میں ہر بار کور چڑھاتا ہوں۔ پھر کھل جاتا ہے مچل جاتا ہے۔ ہے کوئی ایسا بیگ، تھیلا۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چپ سی ہوگئی۔
''ہم ساڑھے نو بجے اٹھ جائیں گے'' فائزہ کے دل نے اصدق کی اذیت کے ہر پل کو خود پر ابھی ابھی جھیلا تھا۔ وہ ایک دم چپ سی ہوگئی۔ اثبات میں سر ہلا گئی۔
''بھابھی! فارا رونے لگی ہے اسے گود میں لیں۔'' آصفہ بولتے ہوئے آ رہی تھی۔ اس کی گود میں چھ ماہ کی گل گوتھنی سی فارا تھی جو نیند سے بیدار ہو کر ہونٹ لٹکا رہی تھی۔
فائزہ جوتی کی اسٹریپ بند کر رہی تھی۔ اصدق نے آگے بڑھ کر بہن کی گود سے فارا کو لے لیا۔ اسے سینے میں بھینچ لیا۔ اس کے سر سے اٹھتی مہک نے اسے بے خود سا کر دیا۔ پے در پے بوسے لیتے

ہوئے وہ گردوپیش سے بے گانہ ہوگیا تھا۔ بچی مسلسل ماں کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

''ارے میرا جانو بے بی!۔۔۔ فیری رو رہی تھی۔'' فائزہ نے دوپٹا لپیٹ کر جلدی سے ہاتھ بڑھا کر فارا کو خود میں سمو لیا۔ بچی فوراً چپ کر گئی۔ فائزہ نے ہونٹ لگائے بنا بوسہ لیا۔

''آج کے بعد میں بھی ایسے ہی ہاتھ بڑھا بڑھا کے گلا پھاڑ پھاڑ رووں گا۔'' اصدق نے آصفہ کے خیال سے دھیمے سے کہا۔ فائزہ اسے گھور کے رہ گئی۔

✿✿✿✿

''آپ نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے بھابھی۔۔۔!'' آصفہ کرسی کے پچھلے پیروں پر جھولتی ہوئی کوئی بہت موٹی سی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر چونکی۔ اونچی آواز میں حیرانگی سے پوچھا۔ کرسی سیدھی کر لی۔

خاموش، سوچ میں گم پژمردہ سی اماں نے بھی آواز کے تعاقب میں اسے دیکھا۔ وہ سوجی آنکھوں اور کسی قدر سوجے چہرے کے ساتھ کل والے گرین سوٹ ہی میں ملبوس تھی۔ پلین جارجٹ پر چکنائی اور پانی کے دھبے نمایاں ہو رہے تھے۔ بال گدی پر جوڑے کی صورت سمٹے تھے۔ اس کے چہرے پر زمانے بھر کی اکتاہٹ اور تھکاوٹ نمایاں تھی۔

''کہنے کو سارا دن سوتی رہی ہوں، مگر سر میں اتنا درد ہے۔ دراصل نیند پرسکون نہیں تھی۔ سوتی جاگتی سی کیفیت رہی۔ الٹی سی آ رہی ہے پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔'' اس کی آواز بھی بوجھل تھی۔ وہ خالہ اماں (ساس) کے تخت پر ٹکی۔

''لاؤ! میں سر میں تیل ڈال دوں۔'' اماں اپنی سوچوں سے ابھریں۔ صبح سے بیٹے کی اتری صورت دل کو بے چین کیے ہوئے تھی اور اب بہو۔۔۔ کی بدحالی۔۔۔ ان کے دل کو کچھ ہوا۔ اصدق دو ماہ کی چھٹی پر آیا تھا۔ ان دو ماہ میں فائزہ بناؤ سنگھار کر کے گویا سال بھر کے ارمان نکالے ایک سے ایک کپڑا، سولہ سنگھار، چوڑی، مہندی، پھول نکھری ستھری بہار کا پرتو۔۔۔ ان کا دل ہول سا گیا۔

''ابھی وہ اس کمپیوٹر پر آ کر بیٹھے گا تو تم ایسے ملو گی؟ میں مالش کر دوں تو نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ آصفہ بھابھی کے لیے چائے بنا دینا۔'' وہ منع کرنا چاہتی تھی مگر کمپیوٹر والی بات سن کر چونکی۔

''بچے کہاں ہیں؟'' سر پر تیل لگواتے ہوئے اسے دھیان آیا۔

''دونوں بڑے دادا کے ساتھ گئے ہیں۔ فارا کو عائزہ لے گئی ہے۔ باپ روز پارک لے کر جا رہا تھا۔ دونوں کی تو عادت بن گئی اس لیے تمہارے چچا لے گئے۔''

''وہ بھی روز روز کہاں لے کر جا سکیں گے۔ آپ منع کیجیے گا چچی جان۔۔۔!'' وہ کسلمندی سے بولی۔

''لو میں کیوں منع کروں۔ لے کر جانا ہی چاہیے۔ اس عمر کے بچے باپ، دادا کی انگلی پکڑ کر ہی باہر سیر کو جاتے ہیں۔ نانا تو بڑی ذمے داری سے ساتھ لے جاتے ہیں تمہارے چچا ہی ڈنڈی مار جاتے ہیں حالانکہ پارک کی سیر خود ان کی صحت کے لیے کتنی اچھی ہے، مگر بس نماز کے لیے مسجد جائیں گے باقی سارا دن جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے جبکہ ڈاکٹرز کہتے ہیں انہیں واک کی کتنی ضرورت ہے۔ بڑا بھائی چھوٹا لگتا

ہے۔چھوٹا بڑا۔"

"ہونہہ۔۔۔۔الف نون کی جوڑی۔" اماں نے جل کر اپنا تکیہ کلام دوہرایا۔

وہ بڑی سعادت مندی سے سن رہی تھی، زور سے ہنس دی۔ اس کے ابا عبدالجبار بڑے بھائی تھے۔ لمبے اور بے حد دبلے اور اس کے چچا یعنی سسر دن بدن موٹے سے ہوتے جا رہے تھے۔ ابا بے حد ایکٹو تھے۔ چچا اتنے ہی بیٹھنے کے شائق، بیٹھے ہیں اور کھا رہے ہیں، سو رہے ہیں، اٹھ کر بھی کھا رہے ہیں، آرام طلبی کے باعث وزن بڑھتا تھا اور پھر بڑھتے وزن کے ساتھ آنے والی تمام بیماریاں جھلک دکھایا ہی کرتیں۔ پھر سب پریشان ہوتے اگر وہ روز شام میں محض پوتا پوتی کو پارک تک ہی لے جاتے تھے تو خود کی صحت پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوتے، مگر۔۔۔ آج بھی شاید اصدق کے جانے کے باعث بچوں کو اور اپنا بھی دل بہلانے کو نکل گئے تھے، مگر دل بہلے نہ بہلے۔۔۔ حقیقت تو یہی تھی ناکہ اصدق سال بھر کے لیے بسلسلہ روزگار جا چکا تھا۔ پیچھے وہی گھر وہی لگی بندھی روٹین۔۔۔

اماں اس کے سر میں تیل لگانے کے بعد ہاتھ دھونے اٹھ گئیں اور آصفہ نے بڑے سے مگ میں چائے لا دی۔

"آپ نہا کر چائے پئیں بھابی!" وہ بولی۔

"نہا کر بھی پی لوں گی، یہ سر کا درد تو جان چھوڑے۔" وہ اکتائی ہوئی تھی۔

"اماں کو پتا لگا ناکہ آپ دو دو کپ چائے چڑھا رہی ہیں تو ڈانٹ پڑے گی۔" اس نے ڈرایا۔

"اماں کو پتا نہیں لگنے دیں گے۔" آصفہ شانے اچکا کر اپنی کتابیں سمیٹتی اندر چلی گئی۔ چائے کے گرم گرم گھونٹ اسے سکون پہنچانے لگے۔ ماحول میں پھیلا سناٹا اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ کل اس وقت کتنا شور و غل تھا۔ ایک عجب سی چہکار در و بام سے پھوٹتی تھی۔ ایک جوش، ولولہ، زندگی۔۔۔ کیا محض ایک شخص کی موجودگی زندگی کے زندہ ہونے کا اتنا گہرا احساس دیتی ہے، اس کے اندر سوال گونجا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے ٹھنڈی آہ کی صورت تسلیم کیا۔

"تو یہ چہار جانب پھیلا سناٹا چیخ چیخ کر بول رہا ہے کہ اصدق جا چکا ہے۔ کس دور دیس کا رزق باندھ دیا اللہ تعالیٰ۔۔۔

اصدق کہتے ہیں مجھے "جدائی" کا احساس نہیں۔ تب میں ہنس کر ٹال دیتی ہوں۔ یہ کیسے کہوں، مجھ میں تو اب کوئی "احساس" ہی نہیں رہا۔ ہاں میں گھر اور بچوں میں مشغول ہو کر وچھوڑے کی اذیت پر پھاہے رکھ لیتی ہوں۔ انہیں مشغول ہونے کو بھی کچھ میسر نہیں۔۔۔ بس اتنا فرق ہے، میں ہجوم میں مدغم ہو کر تنہائی کو جھڑک دیتی ہوں کہ جاؤ وقت نہیں۔۔۔ اور وہ تنہائی سے تنہائی کو کاٹتے ہیں۔ بس۔۔۔"

"لیکن اصدق پھر اور کیا یاد رکھتے؟" وہ خود سے ہم کلام بہت دور چلی گئی تھی۔

❁❁❁❁

صبح ہونے نہ دیں، ساتھ کھونے نہ دیں۔

ایک دوسرے کو ہم۔۔۔۔

پورے کمرے میں فل آواز کے ساتھ گانا گونج رہا تھا۔ جب وہ نائٹ ڈیوٹی کر کے لوٹا۔ ظفر لیٹے

لیٹے ہی ڈانس کے تمام اسٹیپ لے رہا تھا۔ اردگرد کا کوئی ہوش نہیں۔ یونہی آنکھ کھلی تو اسے کرسی پر براجمان جوتے اتارتا دیکھ کر اچھل گیا۔ دائیں بائیں ہاتھ مار کے ریموٹ ڈھونڈا۔ پہلے آواز بند کی پھر کچھ سوچ کر ٹی وی بند کر دیا۔

''یار! تیرے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔۔۔'' اس نے جھینپے انداز میں کہا۔

''اتنے شور میں ڈاکو سب صفایا کر جائیں تو اس کا بھی پتا نہیں چلے گا۔'' اس نے اسکرین پر نظر آتے جلوے کو دیکھ کر ناگواری سے پہلو بدلا تھا۔ اب بند ٹی وی کو بھی گھورا۔ ظفر شرمندہ ہوا۔

''یار! وہ صبح اٹھنے کو دل ہی نہ کرتا۔ انگ انگ درد کرتا ہے۔'' انگڑائیاں۔۔۔ ''ہائے میں نے سوچا تھوڑی ایکسرسائز ہی ہو جائے گی۔'' وہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

''صبح جاگنے اور فریش ہونے کے ہزار دوسرے طریقے بھی ہیں۔''

''ان ہزاروں میں سے ایک یہ بھی تو ہے۔'' ظفر ڈھٹائی سے مسکرایا۔ وہ چیک کی ہزار رنگی دھوتی میں ملبوس تھا۔ اوپر اورنج ٹی شرٹ جس پر قوس وقزح کے رنگوں کا شوخ دائرہ بنا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر ڈھیلی دھوتی کو دوبارہ کستے ہوئے اوپر چڑھایا اور ٹی شرٹ کو نیچے۔

''ناشتا بناؤں۔۔۔ یا آج بھی کوئی روزہ وزہ ہے؟''

''بنالو۔ مگر کیا تم کو آج کام پر نہیں جانا؟'' وہ الماری سے آرام دہ شلوار قمیص نکال رہا تھا۔

''دیر سے جاؤں گا۔ وہی جو مجھے پاسپورٹ کا کام کروانا ہے، چھٹی لی ہے آدھے دن کی۔'' وہ کپڑے بدلنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ ظفر اونچی آواز میں گنگناتے ہوئے بڑے مگن انداز میں ناشتا بنا رہا تھا۔ وہ کھانا بنانے کا کام ہمیشہ بہت مزے سے کرتا تھا۔ اب بھی گانے کی دھن کے حساب سے کام رو کر چمچ کو گلاس پر چولہے پر شیشے کی بوتل سے ٹکرا کر میوزک بھی دے رہا تھا۔

چک چک، ٹن ٹن۔۔۔

اس کے آنے تک بڑی سلیقہ مندی سے وہ دستر خوان پر ناشتا چن چکا تھا۔ کل روزہ رکھنے کے باعث نقاہت رہی اور پھر نائٹ ڈیوٹی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا، شدید تھکان کا ترجمان تھا۔ موٹی سرخ آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ وہ جلد از جلد بستر پر جانے کا خواہش مند تھا۔

''ویسے ایک بات ہے جگر!'' ظفر نے حلق تک ٹھونس لینے کے بعد بے ہودہ سی ڈکار لی۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''میں کافی دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں اور اب تو پکے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ کوئی بات ہے ضرور۔۔۔ بدلے بدلے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں میرا مطلب۔۔۔ خاموش اور اداس تو تُو پہلے بھی رہتا تھا، مگر اس بار تو عجب پریشانی میں ہے، اگر کوئی مسئلہ مسئلہ ہے تو یار شیئر کر لے میرے اس مٹکے میں۔'' اس نے اپنے پیٹ کو بجایا۔

''صرف کھانا ہضم کرنے کا کام نہیں آتا اور میں راز شاذ بھی سانبھ کر رکھتا ہوں کہہ دینے سے بوجھ کم ہوتا ہے اور۔۔۔''

''وہم ہے تمہارا۔۔۔'' وہ لیٹنے کے لیے تکیے جما رہا تھا۔ ذرا سا ٹھٹکا پھر فوراً مکر گیا۔

''اوئے کوئی وہم شہم نہیں ہے، میں ثابت کرسکتا ہوں۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھا۔
''پہلے سرکار جی میرے ہاتھ کی کٹی پیاز کی بھی تعریفیں کرتے تھے اور آج میں نے اتنا اسپیشل انڈا بنایا۔ ساتھ زیرے اجوائن والے پراٹھے۔۔۔ اور جناب ایک لفظ تعریف تنقید کا کیے بغیر سب اڑا گئے۔ مجال ہے جو منہ سے کچھ کہا ہو۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے جواب۔۔۔''
''اوہ سوری۔۔۔'' وہ بری طرح چونکا۔ اس نے بے ساختہ دسترخوان کی جانب دیکھا جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں واقعی پراٹھوں کا ذائقہ بہت عمدہ تھا۔ اس نے خوب لطف اٹھایا تھا۔ انڈا بھی مزے دار۔۔۔ مگر اس نے تعریف نہیں کی تھی۔ ظفر کا شکوہ بجا تھا۔
وہ دونوں ڈیڑھ برس سے یہ روم بانٹ رہے تھے۔ ظفر یاروں کا یار تھا۔ شروع شروع میں یہاں آنے کے بعد اسے رہائش کا مسئلہ ہوا تھا۔ رہائش تو کمپنی کی طرف سے تھی، مگر کمرے بانٹنے پڑ گئے تھے اور روم میٹس اسے کبھی پسند نہیں آئے۔ وہ بے حد صفائی پسند، طریقے سلیقے والا بندہ تھا۔ جبکہ باقی پاکستانی ہوں، انڈین ہوں یا اور بھی کوئی دوسرے عجب چنگڑ خانہ بنا کر رہتے تھے۔ گندے کپڑوں کے ڈھیر، گندے تکیے، بکھری چیزیں، دیواروں پر لگی بے ہودہ برہنہ تصاویر۔۔۔ فحش گفتگو۔۔۔ یہ سب اس کے مزاج کے برخلاف تھا اور اسے دوسروں سے کیا لینا دینا، مگر اس کے تولیے اور تکیے تک کو جس کا جب دل چاہتا، استعمال کر لیتا پر بات آئی تو برداشت جواب دے گئی۔ وہ شروع شروع کا وقت تھا۔ ابھی اسے پیر جمانے تھے، علیحدہ کمرا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے گھر بھی پیسے بھیجنے پڑتے۔ وہ ہمیشہ کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ بس بہنوں کی شادیاں، گھر اور اتنے مزید پیسے کہ واپس جا کر اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا جا سکے یہاں آمدنی اچھی تھی تو محنت بھی پوری تھی۔ بے ایمانی کا کیا سوال۔۔۔
دو سال پہلے ظفر اس کی کمپنی میں اسی کے رینک پر آیا۔ ڈے اور نائٹ ڈیوٹی کی شفٹ میں۔۔۔ بظاہر دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ مگر نہ جانے کب دوستی ہوگئی اس میں بھی ظفر کی ہنسوڑ فطرت کا زیادہ ہاتھ تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کے شانو پر بازو جما کر ''ساری باتیں'' ایک ہی سانس میں کرنے والا بندہ تھا۔ اسے جیسے ہی اس بات کی خبر ہوئی کہ وہ اپنی صفائی پسند فطرت اور جدا مزاج کے باعث سب ہی سے الگ رہتا ہے، فوراً آفر کر دی۔
''یار! صفائی پسندی کا تو ہمیں پتا نہیں پر گندے خیر ہم نہیں ہیں، ابھی سیٹنگ بھی صحیح نہیں ہے، ساری کمائی علیحدہ کمرے پر لٹانے کا کیا فائدہ۔۔۔ آپ کے بھائی کے پاس اپنا کمرا موجود ہے، یہ بڑا کمرا، کچن، باتھ روم اور گیلری بھی۔ میرے ساتھ آجاؤ۔ اویار! کوئی عادت شادت بری بھی لگی تو اتنا آمنا سامنا نہیں ہونا۔ تم رات کو تو ہم دن والے۔۔۔ اور ہم گھر میں تو تم باہر۔۔۔ باقی آپ کا جگر صفائی کرے نہ کرے گندگی بہر حال نہیں کرتا، آزمائش شرط ہے۔'' ظفر نے شانے پر ہاتھ رکھ کے اس یقین و تفصیل سے سمجھایا کہ وہ قائل ہو ہی گیا۔
وہ دونوں ایک ہی ڈپارٹمنٹ کے ڈے نائٹ انچارج تھے، مگر ظفر کی بے فکری کی وجہ یہ تھی کہ وہ کئی سالوں سے یہاں تھا اور اسے پاکستان پیسے بھیجنے کے حوالے سے اتنی فکر نہیں تھی جتنا پریشر اس پر تھا۔ ظفر کو زندگی بھر یہیں رہنا تھا۔

''او آپ کا جگر آزاد بندہ ہے۔۔۔اسے ایسی ہی کسی جگہ پر رہنا تھا۔'' وہ اپنی آنکھ میچتے ہوئے بولا۔ ''بھلے اُدھر پنڈ میں زمینیں ہیں کمیوں کی سلام دعا صبح وشام ملے، مگر اس میں کیا مزا۔۔۔ادھر بیوی بچے ہیں۔ میرے بھیجے پیسے فالتو ہی سمجھو، وہ سال کا دانہ اٹھاتے ہیں۔ آپ کی بھابھی یہ سونے میں پہلی نمائش لگاتی ہے۔'' وہ پہلی رات ہی اسے اپنا سارا حدود اربعہ بتا رہا تھا۔

''او میں کبھی جانے کا بولوں تو کہتی ہے کیوں تسی کرائے نوں اگ لانی اے۔ اتنے پیسوں کے بسکٹ خرید کر بھیج دیں بسکٹ تو سمجھتے ہو نا۔۔۔چوبیس کیرٹ کے بسکٹ، ہاہاہا۔''

''اپنے اپنے مجاز (مزاج) کی بات ہے اور تو کہتا ہے واپس جانا اے۔''

وہ خاموش رہ گیا۔ پیسوں کا مطالبہ تو اس کے گھر کی طرف سے بھی تھا۔ ہاں منہ سے کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہ خود ہی جانتا تھا، لیکن اسے واپس جانا تھا اپنے گھر۔ اپنا شہر، اپنے لوگ۔ سب اذیت ناک سوچیں اس کے اندر پھونکنے لگیں تو سر جھٹک کر ظفر کی جانب متوجہ ہوا۔

''تو آپ ادھر آئے ہی کیوں؟''

(جب پیسوں کا مسئلہ نہیں تو کیوں دور دیس کی خاک چھانی جائے)

''شریکوں کے بندے قتل ہو گئے تھے وڈے پا جی سے، وہ ہماری مٹی سونگھنے لگے۔ میرے ابا جی نے فوراً ٹکٹ کٹا کر بھیجا کہ معاملہ ٹھنڈا ہو گا تو واپس آ جانا پر اب واپس کون کافر جائے؟'' اس نے معنی خیز قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ نہ سمجھا بس سر ہلا گیا۔

''جتنا یہ کمرا میرا، اتنا ہی تیرا۔۔۔جیسے دل چاہے استعمال کرنا۔ میں غلطی کر دوں تو بتا دینا۔ اپنی مرضی کی صفائیاں کرتے رہنا، میرا کوئی دخل نہیں۔ اتنے سارے کمیوں، شودوں میں تو کھرا ہی لگا ہے۔''

اور چار سال تک کی بے چین، بے آرام زندگی کو قرار مل گیا۔ بے ضرر بندہ تھا۔ ہنسنے ہنسانے والا، دونوں کا ٹاکرا کم ہوتا، ایک آتا تو دوسرا جاتا، ویک اینڈ پر ظفر کی اپنی مصروفیات تھیں۔ زندگی میں کئی جانب سے سکون پیدا ہو گیا تھا۔

شروع میں تو قدم جمانے اور فوری طور پر آمدنی حاصل ہونے کے لیے اس نے کوئی بھی کام پکڑ لیا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ جب وہ یہاں کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تو اچھی نوکری کے مواقع ظاہر ہونے لگے۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ انگلش بولنے اور لکھنے پڑھنے میں مہارت تھی۔ کام کے ساتھ ساتھ مختلف کورسز کیے تو ایک دن رجتبے، آمدنی، آسائشوں کے اعتبار سے بہت اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ ظفر اسی عہدے پر کام کرتا رہا مگر بے حد مختلف مزاج ہونے کے باوجود دونوں کا ایک دوسرے سے دل مل گیا تھا۔ ظفر کھانے بہت اچھے پکاتا تھا۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا تو وہاں حسب معمول ایک کہانی تیار۔

''یار پنڈ کے نائی کے دونوں منڈوں سے میری پکی دوستی تھی۔ اس کا باپ سمجھتا تھا میرے ساتھ رہ، رہ کر وہ آوارہ ہوں گے کہ میرے باپ کی تو زمینیں ہیں، ہنر ہو نہ ہو دانے مل جائیں گے مگر نائی کے منڈے کو باپ کا ہنر ہر صورت سیکھنا ہی ہے۔ جب موقع ملتا گنڈے (پیاز) چھیلنے پر لگا دیتا۔ میں مجبور ان کے ساتھ گنڈے کاٹتا۔ مسالے کوٹتا کہ کام جلدی ختم ہو تو کھیلنے جائیں۔ کھیل تو گیا جہنم میں اور مجھے آ گئیں دیگیں بنانی۔۔۔حق ہا۔'' ظفر کی آنکھوں میں ماضی ہلکورے لے رہا تھا۔

''زندگی میں جتنی مار اس دن اباجی کے ہاتھوں پڑی ہے نا، اتنی ساری زندگی کی کُٹ بھی اکٹھی کرلو نا تو نہ پڑے ہاہاہاہاہا۔''

ظفر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ وہ بھی ساتھ ساتھ قہقہے لگانے لگا۔ زندگی میں اب سکون آ گیا تھا۔

اب وہ اپنے پسند کے صاف ستھرے ماحول میں رہ رہا تھا، اچھا لباس، بات ضرورت سے ہٹ کر خواہش تک چلی گئی تھی۔ ظفر کی بدولت اچھا، بلکہ بہت اچھا کھانا، جیسے ہر شے اپنے ٹھکانے پر، ایک ترتیب اور نظم۔

لیکن انسان کی فطرت عجیب ہے۔

بھوکا ہو تو روٹی کی فکر۔

پیٹ بھر جائے تو لباس۔

لباس کے بعد چھت۔۔۔ پھر چھت کے لوازمات۔

اور ہر شے پالے تو خوامخواہ کی دوسری ضروریات سر اٹھانے لگتی ہیں۔

پہلی ضرورت، آخری۔۔۔ اور آخری ضرورت پہلی بن جاتی ہے۔ انسان کو سب چاہیے، جو جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔

وہ اپنی حالت پر خود اپنے آپ سے بھی خفا تھا۔

بہت سی چیزوں کے لیے کچھ چیزوں کو غیر اہم سمجھا جاتا اور اب جب غیر اہم کر دی جانے والی چیزیں گریبان پکڑنے آ رہی تھیں تو۔۔۔ اس کے پاس حال نہیں تھا۔

وہ تکلیف و اذیت کی انتہا پر تھا۔

انسان فطرت پر جیتا ہے۔

لیکن فطرت کے کچھ تقاضے اور بھی ہیں اور اگر۔۔۔ وہ سیدھے رستے سے پورے نہ ہوں تو۔۔۔ آرام سے نہ ملیں تو چھین لو۔

کچھ مسئلے کسی سے بانٹے بھی نہیں جا سکتے۔ وہ اپنے آپ میں گم تھا۔ مگر نہیں۔

ظفر اسے دیکھ رہا تھا۔ بھانپ رہا تھا۔

''یار! دو سال کا ساتھ ہے۔ تو بہت سوں سے الگ ہے، اپنے مزاج کا بندہ۔۔۔ مگر ہم ساتھ رہتے ہیں۔ میں اپنے گھر کا چھوٹا پتر تھا۔ مجھ سے چھوٹا کوئی نہیں۔ تو مجھے چھوٹے بھائی ہی کی طرح عزیز ہے۔ کوئی بھی چھوٹی بڑی پریشانی ہے تو اپنے جگر سے کہہ اور میرے پاس ہر مسئلہ کا حل ہوتا ہے، آزمائش شرط ہے۔'' ظفر برتن اٹھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھے بغیر بولتا جا رہا تھا۔

''اب تو ماشاءاللہ سے تُو نے بڑے چھوٹے بہت سے کام نپٹا دیے ہیں۔ بجائے اس کے تُو خوشی سے بھنگڑے ڈالتا۔ پارٹی شارٹی کرتا۔ بابا چپ شاہ بن گیا ہے۔ مانتا ہوں ہر بندے کے اپنے دل کی باتیں۔ سو مسئلے مسائل، مگر تیری یہ اتری صورت برداشت نہیں ہوتی۔ اتنا یاد رکھ نہ بتانے والی باتیں بھی کسی نہ کسی کو بتانی پڑتی ہی ہیں۔ گھر سے بجائے اس کے خوش آئے تو بڑا اداس بیمار ور آن (ویران) ہو کے آیا ہے۔ بیمار شار لگتا ہے۔ تُو بدل رہا ہے۔ نماز، روزے بھی اچھی بات ہے۔ ہم گناہ گار بندے

ہیں۔ پر دل کی کہہ سن لینا تو کسی مذہب میں منع نہیں۔ مجھ سے کہنے والی بات نہیں تو کسی سے کہہ دے۔ مگر چپ نہ رہ، کھویا کھویا گم صم۔۔۔ خیر۔" وہ ساتھ ساتھ تیار ہونا شروع ہو گیا تھا۔" میرے پاس چابی ہے۔ میں آرام سے آؤں گا تو نیند پوری کرنا اور آج کوئی روزہ بھی نہ رکھنا۔ ویسے دیکھنے میں تو۔۔۔ تو ہٹا کٹا ہے مگر مجھے لگتا ہے تجھے کوئی تکلیف ہے۔ کوئی بڑی ہی اذیت۔۔۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔ بتانے سے حل نکلتا ہے۔ میرے پاس بڑے آئیڈے ہوتے ہیں۔"

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ ظفر کے آخری جملوں پر کرنٹ کھاتے انداز میں چونکا۔

❁ ❁ ❁ ❁

مسلم آباد کے قصباتی ماحول میں بہت مضبوط بنیاد کے ساتھ اٹھایا جانے والا چھ کمروں کا یہ گھر اصدق اور فائزہ کے دادا نے دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دیا تھا۔ بڑے بڑے تین کمرے، ایک گول کمرا اور آگے کھلا صحن اصدق کے والد عبدالقیوم کو ملا اور یہی ترتیب فائزہ کے والد عبدالجبار کو ملی۔ بظاہر گھر ایک تھا، درمیان میں ایک سیدھی دیوار اگر اٹھا دی جاتی تو برابر حصے۔۔۔ لیکن فائزہ کی شادی تک دیوار اٹھانے کی نوبت نہیں آئی کہ دونوں کی مائیں سگی بہنیں تھیں۔

ہاں شادی طے ہوتے ہی عبدالجبار نے دیوار بنوالی تھی کہ بیٹی کی سسرال ہے۔ ایک حد بندی ضروری ہے۔ چھوٹے بھائی عبدالقیوم کی شدید ناگواری کو انہوں نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا تھا۔

دونوں بھائی، باپ کا چھوڑا جنرل اسٹور بہت حسنِ سلوک سے سنبھال رہے تھے۔ کوئی فرق یا بدنظمی کھوٹ کا گمان بھی نہیں تھا۔ بیویوں کا پہننا اوڑھنا تک ایک جیسا تھا۔ شروع میں کھانا پکنا بھی اکٹھا تھا جو بعد میں بوجوہ علیحدہ کر لیا گیا۔

اس منصفانہ تقسیم کے باوجود عبدالقیوم کے گھر خوش حالی کا دور دورہ تھا اور عبدالجبار کے گھر کھینچا تانی۔۔۔ سر اور پیروں کے بیک وقت ڈھکنے کی کشمکش۔۔۔ کیونکہ عبدالجبار اولاد کے معاملے میں خود کفیل تھے۔ اوپر تلے کی پانچ بیٹیاں جبکہ عبدالقیوم کے ہاں پہلی اولاد اصدق نے اس وقت جنم لیا جب عبدالجبار کے ہاں تیسری بیٹی فائزہ جنم لینے والی تھی۔ چھ سال کی بے اولادی کے بعد ملنے والی اولاد۔ اصدق کے سات سال بعد عارفہ اور عارفہ کے آٹھ سال بعد آصفہ۔

عبدالقیوم کے گھر میں وہی آمدنی جایا کرتی تھی مگر یہاں خرچ کم تھا۔ ایک غیر محسوس سا فرق اب محسوس ہونے لگا تھا۔ اصدق گھر کا واحد بچہ تھا۔ سارے گھر کی توجہ کا مرکز۔ اسے عبدالجبار کی بیٹیوں کی بہ نسبت اچھے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروایا گیا کہ لڑکا ہے اچھی تعلیم تو پھر اچھے مواقع۔۔۔ کوئی اعتراض نہیں۔ مگر جب ننھی عارفہ نے بھی ضد باندھ لی کہ وہ تایازاد بہنوں والے اسکول میں نہیں پڑھے گی وہ بھیا کے ساتھ جائے گی تو۔۔۔ بنا کسی مشکل کے اسے بھی اسی اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔

منتوں، مرادوں کے بعد ملنے والی اولاد کے لباس، خوراک، ضروریات کا خیال زیادہ رکھا جاتا تھا۔

جب فائزہ کی والدہ پانچ بیٹیوں کے پانچ جوڑے بناتیں تب اصدق کی امی ایک بیٹی کے پانچ جوڑے بنا لیتیں۔ فرق پیدا ہو جاتا۔

مادی حوالوں سے پیدا ہونے والا فرق نمایاں ہوتا تھا مگر روحانی حوالے سے بھائیوں یا بہنوں کے

دلوں میں کوئی تقسیم نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی (اصدق کے والد عبدالقیوم) بنا بتائے جتائے بڑے بھائی کی اور گھر کی بہت سی ضروریات پوری کر دیا کرتے۔ گوشت، سبزی، پھل، دوا دارو، بچیوں کے لاڈ، چھوٹی چھوٹی خواہشات، ضروریات جو ابا سے کہنے میں گھبراتیں یا اپنی اماں سے کہیں تو ڈانٹ پڑے گی۔ وہ چچا اور خالہ سے منوا لیتیں۔

''خالہ امی فنکشن میں جانے کے لیے نئے جوڑے بنا دیں۔'' ناعمہ کہتی۔

''میرے پاس میچنگ جوتا نہیں ہے اور امی نے منع کر دیا ہے۔'' عائزہ بسورتی۔

''میں اپنی دوستوں کی دعوت کر رہی ہوں چچی اماں۔۔۔ امی چائے بسکٹ پر ٹرخا رہی ہیں۔ آپ چھولے اور کباب چپکے سے بنا دیں گی نا۔'' فائزہ کو بس کہنا ہی ہوتا تھا۔

اصدق کے بعد عارفہ سات سال بعد آئی۔ اس درمیانے عرصے میں زائرہ اور رائحہ اپنی خالہ پلس چچی کے ہاتھ کا کھلونا ہی رہیں۔ وہ اپنی اماں سے زیادہ عتیقہ بیگم کے ساتھ پائی جاتیں۔ بڑی بہن اور جیٹھانی حسنہ بیگم اپنی بیٹیوں پر بہن اور دیور کی نوازشیں دیکھتیں۔ بعض اوقات وہ نوازشوں کو حق سمجھ کر آنکھ بچا لیتیں۔ بعض دفعہ احسان مانتے ہوئے مشکور ہوتیں اور کبھی کبھار بچیوں کو سرزنش بھی کرتیں کہ منہ پھاڑ کے فرمائشوں کا پلندہ لے کر نہ جایا کریں اور شروع میں بچیاں نا سمجھ تھیں۔ سنی ان سنی کرتیں یا ماں کا چہرہ دیکھتی رہ جاتیں۔ بعد میں بھول بھال جاتیں۔

خوامخواہ کی نصیحتیں، آخر کو وہ عتیقہ بیگم خالہ ہیں اور عبدالقیوم پیارے چاچو۔۔۔ امی تو بس ایسے ہی۔

لیکن پھر ماں کے جواز پر جواب دینے کے قابل ہوگئیں، تب اپنے حساب اور مزاج سے صفائی دیتیں۔

ناعمہ بڑی تھی۔ وہ چیزوں کو جلدی سمجھ لیتی تھی۔ فطرتاً ہوشیار، دور بین اور کسی قدر خود غرض واقع ہوئی تھی۔ سیدھی بات تھی اماں، ابا اگر فلاں کام نہیں کر سکتے اور خالہ، چاچو کر سکتے ہیں تو۔۔۔ تو۔۔۔ کر دیں۔۔۔ کرنا چاہیے دیٹس اٹ۔۔۔ عائزہ کی سوچ واضح نہیں تھی۔ وہ کبھی اپنی اماں کی مان لیتی، کبھی ناعمہ کی پیروی کرتی۔ زائرہ اور رائحہ چھوٹی تھیں وہ بڑی بہنوں کی سوچ لے کر پروان چڑھیں۔

اصدق کا معاملہ یہ تھا کہ وہ گھر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں، باپ کی تو طویل انتظار کے بعد کی اولاد تھا مگر خالہ اور تایا کی بھی آنکھ کا تارا، اصدق سے محبت میں کوئی ملاوٹ یا فرق نہیں تھا۔ سب اپنے حساب سے اس پر جان چھڑکتے۔ باپ اور تایا اسے ہمہ وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے۔ وہاں سے فرصت ملتی تو حسنہ بیگم کی آغوش۔۔۔

ناعمہ اور عائزہ کے لیے چھوٹا بھائی۔۔۔ زائرہ اور رائحہ کا بھائی جان۔

اب رہ گئی فائزہ۔۔۔ وہ بھی اصدق سے بہت پیار کرتی تھی۔ بے حد لگاؤ، پروا، فکر۔۔۔ مگر نہ چھوٹے بھائی کی طرح۔۔۔ نہ بڑے بھائی کی طرح۔۔۔ بس محبت ایک لگاؤ جو عتیقہ بیگم کی گود سے پھوٹا، انہوں نے بیٹے اور بھانجی کو ایک پیالے اور ایک چمچے سے کھانا کھلایا تھا۔ ایک پنگھوڑے میں ڈال کر لوریاں دیں تھیں۔ اصدق نے سائیکل چلانا سیکھی تو پیچھے کی سیٹ فائزہ ہی کو ملی۔ پہلے ماں اور خالہ سے کہانیاں سنتی تھی۔ پھر نونہال پر آگئی۔ پھر ناولز، افسانے۔۔۔ اسکول، کالج، دوستیں، بچپن کی کہانیوں

میں گھوڑے پر سوار شہزادے کی آمد کی نوید تھی۔

اور۔۔۔

جوانی میں ناولز کے ڈیشنگ ہیرو گدگداتے تھے۔ خوبرو، پڑھا لکھا صاحبِ حیثیت، برسرِ روزگار، خوابوں کا شہزادہ۔

فائزہ کے پاس شہزادہ تھا۔ وہ خوبرو تھا اتنا کہ آنکھ بھر کے دیکھنے کے لیے دل چاہیے، وہ پڑھا لکھا تھا، وہ صاحبِ حیثیت بھی تھا کہ فائزہ کے انمول دل کا مکین تھا مگر یہ سکونت مکین و مکان کے انفرادی غرور کا باعث تو تھی۔ اجتماعی فائدہ نہیں۔

فائزہ کے شہزادے میں شہزادوں والے سارے گن تھے۔ مگر یہ شہزادہ ''غدر'' کے بعد کا شہزادہ تھا، خالی ہاتھ۔۔۔ خالی کھیسہ۔

زندگی سیدھا ہموار راستہ نہیں تھی۔ تنگ، گول سیڑھیاں، پھولتی سانس کے ساتھ گردن اٹھائے مزید کتنا اوپر کا سوال لیے نئی ہمت کے ساتھ جاری و ساری۔ مگر ایک کے بعد ایک اٹھتا، قدم بلندی، منزل کے قریب کر دیتا کبھی نا کبھی۔

لیکن ایک جست میں اگر چار، چار اسٹیپ لینے پڑ جائیں تو دونوں ہاتھوں سے ریلنگ تھامنی پڑتی ہے بلکہ ساری ہمت مجتمع کرنی پڑتی ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی یا ڈولتا قدم منہ کے بل گرا دے گا۔

اور ناعمہ کی شادی ایسی ہی ایک جست تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے رواں راستے کی پہلی جست۔۔۔ لیکن پار ہوگئی۔

ناعمہ کی شادی گھر کی پہلی شادی تھی۔ بنا کہے سنے ذمے داریاں نپٹ گئیں۔ کچھ ارمان بھی زیادہ تھے اور کچھ ناعمہ کے لیے ہر شے خرید لینے کی خواہش۔۔۔ (خواہش یا ہوس؟) لیکن پہلی۔۔۔ پہلی بار کے چاہ میں دونوں بھائیوں نے سارے وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

ناعمہ کی شادی کے وقت اصدق بیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ باپ اور تایا کا فرماں بردار تھا۔ کالج جاتا تھا اور جنرل اسٹور دیکھتا تھا۔ فائزہ سے اس کی دوستی بڑی ستھری پاکیزہ سی تھی۔ ان کا باہمی لگاؤ ایک اشارہ تو تھا اور اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اپنی سادہ دلی اور من موجی طبیعت کے باعث سب بڑوں کی وہ پسندیدہ تھی۔

اس کے مزاج میں ناعمہ جیسی ''میں'' نہیں تھی۔ عائزہ جیسا غصیلا پن اور ضد بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ زائرہ، رائحہ کی طرح لاپروا بھی نہیں تھی۔ وہ حساس اور دردمند تھی۔ حالات کو دیکھ کر کڑھتی تھی۔ کاش وہ سب کے لیے کچھ کر سکے۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں وہ گریجویشن کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانے لگی۔ یوں ہی وقت گزاری اور پرس میں تھوڑے سے پیسے۔

عائزہ رشتے کے انتظار میں تھی۔ وہ بھی اسکول جایا کرتی۔ مگر دونوں کی آمدنی کا مصرف جدا تھا۔ عائزہ اپنی تنخواہ کو بڑے اہتمام سے خود پر خرچ کرتی۔ وہ فزکس، بائیولوجی پڑھاتی تھی۔ اسکول میں اسے سب سے اچھا پیکج ملتا تھا۔ حسنہ بیگم ہر ماہ اسے خود کو سنوارنے کی تگ و دو دیکھتیں تو کبھی ٹوک دیتیں۔

''جوڑے، جوتے اور بٹوے بھر کے رکھے ہیں الماریوں میں۔۔۔ نرا پیسے کا ضیاع۔۔۔ ہر روز

نئے انداز کی تیاریاں۔۔۔سوٹ مہینے سے پہلے ری پیٹ نہیں ہونا چاہیے، کیا اسکول والوں نے شرط رکھ دی۔ ہونہہ۔۔۔اس دن بازار میں بیڈشیٹس کی سیل لگی تھی۔ ایسی ایسی شان دار چادریں، کھیس، کشنز اتنا میں نے چاہا کہ کچھ لے لوں اس کے لیے پیٹی میں ڈال لوں گی۔ مگر ذرا سا بھی دھیان نہیں دیا۔ اتنا مہنگا وہ کلف لگانے والا سوٹ خریدا، یہ جا وہ جا۔ سوٹ دھونے میں ڈالا تو جیسے کاغذ کی لگدی بن گیا سب کا سب۔۔۔"

"مجھے تو آپ کی باتوں کا ایک حرف، قسم ہے جو سمجھ میں آیا ہو۔" عائزہ بھنائی۔ "آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟ جوڑے جوتے، ضرورت ہیں جب ہی خریدتی ہوں۔ فوجی اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ فائزہ کی طرح گلی کی نکڑ کے اسکول میں استانی بن کر نہیں جاتی میں۔۔۔اور یہ سیل کا اور بیڈشیٹس کا کیا چکر ہے؟ کہیں آپ یہ تو نہیں کہہ رہی ہیں کہ میں اپنی تنخواہ سے اپنے جہیز کے لیے بیڈشیٹس خریدوں، جوسر، بلینڈر اور استری۔۔۔ہونہہ۔۔۔یعنی پیٹی بھروں۔" اس نے نخوت سے گردن اکڑائی اور بالوں کو جھٹکا دیا۔

"جہیز کی چیزیں خریدنا جمع کرنا آپ کا کام ہے۔ جیسے ناعمہ کے لیے خریدیں ویسے ہی میرے لیے بھی لیں اور دوسرے سیل کا کیا مطلب ہوا۔" اس کا انداز جارحانہ تھا۔ "آپ میرا جہیز سیل کے خریدے سامان سے بنائیں گی؟"

حسنہ بیگم گڑبڑا گئیں۔ "تو کیا سیل انسانوں کے لیے نہیں لگتی، کوئی آسمانی مخلوق اترتی ہے بازاروں میں اور سیل میں کیا برائی، جہیز کے لوازمات سوا لاکھ، جہاں سے جو اچھا ملے لیتے جاؤ ہم کون سے لینڈ لارڈ ہیں۔۔۔"

"امی! مجھے مثالیں نہ دیں اور کم چیزیں دے دینا، مگر سب فینسی اور اے کلاس۔" بس وہ ان کی کہی ایک بھی بات پر کان نہ دھرتے ہوئے اپنی فرمائش بہ انداز حکم سنا گئی۔

عائزہ کا رشتہ اچانک ہی طے پا گیا۔ اپنے بھانجوں کو پک اینڈ ڈراپ کرتے نثار احمد جی جان سے اس پر نثار ہو گئے۔ رشتے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ ناعمہ پچیس برس میں بیاہی گئی تھی اور اب عائزہ پچیس کی تھی۔ سال ڈیڑھ سال کا وقت لینے کا ارادہ تھا۔ مگر دوسری جانب سے چٹ منگنی کے بعد پٹ بیاہ کا ارادہ تھا۔

ایک نئی مشکل۔۔۔بے حد مشکل۔

اصدق پڑھنے، لکھنے کا شوقین تھا۔ اس کے بہت سے خواب تھے۔ مگر اس نے خوابوں کی گٹھڑی کو کسی کونے میں ڈال کر میدانِ عمل میں قدم رکھ دیا۔ عائزہ کی فوری شادی مالی اعتبار سے سارے گھر کا مسئلہ تھا۔ اس بار کمیٹیوں کے شروع کے نمبرز لیے گئے۔ تمام جمع جتھا نکالا گیا اور آخر میں کچھ ادھار کے ساتھ عائزہ اپنے گھر سدھاری۔

حسنہ بیگم اور عبدالجبار کی دوسری بیٹی بھی بہت عزت سے اپنے گھر بار کی ہو گئی تھی۔ پیچھے فرض کی بجا آوری کا سکون تو تھا مگر مالی معاملات نے دن اور رات کا چین برباد کر دیا۔ نمبرز کے چکر میں ڈالی گئی کمیٹیاں لیتے وقت بڑا مزا آیا تھا مگر اب ان ہی کو ہر ماہ بھرنا بہت مشکل تھا۔ گھر کے خرچ کو کہاں تک روکا جا سکتا ہے۔

دوسری جانب جنرل اسٹور کے مقابل کئی نئے اسٹورز کھل گئے۔ جہاں توجہ کھینچتی پرکشش چیزیں تھیں۔ اِدھر ان دونوں بھائیوں کا کاروبار انحطاط کا شکار ہو رہا تھا۔ وہی لگی بندھی اشیائے ضروریہ۔
اصدق کب کا پڑھائی کو خیر باد کہہ کر نوکری میں جت گیا۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی کا طوفان۔۔۔ عارفہ چھوٹی تھی اور آنے والے دو، تین سالوں میں فائزہ اور زائرہ رائحہ بھی۔۔۔؟
اصدق جھرجھری لے کر بیدار ہو گیا۔ آنے والے وقت کی ضروریات اور ترجیحات اور فرائض۔۔۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مستقبل کے حوالے سے مضبوط اقدام کیے جاتے۔ وہ بہت اچھی، اعلا پڑھائی کرنا چاہتا تھا مگر اچھی پڑھائی افورڈ نہ کر سکا۔ وہ بہت اچھے عہدے پر ملازمت کرنے کے خواب دیکھتا تھا مگر۔۔۔ یہ بھی ناممکنات میں سے تھا۔ اس ملک میں ایک سے ایک انمول رتن خوار ہو رہے تھے۔ اس کے پاس تو پھر کچھ بھی نہ تھا۔
ادھوری پڑھائی، بنا تجربے کے وہ کون سا تیر مار لیتا۔ بات اگر اپنی زندگی کی ہوتی تو ریت کے گرد پٹی بندھی آنکھوں والے بیل کی زندگی میں بھی کیا برائی تھی۔ کام سے تو بیل بھی لگا ہی ہوتا ہے مگر اس کی زندگی پر بہت سے لوگوں کا حق تھا۔
وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ گھر کے سب لوگ سوچ رہے تھے مگر ان کی امید کی کرن وہ ہی تھا اور۔۔۔ وہ متوسط طبقے کی سفید پوشی کا بھرم، ذمہ داریاں اور حل نکالنے کو سر دھڑ کی بازی لگائے انسان، خوشیاں اور خوش حالی ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کھو جاتے۔ ساری زندگی تگ و دو اور نتیجہ لاحاصل۔
پنکھے کے تین پر چل رہے ہیں تو دائرہ، رک جائے تو الگ الگ سمتیں، متوسط طبقے کا انسان اسی پنکھے سے مشابہ ہے۔ چلتا رہے تو ٹھیک ہے، رک جائے تو خوشیاں، خوش حالی، طمانیت سب الگ الگ سمتوں میں منہ موڑ کر جدا کھڑی ہو جاتی ہیں۔
پریشانی ہی پریشانی۔۔۔ عبدالقیوم نے بڑے بھائی کو پریشانی سے بچانے کے لیے خود کو پیش کیا تھا۔ اب وہ خود کیا کریں، کوئی حل نہیں۔ اکلوتے بیٹے کا دکھایا جانے والا خواب، ایک بڑا اسٹور، خوش حالی، کامیابی اور دوسری جانب انہیں دل کا دورہ پڑا۔
پہلے مرحلے پر شادی ٹل گئی، لیکن وقتی طور پر۔۔۔ شادی ٹالے جانے والی چیز تو نہیں تھی، چار، چھ مہینے بس۔
''تم اسٹور کو بڑھاؤ آمدنی بڑھے گی تو عارفہ کے لیے زیادہ بچت ہوگی۔'' تایا عبدالجبار کا وقتی طور پر یہ آئیڈیا کام کرتا تھا مگر یہ وقتی حل تھا۔ دیرپا ہرگز نہیں۔
''یہ کمیٹیاں ختم ہوں تو اسی طرح شروع کے نمبر لیے جائیں اور پھر اسٹور کو تھوڑا بڑھایا جائے۔ نیا مال ڈالا جائے، کچھ بیکری کارنرز اور جوسز وغیرہ کے اسٹاک۔۔۔ نئے شوکیس اور متوجہ کرنے والی ترغیبات، اس حکمت عملی سے یقیناً فرق پڑے گا اور کامیابی ہوگی۔'' اصدق کے پاس پورا پلان تھا۔
''ایک بار نئے انداز سے آغاز کیا جائے تو لوگ خود بخود آئیں گے۔''
عبدالقیوم اور عبدالجبار کو اس کا یہ آئیڈیا بے حد بھایا۔ واقعی پرانے انداز کے ریکس میں رکھے پرانے طرز کے ڈبے گاہک کی دلچسپی کا باعث نہیں رہے تھے۔ اجناس کی بو۔۔۔ اور خالی ریکیں۔۔۔

اصدق کی ساری باتیں درست تھیں۔ گاہک تو چمکتی چیز ہی کی جانب جائے گا نا۔

''مال بھرتے ہی گاہکوں کا رش لگ جائے گا۔ آپ دیکھیے گا۔'' اصدق پُر یقین اور پُرعظم تھا۔

لیکن نئی کمیٹی شروع ہونے اور نمبر ملنے تک عبدالقیوم کے دیرینہ دوست جنھوں نے اپنی دوستی کو مزید مضبوط کرنے کے لیے سالوں پہلے عارفہ کو مانگ لیا تھا وہ ایک روز شادی کا مدعا لے کر حاضر ہوئے۔

''وہ ابھی بہت چھوٹی ہے، صرف اٹھارہ برس کی اور اس کی تو پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی۔ بی اے تو کر لے اور اسے شوق بھی بہت ہے۔''

''بھائی عبدالقیوم صرف آپ کی بیٹی نہیں، ہمارا بیٹا بھی چھوٹا ہے بلکہ وہ ہمارے گھر کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ سب آل اولاد اپنے ٹھکانے پہنچا دی اب ہم چراغ سحری ہیں۔ بیماری کی پوٹ، ہمیں اس فرض سے بھی سبک دوش ہونا ہے۔ آپ بس تاریخ دیں۔'' وہ ہر بات طے کر کے آئے تھے۔

اور یہاں صرف پڑھائی اور کم عمری ہی تو مسئلہ نہیں تھی۔ یہاں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ چاروں بڑوں اور اصدق کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''اور ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیے، صرف عارفہ۔۔۔ بس۔'' دوست واقعی دوست تھا، وہ جیسے سب بھانپ گیا تھا۔ لیکن کہا تو ایسے ہی جاتا ہے مگر ایسے کیا تو نہیں جا سکتا نا۔

شادی تو کر ہی لی جاتی، بہت اچھے طریقے سے بھی۔ بڑے حساب کتاب جوڑ رہے تھے مگر اصدق تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ آگے بڑھنے کے بجائے یہ مزید کئی قدم پیچھے ہٹنے کے مترادف تھا۔ نیا قرضہ، بدحالی کی جانب گامزن اسٹور اصدق نے بڑی مشکلوں سے جمع کی جانے والی رقم کی پوٹلی کو ہاتھوں میں تولا۔

''اس رقم کا صحیح مصرف کیا ہو سکتا ہے؟'' گیند اس کے کورٹ میں تھی۔ اسے ایسا شاٹ کھیلنا تھا کہ جیت مقدر بنے۔

''کیسے بھی کر کے عارفہ کی شادی سال بھر کے لیے بڑھائی جائے۔'' وہ بولا (اور تو رقم سے اسٹور بڑھایا جائے گا)

''اسٹور جیسے چل رہا ہے، اسے چلنے دیں، گھر کا کچن الحمدللہ بخوبی چل رہا ہے۔'' اس کے لب دوبارہ کھلے۔

''ہائیں۔۔۔'' حاضرین بھونچکے رہ گئے۔ اصدق کی نگاہیں پوٹلی پر جمی تھیں۔ اس نے طویل لمبا سانس لے کر نگاہیں اٹھائیں۔ سب ناسمجھی کے عالم میں اسے تک رہے تھے۔

''یہ رقم مجھے دے دیں، میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔''

ایک دھماکا۔۔۔ ڈھا۔۔۔ ڈھا۔۔۔ ڈھن۔

✿ ✿ ✿ ✿

عادی ہو جائے تو مجرم کو جرم یاد نہیں رہتا۔ کب، کیسے، کیوں اور کتنا۔۔۔ وہ اپنی کامیابیوں میں بس پھر آگے ہی بڑھتا ہے، پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ساری گزشتہ کارروائیاں بھول کر محض آگے کی منصوبہ بندی کرتا رہے تو سیدھی بات ہے کہ اس کا

ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ اب وہ کسی برائی یا گناہ کی دلدل سے نہیں ابھرنے والا۔ لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے جرائم اور گناہوں کو تمغے کی طرح سینے پر لگائے اکڑ اکڑ کے چلتے ہیں۔ جرم ہی ان کا تعارف ہوتا ہے۔ گناہ ہی قابلِ فخر سرمایہ اور گناہ یہ نہیں ہے کہ آپ گناہ گار ہیں۔ گناہ یہ ہے کہ آپ کو اس پر فخر ہے۔ آپ توبہ کے طلب گار نہیں، شرم سار نہیں۔

اور گناہ سے بڑا گناہ یہ بھی ہے کہ آپ کو اپنے گناہ کا احساس نہیں۔ یہ جرم کی سب سے ہولناک صورت ہے۔ یہ گناہ کی بدترین شکل ہے۔ جس کا انجام صرف تباہی، بربادی اور غضب ناکی ہے۔

اسے ہر قدم پر احساس تھا کہ یہ ایک غلطی ہو رہی ہے۔ یا ہونے جا رہی ہے یا بہر حال، ہو جائے گی اور۔۔۔

اور۔۔۔ ہو گی نا پھر۔۔۔

خیالات کا ریلا تھا۔ وہ اپنے بچاؤ کی صورتیں، سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا تھا۔

❁❁❁❁

اس کی طبیعت خراب تھی۔ نزلے زکام کے باعث بخار جیسی کیفیت، کھانسی سے آرام کے لیے کف سیرپ لیا تھا اور اس میں ہلکی غنودگی تھی۔ وہ خود سے بے زار تھی۔ دو دن سے بیڈ روم میں بند تھی۔ اب دل زیادہ تنگ ہوا تو باہر نکل آئی۔

بے حد ڈھیلے ٹراؤزر پر سفید ڈھیلے کرتے میں وہ اپنے گرد ہلکی سی شال لپیٹ کر ننگے پیر بالکونی میں آ گئی۔ وہ چھٹے فلور پر تھی۔ روڈ پر گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ جلتا بجھتا روشنیوں سے سجا شہر تا حد نگاہ روشنیاں یوں لگتیں جیسے کسی نے زمین پر جا بجا دیے رکھ دیے ہوں۔ نادیدہ تاروں سے قمقمے ٹانک دیے ہوں۔ ساکت رواں لرزتی روشنیاں۔

چاند کا احساسِ ذمہ داری بے دار تھا۔ جب ہی وہ ہر روز آسمان کے ماتھے پر آ کر ٹک جاتا ورنہ یہاں تو یوں لگتا تھا کہ زمین کے اس ٹکڑے کو اس کی مدھم پاکیزہ روشنی کی قطعاً احتیاج نہیں۔

اس وقت بالکونی میں کھڑے ہو کر چاند کو دیکھنا اسے بے حد بھا رہا تھا۔ ورنہ دل دادہ تو وہ زمین کی روشنی کی تھی۔

"تب ہی اس کی نگاہ نیچے کھڑے چند لوگوں پر پڑی۔ تیز روشنیوں میں سب کے چہرے واضح تھے۔ مگر ان سب چیزوں میں وہ ایک خاص چہرہ نہیں تھا اور وہ جس دنیا سے تعلق رکھتی تھی، وہاں چہروں کا انتظار کیا بھی نہیں جاتا تھا۔ بے وقوفی سی بے وقوفی اور وہ تو تھی بھی بڑی حساب دان۔"

مگر اس رات کا مہمان، حیرانی کے بعد اسے تجسس میں مبتلا کر گیا تھا اور تجسس ہر پل بڑھتا ہی گیا۔ وہ کہاں سے خبر لائے کہ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا۔ کچھ اور دن گزرے تو اسے ایک نیا احساس ہوا۔

کیا اس کی عمر کی الٹی گنتی شروع ہونے کو ہے۔ کیا اس کی ادائیں اور ناز و ادا میں کوئی کمی سی رہ گئی جو وہ اس روز ہاتھ لگانا تو درکنار، دیکھے بنا پلٹ گیا۔ کیا اس کا زوال شروع ہونے کو ہے۔ وہ اس گھر کی تمام لڑکیوں سے ہٹ کر تھی۔ جدا، منفرد۔۔۔ اس کے پاس آنے والے مرد دوبارہ سہ بارہ یہاں قدم رکھیں

اور غلطی سے بھی کسی دوسری لڑکی کا ہاتھ تھام لیں یہ کبھی ہوا نہیں تھا۔
پھر وہ کون تھا۔ خبطی، دیوانہ، پاگل یا اندھا۔
وہ آئینے کے روبرو اپنے خدوخال ٹٹولتی رہی، اپنی لمبی انگلیوں کو گال پر سرکاتی رہی، ہونٹوں کو چھوتی رہی۔ سب کچھ تو ویسا ہی قاتل تھا۔
کسی پشتینی نواب، مہاراجے کے مہمان خانے میں ایستادہ سیاہ مورتی جیسی سندر انمول۔۔۔ جسے حاصل کرنے کے لیے جتن کیے جائیں، منصوبے گھڑے جائیں۔
پھر وہ کیوں پلٹ گیا۔ چھوئے بنا، نگاہِ غلط انداز بھی نہیں۔
اور اب اسے نیچے ایک ایسا شخص دکھ گیا تھا جو بتا تا کہ وہ کون تھا، اجنبی، بھٹکا ہوا مسافر۔
تیز روشنی میں وہ رینو کے میاں رنگیلے کو پہچان گئی تھی اور اس کے ساتھ مزید چار بندے تھے۔
''کیا ایک وہ بھی۔۔۔'' اپنے وجود پر چھائی کسل مندی اور اضمحلال کی پروا کیے بنا وہ تیز قدموں سے بیرونی راہ داری میں رکی۔ اس نگار خانے میں آنے والا ہر شخص اسے نظر آسکتا تھا۔
وہ پھولی سانس اور کانپتے پیروں کے ہمراہ موتیوں کے پردے کے پیچھے اس طرح کھڑی تھی کہ وہ سب دیکھ لے مگر اسے کوئی نہ دیکھے۔ اس کا ہاتھ اپنے دل پر دھرا تھا۔
قدموں کی چاپ ابھری تو اس نے سر اٹھایا۔
آنے والے پانچ تھے۔ میاں رنگیلے سمیت۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ۔۔۔ نہیں تھا۔
مہمان جھومتے گاتے مسکراتے آگے بڑھ گئے۔ تو وہ دبے قدموں خاموشی سے پلٹ آئی۔ عجیب سی ناکامی کا احساس، قدموں کو منوں وزن سے بندھا محسوس کر رہا تھا۔
وہ نہ جانے کیوں اب اس شخص کے لیے بے چین تھی۔
بہت ساری وجوہات ہوسکتی تھیں۔
حیرانی۔۔۔
تجسس۔۔۔
اور۔۔۔ اور۔۔۔
احساسِ توہین بھی۔۔۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹ کر اس رات کو سوچنے لگی۔

وہ شخص کچھ حیران پریشان گردن گھما گھما کر کمرے کی آرائش دیکھ رہا تھا۔ اتنی کلاسیکل آرائش، انوکھی روشنیاں عجیب سی لبھاتی خوشبو اور خواب ناک ماحول، نازک موم بتیوں کی کپکپاتی روشنی اسے بہت عجیب مگر اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سحر زدہ تھا۔ اس کے الجھے دماغ اور شل اعصاب کو سکون پہنچ رہا تھا۔ جیسے کوئی گھونٹ گھونٹ امرت حلق سے اتار رہا ہو۔ سیرابی سی۔
کھٹکے کی آواز پر چونکا تھا اور اندر داخل ہوتی شخصیت کو دیکھ کر اچھلا۔ غوطہ سا لگا حلق میں کچھ پھنس گیا۔
''آپ؟'' وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کہاں آ گیا تھا اور اس کا دوست کہاں رہ گیا تھا۔ وہ اسے موجیں

کروانے لایا تھا کسی کے گھر۔

وہ اس بیڈروم نما ڈرائنگ روم یا ڈرائنگ روم نما بیڈروم میں حیران منتظر تھا۔ سفید ساڑھی میں ملبوس وہ لڑکی جو دروازہ پیر سے بھیڑتی بڑے نپے تلے قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے مگر پتا چلتا تھا کہ کس قدر نزاکت تھی۔ وہ اس کے پاس ٹھہری نہیں، گزرتی چلی گئی۔

حیرت کی زیادتی فقط ''آپ'' کہہ کر جیسے قوتِ گویائی کھو بیٹھا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے پردے کو دائیں بائیں سمیٹنا چاہا تو سڈول بازو کسی دوشاخہ کی طرح دونوں جانب تن گئے۔ اس کے بازو اسی طرح کھڑکی میں رک گئے تھے۔ اس نے رخ نہ موڑا، بس گردن گھما کر اس حیران کو دیکھا جو سحر زدہ تھا۔ اس کی چال پر اسے لگا تھا پانی پر تیرتی عورت، اس کے تنے وجود کو دیکھ کر اسے کمان کا خیال آیا۔

''آپ کی میزبان۔'' وہ اس کی ''آپ'' کا جواب دے رہی تھی۔

''نہیں! میں تو۔۔۔ دوستوں سے ملنے آیا۔۔۔''

''کیا میں آپ کو دشمن لگ رہی ہوں؟ میں ہی آپ کی میزبان ہوں اور آپ ''آج رات'' کے مہمان۔''

اس کے دماغ میں کچھ نہیں تھا مگر جیسے ایک دم جھماکا ہوا۔ وہ کس چیز کا مہمان بنا تھا اور۔۔۔ اور اس کی میزبان کون تھی۔

(وہ زندگی میں کبھی ایسی جگہ ایسی میزبان کا مہمان نہیں بنا تھا اس نے اس کمرے کو دوبارہ چہار جانب دیکھا اور جیسے سب بھانپ گیا۔ اونو۔

''کوئی غلط فہمی۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ مجھے یہاں لے آئے۔ میں۔۔۔'' وہ باہر نکلنے کو مڑا تھا تو وہ ایک دم اس کے سامنے آ گئی۔

''یہاں لوگ یار دوستوں کے ساتھ ہی آتے ہیں، ہم نے کب اخبار میں اشتہار دیا یا رات بارہ کے بعد چینلز پر ہمارے ریٹ چلتے ہیں۔'' وہ اپنی بات کا مزا لیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دی۔ وہ خاک نہ سمجھا۔

''سنا ہے، آپ کا دل دکھا ہوا ہے، ہوم سک نیس کا شکار ہیں۔ آپ کو بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا۔ کتنے سال سے ہیں یہاں۔''

''سات۔۔۔ سات سال۔۔۔ بس۔''

''اور آج پہلی بار اس طرف۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز حیرانی تھی۔

''ویسے دل کس نے توڑا۔۔۔ گھر والوں نے یا گھر والی نے۔۔۔''

وہ جواب دیتا۔۔۔ سوال سادہ تھا۔ مگر پوچھنے کا انداز اور پوچھنے والی۔۔۔ وہ اس سے کیوں پوچھ رہی تھی۔

''آپ سائیکاٹرسٹ ہیں ڈاکٹر۔۔۔؟'' اس کے الفاظ گم تھے،

''ہاہاہاہا۔۔۔۔'' وہ نزاکت سے ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

''ڈاکٹر؟ ہاہاہاہا کہہ سکتے ہیں، بالکل کہہ سکتے ہیں بس یہ ہے کہ ہمارے کلینک کا بورڈ نہیں ہے۔ کرتے ہم بھی علاج ہیں لیکن کوئی یونیورسٹی ہمیں ڈگری نہیں دیتی۔'' اس نے اس کھلی زیادتی پر احتجاجاً منہ بسورا۔

''یہ کوئی اچھی بات ہے، آپ بتائیے ذرا؟''

''دلوں کو جوڑنے کا کام تو ہم بھی کرتے ہیں۔ ہر پیشے میں ہڑتال ہوتی ہے۔ ہم نے تو وہ بھی کبھی نہ کی، زیادتی ہے نا؟'' وہ اس کے قریب آ گئی تھی۔

''ویسے تو آپ ابھی تک کچھ نہیں بولے۔۔۔ لیکن اندازہ ہو رہا ہے کمال کے آدمی ہیں۔ پہلی بار ہمارے پیشے کو کسی نے صحیح نام دیا ہے واہ۔۔!''

وہ کچھ نہ بولا۔ اس کے خالی ذہن و دل میں اب ایک ہی سوال تھا وہ یہاں کیوں آ گیا؟

استغفراللہ، اسے خود پر غصہ آ رہا تھا اسے۔۔۔

''آپ بیٹھیے تو۔۔۔'' اس نے اس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ دیا تو وہ بے ساختہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیا لیں گے، چائے ٹھنڈا۔۔۔ یا۔۔۔ یا بہت ٹھنڈا؟'' وہ معنی خیزی سے بولی اور دوسرے صوفے پر بڑی ادا سے براجمان ہو گئی۔ وہ مسکراتی آنکھوں اور لبوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ تو یوں بیٹھے ہیں جیسے موقع ملتے ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔'' وہ چونکا، وہ دلوں کے حال جان لیتی تھی۔

''پہلی بار سب ہی ہچکچاتے ہیں، بچہ پہلی بار قدم بھی ڈر ڈر کر اٹھاتا ہے، تب ماں سہارا دیتی ہے۔''

''کیا آپ کو۔۔۔ مجھے سہارا دینا ہوگا؟'' وہ کس جانب اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے کان سے دھواں نکلنے لگا، صوفہ چولہا بن گیا تھا۔ آگ۔۔۔ وہ اس کے ہر تاثر پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ہنس دی۔

''گھڑی کی سوئیاں چکر پہ چکر پورے کر رہی ہیں، آپ کو احساس نہیں کہ رات بیتی جا رہی ہے۔''

اس شخص کی پیشانی پر پسینہ تھا اور نم ہتھیلیاں اور تر بتر پیر۔۔۔ ہر موئے جان سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

اور اس نے بہت سے مرد برتے تھے، ہر طرح کے جوان، بڈھے، کالے، گورے، نیک، بدعلی اعلان آنے والے، منہ چھپانے والے۔۔۔ اسے تو اب چہرے بھی یاد نہیں تھے مگر سامنے صوفے پر بیٹھا وہ شخص جو نظریں بھی نہ اٹھاتا تھا اسے بہت عجیب لگا، وہ ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کب تک ایسے ہی رہے گا۔ اسے اس کھیل کو دیکھنے میں بہت مزا آ رہا تھا۔

یہ رات، یہ خواب ناک اکساتا ہوا ماحول، خوشبو اور سب سے بڑھ کر وہ۔۔۔ کب تک اور کیسے اس طلسم کا توڑ ہوگا۔

رات بیت چکی تھی، مگر بہت سی ابھی باقی تھی، آخری حد تک وہ کشمکش کو جھیلے گا۔

وہ طمانیت سے سوچ رہی تھی، ایک بے حد پر کشش مرد۔۔۔

ایک سحر کار عورت۔۔۔

سین مکمل تھا۔ تیاری پوری تھی، بس ٹیک کہنے کی دیر تھی۔ کلیو آفٹر فائیو منٹس کب تک بچ کے رہے گا، وہ پُر یقین تھی۔

مگر۔۔۔

ایک دم وہ اٹھا وہ بری طرح چونکی تھی، مگر پھر مسکرا دی۔ وہ دروازہ کھول رہا تھا۔

''دائیں جانب جا کر درمیانی دروازے سے نکل جایئے گا۔''

اسے کہنا پڑا ''آپ کہیں تو سی آف کرنے آؤں۔'' وہ مزے سے بولی۔

اگلے پل وہ باہر تھا اس نے اپنا سر جھٹکا اور تڑ تڑ تڑ کر کے ساری ٹیوب لائٹس آن کر دیں پھر سبج سبج قدم اٹھاتی موم بتیوں پر پھونکیں مارنے لگی۔

اس کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے پے منٹ کر دینے کا اصول تھا۔ وہ بے فکر تھی۔

✿✿✿✿

ایسے مواقع عام طور پر بہت کم آتے کہ ظفر اور وہ ایک ساتھ کمرے میں رہیں، مگر کچھ دنوں سے ظفر کے ڈیپارٹمنٹ میں شفٹوں کا مسئلہ تھا، وہ بھی اس کی طرح صبح جا رہا تھا اور رات کو دونوں اکٹھے کمرے میں۔۔

''اوئے ایسے موقع تو عید شبرات پر آتے ہیں۔'' ظفر اپنے پسندیدہ لباس (دھوتی، ٹی شرٹ) میں تھا، وہ کچن میں کھڑا مختلف مسالوں سے نبرد آزما تھا۔

''آج میں بناؤں گا بریانی۔ وہی کراچی والی بریانی جو اور کہیں سے نہیں ملتی، ساتھ میں مچھلی فرائی کروں گا۔ دھنیا، پودینہ، لہسن مرچ پیس کر دہی والی چٹنی۔۔۔ بھئی واہ!'' محض تصور سے اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔

''یہ جو دبئی میں خیری صلا سے چار بوندیں گر گئی ہیں نا، میں نے اپنے پنڈ کا ساون میں نہ بدل دیں تو میرا نام ظفر کی جگہ ڈفر رکھ دینا۔''

''ساون میں پکوڑے لازمی ہوتے ہیں، پورے، آم، گرم گرم جلیبیاں۔'' وہ بھی کھو گیا۔

''اوئے ہوئے۔۔۔ یہ سارے کام تو آپ کے جگر کے کھبے (الٹے) ہاتھ کا کمال ہے مگر وہ کیا ہے نا ڈنر میں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے بریانی، مچھلی رکھی ہے اور جلیبی مجھے بنانی نہیں آتی۔ دراصل ہمارے پنڈ کا حلوائی بے اولاد تھا اگر جو وہ میرے سائز کا کوئی پتر جم دیتا تو آپ کا یار مٹھائیاں بنانے میں بھی ماہر ہو جاتا۔'' اس کے مخصوص لہجے اور انداز پر وہ بڑے دل سے ہنس دیا

''میں کچھ ہیلپ کرواؤں؟''

''او نئیں یار۔۔۔ تُو تو بس کپڑے شپڑے بدل کے مزے سے ریموٹ پکڑ کے سارے پاکستان کی خبریں سن، بڑے دنوں بعد تو تجھے ایسا ہلکا پھلکا دیکھا ہے مانو مزا آ گیا ورنہ تجھے پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔'' ظفر کے انداز میں سچی خوشی اور سچی فکر مندی تھی وہ اس پر واہ پر متکبرانہ انداز سے مسکرا دیا۔

(ہاں اسے خود پتا نہیں چل رہا کہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے وہ دن کی مشقت کے دوران اپنی رات کی اذیت کو سوچتا تو کڑھ کڑھ جاتا، مگر اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا) اس کے چہرے پر شرمندگی، اذیت

کے عجیب سے تاثرات آگرے۔
''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بولا۔
''چل پھر ٹھیک ہے۔جلدی تیاری کر لے پھر یار دوست آتے ہوں گے تو برتن شرتن نکال لے۔''
''ظفر! میں جلدی سوتا ہوں اور عشاء کی نماز کے بعد دعوت ختم کر دینا۔'' اس نے یاد دہانی کروانی ضروری سمجھی۔ اور دوسرے۔۔۔'' وہ بولتے بولتے رکا اور رکتے رکتے بول پڑا۔'' کھانے کے بعد مشروب میں صرف کولڈ ڈرنک اور سبز چائے ہوگی۔سمجھ گئے نا؟''
ظفر بغور سن رہا تھا۔''اوئے فکر ای نئیں۔۔۔اومیرا یار بڑا نیک ہے سب جانتے ہیں۔'' ظفر اس کی تادیب کو بخوبی بھانپ گیا تھا۔
ظفر کی دی گئی ''جبری ساون'' پارٹی اس کے ہاتھ کے بنے بے حد لذیذ کھانوں کے باعث بے حد شان دار رہی۔ظفر کے ہاتھ کا ذائقہ اور اس کی سلیقہ مندانہ پریزینٹیشن نے کمال کر دیا۔دوست سارے ظفر کے تھے۔حلق تک ٹھونسنے کے بعد بھی پلیٹیں چاٹتے رہے۔
''یار ایک کرین بھی منگوا لینی تھی۔ہمیں گھر تک چھڑوانے کے لیے؟'' ان سب سے اٹھنا بھی محال تھا۔وہیں اس کا غافل ہونے کا ارادہ تھا، وہ بھی ضرورت سے بہت زیادہ کھا چکا تھا۔فرائی مچھلی، ہرے مسالے کی چٹنی کے ساتھ اتنی مزے دار تھی کہ زبان کٹنے کا گمان ہونے لگا تھا، مگر دل نہیں بھرا۔وہ بمشکل اٹھا اور برتن دھونے لگا۔
''اوئے صبح دھولیں گے یار۔۔۔ابھی کون سا کوئی انسپکشن کرنے آرہا ہے۔'' ظفر گدے پر چت پڑا تھا۔
''مجھے ابھی نماز بھی پڑھنی ہے۔'' وہ تندہی سے برتن دھو رہا تھا۔
''اوتُو بڑا نیک۔۔۔ہے۔۔۔یار۔۔۔تجھے۔۔۔سیدھے جنت۔۔۔ت ت۔'' ظفر کا جملہ ادھورا رہ گیا، وہ نیند کی وادی میں اتر گیا۔

❁❁❁❁

گہری نیند سے بے داری کا باعث۔۔۔ظفر کو ٹوائلٹ جانا تھا، نائٹ بلب کی روشنی میں کمرے میں نیند پھیلی تھی، اے سی کی مدھم آواز کل عالم خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا، سناٹا، سکون۔
''ہیں؟'' ظفر نے چونک کر اور پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو جائے نماز پر سربسجود تھا، پھر دیوار پر لگے سبز وال کلاک کو جس کے سیاہ ہندسے چمک رہے تھے، ڈھائی کا وقت تھا۔اس نے ٹائم پیس کو اٹھا لیا۔
دو بج کر پینتیس منٹ۔۔۔
ساری منڈلی ساڑھے دس بجے گھر سے جا چکی تھی۔وہ آدھے برتن تو اس وقت تک دھو چکا تھا، بڑی تسلی سے نماز پڑھتا، یکسوئی کے ساتھ، تب بھی گیارہ تک نماز مکمل ہو جانی چاہیے۔پھر رات کے ڈھائی۔۔۔تو کیا تہجد پڑھ رہا تھا؟
ظفر ٹوائلٹ جانا بھول کر اسے عجب ناسمجھی کے عالم میں تکتا جا رہا تھا۔

کیا پتا تھکاوٹ کے مارے آنکھ لگ گئی ہو اور اب آنکھ کھلی تو۔۔۔ظفر کا دھیان گیا لیکن پھر وہ ایک دم چونکا اور بری طرح چونکا۔

وہ نماز کے لیے سفید شلوار سوٹ استعمال کرتا تھا، ٹوپی، جائے نماز۔۔۔ظفر کو چونکانے اور نیند اڑانے کو بڑی باتیں تھیں۔

وہ شلوار سوٹ کے بجائے اپنے نائٹ سوٹ میں تھا، پاکستانی کرکٹ ٹیم کے یونی فارم والا سوٹ، وہ جائے نماز پر نہیں تھا۔۔۔وہ اپنے گدے پر ہی سجدہ ریز تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی اور۔۔۔ اور۔۔۔وہ قبلہ رخ بھی نہیں تھا سمت وہی تھی مگر کافی ٹیڑھی سی۔

کسی کو حالتِ نماز میں جھنجھوڑنا نہیں چاہیے مگر۔۔۔

''اوئے اصدق۔۔۔!اوئے اصدق باؤ۔۔۔کون سے ٹیم کی نماز پڑھ رہا ہے تُو۔۔۔تہجد۔۔۔؟ تو بھلے پڑھ لے مگر ابھی تو میرے خیال میں ٹائم نہیں ہے اور تیری تو ساری حالتیں غلط ہیں۔'' ظفر نے اسے شانوں سے پکڑ کر ہلا ہی دیا۔

وہ سیدھا ہو گیا تھا اور خالی آنکھوں سے ظفر کو دیکھ رہا تھا۔ ظفر بری طرح گڑبڑا گیا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا اور وہ پسینے میں غرق تھا۔ وہ۔۔۔وہ اپنے آپ میں نہیں تھا، وہ پتا نہیں کہاں تھا۔

''کیا ہو گیا ہے یار تجھے۔۔۔کس چیز کی معافی مانگ رہا تھا۔ کس چیز سے ڈر رہا تھا ہیں۔'' نزدیک ہونے پر ظفر نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سنے تھے۔

''کون سا گناہ۔۔۔کیسا گناہ۔۔۔کون سا گناہ کر دیا تو نے؟''

''یار تُو تو اتنا نیک ہے؟ میرے سارے دوستوں میں سب سے الگ، خاص، تُو کیسے کوئی غلطی کر سکتا ہے، تیری گواہی تو سارا شہر دے گا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتی تجھے ہو کیا گیا ہے۔ اچھا بھلا بندہ تھا یار۔۔۔ میں تو تجھے ماڈرن مولوی کہتا ہوں۔ قسم اللہ پاک کی چھیڑتا نہیں ہوں مذاق بھی نہیں اڑاتا تُو ماڈرن مسلمان بندہ ہے، نیک، نمازیں بھی پوری، کوئی لت بھی نہیں، اتنے عرصے سے تو تجھے میں دیکھ رہا ہوں، تیری وجہ سے تو میں نے بھی پینا پلانا کم کر دیا ہے۔۔۔ہم چند سال اور ساتھ رہ گئے نا تو قسم سے میں نے بھی تیرے جیسا ماڈرن مولوی بن جانا ہے، تجھے تو پتا ہے نا! میں یار دوستوں کی کتنی جلدی مان لیتا ہوں، ان جیسا ہو جاتا ہوں اور تُو مجھے کہہ رہا ہے گناہ اور کبیرہ گناہ۔'' (اوکون سا گناہ) وہ زچ ہوا تھا۔

مگر اصدق آپے میں نہیں تھا وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا اسے پتا نہیں تھا۔ ظفر نے سننے کی سعی کی تھی، مگر کچھ پلے نہ پڑا۔

''کوئی گناہ نہیں کیا۔۔۔مگر۔۔۔میں۔۔۔مگر میں گناہ کرنے سے ڈرتا ہوں ظفر۔۔۔!''

❁ ❁ ❁ ❁

''اتنا بڑا فیصلہ۔۔۔اور یوں ایک دم اچانک؟'' عبدالقیوم کی حیرانی نہ جاتی تھی۔

''فیصلہ تو بڑا ہی ہے، مگر ایک دم اچانک نہ کہیے۔ میں بہت عرصے سے اس پہلو پر سوچ رہا تھا اور تمہیں یہ کیسے لگا کہ ہم تمہیں اجازت بھی دے دیں گے۔'' عبدالجبار بولے۔

''میں سب کی اجازت لے کر ہی جاؤں گا۔ چھپ کے تھوڑی بھاگ رہا ہوں۔''

"وہاں کون سے نوٹ درختوں پر لگے ہیں جامن کی طرح پٹ پٹ گرتے کہ جاؤ اور چن لو۔ خون چوس لیتے ہیں تب کہیں جا کر۔۔۔" عبدالقیوم کی اپنی معلومات تھیں۔

"خون تو چوس ہی لیتے ہیں، لیکن وہاں کم۔۔۔ یہاں زیادہ بلکہ وہ اگر زیادہ بھی چوستے ہیں تو بھر آمدنی کے باعث احساس کم ہوتا ہے۔ یہاں کی طرح تھوڑی کہ گدھے کی طرح جتے رہو اور معاوضہ اونٹ کے منہ میں زیرے کی مترادف۔"

"تو تم سے کس نے کہہ دیا کہ جیسے ہی جاؤ گے، اگلے پلیٹ میں رکھ کے نوکری پیش کر دیں گے۔ جیسے اب تک تمہارے ہی تو انتظار میں تھے۔ سو کام روک کے بیٹھے تھے کہ کب جناب اصدق عبدالقیوم پاسپورٹ بنوائیں، ویزا لگوائیں اور پھر۔۔۔" عبدالجبار نے ہاتھ سے جہاز اڑا کر دکھایا۔

"دنوں، مہینوں لگ جاتے ہیں ویزا پاسپورٹ کے حصول میں۔۔"

سارا گھر کھلے آنگن میں اکٹھا تھا، سب کے اپنے اپنے تاثرات۔۔۔ باہر جانے والی بات کسی کو بھی ہضم نہ ہو رہی تھی۔

"میں یہ دونوں چیزیں حاصل کر چکا ہوں۔" اصدق نے اصل دھما کا کیا۔

زوں۔۔۔ں ں ں۔۔۔ ایک ٹرین سب کے اوپر سے گزر گئی۔ عتیقہ بیگم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور تمام حاضرین کو۔۔۔ اگلے پل وہ منہ پر دوپٹا رکھ کے با آواز بلند رو رہی تھیں۔ حسنہ بیگم نے بھی بہن کا ساتھ دیا۔

"تو نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تجھے جانے دوں گی۔ ایک لمحے کو ماں کا خیال نہ آیا جو اب بھی رات کو اٹھ اٹھ کر یونہی خوامخواہ چہرہ دیکھنے چلی آتی ہے۔

کچھ احساس ہے کہ یہاں سب تیرے بغیر کیسے رہیں گے۔ باپ تایا کا بازو ہے، ابھی باپ بیمار ہوا ہے تو تائے کے ساتھ اسٹور سنبھالا نا۔ یہ کام کون کرے گا، بہنیں سو سو ناز اٹھاتی ہیں، وہ کون دیکھے گا۔ بس حکم سنا دیا۔" وہ روتی جاتیں تھیں اور بولے جاتی تھیں۔

"امی! سال دو سال کی تو بات ہے۔ ابھی فوری مسئلہ عارفہ کی شادی اور اسٹور ہے اور چلیں ہم کسی نہ کسی طرح اسے حل بھی کر لیں۔ تب بھی سچویشن سر ڈھانپنے اور پاؤں ننگے والی ہی رہے گی، آگے زمانہ بہت مشکل آ رہا ہے۔ عارفہ کے بعد دوسری لڑکیاں ہیں، ایسے کیسے گزارا ہوگا؟"

"سال دو سال۔۔۔" عتیقہ بیگم نے ہچکی لی۔ اصدق کی حقیقت بیانی میں کوئی دو رائے نہیں تھی۔ انہوں نے خود کو پسپا ہوتے دیکھا تو اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

یہ نشست بنا کسی نتیجے کے بے کار گئی۔ عجیب سناٹے کا عالم سب کترائے کترائے گھوم رہے تھے کسی کو بھی اس فیصلے کی سمجھ نہ آ رہی تھی، ہضم نہ ہو پا رہا تھا۔

"آپ کو یاد ہے آپا۔۔۔ اسکول بھیج کر بھی دروازے سے جھانکتی کہ کہیں اصدق آ تو نہیں رہا۔ آپ لاکھ کہتیں بارہ بجے کے بعد ہی آئے گا، مگر مجھے بس لگتا یہ آ رہا ہے۔"

"مجھے کیا یاد کروا رہی ہو عتیقہ۔۔۔ سبزی لینے جاتی تو یونہی اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر خوش ہو لیتی کہ اندر میرا اصدق ہے۔" حسنہ بیگم کا لہجہ سچ تھا۔ انہیں اصدق بہت پیارا تھا۔ اصدق کے دکھائے

روشن پہلو نظر آ ہی نہ رہے تھے اس نے نہ ہونے سے پیدا ہونے والی تاریکی کا خوف ہچکیوں سے رلا رہا تھا۔ سب سوچوں میں غلطاں لیکن جب۔۔۔

''امی! کیسے احمقوں کی طرح آپ لوگ خوامخواہ باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ اس سے اچھا سنہری موقع کب ملے گا۔ سارے دلدّر دور ہو جائیں گے، ڈبل کرنسی ہوتی ہے وہاں کی، ایسے ہی مجھے رو رو کر بلوایا۔۔۔ میں نے کہا اللہ خیر کرے یہ تو بڑی ہی خوشی کی خبر ہے، بھنگڑے ڈالنے والی اور آپ لوگ۔۔۔ چچ چچ چچ۔'' ناعمہ سب کے پاگل پن پر سر پیٹ لینے والی تھی۔

''بے حد عقل مندانہ فیصلہ۔۔۔'' عائزہ ابھی تک اسکول کی استانی تھی، دوٹوک اظہار، ''کل کا جاتا ہے آج جائے اور آج کا جاتا ابھی۔۔۔ قسمت والوں کو ملتے ہیں ایسے موقع، زبردست۔''

''امی! آپ کچھ سمجھتی کیوں نہیں۔'' ناعمہ کچھ قریب کھسکی۔ ''عارفہ کو سال چھ ماہ میں اچھی طرح نبٹا بھی دیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے بعد فائزہ، زائرہ، رائحہ اور آصفہ بھی ہوں گی اسٹور روٹی ہی پوری کرتا ہے جانے دیں سال دو سال کے بعد ہن برسے گا ہن، بجائے سمجھانے بجھانے کے آپ بڑھ بڑھ کر نیر برسا رہی ہیں۔'' ناعمہ کی باتیں حسنہ بیگم کے دل پر دستک دے رہی تھی۔

''ناعمہ درست کہہ رہی ہے۔'' عائزہ بولنا شروع ہوئی۔

''تعلیم بھی کوئی خاص حاصل نہ کر سکا۔۔۔ ہنر بھی نہیں۔''

''تعلیم کی کیا بات سب کچھ تو تمہارے سامنے ہے، اتنا قابل تو ہے میرا بچہ۔۔۔ وہ تو حالات ہی۔۔۔ کبھی فیل آیا؟ پورے اسکول میں فرسٹ آتا تھا۔ بچپن سے باپ کا، تایا کا ہاتھ پکڑ کے مسجد کے اندر اور۔۔۔'' حسنہ بیگم کو بہت ہی برا لگا۔

''اف اللہ۔۔۔'' عائزہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''میرا وہ مطلب نہیں ہے امی! میں اصدق کو نالائق نہیں کہہ رہی مجھے پتا ہے وہ بہت قابل ہے، مگر مواقع نہ مل سکے اور چلو مل بھی جائے مواقع، لے آتا ڈگریوں پر ڈگریاں۔۔۔ مگر آج کل تو ڈاکٹر انجینئر جوتیاں چٹخار ہے ہیں، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے ہیں۔''

''لیکن وہاں بڑی مشکل زندگی ہوتی ہے۔ شدید ترین گرم صحرائی علاقے ہیں۔ ریت ہی ریت اور محنت بھی پوری پوری کرواتے ہیں تب ریالوں کی شکل دیکھنے کو ملتی ہے اور میرا اصدق لاڈوں پالا وہ۔۔۔'' حسنہ بیگم کا دل بھر آیا، انہیں بھانجے سے بہت محبت تھی۔

''اتنے سخت حالات میں۔۔۔'' وہ دوبارہ بولنا شروع ہوئی تھیں۔ عائزہ نے سخت جھلائے انداز میں ٹوک دیا۔

''امی!'' اس کے انداز میں ناگواری تھی۔ ''مرد سختیاں جھیلا ہی کرتے ہیں۔''

❁ ❁ ❁ ❁

وہ اپنی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ چلتے پھرتے بس جانے ہی کی گفتگو۔ ہدایتیں، اعلان، فرمائش، خواہش، ارادے۔

''دوست نے ساری سیٹنگ کر رکھی ہے، ہر شے طے ہے، نوکری کا بھی بندوبست ہے، کوئی فکر

نہیں۔"
"دو تین ماہ تک ذرا تنگی جھیلنا ہوگی۔ پھر میں پیسے بھیجوں گا۔ تو سب سے پہلے اسٹور میں مال ڈلوانا ہے اس کی حالت درست کرنی ہے، میرے دوست علی اور شاہد کو میں نے نئے ریکس کے بارے میں سب بتا دیا ہے، وہ پوری ذمے داری لیں گے۔ اسٹور سیٹ ہوگیا تو پھر باقی کے سب پیسے جمع ہونے ہیں۔ میں کروں یا آپ لوگ، گھر کا کچن حسب معمول اسٹور ہی چلائے گا، لیکن یہ ہے کہ جب نئے سال کے ساتھ اسٹور جدید انداز میں آجائے گا تو آمدنی چار گنا بڑھ جائے گی، ان شاء اللہ، کوئی سیلز مین رکھ لیجیے گا۔"
عبدالقیوم اور عبدالجبار کی آنکھیں چمکیں۔ حسرت ہی رہی تھی کہ وہ بھی کسی کو ملازم رکھیں۔ ساری زندگی مل جل کر ہی کام نبٹایا تھا۔
"برانڈڈ اشیاء رکھنی ہیں اور نئے ڈیپ فریزر تو لازمی لینے ہیں۔" ایک خاکہ سا چمکنے لگا تھا۔
"امی! آپ میرے لیے الیکٹرونکس کے آئٹمز بھائی ہی سے منگوائیے گا۔ یہاں سے نہیں لوں گی، سب نقلی مال ملتا ہے دو نمبر۔۔۔" عارفہ اپنا آئیڈیا لیے حاضر تھی۔
"نہیں، پہلے میرے لیے گڑیا بھیجیں گے، میرے قد جتنی لمبی۔۔۔" آصفہ نے کہا۔ عتیقہ بیگم دونوں کی صورت دیکھتی رہیں۔
"تم سے کس نے کہہ دیا کہ کہیں جا رہا ہے تمہارا بھیا۔۔۔! یہیں رہے گا چپکی بیٹھو۔"
"اب مان بھی جائیں امی۔۔۔! بھائی صحیح ہی تو کر رہے ہیں۔" عارفہ نے گلے میں بانہیں ڈالیں۔
"میرے بچوں کے لیے اے بی سی والی گیم لائے گا ماموں۔" ناعمہ نے اپنے بچے کو پچکارا تھا۔
"باہر سے نیو بورن بے بی کے لیے بڑے ہی مزے کی چیزیں ملتی ہیں۔" عائزہ نے اپنے ہونے والے بچے کے لیے بھی کہہ دیا۔ "امپورٹڈ آئٹمز۔۔۔ واہ!"
"سب کچھ چھوڑیں اصدق بھائی جان!" زائرہ، رائحہ ایک ساتھ حاضر ہوئیں۔
"آپ نے ہمارے لیے میک اپ کا سامان بھیجنا ہے۔ پہلی تنخواہ ملتے ہی سیدھے بازار جانا ہے اور میک اپ کے سارے آئٹمز۔۔۔ دوکان دار خود ہی گائیڈ کرتے ہیں۔" ساتھ ہی اسے پریشانی نہ ہو گائیڈ کا نام بھی بتا دیا۔
"تم کیوں چپ ہو۔۔۔ تم بھی کچھ کہہ دو۔" اس نے خاموش کھڑی فائزہ سے کہا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی بس نروٹھے پن سے نفی میں گردن ہلا دی۔
"نہیں بھئی کچھ تو کہنا پڑے گا۔" وہ مصر ہوا۔ "میں سب کی فرمائشیں نوٹ کر رہا ہوں سب کو سب کچھ ملے گا ہم کسی کو مایوس نہیں کریں گے۔" اصدق نے شاہانہ انداز میں اپنایا۔
"آپ انہیں چھوڑیں بھائی جان! میری گڑیا کی بات کریں بس۔۔۔" آصفہ اس کے ساتھ چپکی۔
"ایسا ہے میری پیاری بہنو! تین چار ماہ تک سب خاموش بیٹھو۔ سب سے پہلے اسٹور، باقی سب

بعد میں۔۔۔عارفہ کے لیے سب سامان جب میں آؤں گا تب ساتھ لاؤں گا یعنی شادی پر۔۔۔ باقی پیسہ پھینک تماشا دیکھ والی بات ہے۔ ہر شے یہاں سے بھی ملتی ہے۔ ہاں گڑیا اور میک اپ کا سامان میں سب سے پہلے بھیج دوں گا۔''

''یاہو۔۔۔'' آصفہ اور زائرہ، رائحہ نے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔ ناعمہ اور فائزہ کچھ خجالت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''پہلے مجھے اپنے ٹارگٹ اچیو کرنے ہیں۔ فرمائش خواہش بعد کی باتیں ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

ناعمہ، فائزہ تھوڑی دیر بعد اٹھ گئیں۔ آصفہ پہلے ہی یاہو کا نعرہ مارتی نکل گئی تھی۔ زائرہ، رائحہ آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔

''سب دوستیں حیران رہ جائیں گی۔ باہر کے میک اپ کی تو کیا ہی بات ہے۔''

''یار! وہاں سے انڈین جیولری بھی بہت اچھی ملتی ہے وہ تو کہہ ہی نہیں بھائی سے۔۔۔''

''تم نے کوئی فرمائش نہیں کی؟'' اصدق نے ستے چہرے کے ساتھ کمرے سے نکلتی فائزہ کو جالیا۔

''میری کوئی فرمائش نہیں۔''

''یار کوئی تو ہوگی۔۔۔ کچھ تو کہو۔۔۔''

''پوری کر دیں گے؟'' اس نے نظروں میں تولا۔

''بالکل۔'' وہ سینے پر ہاتھ لپیٹ کر تیقن سے مسکرایا۔

فائزہ نے شہزادوں سے بڑھ کر خوب صورتی رکھنے والے اس شخص کو دیکھا، جو اپنی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے منتظر کھڑا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی خوب صورت جان دار بولتی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک جاتی تھیں۔ یہ گدگدی مچاتا احساس اسے ساری رات جگاتا تھا۔ یہ چہرہ نظروں سے اوجھل ہونے جا رہا تھا۔ اتنی بے فکری کے ساتھ۔۔۔ ذرا جو پیچھے والے کا احساس کیا ہو، وہ خفا ہی ہوگئی۔ سوچوں کا اتار چڑھاؤ چہرے سے چھلک رہا تھا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بول رہی تھی بس خفا۔۔۔ بس۔۔۔ بے بس و مجبور۔

کاش! وہ اسے روک پاتی۔۔۔ آہ!

لیکن۔۔۔

وہ رک کیوں نہیں جاتا۔

کیا ایک بار بھی دل کو مسلے جانے کا احساس نہ ہوا۔

فقط یہ سوچ کر دل پھٹ پھٹ جاتا تھا کہ چند روز بعد وہ اس کے آس پاس نہ ہوگا۔

وہ اسے کیسے بتائے کہ دل ٹوٹ جائے گا اور ٹوٹے دل کو جوڑنا۔۔۔ اف ایسے ہی تو نہیں کہتے دل کی پیوند کاری بڑا مشکل کام ہے۔

''اب بول بھی دو یار۔۔۔!'' وہ منتظر کھڑا تھا۔

''تو مت جائیے۔۔۔ رک جائیں۔'' اس نے ایک دم کہہ دیا۔

اصدق کے چہرے پر زلزلہ سا آرکا۔ فائزہ زخمی مسکراہٹ لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اور یہ آپ سے ہوگا نہیں۔'' وہ اندر بھاگ گئی۔

✿✿✿✿

''تم واقعی نہیں چاہتیں کہ میں جاؤں۔'' اصدق نے شام میں اسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ سب سے خفا پچھلی سیڑھیوں میں بیٹھی تھی۔ گود میں چمپا کے پھول بھر رکھے پتیوں کی ملائمت کو چھوتی وہ ذہنی طور پر کہیں اور ہی تھی۔ آواز پر اچھل کر کھڑی ہوئی تو تمام پھول اصدق کے قدموں پر گر گئے۔

''واہ۔۔۔!'' وہ جھوم اٹھا اور وہ چونکہ خفا تھی سو پھول چننے کے بجائے ایک سیڑھی اور اوپر ہو کر بیٹھ گئی۔ پھول اصدق ہی کو چننے پڑے۔ اس نے اپنا سوال دوبارہ دوہرایا۔

''میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی۔ ''میری چاہت اہم ہوتی تو آپ جاتے ہی کیوں؟ بلکہ آپ کے دل میں ایسا خیال ہی نہ آتا۔''

''تم تو بڑی دردمند تھیں فائزہ۔۔۔ کسی گملے میں اگا ہوتا نا تو تب بھی صرف اپنے بارے میں نہ سوچتا۔ پورے کنبے کی ذمے داری ہے۔ کیسے پہلو تہی کروں۔ مجھے ہی ان ذمے داریوں کو پورا کرنا ہے اور بہت سوچنے سمجھنے کے بعد یہی حل سب سے بہترین نظر آیا ہے۔ اچھے مستقبل کے لیے اپنے خوابوں، خواہشوں۔۔۔''

''آپ سے کب کہا میں نے کہ میرے خواب اتنے بلند ہیں؟'' وہ بری طرح خفا ہوئی۔ اصدق نے ہاتھ میں موجود پھولوں میں سے ایک پھول اس کی جانب بڑھایا۔ جسے اسے طوعاً کرعاً تھام لیا۔ وہ اس سے دو اسٹیپ نیچے سیڑھی پر ٹک گیا۔

''خواب میرے بھی بلند نہیں ہیں اور۔۔۔ تم نے کب دیکھا مجھے حسرتیں پال کر خواہشوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔ مگر گھر میں میری بہنیں ہیں۔ کھانا وہی کھا لیتا ہوں جو میسر ہو۔ شرط یہی کہ حلال ہو۔ لباس خریدتا ہوں کہ تن ڈھانپنا ضروری ہے۔ جوتے سستا بھی ہو اور پائیدار بھی۔۔۔ کبھی کوئی مخصوص برانڈ یا ڈیزائن کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا، میری عمر کے لڑکے آج بھی بلکہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی خبط میں مبتلا رہے جب کان کو ریڈیو لگا کر بچپن میں کنٹری سنتے تھے، میں نے تب بھی شدید خواہش کے باوجود طلب نہیں کیا۔ پھر اچھے پین، جوتے، اکلوتا بیٹا ہوں۔ ہمیشہ سب اچھا دیا گیا۔ کوشش کی گئی، مگر باہر کی دنیا اور ہی طریقے سے جیتی ہے۔ تلے والے جوتے، نوک والے بند بوٹ، مہنگی جینز، امپورٹڈ شرٹ، مہنگے کرتے، سب بازاروں میں مجھے بھی نظر آتا ہے۔ کئی بار دل مچلا بھی، مگر پھر خیال آتا، میرا کیا ہے، میں تو ایک مرد ہوں، ایک بدرنگی سو بار کی دھلی جینز کوئی سی بھی شرٹ، جوتا کافی ہے مجھے ڈھانپنے کے لیے۔ مگر گھر میں میری بہنیں ہیں۔ بہت بچپن میں سیکھا کہ یہ بہنوں کو شو مارنے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے اور تیار شیار رہنے کا، سو میں اپنے لیے شیمپو اٹھا کر نہ لاتا۔ مگر ان سب کے لیے اٹھا لیتا حالانکہ اپنا ذاتی اسٹور تھا۔'' اس کے ہونٹوں پر معصوم بچے جیسی مسکان آرکی تھی اور لہجے میں لڑکپن بولنے لگا۔

فائزہ کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا۔

''وہ میرا بچپن تھا۔ بچپن کی معصوم سوچ۔۔۔ بہنوں کو پرس پکڑ کے چلنے کا بہت شوق تھا اور میں انہیں ہر عید پر بٹوے گفٹ دیتا۔ لیکن اب وہ عمر کے اس دور میں داخل ہو گئی ہیں جب بٹوے کا نوٹوں

سے بھرا ہونا بھی ضروری ہے اور میرے لیے یہ احساس موت جیسا ہے کہ وہ خالی بٹوے کے باعث خوش نہ رہ سکیں گی اور بٹوے کو بھرنے کے لیے میرے پاس یہی حل ہے، یہی ایک۔۔۔ ورنہ میرے لیے تو وہی ایک جینز کافی ہے۔'' اس کے لہجے میں موجود قناعت۔

فائزہ ششدر رہ گئی۔ اصدق نے ایک پھول پھر اس کی جانب بڑھایا۔

اصدق کی اپنی تو ایک ہی بہن تھی۔ عارفہ اور بہت چھوٹی آصفہ۔۔۔ اس نے بہنوں کہہ کر تایا کی بیٹیوں کو بھی شامل کیا تھا۔ ان کی فکر پالی تھی۔ اتنا بڑا دل۔۔۔ اتنا انمول احساسِ ذمہ داری۔

''یہیں رہ کر کچھ کر لیتے، اتنی دور۔۔۔'' اس کی آواز گھٹ گئی۔

''یہیں رہ کر سب کچھ کر لیتا اگر خود غرض ہوتا اور مجھ پر دوسروں کا حق نہ ہوتا۔ لیکن اب اصل بات یوں ہے کہ اگر تھوڑی سی تکلیف، دوری کاٹ کر بہت سوں کو خوشی ملتی ہے تو سودا برا نہیں۔'' اس کی جانب ایک اور پھول بڑھاتے ہوئے وہ طمانیت سے مسکرایا۔ ایسی بے ریا انمول مسکراہٹ۔۔۔ پرخلوص۔۔۔

''قناعت بہت ارفع خوبی ہے اور۔۔۔۔! مگر اس سے بڑھ کر کوشش اہم ہے۔ میں جانتا ہوں۔ تم اور میں قانع ہیں۔ مگر کچھ ہاتھ پیر ہلا لینے سے کیا جاتا ہے؟ ایک اچھا مستقبل۔۔۔ یہاں سب مجھے چاہتے ہیں۔ تو کیا میں انہیں نہیں چاہتا۔ چند سال کی مشقت۔ میں نے کون سا وہاں ہمیشہ رہ جانا ہے۔ یہیں لوٹوں گا۔ بس تمہیں ذرا سونے میں پیلا کر دوں گا بیگم صاحبہ جیسی۔'' وہ شریر ہوا اور باقی کے سارے پھول اس کی گود میں ڈال دیے۔

فائزہ کے چہرے پر رنگ آ گئے۔ وہ لجا گئی۔ پھر کچھ خفا ہو گئی۔

''کس نے کہہ دیا کہ مجھے سونے میں پیلا ہونے کا شوق ہے؟'' اس نے اپنی گودی کے پھولوں کو مٹھی میں اٹھا کر دکھایا۔ ''میرے لیے تو یہی پھول کافی ہیں۔ سنگھار کے لیے بھی اور دل بھرنے کے لیے بھی۔'' اس نے ایک دھار سے اپنی گود میں گرتے پھولوں پر نثار ہو کر کہا تھا۔ اصدق اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''اور میرے لیے یہ خوشبو۔'' اس نے اپنی ہتھیلیاں ناک سے جوڑ کر سونگھیں۔ جن میں پھولوں کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے ناک کے قریب لے گیا۔ فائزہ کی روح تک معطر ہو گئی۔

۞۞۞۞

چور، چوری کو بھول جاتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں کہاں نقب زنی کی تھی۔ کون سا رستہ، گلی، مگر مال کو تو گن کر رکھتا ہے۔

چھوٹے نوٹ، اور بڑے نوٹ اور زیور اور کپڑا۔

ایک حساب اس کا بھی ہوتا ہے، ایک سرمایہ۔ ایک ایسا حساب کتاب جو کہیں کسی کاغذ، قلم کے سہارے محفوظ نہیں کیا ہوتا۔ بس انگلی کی پوروں پر گن کر یادداشت کی تجوری میں مقید۔

اسے ادراک نہیں ہوتا، مگر جرم یاد تو ہوتا ہے۔ کب اور کتنا۔

اور قاتل بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔

ایک جو مقتولین کی تعداد کو یاد رکھتے ہیں اور ایک جو بھول جاتے ہیں۔
دونوں صورتوں میں اگر جرم ان کے لیے قابلِ فخر ہے تو۔۔۔
وہ بے فکری سے کہے گا۔ اور اب تو یاد ہی نہیں کہ کتنے بندے پھڑکائے ہیں اور دوسرا فخر سے سینہ تانے گا۔
اب تک دو سو نو بندے کھڑچ کر چکا ہوں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ جرم بھی یاد۔۔۔ تعداد بھی۔۔۔ اور فخر بھی۔۔۔''
تو کیا وہ اب جرم پر بے فکری کا پردہ ڈال کر بھول جائے کہ کب، کب یا۔۔۔ وہ یاد رکھے اور گنوائے کہ۔۔۔ کب۔۔۔ کب (اور کیا وہ فخر کرے)
اس طرح کے اعمال جرم کی حد میں داخل ہوئے۔
جرم کی طرف، گناہ کی جانب پہلا قدم
نہیں، پہلا ارادہ یا پہلی خواہش۔
نہیں نہیں۔۔۔ سب سے پہلے تو ''خیال'' ہی گناہ کے زمرے میں آیا۔ وہ اس تپتی بنچ پر بیٹھا گنتی کرنے لگا تھا۔ بنا کسی کاپی، پنسل کے وہ بس ذہن ہی میں ایک ترتیب سی بنا رہا تھا۔
پہلا جرم خیال۔
دوسرا ارادہ۔
تیسرا عملی قدم۔۔۔ چوتھا۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ ان تین اعمال کے بیچ بھی بہت کچھ تھا جو جرم ہی تھا۔ گناہ کے زمرے میں ہی آ رہا تھا۔
اس کا اٹھنا، تیار ہونا، گھر سے نکلنا، قدم بڑھانا، ہر اٹھتا قدم، ہر جنبش، آہ۔۔۔! اس نے ہار کر اپنا سر ہاتھوں پر گرا لیا۔
وہ گناہ کی ترتیب کیسے لگا پائے گا۔

❂ ❂ ❂ ❂

خبروں کی پٹی پڑھتا ظفر بڑا مگن دکھائی دیتا تھا۔ وہ ناشتا کر رہا تھا اور ہر خبر میں اس کے لیے دلچسپی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ بہت عمیق نگاہی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو تین روز کی ناسازیٔ طبع کے بعد آج کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ چہرے پر ہلکی نقاہت، گہری بے زاری اور اکتاہٹ کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ جیسے ناچاہتے ہوئے سب اعمال کی انجام دہی کر رہا تھا۔
''اوشٹ۔۔۔!'' دفعتاً اس کی بے حد ناگوار، بے زار آواز گونجی۔ ایک دھاگے سے لٹکتا بٹن پٹچ کی آواز سے فرش سے ٹکرایا اور تھوڑا سا گھومتا ہوا زمین پر ٹک گیا۔
''پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی تھی۔'' وہ بڑبڑایا۔
''او یار! کوئی اور کپڑے پا (پہن) لے۔'' ظفر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔
'''' کوئی ایک کپڑا استری نہیں ہے۔ بلکہ استری تو کیا دھلے ہوئے بھی نہیں۔'' وہ سر پر ہاتھ رکھ کے کرسی پر ٹک گیا۔ '' کوئی اور بٹن ٹوٹتا تو مینج کر لیتا، بالکل گریبان کا ہے۔ کتنا برا لگ رہا ہے۔'' وہ منہ بسور کر بولا۔

''میرے خیال میں آج بھی رہن دے۔۔ مار لے چھٹی۔۔ تو ابھی بھی صحیح نہیں لگ رہا۔'' ظفر نے کسی بہت گہرے خیال سے ابھر کر اسے بغور جانچا تھا۔
''نہیں یار! ٹھیک ہوں میں، میری اور چھٹیاں اب ہیں بھی نہیں۔''
''اچھا خیر تُو یہ ناشتا کر۔ تھوڑی جان شان بنا، دودھ شدھ پی، کمزوری بھی جائے گی۔'' ظفر ہدایتیں دیتا اٹھا، وہ کیبنٹ سے کچھ ٹٹول رہا تھا۔
اب اس کے ہاتھ میں سوئی دھاگا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے دھاگا، سوئی کے ناکے سے گزار گانٹھ دے کر اس کے سامنے آرکا۔
''تم بٹن لگاؤ گے ظفر؟'' اس کی بے زاری پر مسکراہٹ حاوی ہوگئی۔
''لگانا آتا ہے؟''
''لو جی۔۔۔'' ظفر نے تاسف کا اظہار کیا۔ ''پنڈ میں درزیوں کے دو پتر میرے پکّے دوست تھے۔ ہم اس کی دوکان پر جا کر بیٹھتے تو اس کا ابا ہمیں یا تو کپڑے استری کرنے پر لگا دیتا، یا ادھیڑنے پر۔ سارے پنڈ نے میرے ہاتھوں لگے بٹن ہی پہنے۔'' ظفر کے جلے کٹے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس دیا۔
''یہ تمہارے سارے دوست ایسے ہی کیوں تھے؟ درزی، نائی اور۔۔۔'' وہ قصداً رکا۔
''ہاہاہا۔۔۔'' ظفر نے بھی زندہ دلی سے قہقہہ لگایا۔
''سب سے تم نے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ لیکن میں تو ہر معاملے میں بڑا نکما ہوں۔ میری دوستی سے تو تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوا ہوگا۔''
''خیر باؤ! اب ایسی بھی کوئی شرمندگی کی بات نہیں۔ میں نے کہا نا دراصل میری اپنی تو کوئی خاص اوقات ہے نہیں۔ بس یار دوستوں کی صحبت نے جو بنا دیا، بن گئے۔ رب سوہنا جانے۔۔۔ کہ چنگے یا مندے اور رہی آپ ہوراں سے سیکھنے والی بات۔۔۔ تو بس اتنا سیکھا کہ بندے کو اتنا شریف اور اتنا نیک بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے ذومعنی بات کہی تھی۔
''ہائیں! یہ کیسی بات ہے۔'' اسے ایک لفظ بھی پلّے نہ پڑا۔ ظفر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بٹن ٹانک چکا تھا اور گریبان پر جھکا دانت سے دھاگا کاٹ رہا تھا۔
''یار! تیرا میرا رشتہ بڑا ہی عجیب ہے۔ جب میں تیرے لیے کھانا بناتا ہوں نا تو مجھے لگتا ہے میں تیری امی ہوں۔ ہاہاہا۔۔۔ جب بیماری میں ماتھے پر پٹیاں رکھیں تو مجھے لگا میں تیری باجی ہوں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ وڈی باجی، ہوہوہو۔'' وہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اپنے ہی جملوں پر۔
''لیکن آج تو کمال ہی ہوگیا نا۔ یہ بٹن ٹانکنے کے بعد مجھے لگ رہا ہے میں تیری بڈی (بیوی) بھی بن گیا۔ اوئے میرے ربا۔'' وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کے گول گیند ہوگیا۔
''تم بہت بدتمیز ہو ظفر!'' اسے زور کی ہنسی آئی بھی مگر اسے ٹوکنا ضروری خیال کیا۔
''او یار! نویں گل کر۔۔۔ یہ والی بات تو پنڈ کی دائی نے میرے جمتے ہی کہہ دی تھی۔ چوہدری صاحب تہاڈے کار (آپ کے گھر) بدتمیز ہوا ہے، ہاہاہا۔''
''تم دائی کی پیشن گوئی پر سر دھنتے رہو، میں چلا۔ پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔'' اس کے وجود پر چھائی

بے زاری کی دھند چھٹ گئی تھی۔ وہ اب تیزی سے پیروں میں جا گرز چڑھا رہا تھا۔
"میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔" ظفر کے لبوں سے پانی کا گلاس لگا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش تھا۔
"تُو بھرجائی ہوراں کو اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ میرا مطلب ہے فیملی، بچے وچے تجھے بھابھی جی کو اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہیے۔ میرا مطلب۔۔۔" ظفر نے بہت سے جملے سوچ رکھے تھے۔ مناسب، موزوں ڈھیلے ڈھالے جملے، ہلکے پھلکے۔
"یہ بات کیوں کہی، آئی مین اس وقت اچانک۔"
"نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ دراصل تُو جو ہے نا۔" ظفر اٹکا۔ "یار! تُو چھڑا چھانٹ رہنے والا بندہ نہیں ہے۔ یعنی تیری ہڈی ہی نہیں کلم کلا (تن تنہا) رہنے کی۔" ظفر گڑبڑایا۔ وہ تین دن سے جملوں کی ترتیب بنا رہا تھا۔ تب کامیاب نہ ہوا تو اب ایک دم کہاں سے فصیح و بلیغ ہو جاتا۔
"میرا مطلب ہے تُو وہی آدمی ہے یار! وہ اس کو کیا کہتے ہیں۔" وہ پیشانی مسلنے لگا۔ "ہاں، وہ فیملی مین۔۔۔ یہ تھا میرا مطلب۔" ظفر نے بات گھما ہی لی۔ سنبھال ہی لی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسکرا کر اللہ حافظ کہتا باہر نکل گیا۔
"بچ گیا تُو ظفر پتر۔" ظفر نے سارا گلاس ایک سانس میں چڑھا لیا۔
"بعض باتیں کہنی کتنی مشکل ہوتی ہیں۔ اتنے جملے امتحان میں بناتا چھانٹ چھانٹ کرتا پورے پنجاب بورڈ میں پوزیشن بن جاتی۔ جتنے ان تین دنوں میں بنائے ہیں۔ مگر دھت تیرے کی، عین ٹیم پر ایک بھی کام نہ آیا اور سچ کہتے تھے ابا جی! دو بندے بڑے ہی بے شرم ہوتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر تے دوجا وکیل۔" کیسے مزے سے کہہ دیا اس ڈاکٹر نے۔
"اپنے دوست سے کہیں وائف کو ساتھ رکھیں۔"
"بھئی میں تو نہیں کہہ سکتا۔ دوبارہ ایسا کچھ ہوا تو کہہ دوں گا جی ڈاکٹر صاحب! آپ ہی نے شرم گھول کر پی ہے۔ آپ ہی کہہ دیں ہونہہ۔۔۔" وہ باآواز بلند بڑبڑا رہا تھا۔
"لیکن چوہدری ظفر!" وہ خود سے مخاطب تھا۔ "یہ اتنا سیدھا مسئلہ نہیں ہے۔" بہرحال تین دن پہلے کی رات اپنی تمام تر جزئیات سے یاد تھی۔

✿✿✿✿

ایک رات تو وہ تھی جس میں وہ انتہائی ناگفتہ حالت میں سجدہ ریز تھا۔ اس کا جسم گرم تھا اور سینہ ٹھنڈا۔۔۔ وہ نہ جانے کس عالم میں تھا کہ ظفر کے بار بار بلانے، چونکانے پر واپس نہ پلٹا۔ پھر عجیب سے بڑبڑاہٹیں جو ظفر کے خاک پلے نہ پڑیں۔ وہ اس کی پشت سہلانے لگا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا اور پھر پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر جیسے ہی حواس بحال ہوئے۔ وہ بے حد اچنبھے کے عالم میں ظفر کو تکنے لگا۔ پھر در و دیوار کو اجنبیت سے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے واپس پلٹا۔ اس نے اپنے پورے وجود کو دیکھا تھا اور پھر ایک دم ادراک سا ہوا، نظریں چرا گیا۔
"کیا ہو گیا ہے یار تجھے!" ظفر کی حیرت آمیز پریشانی کی کوئی حد نہ تھی۔
"اچھا بھلا سویا ہوا تھا۔ یہ ایسے سجدے کی طرح مودا (جھکا ہوا) کیوں پڑا تھا۔ کھانا ہضم نہیں ہوا۔

پیٹ میں درد شرد ہے۔تو مجھے جگا دینا تھا۔کوئی علاج دلاج کرتے بلکہ میرے پاس تو بے بے کی دی ہوئی پھکی بھی ہوتی ہے۔'' وہ بے بے کی پھکی ڈھونڈنے کے لیے ڈبے ٹٹول رہا تھا۔

''چل شاواشے! ایک چمچہ لپک کے اوپر سے گلاس پانی چڑھا لے۔پھکی اندر درد باہر شڑ لگا لے۔'' وہ چمچہ اور گلاس لیے کھڑا تھا۔

''اوں۔۔ہوں۔'' اس نے منہ پھیرا۔

''او سجنا! کوئی گندی سندھی چیج نئیں ہے۔میری دادی کی دادی کے زمانے کا نسخہ ہے۔او میں تجھے خراب چیز کیوں کھلاؤں گا۔'' وہ صفائی دیتے دیتے خفا ہونے لگا۔

''نہیں، میرے پیٹ میں درد نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''ہائیں۔۔۔تے فیر ٹیڈھ پھڑ کے موڈا کیوں سیں۔ (پھر پیٹ پکڑ کے دوہرے کیوں تھے)۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' وہ پانی کا آخری گھونٹ چڑھا کر ہاتھوں سے بال سنوار اپنا تکیہ جمانے لگا۔ظفر ہنوز گلاس، چمچہ لیے کھڑا تھا۔

''سچ کہہ رہا ہوں ظفر! واقعی میرے پیٹ میں درد نہیں ہے۔اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔درد ہوا تو ان شاء اللہ بے بے کی پھکی ہی کھاؤں گا۔''

''اوئے پاگلا۔۔۔درد کے ساتھ ان شاء اللہ نہیں بولتے۔'' ظفر اچھلا۔

وہ غیر محسوس سا مسکرا دیا۔''میں نے بے بے کی پھکی کی تاثیر کے لیے ان شاء اللہ کہا ہے۔'' وہ اوندھا لیٹ گیا۔

چیزیں واپس جگہ پر جماتے ظفر اسے حیرت سے دیکھ لیتا تھا۔جو واقعی پرسکون حالت میں سونے ہی والا تھا۔

ظفر نے شانے اچکائے۔وہ بھی بستر پر گر گیا۔نیند کی وادی میں غرق ہونے تک وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا تھا؟

مگر وہ کبھی بھی معاملہ فہم، زیرک نگاہ یا پیش بین نہیں رہا تھا۔سیدھا صاف کھرا۔۔۔گہرائی سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا کہ وہ قیاس کرتا اور کڑیاں جوڑتا۔

اور اگر عقل کے گھوڑے دوڑا کر کچھ نتیجہ نکالنا بھی چاہتا تو وہ تو کبھی بھی نہ نکال سکتا۔جو ڈاکٹر صاحب کہہ گئے تھے۔

دوسری رات یا دوسری مرتبہ کا ماجرا بالکل جدا تھا۔یعنی گزشتہ سے پیوستہ تو تھا مگر ایک نئے ڈھنگ کے ساتھ۔وہ ویک اینڈ نائٹ تھی اور ظفر پوائنٹ چڑھا کر آیا تھا۔وہ ہلکے سرور اور ترنگ کے زیرِ اثر تھا۔ میڈ لے گاتا ہوا، بیک ٹو بیک میوزک سب مکس۔

''میری چی چی دا چھلا ماہی لا لیا۔۔۔گھر جا کے شکیت لاواں گی۔''

اپنی چابی سے لاک کھولتا وہ اندر داخل ہوا۔آتشی گلابی پینٹ پر تھائی شرٹ تھی جو رنگوں سے بھری تھی اور ایک ڈریگن سینے پر منہ کھولے آویزاں تھا۔وہ کارٹون فلمز کے جاسوسوں کی طرح پراسرار بنا چاپ پیدا کیے لمبے ڈگ بھرتا تھا۔

''اب کے سال پونم میں۔۔۔جب تو آئے گی ملنے، ہم نے سوچ رکھا ہے۔
رات یوں گزاریں گے۔ہچ ہچ۔''
ایک انتہائی عجیب وغریب ہنسی اور غیر فطری سی آواز پر وہ چونکا۔یہ اس کی اپنی ہچکیوں کی آواز تو ہرگز نہیں تھی۔وہ نشے کے زیرِ اثر تھا اور خوب موجیں اڑا کر آرہا تھا۔مگر گردن گھما کر جب زمینی گدے پر اوندھے اکڑے اور جھٹکے کھاتے ہوئے اصدق کو دیکھا تو جیسے سارا نشہ ہرن ہوگیا۔جیسے کسی نے بالوں سے پکڑ کر اسے ٹھنڈے برف پانی میں غوطے دے دیے ہوں۔
''اوئے اصدق۔۔۔اویار۔۔۔اوکی ہوگیا جگر۔۔۔اوتینوں کی ہورہا ہے۔''
ظفر شدید حیرت اور خوف کے عالم میں اس تک گیا تھا۔جس پر تشنجی کیفیت تھی۔
''اوئے ربا۔۔۔اج پھر اس کے پیٹ میں درد ہورہا ہے۔اوکہڑا روگ والیا۔اوجگر!اواصدق باؤ!''
ظفر تیزی سے اٹھا اور بے بے کی پھکی ڈھونڈنے لگا۔ہڑبونگ کے عالم میں ڈبے کی پہچان ہی نہ ہورہی تھی۔اسی پل اسے عجیب سا احساس ہوا کہ اس کی حالت پیٹ درد والی نہیں ہے۔یہ۔۔۔مرگی کے دورے جیسی کوئی حالت تھی۔وہ وہیں رک کے اسے بغور دیکھنے لگا اور حتمی نتیجے پر پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کیا کرے۔وہاں پنڈ میں تو جوتی سنگھائی جاتی تھی تو کیا وہ بھی۔۔۔وہ سرعت سے جوتی اٹھانے لگا، مگر رک گیا۔وہ اتنی ہی تیزی سے ٹیلی فون کی جانب بڑھا۔وہ ایمر جنسی ڈاکٹر کو کال کررہا تھا۔
اور پھر ڈاکٹر کے آنے تک اس کے اکڑے ٹیڑھے میڑھے وجود کو اس نے کیسے سنبھالا دیا تھا یہ وہی جانتا تھا۔
جب تک ڈاکٹر آکر جانچ کرتا رہا وہ حیرت اور خوف کے زیرِ اثر کرسی پر پاؤں اوپر کیے سینے پر بازو لپیٹے بس اسے حیرت سے تکتا ہی جاتا۔
''رسولی۔۔۔برین ٹیومر، کینسر۔'' اس نے اپنے دل میں دنیا کی خطرناک سے خطرناک بیماری سوچ لی۔''اور علاج کہاں سے ہوگا۔کب تک چلے گا۔علاج ہے بھی کہ نہیں۔۔۔کتنا مہنگا علاج ہوگا۔کمپنی کروائے گی یا خود ہی۔۔۔اوئے ربا۔'' گھڑی کی آگے کی جانب بڑھتی ٹک ٹک اس کے اعصاب کا کڑا امتحان تھی۔
''کیا یہ شادی شدہ ہے؟''
''جی۔۔۔جی۔۔۔ماشاءاللہ تین بچے ہیں۔دومنڈے، ایک کڑی۔''
''کتنا عرصہ ہوا شادی کو؟''
''او جی یہی کوئی آٹھ، سات سال۔'' ظفر کو یہ سب سوال انتہائی غیر ضروری لگ رہے تھے۔جلدی سے بتاتا کیوں نئیں ہویا کی اے۔
ایک سکون اور انجکشن اپنی ناک کی سیدھ میں رکھ کر جانچتا ڈاکٹر اسے زہر لگنے لگا۔
بڑا ہی ڈھیلا ہے۔اب منہ سے کچھ پھوٹ بھی دے۔
''کتنے عرصے بعد پاکستان کا رخ کرتا ہے۔میرا مطلب ہے گھر جاتا ہے؟''
''او ڈاکٹر جی۔'' ظفر کو بے تکا سوال نہ بھایا۔''سیدھے سیدھے بتائیں ایہنوں کی ہوریا ہے۔میں نے آپ کو ابھی ساری باتیں تو بتائی ہیں نا۔''

ڈاکٹر نے پراسرار انداز میں سر ہلایا۔ وہ سامان سمیٹ رہا تھا۔
''اپنے دوست سے کہیں، وائف کو ساتھ رکھیں۔''
''ہیں جی؟'' ظفر بھونچکا رہ گیا۔

بہت دن ہوئے چندرا نے اسے دیکھ کے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی اب اِدھر آکر اچنبھے سے گردوپیش کو نہیں دیکھتا تھا کہ کہاں آگیا، کیسے آگیا؟ بس آگیا، بیٹھ گیا اور چلا گیا۔

مگر اس وقت دونوں کے چہرے حیرانی کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت دنوں کے وقفے سے آیا کرتا تھا۔ ایسے ہی اچانک ایک دم حاضر۔۔۔ ورنہ دنوں غائب، نہ نام کی خبر، نہ فون نمبر، نہ پتا۔
فقط چہرے کی شناسائی۔

اور چندرا یوں حیران تھی کہ وہ ابھی پرسوں ہی تو آیا تھا اور حسبِ معمول اسے دھتکار گیا تھا۔
اور وہ حیرت سے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ تو بالکل ہی بدلے حلیے میں تھی۔ اس کے سامنے وہ ہمیشہ بہت ہلکے پھلکے سنگھار کے ساتھ نمودار ہوتی تھی۔ ہوا جیسی بے ضرر بن کر۔۔۔ مگر اس وقت تو وہ اتنی بدلی ہوئی تھی کہ وہ ٹھٹکا تھا اور خود کو قائل کیا تھا کہ وہ وہی تھی۔

گلاب رنگ کی ساڑھی کا بارڈر سیاہ و سنہری تھا۔ ڈھیروں گلاب جوڑے پر کسے تھے۔ اس کی سڈول کلائیاں بھی پھولوں سے بوجھل تھیں۔

وہ سحر کار تھی، مگر ایسا ٹونا۔۔۔ معمول پانی بھی نہ مانگے، ایڑیاں رگڑے اور ختم۔
''میں شاید غلط وقت پر آگیا۔''
''نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''وقت غلط ہو سکتا ہے، آپ خود کو الزام مت دیں، آپ درست ہیں۔'' اس نے پورا پٹ وا کر دیا، یعنی وہ اندر آجائے۔
''کہیں جا رہی تھیں؟''
''نہیں۔'' وہ کلائی کے پھول کھول رہی تھی۔ ''کچھ مہمانوں کے ساتھ تھی۔'' وہ بے نیازی سے پھول سونگھ کر احتیاط سے انہیں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔
''دن کے وقت بھی مہمان؟'' وہ اچنبھے کا شکار ہوا۔ ''تم دن میں بھی یہی سب کرتی ہو۔ دن میں لوگ آتے ہیں؟'' اسے کراہت سی ہوئی تھی۔
''آپ بھی تو آئے ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ ہنسی کی حد کو چھو کر آئی تھی۔
''میں۔۔۔؟ میں تو پتا نہیں کیوں آجاتا ہوں اور آجانے کے بعد سوچتا ہوں کہ۔۔۔'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پیشانی مسلنے لگا اور وہ جملے کے ادھورے پن پر ذرا نہ کلسی، بخوبی جانتی تھی وہ کیا کہتا۔
خاموشی کے شور میں خوشبو بول رہی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے سب چیزیں میز پر رکھتی جا رہی تھی۔
''میں نے کبھی تمہیں اتنے سنگھار کے ساتھ نہیں دیکھا، میرا مطلب ایسے۔۔۔''
''آپ نے ابھی تک مجھ میں اور بھی بہت کچھ نہیں دیکھا صاحب!'' اس نے لطف اٹھا کر کہا تھا۔
اس کی نگاہیں گریبان کی کشتی پر ٹکیں، ٹھہریں اور پھر چونک کر پلٹیں۔ وہ اب قصداً منہ موڑے بیٹھا تھا۔

چندرا کا لطف دوبالا ہو گیا۔ نگاہوں کی یہ چوری اس کی نگاہوں سے مخفی نہ رہی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے تسلی سے براجمان ہو گئی۔ ہاتھ سے فال کو جماتے ہوئے وہ کچھ کہہ رہی تھی۔

''طوائف اپنی مرضی سے کبھی کچھ نہیں کرتی۔ وہ خود کو گاہک کے حساب سے پیش کرتی ہے۔'' اس کا انداز خطاب جیسا تھا۔

''ہمارے دھندے کے رولز لکھے ہوئے تو نہیں ہوتے۔ مگر نافرمانی کی بھی اجازت نہیں، دنیا کے ہر خطے میں طریقہ الگ ہو سکتا ہے، مگر مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ آمدنی بس۔۔۔'' اور یہاں وہ ہنسی تھی اپنے ہی کسی خیال پر۔

''ہمیں تو زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے، پتا ہے یہ ایشیائی مرد گوری چمڑی کی چاہ میں آتے ہیں۔ وہ اس کے ریٹ منہ مانگے دیتے ہیں اور انگریز یعنی گورے۔۔۔ یہ مشرق کے نمکین حسن کی تلاش میں آتے ہیں۔ ہم پر حکمرانی کرتے وقت رعایا کی عورتوں کا چسکا لگ گیا تھا۔ اب حکمرانی کے دن تو گئے پر اپنے پرکھوں سے سنے قصوں کو لے کر ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ انہیں الو بنانے کے لیے ہمیں آج بھی یہ روپ دھارن کرنا پڑتا ہے اور تمہارے ہمارے ملک کے یہ مزدور پیشہ مرد جن کے دانتوں کا خلا انہیں بدشکل بناتا ہے، چری باچھیں، انہیں چٹی چمڑی کے نام پر بندریا بھی تھما دو تو ڈولتے جائیں گے، جیسا گاہک، ویسا مال اور آج میرے مہمان بھی اپنے پرکھوں کی پرم پرا نبھانے آئے تھے کہ عورت بس ہندوستانی۔

لوگ کہتے ہیں زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ نئے نئے راستے، کاروبار کے نئے طریقے، پرانے پیشے دم توڑ رہے ہیں مگر ہمارا پیشہ یہ اعزاز رکھتا ہے کہ دنیا کا سب سے قدیم پیشہ۔۔۔ جو آج بھی قائم و دائم ہے، بلکہ ترقی ہی کی جانب گیا ہے، بلکہ جتنی جدت اس کے اندر۔۔۔''

''چندرا۔۔۔'' وہ اب اور سننے کی تاب نہ رکھتا تھا۔

''تمہارے منہ سے اپنا نام کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی وہ موئے سفید بندر مجھے چنڈرا کہہ رہے تھے، مجھ لگ رہا تھا وہ مجھے چڑیل کہہ رہے ہیں۔ تم بتاؤ، میں چڑیل لگتی ہوں۔'' وہ دفعتاً اٹھ کر اس کے صوفے پر آ گئی اور گردن سیدھی رکھ کے تن کے پیش ہوئی۔

وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ وہ کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے۔۔۔ لیکن وہ ہمیشہ یہاں آگ بن کر آتا تھا اور برف بن جاتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔

دھواں آگ سے بھی نکلتا ہے اور۔۔۔ اور برف سے بھی۔

دھویں کے اس مرغولے سے چھلکتا وہ نمکین چہرا۔

اس نے بڑھے ہاتھ کو تھام لیا۔ چڑیلوں کے ہاتھ ایسے تو نہ ہوتے ہوں گے۔ وہ چہرے کو تکتے ہوئے ہاتھ کی پشت کو سہلا رہا تھا۔

کتنے پل بیت گئے۔

آگ اور برف کا دھواں۔۔۔ نتیجہ دھندلا منظر۔

''تم نے آج تک اپنا نام بھی نہ بتایا۔ شاید مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتے، تمہیں کیسے بتاؤں، میرے پاس صرف یہ ہاتھ نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔'' وہ خود کلامی سی کر رہی تھی۔ جانتے بوجھتے۔

اور وہی ہوا، کرنٹ کھائے انداز میں وہ اس کا ہاتھ چھوڑ چکا تھا۔ اسے جھٹکا سا لگا تو وہ زمین پر گرنے کے سے انداز میں جا بیٹھی۔

ایک کی آنکھوں میں ذلت اور دوسرے کا ہر رنگ ہراساں تھا۔

❁ ❁ ❁ ❁

ان کے کام میں چھٹی کا تو سوال ہی نہیں تھا مگر کبھی کبھار ایسی فرصت کے دن بھی میسر آ جاتے تھے جب اس گھر کی تمام عورتیں، لڑکیاں فراغت سے لطف اٹھاتیں، باتیں کرتیں، بازار چلی جاتیں یا یوں ہی کسلمندی سے بستروں میں دبی ریموٹ سے کھیلتی رہتی، کچھ اپنے گھروں کا بھی رخ کرتیں۔ ساری کمائی سے خریدی ہوئی چیزوں کے تھیلے اٹھائے۔

وہ سب اپنے نوٹ گنتی اور خرچے کو یاد کرتیں۔ آمدنی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ مگر بے برکتی آمدنی۔۔۔ پتا نہیں کیوں؟

وہ سب مل کر بیٹھتیں تو اپنے گاہکوں کو یاد کر لیتیں۔

چار بیویوں والا شیخ اور وہ موٹی توند والا ہیروں کا بیوپاری اور وہ چائنیز جو قد لمبا کرنے کے کیپسول کھاتا ہے اور اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر ہیجڑا دکھائی دیتا ہے۔

وہ ان مردوں کو یاد کر رہی تھیں اور ان کی گفتگو بے ہودہ، نہیں بے شرم نہیں، اخلاق کی انسانیت کے لیے باعث شرم نہیں بلکہ برہنی تار تار باتوں کے چیتھڑے جملوں کی برہنگی، لفظوں کی پامالی۔

ایسی باتیں جو قوتِ گویائی کو شرمسار کر دیں۔

جو حسِ سماعت کو منہ چھپائے پر مجبور کر دیں اور وہ سب ہنس رہی تھیں۔ یادوں پر، باتوں پر، چہروں پر۔۔۔

''وہ چندرا سے عشق کرنے لگا ہے۔'' اب موضوع چندرا تھی۔

وہ اوندھی لیٹی کش لے رہی تھی۔ دھویں کے مرغولے میں اس مرد کا چہرا ہلکورے لینے لگا۔ اس کے چہرے پر مسکان در آئی۔

''بہت دن سے وہ آیا نہیں۔''

''بھاگ گیا۔'' ایک نے کہا۔

''یا ڈر گیا۔'' دوسری نے مزا لیا۔ ''چندرا کو جھیلنا آسان نہیں۔'' اس نے اپنے جملے کو مکمل کیا۔

''وہ تجھ پر فدا ہو گیا ہے چندرا۔''

''قسم کھا وہ چائے پی کر ہی جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی وہ بھی نہیں پیتا۔''

''وہ یہاں کیوں آتا ہے چندرا۔۔۔ تو نے ابھی تک اگلوایا کیوں نہیں؟''

''وہ کھایا پیا ہضم کر کے آتا ہے۔'' چندرا دوبارہ کہیں کھو گئی۔

''کتنے دن ہو گئے وہ آیا ہی نہیں۔'' رنگیلے کو تو اس روز اس نے دیکھا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں رک گئی۔

وہ اس سے کیا کہہ کر پوچھتی جس کا نام تک نہ جانتی تھی۔

چندرا کا بنجے۔

اور یاداتنی طاقت وریادل سے تھی کہ وہ اگلے روز موجود تھا۔ چندرا کسی اور کے ساتھ جانے کو تیار تھی، فیصلہ ہو چکا تھا۔

''آپ کسی اور کے ساتھ ۔۔۔ روزا اور شمیلی ہیں ابھی۔'' اِن کی نگراں میڈم نے دوسرا راستہ بتایا تھا اور وہ والٹ کھول کر پیسے بڑھا رہا تھا۔ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی نگاہیں چندرا کے چہرے پر رکیں، جو بس اسے دیکھ رہی تھی۔ پلکیں جھپکے بنا ٹکٹکی باندھ کے۔

اس نے پل بھر میں فیصلہ کیا تھا۔

والٹ سے نکلے پیسوں کو میڈم کے پھیلے ہاتھ پر دھر کے وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر گیا۔

چندرا کا دل پھسلا سکڑا اور پھر پسلیوں سے ٹکرا ٹکرا کر سر پٹخنے لگا۔

میڈم نے نوٹ گنے، وہ مسکرا رہی تھی۔

اندر بڑھتی چندرا کے قدم من من کے تھے۔

ایک انتہائی لمبی کھنچی ہوئی ''ہیں جی'' کہتے ہوئے ظفر کھڑا ہو گیا۔ اسے خاک سمجھ میں نہ آیا۔ وہ کبھی ڈاکٹر کو دیکھتا اور کبھی چت لیٹے اصدق کی صورت، سینے کا مدھم زیروبم پرسکون تھا۔

ڈاکٹر کچھ کہہ رہا تھا۔ ''میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ لیکن آپ نے جو جو باتیں بتائی ہیں کہ یہ جھنجلائے رہتے ہیں۔ مطلب کچھ عرصے سے رہنے لگے ہیں۔ خاموش بھی ہو گئے ہیں اور۔۔۔'' ڈاکٹر نے ہلکی رفتار سے بولنا شروع کیا تھا اور بعد میں اس کی فراٹے سے چلتی زبان۔۔۔ ظفر کے چودہ طبق روشن تھے۔ ڈاکٹر مسلسل بول رہا تھا۔

''علامتیں، وجوہات، تدارک۔''

میڈیکلی، مذہبی حوالہ، جذباتی حوالہ، وغیرہ وغیرہ۔

سب کہہ سن کر ڈاکٹر یہ جا وہ جا۔

ظفر کسی ٹرانس کے عالم میں تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور دوبارہ کرسی پر پیر اوپر رکھ کے بیٹھ گیا۔ وہ اصدق کے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ خیالات کا ایک ریلا، ڈاکٹر کے جملے، اصدق کے رویے، سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

اس کی سوچوں میں ارتکاز کا فقدان تھا۔

وہ خود شادی شدہ، پتا نہیں کتنے ہی بچوں کا باپ تھا۔ لیکن اسے کبھی ایسی کسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اس نے ایسا کبھی سنا ہی نہیں تھا۔ دیکھنا تو دور کی بات۔

اسے اپنے پنڈ کا وہ بڈھا کنوارا یاد تھا جو عجیب خبطی عالم میں گلیوں کی خاک چھانتا۔ اسے ہی پڑتے تھے اس کے دورے۔

تب گاؤں کے بڈھے تجربہ کار زیرک اسے ہٹے کٹے لڑکوں سے جکڑوا لیتے، جوتی سنگھاتے اور بعض اوقات اس کے سر کے عین اوپر جوتے برساتے کہ خناس نکل جائے۔

مگر انسان کی جبلی ضرورتیں خناس نہیں ہوتیں کہ مار مار کے باہر کر دی جائیں۔ بھوکا روٹی مانگے تو کیا اسے جوتے مارنا چاہیے۔

ننگا کپڑا مانگے تو کیا۔۔۔

انسان محبت مانگے۔۔اور انسان رشتہ مانگے، ساتھ مانگے، اپنا جوڑی دار مانگے۔ (مرد و عورت کی تخصیص قطعاً نہیں) تو سر کے اوپر پے در پے پچ پچ جوتیاں؟

بچپن کا ایک اچھا منظر آج کیسے ظفر کی نگاہوں میں واضح ہو گیا تھا۔

وہ خبطی اول جلول بڈھا جو خونی رشتوں کے زمین جائیداد ہتھیانے کے بعد گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ جس کے پچھلے (ماں، باپ) مٹی ہو چکے تھے۔ جس کے اگلے (بیوی، بچے) کبھی ہونے ہی نہیں دیے گئے۔ بہن، بھائی ہر شے کے شراکت دار ہوتے ہیں، ایک چھابی سے روٹی کے نوالے چننے والے، مگر جب بات روٹی کے نوالے سے آگے بڑھ کر زمین و جائیداد کے ہتھیانے پر آئے تو یہی دودھ شریک شریکے بن جاتے ہیں۔

مگر وہ بوڑھا خبط، اوں ہوں۔۔۔ اور کہاں۔۔۔ اصدق باؤ۔

نکھرا، ستھرا، ذی ہوش، قابل ہنرمند، چلتے چلتے کہیں بے حس و حرکت چند پل کے لیے کھڑا ہو جاتا تو یوں لگتا چوک پر ایک خوش شکل مجسمہ ایستادہ ہے اور اس کا اس خبطی سے کیا موازنہ۔ مگر۔۔۔ حالت تو دونوں کی آج ایک تھی۔

تین دن تک خراب طبیعت۔۔۔ ظفر کو اس سے دلی لگاؤ تھا اور اب اس حالت میں۔۔۔

''مجھے کیا ہو گیا تھا ظفر۔۔۔ یہ کس چیز کی گولیاں دے رہے ہو۔'' وہ متامل تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دی ہیں، کوئی میری پڑدادی کی پھکی نہیں ہے جو تُو شک کرے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے جتا رہا تھا۔

''لیکن دوائیاں کیوں؟''

''یار کام کا برڈن، گرمی کا موسم، آب و ہوا، ہاں آب و ہوا کا بدلاؤ۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا دنیا گلوبل ولیج ہے اور سکڑ کر۔۔۔ دراصل گلوبل وارمنگ۔۔۔''

''ڈاکٹر نے میری بیماری کی یہ وجوہات بتائی ہیں؟'' اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''او یار!'' ظفر نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ''تو دوائیاں کھا۔ ڈاکٹر تو ایسی ویسی ہانکتے ہی رہتے ہیں۔''

''اچھا۔'' اصدق نے چپ چاپ گولیاں نگل لیں۔ دوائیاں واقعی سکون آور تھیں اور وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

لیکن۔۔۔

اس دن۔۔۔

✿ ✿ ✿ ✿

ظفر نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا، اس نے دواؤں کے ڈبے میں موجود

ہدایتوں والا پرچہ پڑھ لیا تھا۔
سکون آور ادویہ۔۔۔مگر دوا ہر مرض کا علاج نہیں ہوتی اور ظفر اس کے مرض کو بھانپ گیا تھا۔ ان دونوں کی ڈیوٹیاں ایک بار پھر صبح و رات میں بدل گئی تھیں۔ آمنا سامنا کم ہی ہوتا اور شاید وہ چاہتا بھی یہی تھا بلکہ دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چراتے تھے۔
اصدق مزید خاموش ہو گیا تھا۔ وہ پہلے بھی کم بولتا تھا، مگر ظفر کے سننے میں اسے بڑی دلچسپی تھی وہ دنیا کے ہر موضوع پر معلومات ہو نہ ہو، بولتا ہی رہتا تھا اور وہ ایک اچھا سامع تھا مگر یہ دن و رات پتا نہیں کیسے تھے۔
پتا نہیں اس کی یہ حالت کیوں ہو رہی تھی، وہ تو سات سال سے یہاں تھا، مگر پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ زیادہ بے چین تھا۔ بے چینی کا غیر معمولی احساس اب ایک تکلیف دہ روگ بن چکا تھا جس سے ابھرنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ تھی، وہ کیا کرتا؟ وہ کیا کر سکتا تھا؟
جو واحد حل اس کے پاس تھا اس پر کم از کم فوری عمل درآمد ناممکن تو نہ تھا مگر مشکل ضرور تھا۔ پردیس میں بن باس کاٹتے انسانوں کے پاس دل ہلکا کرنے کے سہارے نہیں ہوتے، ایمان کے ڈھیلے ہوں تو بدی کا راستہ بانہیں وا کیے خود میں سمیٹ لیتا ہے اور داخل ہونے والے بغلوں میں منہ دیے جاتے ہیں۔
دل میں تقویٰ کا قفل ہو تو بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔
دنیا کے ہر مسئلے کا حل اسی ایک ''رجوع'' میں ہے مگر اسے لگنے لگا کہ اس کی حالت سے آرام کے لیے سب سے بہترین راستہ ہے کہ وہ اللہ سے نزدیک ہو جائے۔ اللہ جو صبر دیتا ہے اور ہمت اور استقامت اور ڈھال۔۔۔
پھر شیطان اس قلب کو کبھی زیر نہیں کر سکتا۔
لیکن اس کی طلب شیطانی نہیں تھی۔
عین فطرت، عین اصول، عین شریعت اور ایک انسانی تقاضا جو کہیں سے بھی فحش یا گناہ نہیں تھا کہ اس کے بائیں کندھے پر بیٹھا فرشتہ جو گناہ کا اندراج کرتا ہے ہر وقت صفحے پلٹتا رہے اور لکھتا رہے۔
فرشتے گناہ لکھنے سے تھکتے نہیں مگر گھبراتے ضرور ہیں۔ جس رجسٹر کو وہ بار کے باعث اٹھا نہیں پا رہے ہوتے۔ انہیں ''حساب کے دن'' گناہ گار خود کیسے اٹھا پائے گا۔
لیکن وہ تو۔۔۔ گناہ نہیں کر رہا تھا۔ گناہ سے بچنے کی سعی۔۔۔ سعی مسلسل اور آپ نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ اللہ کو یہ بات پسند ہے، آپ کی بخشش ہو سکتی ہے اور آپ زندگی بھر گناہ سے بچنے کی کوشش کرتے رہے، دامن بچا کر چلے ایسا سوچا اور کوشش کی۔۔۔ بخشش کی امید رکھیں۔
اور دوسرا کام بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ وہی کر رہا تھا۔
اس نے سجدوں میں طوالت پیدا کر دی۔
وہ ہر وقت باوضو رہنے لگا۔
اس نے گانے سننے چھوڑ دیے، دیکھنے بھی۔۔۔
اس نے ٹی وی لگانا چھوڑ دیا۔ پاکستانی نیوز بلیٹن سنتا تو وہ بھی وہی جو میل نیوز ریڈر دہو۔
پانچ وقت کی نماز تو بچپن سے باپ، تایا کے ساتھ پڑھنے مسجد جاتا تھا مگر چاشت اور اشراق میں

بھی باقاعدگی آئی۔

وہ دینی کتب کا ڈھیر خرید لایا، اس نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا۔

وہ قرآن پاک پڑھنے لگا جن کے اعراب میں بھی ہدایت پنہاں تھی وہ باقاعدگی سے تلاوت کرتا، تفسیر پڑھتا۔

اسے بہت سکون ملا۔۔۔ مگر۔۔۔ سکون ذہن و دل کے لیے تھا، مگر جبلی تقاضے جو بلی کی طرح گھات لگائے تاک میں بیٹھے رہتے جب موقع ملے اور حملہ آور ہوں۔

اس نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔

دبئی کی شدید گرمی، سخت کام اور وہ حالت روزہ میں۔۔۔ لیکن روزہ کھولنا پڑتا ہے۔

وہ فون پر فائزہ کو اپنا حال سنا سنا کے اب خاموش ہو گیا تھا۔ وہ بھی کیا کر سکتی تھی۔ حیا کی پوٹ، ہونٹ کاٹتی، خود کو مجرم محسوس کرتی، لیکن۔۔۔ کرے تو کیا کرے، بڑی لمبی گتھی تھی۔

کہانی کا نیا موڑ یہ تھا کہ پہلے اس راز کے دو امین تھے۔ ایک اللہ اور دوجا اس کا بندہ یعنی وہ خود۔۔۔ اور اللہ عیب پوش ہے لیکن۔۔۔ لیکن پتا نہیں کیوں ظفر بھی اس راز کا تیسرا بن گیا۔

✿✿✿✿

وہ زیادہ محتاط ہو گیا، مگن، کمپنی میں گزارا وقت تو سر کھجانے کی ضرورت بھی نہ دیتا تھا۔ پھر نماز پنجگانہ، تلاوتِ کلام، دینی تاریخی کتابیں اور گھر کی صفائی ستھرائی۔ جب اسے لگنے لگا کہ وہ کامیاب ہو رہا ہے۔ ایک سہل احساس اور پرسکون وجود۔

تب ہی۔۔۔

اس بار ظفر انجان نہیں تھا۔ وہ اسے سنبھالنے لگا، مگر اتنے دنوں بعد خراب ہونے والی طبیعت۔۔۔ ظفر اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو وہ دوا کھا کر شانت ہو جاتا تھا خود سے بھی نظریں چرائے تکیے میں منہ دیے اندھیرے میں پڑا رہتا اور ظفر سے اول تو بات ہی نہ کرتا اور کوشش کرتا کہ نگاہیں نہ ملائے۔

مگر اس بار جب وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے یا ہو رہا ہے اور مطمئن ہونے لگا تب اسے اچانک اور وہ بھی اتنی شدت سے۔۔۔ "اف" اسے خود تو کچھ ہوش یا احساس نہیں تھا۔ مگر ظفر سب دیکھ رہا تھا۔

اور اس رات وہ ایسے جنون میں تھا اس کے ہاتھ پیر مڑ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں پلٹ رہی تھیں اس کی کیفیت کو احاطہ تحریر میں لانا مشکل اور پڑھنا مشکل ترین اور دیکھنا۔۔۔ دیکھنا تو ناممکن تھا۔ ناقابل برداشت، اذیت ناک اور ظفر اس مشکل سے گزر رہا تھا۔ اس اذیت کو سہہ رہا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کر سکتا تھا اس نے سوچا کہ اصدق کی طبیعت سنبھلے تو وہ اس سے ہر پہلو کے حوالے سے گفتگو کرے گا۔ نتیجہ خیز گفتگو۔۔۔ لاحاصل نہیں۔

اس کے دماغ میں ایک واضح خاکہ ترتیب پا رہا تھا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ رکھا تھا۔

لیکن اس وقت۔۔۔ اس وقت وہ کیا کرے؟ ظفر کو کہیں جانا تھا، لیکن یہ تین چار دن وہ اصدق کے ساتھ مصروف رہا تھا۔ ظفر کے ہم مزاج دوستوں کے فون آ رہے تھے۔ ظفر دیر کیوں کر رہا تھا ویک

اینڈ نائٹ پر ''موج مستی'' کا پروگرام تھا، لیکن ادھر اصدق۔۔۔

اس نے نہ جانے کیا سوچ کر کس خیال میں آ کر اصدق کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اسے اس حال میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اسے ایک دم کوئی بھڑکیلا سا خیال آیا تھا۔

''اور زندگی اتنی مشکل بھی نہیں ہے۔ خوش رہنے کے سو راستے۔ چل میرے نال۔''

''کیا کر رہے ہو کہاں جانا ہے؟'' وہ متامل تھا۔

''یار تُو اک بار آ تے سئی۔'' (آؤ تو سہی)

اصدق بھی کمرے کی دیواریں تک تک کے تھک چکا تھا، باہر کی تازہ ہوا، آوازیں، شور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اتنے دن بعد باہر جا رہا ہے شیو تو بنا لے، لوگ مجنوں کہیں گے۔'' وہ بھی نہ جانے کیا سوچ کر سر ہلا گیا، جو جو ظفر کہتا گیا وہ کرتا گیا۔ شیو کر کے نہایا دھویا، سلکی بالوں میں برش پھیرنے کے بعد اس کی جون ہی بدل گئی۔

وہ سانولی رنگت والا بے حد پرکشش مرد تھا اور اب آنکھوں میں چھائی کچھ ہراساں کیفیت، بجھی بجھی سی مسکراہٹ۔۔۔

سفید شرٹ، نیلی پینٹ۔

ظفر کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے سراہنے لگا۔

''بس اپنی اپنی قسمت ہے یار! تُو سب سے پہلے شادی شدہ ہی نہیں لگتا۔۔۔ ہمیں دیکھ جوان ہوتے ہی بندے لگنے لگے اور دوسرے تُو نے صرف منہ دھو کر کپڑے بدلے ہیں اور تباہی آ گئی اور میں نے پورے کمرے کی الماری تباہ کر دی، مگر مجال ہے جو ذرا رونق آئی ہو۔ سب محنت غارت گئی۔''

وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے سراہ رہا تھا اور اپنا آپ دیکھ کر پچھتا رہا تھا۔

یہ اس کا ہمیشہ کا دکھڑا تھا۔ اصدق کچھ نہیں بولا، وہ تیار ہو چکا تھا مگر ذہنی طور پر اب بھی حاضر نہ تھا۔ ظفر اپنا کالر سیٹ کر رہا تھا۔

''مگر ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''اوئے چپ۔۔۔'' ظفر نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ اپنا بازو اس کے شانے پر رکھا۔

''ادھر جدھر تجھے بہت پہلے چلے جانا چاہیے تھا۔'' وہ معنی خیزی سے بولا۔ دونوں ہم قدم تھے۔

✿✿✿✿

جاتے وقت ظفر شاید آنے والے خوش گوار پلوں کا سوچ کر سُرور میں تھا اور جب شام ڈھلے لوٹا تو پی پی کر مدہوش سا تھا اور اس کے انتظار میں اصدق جو شاید اسے چیر پھاڑ ڈالنے کے ارادے سے گھر لوٹا تھا کہ وہ۔۔۔ آگے اس کا ذہن خالی ہو جاتا۔

وہ ظفر کا گریبان پکڑے گا اور تار تار کر دے گا۔

یا وہ اس کا چہرہ طمانچوں سے لال کر دے گا۔

اس کا حشر برا کر دے گا وہ اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔

اسے اپنی چنی ہوئی تمام سزائیں بہت ہی کم اور ناکافی لگ رہی تھیں وہ ظفر کو۔۔۔

لیکن جب تک ظفر لوٹا یعنی شام چھ بجے کے بعد۔۔۔تب تک وہ غائبانہ ظفر سے اور خود سے اتنا لڑ چکا تھا اور تھک گیا تھا کہ کچھ پوچھنے کا یارانہ رہا۔ دوسرے ظفر گنگناتا ہوا آیا اور جھومتے ہوئے ہوا میں ہاتھ لہرائے، اکیلے بیلے ڈانس کر رہا تھا جیسے سامنے کوئی نازک اندام حسینہ بازوؤں میں ہو۔

وہ زمینی گدے پر گر کر بے خبر ہو گیا۔ اصدق غصہ آمیز تاسف سے تلملا کر رہ گیا۔ تقریباً پندرہ گھنٹوں سے اس کا دماغ تندور بنا ہوا تھا۔ ایک پل کا سکون نہیں اور ادھر بے خبر ظفر۔

اس نے اپنے اشتعال پر قابو پایا اور وہ اس کے بھک سر پر پانی کا جگ بھی انڈیل دیتا تو جواب نہیں پا سکتا تھا۔

وہ خود کو صبر کی تلقین کرتا۔ اپنے معمولات نبٹاتا رہا۔ ''رات'' رات کا ہر پل۔۔۔

اس نے اپنے ذہن و دل سے ہر شے جھٹک جھٹ کرٹی وی لگا لیا۔ ایک دوسرے پر بہتان بازی کرتے چلاتے لڑتے ہوئے سیاست دانوں کو دیکھتا رہا مگر اسکرین پر کچھ اور ہی چمک رہا تھا۔ ایک سایہ سا، سفید سلیولیس بلاؤز پر بے حد باریک شیفون کی ساڑھی، سیاہ و سفید کا ایسا امتزاج اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دوسرے کے مخالف دو علیحدہ رنگ سفید اور کالا، ایک دوسرے میں کتنے انوکھے انداز میں ضم تھے۔

اس نے تنگ آ کر ٹی وی بند کیا اور خود کو کاموں میں الجھایا تو وہ دھلتی پلیٹ سے چھب دکھلانے لگا۔ ٹب میں پڑے پانی پر سایہ لرزنے لگا اور جب جب وہ ظفر کی جانب دیکھتا تو پھر تو جیسے سایہ، خیال، مجسم ہو جاتا۔ اتنا نزدیک کہ چھو لو اور ساتھ ہی اشتعال کی نئی لہر۔

اور ظفر کے بے دار ہونے کے انتظار میں وہ خود اونگھنے لگا۔ جب کچن میں کھٹ پٹ ہوئی۔ وہ ہشیار ہوا، ظفر ہی تھا، چیک کی دھوتی اور ساتھ بنیان۔۔۔وہ چوکنا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

کھٹکے پر ظفر نے گردن موڑی۔ اسے جاگتا پایا تو بڑے دل سے مسکرایا۔

ساتھ ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا کہ کیا حال ہے۔ اب کیسا ہے تو جگر بڑی گہری نیند میں تھا۔

''چائے پینی ہے لاؤں؟'' اس نے سوال کیا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ نفی میں گردن ہلا دی۔ اس نے بہت سے سوال سوچ رکھے تھے مگر اب وہ فقط اسے گھور رہی پا رہا تھا۔

ظفر نے چائے کی پیالی اس کے سامنے دھر دی۔ وہ کچھ پوچھنے کو بے چین تھا۔ مگر الفاظ کا چناؤ۔۔۔

اصدق بھی بولنے کو بے تاب تھا مگر جملے کہاں سے لاتا۔

دونوں ادھیڑ بن میں تھے۔

کل رات۔۔۔

رات کو۔۔۔

دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا پھر دونوں ہی چپ ہو گئے۔

''تم مجھے کہاں لے گئے تھے ظفر؟'' اس کی آواز میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔

ظفر کھنکھارا، اس کا جواب اس کے پاس تھا۔

''جہاں جانا تمہارے لیے ضروری تھا۔ بلکہ تمہیں بہت پہلے ہی چلے جانا چاہیے تھا۔''

"یہ گناہ ہے۔" وہ حیرت وصدمے کی زیادتی کے باعث چلا بھی نہ سکا۔ آواز گھٹ سی گئی۔
ظفر نے ازحد اطمینان سے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا۔
"تُو بیوی کو یہاں کیوں نہیں لے آتا؟ اس دن ڈاکٹر بھی مجھے یہی کہہ کر گیا تھا۔" وہ ظفر کے پہلے جملے پر خاموش ہو گیا تھا اور دوسرے پر ششدر رہ گیا۔
"میں مانتا ہوں دبئی جیسے مہنگے شہر میں فیملی کو ساتھ رکھنے کے لیے ایک مخصوص اماؤنٹ لازمی چاہیے ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں تُو اتنے تو کما ہی لیتا ہے۔ اب تو بہنیں بھی بیاہ دیں، گھر بھی سیٹ کیا ہے۔ پھر کیا بات ہے؟" ظفر کے لہجے میں فکر، درد، حیرانگی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

✿✿✿✿

دوبئی جیسے ملک میں آکر سیٹل ہونا بڑا مشکل کام تھا۔ ہر لحاظ سے جن میں سب سے اہم معاشی مضبوطی۔ وہ اس حوالے سے خوش قسمت رہا تھا کہ اسے ایک اچھی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ آمدنی بھی بہت اچھی تھی۔ کم از کم پاکستان کے تقابل میں۔۔۔ بہت زیادہ تھی۔ یہاں کے تھوڑے درہم پاکستان میں خرچ کرنے میں بہت ہوتے لیکن اسے اپنا خرچا یہیں رہ کر یہیں کے حساب سے کرنا تھا۔
یہاں ہر شے سیل بند پیکنگ میں ملتی جس میں اصل قیمت سے ڈبل چارجز لوازمات کے ہوتے۔ سب ایک نمبر مال۔۔۔ تو دام بھی فرسٹ کلاس۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے اخراجات کو کنٹرول میں رکھتا۔ حساب میں جتا رہتا اتنے درہم۔۔۔ تو کتنے پاکستانی روپے اور اتنے روپے تو۔۔۔ کتنے درہم؟ وہ انگلیوں پر گنتا اور ہانپ جاتا۔
وہ ہمیشہ کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ رہنے بسنے۔ اس نے گھر والوں کے سامنے خود کو بہت مضبوط اور لاپرواہ دکھایا تھا مگر یہ اس کا دل جانتا تھا وہ کیسے تنہائی کے سمندر میں بے بسی کی کشتی کو دھکیلتا آیا تھا۔ ماں، باپ، خالہ، تایا، بہنیں، کزنز اپنا شہر محلہ ملک اپنے لوگ اور۔۔۔ وہ یعنی فائزہ، جسم ادھر آگیا تھا روح ادھر رہ گئی۔
اور جسم بغیر روح۔۔۔ بے جان ہی کہلائے گا نا؟
درہم ضرورت تو تھے مگر جنون نہیں۔ اپنی ضروریات اور خواہشات بچپن ہی سے اکلوتے ہونے کے باوجود محدود رکھنے کی عادت تھی۔
اسے اسٹور کو مستحکم کرنا تھا اور اسے کاروبار کو بڑھانا تھا اور بہنوں کی شادی اور۔۔۔
مسلم آباد کے قصباتی ماحول سادہ زندگی میں وہ درہم۔۔۔ واہ اتنے سے درہم اور اتنے سارے نوٹ۔۔۔ بھئی بہت خوب ایک جانب سب کو احساس تھا کہ اس رقم کو بہت دھیان سے خرچ کرنا ہے۔ قطعاً ضائع نہیں کرنا، سب کے ذہن میں واضح تھا۔ مگر۔۔۔ دوسری جانب نظر بھی آنے لگا کہ بیٹے کی باہر کی کمائی کو خرچ کرنے کا مزا لیا جا رہا ہے۔ غیر محسوس ہلکا پھلکا بے معنی سا فرق۔
سیل سے خریدے جانے والے لان کے جوڑے، بڑے حساب کتاب سے بنتے تھے۔ اس بار شہر کی سب سے بڑی دوکان پر جا کر دھڑا دھڑ نئے لان پرنٹس خریدے گئے۔ دونوں بھائیوں نے ساری زندگی سالانہ سیل سے جوتے خریدے تھے۔ وہ نیو کلیکشن سے نئے جوتے پسند کرتے نظر آئے۔ قیمت کی چٹ کو جانچے پرکھے بنا۔

قربانی کے نام پر حصہ ڈل جاتا یا پھر بکرا لا کر پال لیا جاتا تھا۔
اس سال پوری گائے لی گئی اور دو دو بکرے۔
اسٹور میں اتنا کام کرنا تھا جتنا کہ وہ تیز قدموں سے چلنا شروع کر دے۔ وقت گزرتا تو وہ بھاگنا شروع کر دیتا مگر آتی رقم نے فیصلہ کروایا۔ اسٹور اول نمبر کی ریس میں حصہ لے گا۔
بظاہر معمولی معمولی سی رقمیں تھیں۔ ذرا ذرا سی خواہشیں۔
"ضرورتیں پوری ہونے کی خواہش کرنا عین فطرت اور سراسر جائز عمل ہے۔ مگر جب خواہشیں ضرورتوں کی طرح لازم وملزوم لگنے لگیں تب اور گھر والوں کی خواہشوں کی جانب بھاگنا گناہ نہیں تھا مگر وقت سے پہلے اور کچھ ہڑبونگ ضرور تھا۔
سال بعد جب وہ عارفہ کی شادی کے لیے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں سونے کے سکوں سے بھری مٹھیاں نہیں تھیں۔ لیکن وہ سب کچھ ضرور تھا جو پہلے کبھی نہیں تھا۔ عارفہ کی شادی بہت دھوم دھام سے انجام پائی۔ وہ کم عمر اور لاابالی سی تھی۔ اس نے عائزہ کی طرح کوئی فرمائش نہیں کی۔ نہ اعلیٰ نہ کمتر۔ اماں ابا جو مرضی خریدیں بنائیں وہ برتن بیڈ شیٹس اور فرنیچر تک پسند کرنے نہیں گئی۔ اس کی تو بس ایک ہی خواہش فرمائش جنون تھا۔ کوئی اچھا عروسی لباس، گولڈ کی میچنگ جیولری اور قیمتی نگوں والے نازک جوتے اور خوب صورت کپڑے۔۔۔
"بس اور کچھ دیں نہ دیں میرے کپڑے سب سے اعلیٰ ہوں گے۔
مجھے وہی لہنگا لینا ہے جو چالیس ہزار کا ہے اور جس کی میچنگ آرٹی فیشل جیولری نو ہزار کا سیٹ ہے۔ جوتا ساڑھے تین ہزار میں نے اور کسی چیز کی ضد کی؟ یہی ایک تو کہا تھا نا۔" وہ رو پڑی تھی۔
سب سمجھانے لگے، ایک دن کا لباس۔۔۔ بلکہ ایک دن بھی کیا، چند گھنٹے زیب تن رہے گا۔ کون اتنی فضول ضد کرتا ہے سب کے اپنے الفاظ تھے۔
"میں کرتی ہوں اتنی فضول ضد۔۔۔ میری شادی اور میں ہی خوش نہیں۔" وہ ضدی نہیں تھی مگر اڑ گئی تھی۔
وہ گھر آ کر بہت خوش تھا۔ سال بعد اپنے پیروں کے درمیان۔۔۔ اپنے رشتے اس کا دیکھا خواب تعبیر کی راہ پر تھا۔ اپنی بے حد لاڈلی چھوٹی بہن۔
اصدق سیدھا عارفہ کے کمرے میں پہنچا۔ "صرف چالیس ہزار روپے کے لیے میری بہن رو رہی ہے۔ یعنی سارے کیے کرائے پر پانی۔۔۔ صرف اچھا لہنگا لینے کے لیے اتنے آنسو۔ تم دیکھو، اب میں کرتا کیا ہوں۔"
وہ بہن کی سوجی آنکھیں دیکھ کر دل کھول کر ہنس دیا۔ وہ بچوں کی طرح لہنگے پر اڑی تھی۔ باقی شادی اس کی بلا سے۔
وہ اسے لاہور لے گیا۔ عائزہ آپا ہمراہ تھیں۔ شام ڈھلے جب لوٹے تو عارفہ کا چہرہ کھلا کھلا تھا۔ روپ رنگ سرخ سرخ۔
"اتنا خرچا؟" امی اور تائی سرخ اور سبز لہنگے کی جھلمل کو تکتی تھیں۔ "وہ تو بے وقوف تھی، مان جاتی۔"
"امی اس کے لیے تو اتنی محنت کی اور وہی ناخوش۔ پچاس ہزار میں ہنسی مل رہی تھی، مہنگی تو نہ

ہوئی۔“اس کا لہجہ بے فکر اور محبت سے چور تھا۔
”ارے تو پیچھے اور بھی بیٹھی ہیں، وہ پھر لاکھ کا مانگ لیں گی۔ توبہ قیامت کی نشانی لال جوڑا شگن کا، قیمت موئی سوا لاکھ۔“
”تو ان کو بھی دوں گا۔ اس میں کیا اچنبھا۔“
”دوبارہ جانے کی باتیں ہیں نا ساری۔۔۔“امی نے پکڑ لیا۔
”امی جانا تو ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔
”اب کس لیے؟ اسٹور میں مال ڈلوا لیا نئی لک بھی دے دی۔ ہو رہی ہے عارفہ کی شادی، یہی کہا تھا نا تم نے۔۔۔“ وہ کچھ نہیں بھولی تھیں۔
امی ابھی بہت ذمہ داریاں باقی ہیں چند سال اور۔ میں خود جانا نہیں چاہتا لیکن آپ بتائیں کیا میرا فیصلہ غلط تھا۔ آج بہن کی فرمائش پوری کر کے میں کتنا خوش ہوں۔ کیا آپ اندازہ نہیں کر پا رہی ہیں۔ یہی بہن دوسرے حالات میں یا تو خواہش کا گلا گھونٹ کر بیٹھ جاتی، کڑھتی سڑتی یا پھر کہہ دیتی تو میں ہی کونوں کھدروں میں منہ چھپاتا پھرتا۔
بہنیں فقیرنیاں نہیں ہوتیں کہ اجنبیت سے کہہ دو ”جاؤ بابا معاف کرو“ ان سے تو اگلوانا پڑتا ہے کہ اور کیا چاہیے۔
میری پیاری امی۔۔۔! جو کمایا انہی کے نصیب کا تھا۔ کسی کا کیا احسان یا حساب۔ محنت تو کرنی ہے بس یہ ہے کہ ذرا دور جا کر کرنی ہے۔ زندگی کا ٹارگٹ صرف اسٹور اور عارفہ کی شادی نہیں ہو سکتا۔“ وہ رسانیت سے کہہ رہا تھا۔”یہ تو صرف آغاز ہے۔“
”تو پھر میری بھی ایک شرط ہے۔“
”کیا آپ بھی میرے ساتھ جائیں گی۔ جیسے بچپن میں اسکول کے باہر گراؤنڈ میں بیٹھ جاتی تھیں۔“ اسے مزا آیا۔
”نہیں۔۔۔ میں نہیں، تجھے شادی کر کے جانا ہوگا۔“
”جی ی ی ی۔۔۔“ وہ اچھل ہی پڑا۔”امی! مذاق کر رہی ہیں۔“ اس نے ان کا چہرہ بغور دیکھا مگر وہاں تو گہری سنجیدگی اور قطعیت تھی۔

✿✿✿✿

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں تمہیں ایسے بیاہوں گا۔“
اس کے بیڈروم میں وہی پرانا فرنیچر تھا۔ صرف نئی گولڈن و میرون بیڈ شیٹ ڈال کر نیا لک دیا گیا۔ سیج سجانے کا وقت نہیں تھا۔ کل اس کے ولیمے میں عارفہ کی رخصتی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی آرائش کرتا جبکہ ادھر سو کام تھے۔
گل دانوں میں تازہ گلابوں کی لمبی لمبی ڈنڈیاں مہک رہی تھیں۔
یہ گلاب بھی اللہ جانے کس کی مہربانی سے یہاں پہنچے تھے۔
کمرے میں بظاہر عروسی کمرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر وہ شب زفاف تھی اور مہک رہی تھی۔

جیسے بعض دفعہ بن پیے بہک رہے ہوتے ہیں۔
ابھی پندرہ روز پہلے ہی تو جب وہ عارفہ کو لہنگا دلوانے لے گیا تب ایک میرون لہنگے کو دیکھ کر اسے فائزہ کا خیال آیا۔
(وہ فائزہ سے کہے گا، وہ میرون رنگ کا لباس ہی پہنے جب دولہن بنے)
لیکن فائزہ اس وقت سبز چوڑی دار پاجامہ پر پیلا کلیوں والا ڈھیلا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ چنا ہوا دوپٹا جو شام کو اس نے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اب کھینچ تان کر سینے کی طرف سے پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی ایک پلوسر پر لگا تھا۔ اس کے کانوں میں موتیا کے بڑے بڑے بالے تھے اور ہاتھوں کی پوروں پر لگی مہندی ہنوز تھی۔ اسے دھونے کا موقع نہیں ملا، مہندی اب سوکھ کر جھڑ رہی تھی۔ وہ مسلسل پوریں رگڑ رہی تھی۔
یہ سارا سنگھار عارفہ کی مہندی کے لیے تھا۔ جب ان دونوں کو پکڑ دھکڑ کر نکاح کی رسم ادا کر دی گئی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ کچھ بولنا چاہا مگر یہاں سن کون رہا تھا۔ بڑوں کی آنکھوں میں تادیب تھی، خاموش رہو، سیدھے سیدھے ہاں کہنی ہے۔ تائی کی آنکھیں لبریز تھیں اور امی کی آنکھوں میں خوشی اتنی خوشی، اس نے اتنی روشن آنکھیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔
اس کے حق دق چہرے پر ہنسی نمودار ہوگئی۔
لیکن اب کمرے میں آنے کے بعد ایک عجیب سا احساسِ شرمندگی اسے عرق عرق کرنے لگا۔ اس نے عارفہ کو اپنے پسندیدہ عروسی لباس، زیور جوتے کے لیے مچل مچل کر روتے دیکھا تھا، وہ کسی کمپرومائز پر تیار نہیں تھی تو کیا فائزہ لڑکی نہیں۔ اس کے بھی تو کچھ ارمان ہوں گے۔ اسے بھی تو ہزاروں کا لہنگا اور دیگر۔۔۔ یہ تو فائزہ کے ساتھ زیادتی ہوگئی۔
وہ بہت جوش وخروش کے عالم میں کمرے میں آیا تھا۔ وہ پاؤں لٹکائے ہلکا سا رخ موڑے بیٹھی تھی۔
ذہن مختلف خیالوں کی آماجگاہ تھا۔ وہ یہ کہے گا اور وہ۔۔۔ لیکن دھیان کسی اور ہی جانب چلا گیا تھا۔
ایک دم شدید شرمندگی اور احساسِ جرم سا۔۔۔ بہت سے ڈائیلاگ سوچ رکھے تھے۔ مگر جب منہ کھولا تو۔۔۔
”کبھی سوچا نہیں تھا کہ میں تمہیں اس طرح بیاہوں گا۔“
وہ دیوار میں لگے آئینے میں اس کے چہرے کی کشمکش کو حرف بہ حرف پڑھ رہی تھی۔ چہرے پڑھنے کا یہ ہنر تو شاید پنگھوڑے میں ہی سیکھ لیا تھا۔ جب ہی تو کچھ بھی کہے سنے بنا محبت ہوگئی تھی۔
اسے ہی اصدق کو اس احساسِ ندامت سے نکالنا تھا۔ وہ تسلی دیتی یا۔۔۔ ”تو کیا آپ نے یہ سوچا تھا کہ بیاہوں گا نہیں اسے بھگاؤں گا۔۔۔ ہیں۔“ وہ اس کے رخ موڑنے پر چونکا تھا اور لب کھلنے پر ہمہ تن گوش۔۔۔ مگر ”ہائیں“ اس نے اس کی صورت دیکھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور کمرے میں قل قل کرتی ہنسی گونجنے لگی، وہ بیڈ پر آ گیا اس کی طرح پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔
سات جنموں پر یقین نہیں لیکن اگر یونہی خوامخواہ سوچا جائے تو یقیناً میں نے کوئی بڑا نیک عمل کیا جو مجھے تم۔۔۔ رکاوٹ تو کوئی نہیں تھی مگر اتنی آسانی سے مل جاؤ گی یقین نہیں آیا۔“
”نیکی کرنے کے لیے ایک ہی جنم ملتا ہے اصدق۔۔۔! اسی کو صحیح طرح سے گزار لیں تو سو جنموں

کا ثواب مل جائے۔۔۔اور آپ نیک عمل کرنے ہی آئے ہیں۔آپ برا کر ہی نہیں سکتے۔'' وہ اس پر یقین کرتی تھی۔

''تمہیں ملال نہیں ہو رہا۔'' وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

''کس بات کا ملال۔۔۔'' وہ حیران تھی۔

''کہ اس طرح۔۔۔اس لباس میں، میرا مطلب ہے تمہیں عارفہ کی طرح کے شوق نہیں؟''

''مجھے جس چیز کا شوق تھا وہ مجھے مل چکی ہے۔'' فائزہ نے اپنا سر دھیرے سے اس کے شانے پر ٹکایا۔وہ مسحور ہو گیا۔اپنا بازو اس کے کندھے پر پھیلا دیا۔

''میری امی کتنی اچھی ہیں نا!'' اصدق بولا تھا۔

''ہاں، بہت۔'' وہ ہنس دی۔''بہت زیادہ۔''

پہلی بار وہ دوبئی ایئرپورٹ پر اترا تھا تو عارفہ کا چہرہ اور اسٹور کی بحالی کا خیال سب خیالوں پر حاوی تھا اور اس بار فائزہ کی سونی کلائیاں احساسِ شرمندگی سے دوچار کرتی تھیں۔کسی بھی قسم کے لوازمات کے بنا دمکتا اس کا سنہرا روپ سونے چاندی کا محتاج نہیں تھا مگر عارفہ اور فائزہ کے چہرے آپس میں گڈمڈ ہوتے۔سولہ سنگھار کیے عارفہ اور ادھر فائزہ ناک میں لونگ کانوں میں وہی سادہ گول بالیاں جو اس کے وجود کا ہی حصہ معلوم ہوتی تھیں۔

عتیقہ بیگم نے اپنے کانوں کی جھمکیاں اتار کر اس کے کانوں میں ڈال دیں تھیں مگر فائزہ کو خود ہی بے چینی نے گھیر لیا۔

''بچپن سے آپ کو ان ہی جھمکیوں میں دیکھنے کی عادت ہے، ان کے بغیر آپ کا چہرہ کس قدر ویران لگ رہا ہے۔توبہ توبہ!'' اس نے جھمکیاں انہیں پہنا کر ہی دم لیا۔اصدق کی جیب خالی تھی مگر اس نے جانے سے پہلے ایک نازک سی انگوٹھی اس کی انگلی میں محبت سے پہنا دی۔

اندر کی ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا سونے کا سنہرا پن زیادہ جگ مگ کرتا ہے یا اس کے وجود کی شعاعیں آنکھیں خیرہ کرتی تھیں۔گندم کی پکی ہوئی بالی جیسی رنگت موٹی لمبی چوٹی اور معصوم بے ریا چہرہ۔۔۔

اس بار اس کی ملازمت زیادہ اچھی تھی۔وہ سوچنے لگا فائزہ کو بلا لے اپنے پاس مگر دوبئی جیسے شہر میں ہمراہ فیملی رہنا بے حد مشکل تھا اگر آپ ایک خاص حد تک آمدنی نہیں رکھتے اور اسے تو ابھی گھر بھی پیسے بھیجنے تھے۔گھر میں بہت سے کام ابھی باقی تھے بلکہ شروع بھی نہ ہوئے تھے۔

وہ پاکستان سے لوٹ کر ایک بار پھر خالی ہاتھ تھا، نئے سرے سے آغاز۔۔۔لیکن اسے لگتا کہ اس کے درہم ڈنٹ کے منہ زیرے کے مترادف ہو گئے ہیں۔

کیونکہ گھر والے بہت ڈیمانڈنگ ہو گئے تھے۔پتا نہیں کون کون سی ضرورتیں اور وہ بھی از حد ضروری۔

اس بار وہ دو سال کے معاہدے پر آیا تھا۔بیچ میں اسے اللہ نے دو بیٹے جڑواں بھی عطا کر دیے۔

وہ انہیں دیکھنے، چھونے کو مچل گیا مگر۔۔۔
دو سال بعد دو ماہ کی چھٹی پر جاتا تو کمپنی کرایہ دیتی اور ایک تنخواہ بھی۔۔۔اور اگر درمیان میں چل دیتا تو کرایہ خود سے اور دوسرے خرچے اپنی جانب سے۔ یہ اتنا مہنگا سودا نہیں تھا مگر باپ اور تایا نے گھر کے اوپری پورشن کی تعمیر شروع کروا رکھی تھی۔
یہ ایک ضروری کام تھا مگر اسے آرام سے بھی کیا جا سکتا تھا۔
"آپ آئیں گے تو تسلی سے سمجھاؤں گی کہ مسئلہ کیا ہے۔"
"ایک پورشن اور اتنے پیسے لگ رہے ہیں۔" وہ حیران تھا۔
"دونوں گھروں میں ایک ساتھ کام شروع ہوا ہے نا۔" فائزہ کچھ شرمندہ تھی۔
"کون سے دو گھر۔۔۔؟" وہ چوکنا ہوا۔ ہمارا ایک ہی گھر ہے جس میں عبدالقیوم اور عبدالجبار مل کر رہتے ہیں۔ دونوں گھر دوبارہ نہ کہنا جو یہاں ہوگا وہی وہاں ہوگا۔" اس نے یاددہانی کروادی۔
"تایا ابا نے بیٹی کا گھر سمجھتے ہوئے دیوار اٹھوادی ہے وہ ان کی سوچ مگر دل میں دیوار نہیں اٹھنا چاہیے۔ میں اس گھر کا اکلوتا بیٹا ہوں یار!"
اس کے دل میں کوئی ملال نہیں تھا۔ لیکن جب وہ لوٹا تو نہ جانے کیوں دکھ کی ایک لہر اس کے دل و دماغ کے گرد گھیرا کسنے لگی اور ہر بار یہ پکڑ سخت سے سخت ہوتی رہی۔
قیمتی پتھر، ٹائلز، کھڑکیاں، دروازے اور اندر بھرا ہوا فرنیچر، قیمتی ساز و سامان وہ دوبئی سے کیا امپورٹڈ آئٹم لاتا۔
ریالوں کی بدولت گھر کے لیے مسلم آباد ہی دوبئی بن چکا تھا۔ وہ خوش حالی کی یہ لہر دیکھ کر خوش ہونے کے باوجود اندر کہیں افسردہ تھا۔
"تم تو خالی پورشنز کہہ رہی تھیں یہاں تو جون ہی بدل گئی۔ ایسی بھی کیا ضرورت تھی۔"
فائزہ کے پاس جواب تھا مگر وہ دینے سے ہچکچاتی رہی۔ عتیقہ بیگم نے عذر بیان کیا۔
"رائحہ، زائرہ کے رشتے کرنے ہیں، عارفہ ان سے چھوٹی ہے اور ایک بچی کی ماں بھی بن گئی۔ رشتے کرانے والی ایک سے ایک اچھے رشتے لاتی ہیں۔ بچیاں صورت شکل کی ہی پیاری ہیں۔ بس جب نصیب کھلے۔
آنے والے اسٹور کا سنتے ہیں، دوبئی میں بھائی ہے یہ بھی کانوں میں پڑا ہوتا ہے مگر جب گھر دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔ تمہارے دادا کے زمانے ہی میں جو بن گیا سو بن گیا بعد میں تو ایک کیل ٹھونکنے کی بھی گنجائش نہ نکلی۔ لاکھ اشارے دیے جائیں کہ بچیوں کو سب کچھ ہی دیا جائے گا مگر اگلوں کے چہروں پر یقین ابھرتا ہی نہیں، کھاپی کے رخصت، لوگ اب شرافت نجابت بعد میں دیکھتے ہیں پہلے گھر گھاٹ کا حلیہ۔"
وہ تفصیل سن کر قائل ہو گیا۔ سر اثبات میں ہلانے لگا۔
"تو پھر بنی کوئی امید رشتے وغیرہ کی۔"
"حق ہا۔۔۔ابھی تو نہیں لیکن تم فکر نہ کرو، اللہ بہتر کرے گا بس تم تو یاد رکھنا بہنوں کو کتنی شان سے اللہ حافظ کہنا ہوتا ہے۔"

''امی!'' وہ خفا ہوا۔ ''یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔''
فائق اور شائق کی پیاری صورتیں، اس بار اکیلے جانا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔
''اگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو۔۔۔؟'' فائزہ کی آنکھیں چمکیں پھر بجھ گئیں۔
''کیا ہوا؟'' وہ اس کے چہرے پر ہی نگاہیں ٹکائے ہوئے تھا۔
''گھر والے کبھی نہیں مانیں گے۔''
''یار! میری بیوی ہو، بچے ہیں، میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''
''ہاں! ہیں بیوی بچے آپ کے۔۔ مگر گھر والے ان میں آپ کی شبیہ گھڑتے ہیں، آپ کی کمی کو سہارا دیتے ہیں۔ ایسا تو خیال بھی ظاہر نہ کیجیے گا۔ ہنگامہ مچ جائے گا۔''
''نہیں۔۔۔'' امی نے چیخ مار کے بچوں کو خود میں سمویا تھا۔ ''یہی تو میرا جینے کا سہارا ہیں۔ تیرے بغیر رہ لیا اصدق! ان کے بغیر تو میرا اگلا سانس بھی ختم۔''
اور سب کی ایسی ہی رائے تھے۔
''اچھا چار چھ ماہ کے لیے۔۔۔ یونہی سیر و تفریح کے لیے لے جاؤں تو۔۔۔؟''
''ابھی تو کہہ رہے تھے ہاتھ تنگ ہے۔ تمہیں تو کمپنی ٹکٹ دے رہی ہے ان کا کیا ہوگا'' نائمہ آپا بھی اعتراض کرنے والوں میں تھیں۔
''ابھی فوراً ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ وہاں جا کر بلوالوں گا۔ امی میرا برا حال ہو جائے گا'' وہ التجائیہ انداز میں بولا۔
سب ہی نے خاموشی اختیار کی۔ ''اچھا جب بھیجے گا تب کی تب دیکھی جائے گی۔'' اور اس بار دو ڈھائی ماہ بچوں اور فائزہ کے ساتھ رہنے کے بعد وہ ان دونوں کے لیے زیادہ بے چین ہوا۔ بے قرار، بے کل۔
اور اس نے بڑے حساب کتاب کے بعد چھ ماہ بعد ٹکٹس بھیج ہی دیے۔ سب حیران رہ گئے اور فائزہ بھی مگر وہ خوشی خوشی تیاری کرنے لگی۔
وہ اکثر حیرت سے سوچتی تھی وہ کتنی آسانی سے ایک دوسرے کے بنا دیے گئے تھے۔
وہ اب دکھ سے کراتی کہ اتنی بڑی جدائی دونوں کے درمیان پھن پھیلائے بیٹھی تھی۔
''میں نے رہائش وغیرہ کا بندوبست کیا ہے اور فیملی کے ساتھ خرچا بہت زیادہ ہوتا ہے، آپ لوگ اسٹور کی آمدنی کو استعمال کریں، میں اتنے پیسے نہیں بھیج پاؤں گا۔'' اس نے اپنے باپ سے کہا تھا
''تم پریشان نہ ہو بیٹے۔۔۔ ہماری فکر نہ کرو۔ تم بیوی بچوں کا خیال رکھو اور انہیں خوب گھماؤ پھیراؤ۔'' عبدالقیوم نے محبت سے تاکید کی تھی۔
(مگر دوسری جانب۔۔۔)

✿✿✿✿

ان کا آفاقی رشتہ فاصلے کے باعث اتفاقی سا لگتا تھا جب اس طرح پہلی بار وہ اتنے سکون سے اکٹھے تھے تو اس رشتے کی تمام تر خوب صورتی نکھر کے سامنے آگئی۔
''میں اب تمہیں جانے نہیں دوں گا۔'' وہ فیصلہ سناتا۔

''میں جاؤں گی بھی نہیں۔'' ارادہ اس کا بھی یہی تھا مگر وہ منہ سے نہ بولتی۔ مرد اظہار کے معاملے میں بے باک ہوتا ہے اور یہ بے باکی اس پر بجتی بھی ہے۔

عورت کی خاموشی میں سارے راز پنہاں ہوتے ہیں۔ وہ مبہم مسکراتی ہے اور جچتی ہے۔

اور اصدق اثبات بھری اس مسکراہٹ پر نثار ہو ہو جاتا۔

لیکن!

پاکستان سے آئی اطلاع، امی پوتوں کے غم میں شدید بیمار پڑی تھیں اور سب کو منع کر رکھا تھا اصدق تک خبر نہ دی جائے مگر جب حالت زیادہ غیر ہوئی تو۔۔

اور دوسری جانب حسنہ بیگم شائق کو یاد کر کے روتی تھیں۔ ان کا پاپا سب سے نرالی۔

''جب اس طریقے سے لے لینا تھا تو دیا ہی کیوں تھا، لے کے چلے گئے میرا بچہ۔ کسی کو جو ایک بار بھی میرا خیال آیا ہو۔''

کہانی یہ تھی کہ فائزہ کی نوعمری اور ناتجربہ کاری۔۔ اس پر جڑواں بچے۔۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آتا اور وہ ہلکان رہتی۔

دادی، نانی بچے بخوشی سنبھالتیں۔

''یہ نواسا نہیں ہے، یہ تو میرا بیٹا ہے۔'' حسنہ بیگم شائق سے لاڈ کرتیں۔

''امی! آپ لے لیں، آپ کا بیٹا ہی ہوا'' فائزہ نے ایک دن اس کا چھوٹا سا بیگ بنا کر امی کے حوالے کر دیا۔

''کوئی خاص فرق نہیں پڑا، وہی گھر وہی لوگ، وہی لاڈ۔۔۔ مگر حسنہ بیگم کا دل بڑا ہو گیا۔

مگر اب حسنہ بیگم کا کیا جانے والا شکوہ۔

''تم لوگوں کو سوچنا چاہیے تھا نا۔ امی کتنی تکلیف سہہ رہی ہیں۔ کھانا پینا چھوٹ گیا، ہر وقت ''ہائے فائزہ سے یہ امید نہ تھی'' کی گردان کرتی ہیں۔'' عتیقہ خالہ تو سب کے سامنے رو لیتی ہیں۔ امی تو بس چھپ چھپ کر آنسو پونچھتی ہیں۔

انہوں نے کب سمجھا شائق کو نواسا۔۔ بیٹا ہی کہتی تھیں مگر سچ ہے اولاد اپنی ہی ہوتی ہے۔'' عائزہ اور ناعمہ نے فون پر فائزہ کو سنائیں۔ اصدق نے بھی حرف بہ حرف سنا۔

وہ دونوں خوش تھے، ایک دوسرے میں مگن اور پیچھے یہ حال۔۔۔

نہ اصدق نے کہا کہ تم واپس جاؤ۔

نہ وہ بولی کہ مجھے جانا ہے۔

بس خاموشی سے بکسے بند ہونے لگے۔

''گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے، تعمیر آرائش ساز و سامان سب ضروری ہی تھا۔ مگر اتنا بھی نہیں ہم بعد میں آرام سے کر لیتے۔ بعض باتیں درست ہیں لوگ اب ظاہری شو شا کو دیکھتے ہیں۔ گھر، گھر کی آرائش اور کچھ جان بوجھ کر نہ سہی مگر۔۔۔ ہم نے سادگی اور قناعت کو بس شیٹ ڈال کر نیا طرزِ زندگی اپنا لیا ہے جو بہت ڈیمانڈنگ ہے اور کسی ایک پر الزام نہیں سب ہی شریک ہیں شاید میں بھی۔۔۔''

فائزہ دبئی کی آخری رات میں اس سے کہہ رہی تھی۔

"مگر آپ گھر پیسے بھیجنے کے بجائے خود سے بھی جمع کریں۔ ہم وہاں جمع کر بھی لیں تو خرچے نکل آتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ میں یہاں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ آپ بس اتنا اکٹھا کر لیں، دو چار سالوں میں وہاں کوئی اچھا کاروبار شروع کر لیں، نصیب میں ہوگا تو رزق وہاں سے بھی ملے گا۔"

فائزہ زیادہ کچھ نہ بولی مگر اسے اشارے دے گئی۔ راہ بتا گئی۔

فائزہ کی بات میں دم تھا۔ اسے یہاں رہتے ہوئے دوستوں کے حالات معلوم ہوتے ہی رہتے تھے۔ خاص طور پر ظفر کے تجزیے، تبصرے جن سے مستند کوئی اور شے نہیں۔

"اودو چوڑیاں بیچ کے بندے کو دبئی بھیج دیتی ہیں اور پھر ساری زندگی اس کا احسان جتاتی ہیں۔ کھانا تک سونے کی پلیٹ میں کھاتی ہیں۔ پچھلے سمجھتے ہیں درہم ادھر بانٹے جا رہے ہوتے ہیں۔ اوکوئی ہزار میں سے ایک قسمت والا ہوگا جس کی کمائی سنبھل جاتی ہو، اڑا دیتے ہیں سب کچھ۔۔۔

عقل مند وہی ہے جو نک میں نکیل ڈال کر رکھے۔ اتنے ہی دے جتنی ضرورت ہے اور سارا سال یہ پیغام بھیجے کہ نوکری کا کچھ پتا نہیں کب جواب ہو جائے۔

خطرے کی تلوار لٹکا کے رکھو۔

بیڑی کو سینت سینت کر پینے والے اور ادھار حقے کا ایک کش باری ملنے پر لینے والے میراثی جیسے بھی امپورٹڈ سگریٹ جیب میں ڈال لیتے ہیں۔" ظفر ٹھٹھا اڑاتا۔

اور وہ اپنے گھر والوں سے اتنا بدگمان تو ہرگز نہیں تھا مگر۔۔۔

مگر اس نے ہاتھ روکا اور خود سے جمع کرنا شروع کیا۔ اسے جلد از جلد پاکستان واپس جانا تھا۔ یہی کوئی چار پانچ سال کے اندر۔

اس نے سب طے کر لیا تھا۔ لیکن تب ہی دو مصیبتیں ایک ساتھ وارد ہوئیں۔

عتیقہ بیگم جو گھٹنے کے درد میں مبتلا رہتی تھیں۔ شدید ترین تکلیف کے زیرِ اثر آ گئیں۔ گھٹنے سے نیچے ان کی دونوں ٹانگیں جیسے بس کھال کے سہارے لٹکی رہ گئیں۔ شلوار میں جھولتی بے دم ٹانگیں۔ تکلیف کی انتہا۔

تشخیص سے پتا چلا ہڈیوں کا سفوف بن گیا ہے اور گردے کی رطوبت کے ساتھ مکس ہو کر اسٹون بن گئے۔ واحد حل آپریشن۔

یہ مہنگا اور نو گھنٹے طویل آپریشن کامیاب رہا۔ ایک اذیت بے تحاشا اور خرچا۔

ایک لاکھ سے پندرہ لاکھ تک کی گنتی۔

تین ماہ بعد لگنے والا ٹیکا Bone Viva جو دس ہزار کو چھو لیتا تھا اور مسلم آباد سے کراچی تک کا سفر، ہوٹل کے اخراجات۔

"کوئی بات نہیں، وہ اللہ کا شکر گزار تھا کہ اسے اتنے وسائل دیے کہ اس نے اپنی ماں کو تکلیف سے بچا لیا۔ لیکن۔

فائزہ ایک بار پھر اس کے بے حد اصرار پر تین ماہ اس کے ساتھ رہ گئی تھی۔ پھر ماں کے آپریشن

کے سلسلے میں وہ چھ ماہ کی رخصت پر آیا اور یہیں سے اس کی اذیت کا آغاز ہوا۔ وہ فائزہ کا عادی ہو چکا تھا۔ نہ گناہ نہ شرم نہ جھجک۔ ایک فطری ناتا مگر۔۔۔ وہ واپس لوٹا تو جیسے کچھ کھو آیا۔

خاموش یا پھر چڑچڑا۔۔۔ اپنے ماحول میں سمٹتا اپنی بیماری کا علاج وہ کس جگہ سے کروائے۔

اس کا جمع جتھا پھر ہوا برد ہو چکا تھا۔ نئے سرے سے آغاز۔۔۔ وہ شدید ترین نفسیاتی دباؤ سے گزر رہا تھا۔ اس کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ وہ تو بس اب واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا سال دو سال اور بس۔۔۔ جیسے کوئی کنارے پر آ کر ڈوب جائے دکھ ڈوبنے کا نہیں کنارے کا ہوتا ہے۔

پھر دوبارہ ایک سے گنتی۔

اور اس کے طے کیے بہت سے کام ابھی باقی تھے۔

آصفہ نے ڈاکٹری کی پڑھائی کرنی تھی۔ وہ بہت قابل اور محنتی تھی۔ اور رائحہ، زائرہ ہنوز کنواری تھیں۔

اور عائزہ خلع لے کر دوبارہ اسی گھر کے اندر۔۔۔ وہ ملازمت کرتی تھی (مگر اسی گھر میں رہتی تھی جو اس کے زیر کفالت تھا)

وہ سوچتا، وہ دوبارہ پر عزم ہو کر سب کچھ کرنے کو تیار ہے مگر یہ فائزہ کی غیر موجودگی؟ پہلے وہ آ کر رہتی نہیں تھی اور اب آج کی مہنگائی میں اسے بچوں کے ہمراہ رکھنا اس کے لیے مشکل تھا۔

آصفہ ڈاکٹری کی پڑھائی کرے اور رائحہ زائرہ کی شادیاں اور۔۔۔ اسے لگتا وہ تھک گیا ہے اس کے اندر سے جذبے اور توانائی ختم ہو رہی ہے۔

وہ ضبط نفس سے کام لے رہا تھا۔ وہ نمازیں پڑھتا، روزے رکھتا خود کو خرافات سے بچاتا مگر مرگی کے دورے جیسی بیماری۔۔۔

جس کا حل اس کے پاس نہیں تھا۔

انہی دنوں حسنہ بیگم کو بھی وہی بیماری ہو گئی جو عتیقہ بیگم کو ہوئی تھی۔ اس رات شدید دباؤ کے عالم میں اس کے ہاتھ پیر مڑ گئے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ دماغی پریشانی۔ جسمانی طلب۔ آہ۔

✿✿✿✿

چندرا سیاہ رنگ کے عبایا میں ملبوس تھی۔ نقاب چہرے کے گرد کسا تھا۔ حجاب کے کنارے پر لگی باریک نگوں والی بیل کے ہیرے کے جیسے نگ زیادہ چمک رہے تھے یا اس کی آنکھوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ فیصلہ بہت مشکل۔۔۔

اور وہ بھی اسے دیکھ کے اتنا حیران ہوا کہ گھونٹ گھونٹ جوس حلق سے اتار رہا تھا اچھو کا لگا۔

پیپسی کی بوتل سیاہ لفافے میں ملبوس تھی۔ وہ ایسا لباس بھی زیب تن کر سکتی ہے اور اور۔۔۔ اتنا سج سکتی ہے اور اتنی پاکیزہ لگ سکتی ہے۔ ان چھوئی متبرک سی۔

جب اس سے ملتا تھا تو مشکی شانوں، سیاہ صراحی دار گردن اور گردن کی گہرائیوں سے نگاہیں چراتا تھا۔

سارا وقت اسی کشمکش میں گزر جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ خوش رو ہے، کٹار نین اور دھار ریتی پر گڑی ہوئی۔

مگر سیاہ لبادے میں دمکتا اس کا چہرہ۔۔۔ وہ سحر زدہ سا تکنے لگا۔

اور وہ اس کا ارتکاز بھانپ گئی اور۔۔۔ اور اس کے چہرے پر ایک شرمگیں مسکراہٹ دوڑ گئی۔

(طوائف اور شرمیلی مسکان)

(طوائف ایک دھوکا۔۔۔تو کیا مسکان بھی جھوٹی)

''تم یہ سب کیوں کرتی ہو چندرا۔۔۔!'' یہ پہلا موقع تھا جب مخاطب کرنے میں اس نے پہل کی۔

''کیا سب۔۔۔؟''

''یہ۔۔۔یہ تمہارا پیشہ۔۔۔''

''میرے پیشے کو برا نہ کہنا سنجے بابو!'' وہ فلمی انداز میں گڑگڑائی تھی۔

''اسی کے سبب سے تو تم مجھے ملے۔۔۔آتا تھا کبھی کبھی یہ خیال کہ یہ ہی کیوں، دنیا میں کرنے کے سو کام۔ اوپر والا کہیں بھی ڈال دیتا مگر اب کوئی شکوہ نہیں، کوئی گلا نہیں۔'' اس نے عالم جذب میں آنکھیں موندیں۔

''تم اسی کے ذریعے تو ملے نا۔۔۔''

وہ نگاہیں چرا گیا۔ شیشے سے دور سمندر کی لہریں دیکھنے لگا۔

''یہ حرام کاری ہے۔۔۔گناہ۔ جسم کی کمائی۔''

وہ اب تک ہوا میں اڑ رہی تھی۔ جیسے کسی نے پر کتر دیے وہ دھڑام سے نیچے۔ ناک پر، ٹھوڑی پر اور سب سے زیادہ چوٹ سینے پر لگی۔ جس کے اندر نازک دل تھا۔

کیا وہ اسے راہِ راست پر لانے کے لیے تبلیغ کرے گا۔ کیا اس نے اس لیے اسے بلایا۔ کہیں باہر دور۔

وہ کیا کیا نہ سوچ کر آئی تھی اور اتنا بڑا طعنہ۔۔۔سچا طعنہ تھا۔ گڑ گیا سینے میں، وہ تکلیف کی شدت سے دوہری ہوگئی۔

''تو یہاں کون ہے جو حرام کی کمائی نہیں کرتا صاحب! سیدھے راستے سے الٹا کام اور الٹے راستے سے سیدھی لکیر۔۔۔ہوتا ہے کبھی ایسا۔ فہرست لگائی جائے تو طوائف سب سے اوپر۔۔۔اس کے ہاتھ کس نے پکڑے ہوتے ہیں۔ شریفوں کے ہاتھ کا سہارا پا کر ہی طوائف فہرست میں نمبرون کی جگہ پاتی ہے، بنا سہارے کے کبھی عورت اوپر پہنچی ہے۔ پیروں میں رلتی عورت اور جسم کی کمائی۔۔۔'' اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور ضبط گریہ سے آنسو حلق کے اندر ایسے جوش کھا رہے تھے جیسے۔۔۔تیزاب کے بلبلے۔

جسم کی کمائی کون نہیں کرتا۔ ساری دنیا جسم ہی کی کمائی کھاتا ہے۔ طوائف ہی کیوں بدنام۔۔۔

قلم کار ہاتھ کی کمائی کھاتا ہے۔ ہاتھ کیا جسم کا حصہ نہیں۔

بڑھئی، نان بائی شاعر دماغ سے۔۔۔

جوہری آنکھ سے نگینے جانچتا ہے۔ آنکھ کیا جسم نہیں۔۔۔'' اس کی گھٹی آواز پھٹ پڑی۔

''کمہار پیروں سے مٹی گوندھتا ہے۔ پیر کیا لکڑی کے۔۔۔کون ہے جو جسم کی کمائی نہیں کھاتا اور آپ کہتے ہیں ہم جسم کی کمائی۔۔۔'' اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو۔۔۔گالوں سے گزرتے اسٹول میں جذب ہو رہے تھے۔

''خریدار ہوتا ہے تو گاہکی بڑھتی ہے۔'' وہ مسلسل رو رہی تھی۔ دوکان چوک پر لگائی جاتی ہے۔

ویرانے میں نہیں۔۔۔نہ شمشان گھاٹ میں۔۔۔"
وہ سراسیمہ سا ان جملوں کو سن رہا تھا۔خاک جو پلے پڑا ہو۔
"لاحول واللہ۔۔۔استغفر اللہ۔۔۔کس بات کو کس بات سے ملا دیا۔تمہیں حرام حلال کے باریک فرق کا پتا نہیں۔۔۔کس قدر فضول گوئی بلکہ گناہ۔۔۔یا اللہ!" اسے سمجھ نہ آیا وہ کیا کہہ رہا ہے یا کہنا چاہیے۔
وہ تو بہت عام سا بندہ تھا۔شاید کوئی عالم جواب دے۔مگر عالم کیا جواب دے۔
کوئی سوال کی اوقات تو دیکھے۔آخ تھو۔۔۔(پاگل، نادان عورت کم عقل، کم علم) مگر سامنے روتی عورت۔۔۔اس نے اس کے حیران چہرے کو دیکھا جس پر خوف زدگی بھی آرکی تھی۔
"دنیا کا دستور ہے۔سب اپنے اعمال کے لیے جواز گھڑتے ہیں اور یہ ہمارا جواز ہے۔ضمیر ہمارے اندر بھی ہے۔نشے کی پڑیا دے کر سلاتے ہیں مگر جب کبھی ذرا سی انگڑائی لے، بے داری کی کوشش کرے تو ہمیں بس اسے بہلانا پڑتا ہے۔
اوپر والے کا خوف ہمارے اندر بھی ہے۔زیادہ ڈر گئے تو ہم بھی دوسروں پر الزام دھر دیتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں تو اگلے کون سے دودھ کے دھلے۔۔۔"
اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جھٹکے سے اسٹول کھینچ کر دور پھینک دیا۔ریشمی لچھے دائیں بائیں بکھر گئے۔
وہ بچوں کی طرح آنکھیں رگڑتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
"چندرا۔۔!" اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
اور
یہ پہلی بار تھا کہ اس نے پہلے چھوا تھا۔

✿✿✿✿

ادائیں دکھاتی، بے نیازی برتتی، فضول گو، بے باک عورت، جسارت میں پہل اور روتی عورت، کتنی معصوم لگی تھی۔۔بے بس، بے چین، مجبور۔۔۔
پورا وجود گناہ کی دعوت کا اشتہار۔۔۔
مگر روح اتنی گھائل۔۔۔جو قائل کرنا جانتی تھی اور مائل بھی۔۔۔اور یہی ہوا۔
دونوں کے درمیان ایک رشتہ استوار ہو گیا تھا۔
دوستی۔۔نہیں۔
ہم مزاجی۔۔۔قطعاً نہیں۔
جائز۔۔۔سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
تکمیل۔۔۔لاحول۔۔
تو کیا تھا اس رشتے میں۔۔۔؟
کھچاؤ۔۔ترغیب۔۔۔کشمکش۔
وہ پتا نہیں اس کے پاس کیا کرنے آتا تھا۔
کیا چاہتا تھا۔نہیں جانتا تھا لیکن وہ واضح تھی۔

وہ اس سے وہی چاہتی تھی۔ جس کی دوکان سجا کر بیٹھی ہے وہ اسی چیز کی خریداری نہیں کرتا، اسے دیکھتا بھی نہیں، چھوتا بھی یوں جیسے غیر ارادی طور پر ہاتھ لگ جائے اور پھر چونک چونک جاتا۔

آگ بھڑکا کر تماشا دیکھنے والا سنگ دل۔۔۔

وہ اس سے نفرت نہیں کرتا تھا لیکن محبت بھی نہیں اور وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور طوائف کی محبت۔۔۔ انتہا چاہتی ہے۔ تکمیل۔۔۔ آخری حد۔

طوائف ہی کیوں ہر عورت ہی۔۔۔

وہ جانتی تھی وہ اسے معاشرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا نہیں سکتا۔

لیکن اس۔۔۔ اکیلے کمرے میں۔۔۔ کیا امر مانع ہے۔

وہ قریب ہونے کی کوشش کرتی تو وہ کرنٹ کھا کر جھٹک دیتا تھا مگر پھر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ ساکت مجسمہ بن جاتا۔

اتنا بے جان کہ۔۔۔ سرد، بے تاثر۔

اور وہ بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ سارا دبئی جل تھل تھا۔ پانی پانی اور پانی بادلوں کی گھن گرج۔۔۔ کڑکتی بجلیاں، ہوائیں جو اپنی زد میں ہر کمزور کو اڑائے دے رہی تھیں۔

اور چندرا بہت کمزور عورت۔۔۔

وہ کشمکش کی رات تھی۔ وہ اسے رجھانے کے سارے اوزار تیز کیے ہوئے تھی۔ وہ ہر بار اسے ٹھکرا جاتا تھا۔ وہ جو اس کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی کہ وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ کیا چاہتا تھا۔

شمعوں کی روشنی، پھولوں کی خوشبو، آسمان سے برستا پانی، کھڑکی کے شیشے جگمگا جاتے، آسمانی بجلی کے جھٹکے پر۔

آج وہ۔۔۔ اس کے ارادے پختہ اور منہ زور تھے۔

طوائف ہو کر ناکام۔۔۔ اب جیسے یہ خود اس کے لیے طعنہ تھا۔

طوفانی بارش سب کچھ بہالے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ گندگی بھی اور صفائی بھی، برائی بھی اور اچھائی بھی، تو کیا آج وہ بھی۔۔۔ چندرا کے ارادوں کے آگے۔۔۔ وہ شاید بادل کی گرج سے ڈر کر اس سے لپٹی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

ایک غیر ارادہ عمل۔۔۔ اس نے اسے سمیٹ لیا۔ وہ آج شکست نہ کھائے گی۔

بس کچھ پل ہی جاتے تھے۔

بجلی کڑکی، روشنی کا جھماکا۔۔۔ اور اس شخص نے خود کو بے خودی کے عالم میں پایا تھا۔ ہوش میں آ گیا۔

اس نے ایک ہاتھ سے اسے بالوں سے پکڑ کر خود سے دور کیا اور دوسرے ہاتھ سے زوردار طمانچہ۔۔۔ اس کے گال پر مشکی گھوڑے جیسی جلد۔۔۔ جسے بس سہلانے کا دل کرتا ہے۔

وہ لڑکھڑا کر گری تھی۔۔۔ تپائی کا کونہ ماتھے پر، عین پیشانی پر۔۔۔ اس نے ایک ہاتھ گال پر اور دوسرا تیزی سے ابھرتے گومڑ پر رکھا۔ موم بتی کی روشنیاں کم تھیں مگر اس کے محبوب کا تربتر ہراساں چہرہ۔۔۔

اور چندرا کا متحیر خوف زدہ۔۔۔ بے رنگ چہرہ دونوں ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

"یہ۔۔۔گناہ۔۔۔ہے۔" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ اس نے اسے کچھ نہیں کہا تھا، وہ نہ جانے کس سے ہم کلام تھا اور چندرا کو سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ جملہ سن کر تڑپ کر سیدھی ہوئی۔ وہ کس طرح چیل کی طرح اس پر جھپٹا مارنے اٹھ آئی تھی۔ اس نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"تو۔۔۔تو اب تک کیا کرتے رہے؟ یہاں آتے رہے۔ پوری پوری رات یہاں رہے۔ وہ سب گناہ نہیں تھا۔ وہ کون سا پن تھا؟"

وہ اس کے گریبان کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

"ہر بار میرے عورت پن کی تذلیل کر کے گناہ اور ثواب کی بات کرتے ہو۔" وہ حلق کے بل چلائی۔

"اور ہم تو گناہ گار ہیں ہی۔۔۔ جہنم کے مکینوں کو جلتا بلتا نہ دیکھو گے تو خاک مزا آئے گا جنت مل جانے کا۔

اور اب کس گناہ سے ڈرتے ہو بس ایک آخری انتہا۔۔۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"یہ۔۔۔زنا ہے۔" اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا، وہ اس کے جنون پر حیران تھا اور ادھر بہت تیزی سے جھاگ اڑاتے ہوئے وہ جو مسلسل بول رہی تھی۔ اسے جیسے کسی نے الیکٹرک شاک دیا۔

"ز۔۔۔نا۔" وہ کھینچ کر بولی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"تم سے کس نے کہا زنا بس وہ آخری حد ہے۔ تمہارا تو ہر قدم ہر عمل زنا رہا۔ اتنے علم والے اور ڈر والے تھے تو ادھر آئے ہی کیوں؟" اور وہ اس کے جملے پر بری طرح چونکا تھا۔ چندرا کے منہ سے ایسا جملہ اور وہ بھی سمجھ گئی۔

"ہمیں بھی پڑھائے گئے تھے سارے سبق۔۔۔ تمہیں کیا لگا چندرا پیدا ہی ایسی ہوئی تھی۔

باپ مسجد بھیجتا تھا اور ماں مندر۔۔۔ دونوں کو سیکھ لیا۔ دونوں جگہ ہی غلط تھا وہ سب جو میں اب کرتی ہوں اور تم کہتے ہو زنا ہے۔"

وہ ہنسی اور پھر رو پڑی۔۔۔ "کیوں آئے تھے یہاں، کس لیے۔۔۔؟ مجھے بتا رہے ہو کیا کیا ہے؟"

"میں تو نہیں میرے دوست۔۔۔" بس اس کے منہ سے نکلا۔

"پہلی بار۔ بعد میں تو تم خود ہی نا۔۔۔" اس نے جتایا۔ "کس چیز کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ کیا کرنا چاہتے تھے۔ میں تو تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔۔۔ گڑ کھا کے گلگلوں سے پرہیز۔۔۔؟ گناہ سے ڈرا رہے ہو۔ اب کس گناہ سے ڈرتے ہو۔ سارے گناہ تو ہو گئے پورا رجسٹر بھرا ہوا ہے۔ آخری خانہ خالی کیوں؟"

اس نے سنا نہیں۔ وہ کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔

✿ ✿ ✿ ✿

دوشاخ راستے پر پتھر کی بینچ پر تنہا اصدق عبدالقیوم۔۔۔

کس گناہ سے بچتا رہا اور کون کون سے گناہ کرتا گیا۔ یہ اسے بتایا ایک طوائف نے۔۔۔ وہ گناہ کی انتہا سے بچنے کے لیے نمازیں پڑھتا رہا۔ روزے رکھتا رہا۔ خود کو بچاتا رہا اور پھر جانے انجانے ایک طوائف کے گھر کا پھیری ڈالنے والا بن گیا تب بھی۔۔۔

ہاں تب بھی۔۔۔

وہ شدید جنون اور بے بسی کے زمانے میں ظفر کے بتائے راستے پر چل نکلا تھا۔ گھر آ کے بہت پچھتایا۔ قسم کھائی کہ دوبارہ رخ نہ کرے گا۔ لیکن۔۔۔!

وہ پھر ایک بار۔۔۔ اور پھر کئی بار اس گھر تک چلا گیا۔ جاتے وقت وہ جیسے ہر شے کو فراموش کر دیتا تھا، کسی معمول کی طرح اٹھتا اور چل پڑتا۔ ڈرتا رہتا کہ کہیں گناہ میں نہ پڑ جائے۔

اور بہت ہی عجیب بات یہ تھی کہ وہ جس بے صبری، تشنگی، بے بسی کی کیفیت میں گھر سے نکلتا تھا۔ چندرا کا چہرہ دیکھتے ہی وہ جیسے شانت ہو جاتا۔ سارے کھولتے جذبات واحساسات پر برف سی گر جاتی۔ چندرا کے پاس گزارے ہوئے پل۔ گھنٹے، منٹ۔۔۔ وہ ہر بار واپسی کی راہ چلتے ہوئے سوچتا۔۔۔ کہ گناہ سے بچ کر آ گیا ہے اور قسم کھاتا کہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ ہر بار گناہ کی دلدل سے بچ نکلتا ہے۔

جاتے وقت اس پر فقط جانے کا جنون سوار ہوتا اور واپسی پر شرمندگی۔ خود پر غصہ، ملامت۔ وہ اپنا ہاتھ زور سے دیوار پر دے مارتا اپنا سر دیوار سے ٹکراتا کہ وہ کیوں چلا جاتا ہے۔

کیا وہ عورت جادوگرنی ہے جو ہر بار وہ کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ خود کو کوستا، دانت پیستا، اس نے فائزہ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس نے نوٹو کا ڈھیر حسنہ خالہ کے آپریشن کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کے جذبات پر اوس تھی۔ واپسی کا راستہ بند۔۔۔ وہ کب جا سکے گا اور وہ کبھی بھی فائزہ کو نہیں بلا سکے گا۔

یہ اذیت۔۔۔ وہ کام میں دھیان نہ لگا پاتا۔

وہ کیا کرے اور وہ کیا کرتا۔

شدید طیش کے عالم میں چندرا کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتا۔

اور واپس آ کر سجدہ ریز ہو جاتا۔ توبہ کرتا، گڑگڑاتا اور پھر شکر ادا کرتا کہ گناہ کرنے سے بچ گیا۔

اور آج اسے ایک طوائف نے بتایا کہ وہ فقط ارادہ کرنے بلکہ خیال آنے ہی سے گناہ گاروں کی فہرست میں کھڑا ہو جاتا تھا۔

ایک ایسی طوائف جس کا مذہب مشکوک تھا۔ ہندو یا مسلمان۔۔۔

اس نے اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہا بلکہ دھکے دیے تھے۔ وہ ناسمجھی کی کیفیت میں اپنے گھر تک لوٹا تھا۔ وہ جوتے کپڑے بدلے بنا ننگے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ خالی تھا اور یہ خالی پن اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ کسی مجذوب کی طرح سر کو زور سے جھٹک کر حاضر ہونے کی کوشش کرتا۔ اس کی یادداشت میں چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ گھر والے، فائزہ، ظفر اور چندرا۔۔۔ چندرا سو روپ بدل کر اس کی آنکھوں کے پاس سے گزر رہی تھی۔

اور وہ بہت زیادہ ہنس رہی تھی۔

اور وہ رو رہی تھی۔

اور۔۔۔ وہ مسلسل کچھ بول رہی تھی۔ مگر کیا۔۔۔؟ بہت زور دینے پر بھی اسے یاد نہ آتا تھا۔ ہاں مگر استہزائیہ انداز، تلخ جملے، اس پر ہنستی ہوئی جادوگرنی عورت۔۔۔ وہ سر ہاتھوں پر گرا کے فقط یہ سوچ

رہا تھا کہ بس ایک بار یاد آ جائے۔
کس بات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کر لیا ہے۔ بس ایک بار وہ بات یاد آ جائے نا تو۔۔۔ وہ حل بھی سوچے۔
کمرا اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ کہاں تھا۔ یہ کون سی جگہ۔۔۔ اے اللہ!
بس تھوڑا سا یاد آ جائے کہ میں کون ہوں، وہ آسمان کی طرف منہ کر کے چلایا۔ ''اللہ میرے ساتھ کیا ہوا؟''
وہ خالی پن سے ہر شے کو جانچ رہا تھا۔ کوئی نشانی۔۔۔ جو یادداشت کو واپسی کی راہ دے۔ تب ہی اس کی نگاہ کتابوں کی ریک پر گئی۔ غائب دماغی کی کیفیت ہنوز تھی۔ مگر وہ چیل کی طرح اس کونے میں جھپٹا۔ گھٹنوں کے بل سرکا۔
اور نشانی رکھے صفحے۔۔۔
اور حاشیہ لگی لائنوں کو پڑھنے میں چند منٹ ہی لگتے ہیں۔ سیاق و سباق کو جانچے بنا۔
اور پھر اس نے شروع سے پڑھنے کی کوشش کی تھی۔
اور اس کی یادداشت واپس آنے لگی۔ یہ تو اسی کی کہانی تھی۔
''چار جرائم کی سزا اور اس کا طریقہ خود قرآن حکیم اور احادیث متواترہ سے متعین کر دیا ہے۔ کسی قاضی یا امیر کی رائے پر نہیں چھوڑا۔ انہیں متعینہ سزاؤں کو اصطلاح شرع میں حدود کہا جاتا ہے۔
حدود شرعیہ چار ہیں۔
چوری
کسی پاک دامن عورت پر تہمت رکھنا۔
شراب پینا۔
زنا کرنا۔
ان میں سے ہر جرم اپنی جگہ بڑا سخت اور دنیا کا امن تباہ و برباد کر دینے والا ہے لیکن ان سب میں بھی زنا کے عواقب و نتائج بد دنیا کے نظام انسانیت کو تباہ کرنے والے ہیں وہ شاید کسی دوسرے جرم کے نہیں۔
وہ ان لائنوں کو متعدد بار پڑھ چکا تھا اور اس نے کبھی چوری نہیں کی اور تہمت نہیں لگائی۔ تہمت تو دور کی بات، اس نے تو کبھی کسی بھی انسان کے لیے برا گمان تک نہ کیا۔
اور شراب۔۔۔ لاحول۔ ظفر جیسے دوست اور دبئی جیسی ریاست میں رہتے ہوئے اس نے کبھی اس حرام شے کو دیکھا بھی نہ۔ اسے تو اس کی بو ہی سے کراہیت اور ابکائی آتی تھی۔
اور زنا۔۔۔ اس نے کبھی زنا نہیں کیا۔۔۔ کون کہہ رہا ہے کہ۔۔۔ وہ چندرا جیسی عورت کے ساتھ تاریک راتوں کے پل بتا کر بھی بچ آیا تھا۔ لیکن چندرا کہتی ہے وہ جرم کر چکا تھا۔ سارے خانے بھر چکے ہیں بس اک آخری۔۔۔
اس کی یادداشت ہر سطر کے ساتھ لوٹ رہی تھی۔۔۔ کتابوں میں اسی کا تو ذکر تھا لیکن کون سا جرم۔۔۔؟
کب ہوا گناہ سرزد۔۔۔؟

وہ تو عبادتیں کرتا رہا اور بچتا رہا پراگندگی سے۔ مشکل سے روزے رکھ کے نفس کو سبق دیتا رہا۔
''نظر ایک زہریلا تیر شیطان کے تیروں میں سے ہے جو شخص باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نظر پھیرے تو میں اس کے بدلے اس کو ایسا پختہ ایمان دوں گا جس کی لذت وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔''
وہ ان لائنوں کا ایک حرف بھی نہ سمجھا۔ ہاں اس کا ایمان پختہ تھا اور اس نے کبھی شرک نہیں کیا۔ کسی بھی حوالے سے جانے انجانے اور عبادت اس کے لیے باعثِ سکون تھی ہمیشہ۔۔۔ لیکن دل کے تقاضے۔۔۔
وہ اب بھی دل جمعی سے سطر سطر حرف بہ حرف نہیں پڑھ رہا تھا۔ بس جہاں نگاہ ٹھہر جاتی اس چیز کو پڑھ لیتا۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''پہلی نظر تو معاف ہے، دوسری گناہ ہے۔''
کس چیز کی نظر۔۔۔؟ اس نے صفحہ پلٹا۔
الفاظ یوں لگ رہے تھے جیسے نامعلوم زبان میں لکھے ہوں۔۔۔ اس نے بڑی دقّت سے نگاہ ٹھہرائی۔
اصل زنا جس کو کہتے ہیں سب ہی کو معلوم ہے۔ لیکن زنا کے اسباب کو بھی زنا کہا گیا ہے۔
''آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے اور کانوں کا زنا سننا ہے اور زبان کا زنا بات کرنا ہے اور ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے۔''
معلوم ہوا کہ نامحرم مرد و عورت کا ایک دوسرے پر نظر ڈالنا بھی زنا ہے اور بدنیتی کے ساتھ یا لذت کے لیے نامحرم مرد و عورت کا آپس میں بات کرنا اور سننا بھی زنا ہے۔
کسی نامحرم مرد و عورت کی طرف بری نیت سے چل کر جانا یا ہاتھ سے چھونا سب زنا ہے۔
ہاں! اس کے ذہن و دل پر چھائی دھند کا پردہ کسی نے چاک کر دیا۔ وہ کانپنے لگا، اس کے لرزتے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گئی۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ اس کا گال زمین پر لگا تھا اور پھڑپھڑاتے ورق۔۔۔ اس نے اپنا پنجہ دھپ کر کے اوراق کو جمایا۔
''کسی مرد و عورت میں جب ناجائز تعلقات ہوتے ہیں تو یک لخت نہیں ہو جاتے بلکہ پہلے بہت سے ایسے کام کیے جاتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کو قریب سے قریب تر کرتے چلے جاتے ہیں۔''
اس لیے شریعت مقدسہ نے ان محرکات و اسباب کو بھی زنا قرار دیا ہے۔
وہ اپنی بہتی آنکھوں سے ان جملوں کو پڑھ رہا تھا۔
اس نے خواہش کی کہ اس کا دل بند ہو جائے مگر وہ تو اور شدت سے دھڑک رہا تھا۔ پھڑک رہا تھا کوئی پل جانے کہ پسلیوں کے جنگلے کو توڑتا اسی کی طرح اس ننگے فرش پر آ گرے اور مجھے تڑپائے۔۔۔ اور اگر ایسا ہو تو وہ خواہش کرے گا کہ۔۔۔ بھاری نوکیلے جوتوں والے لوگ آ جائیں اور اپنے پیروں سے اس لوتھڑے کو کچل دیں جس نے اس کو خوار کیا اور گناہ گار اور بدکار۔۔۔ لیکن۔۔۔
وہ بدکاری سے تو بچنا چاہتا تھا۔
اور چندرا جیسی طوائف نے کہہ دیا کہ وہ سب گناہ کر چکا ہے۔ اسے کیسے پتا۔۔۔ کیا اس نے ان کتابوں کو پڑھ رکھا ہے۔

شاید وہ ان میں سے تھی جو جانتے بوجھتے گناہ کرتے ہیں۔ وہی جن کے دلوں پر مہر لگ جانے کا اعلان ہو چکا ہے۔

لیکن اس کا دل وضمیر ابھی زندہ تھا۔ مہر نہیں تھی۔ اسے پلٹا دیا گیا تھا۔ روک دیا گیا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں نے کتنے ہی چکر پورے کر لیے وہ شاید ہوش وخرد سے بے گانہ تھا۔

''اسلامی سزاؤں میں سب سے سخت سزا زنا ہی کے لیے رکھی گئی ہے۔ اس سخت سزا کے دوران مجرم پر رحم اور ترس کھانا جائز نہیں۔۔۔ ہاں اسے رحم نہیں چاہیے اسے سزا چاہیے سخت سے سخت۔۔۔ لیکن کیا ہو گی سزا اس نے بے صبری سے ورق پلٹے۔

''سو کوڑوں کی سزا صرف غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے مخصوص ہے۔ شادی شدہ لوگوں کی سزا سنگساری ہے۔''

وہ یک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے جوتے ہنوز پیروں ہی میں تھے۔ وہ زمین پر پڑی کتابوں کو چھوڑ گرتا پڑتا گھر سے نکلا، وہ سڑک پر آ گیا۔ اس کے پاس نشانِ منزل نہیں تھا۔ وہ چلتا جا رہا تھا۔ بھوکا پیاسا۔

پہلے وہ خود کو گناہ گار نہیں مان رہا تھا اور اب جب حقیقت کی آنکھ سے دیکھا تو۔۔۔

وہ اپنے گناہوں کی گنتی کرتا۔ سورج کی تپش سے بے نیاز چلتا تھا اور ہر بار گنتی پلٹ جاتی ان گنت گناہ اور دوبارہ سے نئی ترتیب لگاتا۔

''میں کیا کروں میرے اللہ!'' وہ اس تپتی بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا وہ دوبارہ چل رہا تھا۔

''اے اللہ میرا فیصلہ آپ ہی کر دیجیے۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟'' وہ گرد میں اٹا۔۔۔ کف سے آنسو رگڑتا پسا جا رہا تھا۔

یہ اندھا دھند بھاگتی گاڑیاں۔۔۔ ایک کو میرے اوپر سے گزار دے یا۔۔۔ میرا دل بند کر دے یا میری شریان کو پھاڑ دے۔۔۔ مجھے خود ہی سزا دے دے، میرا فیصلہ کر دے۔

میں عبادتیں کرتا رہا، روزے رکھتا رہا، میں خوامخواہ کی فکریں اور بلاوجہ کا فاقہ، جب میں نے تجھے اور تیرے حکم کو ہی نہ سمجھا اور ایک طوائف نے کہا کہ۔۔۔''

اسے چندرا کی دوسری بات اب یاد آئی تھی۔ وہ ایک بار پھر رک گیا۔ اس نے اپنے بال اتنی طاقت سے نوچے کہ مٹھیوں میں چپک کر باہر آ گئے اور چندرا نے اسے حیران کر دیا تھا۔

وہ یہ بات جانتا تھا مگر یہ اسی پر لاگو ہو گی یہ تو اس نے کبھی نہ سوچا اور چندرا نے کہا تھا۔

✿✿✿✿

چندرا نے کیا کہا تھا۔ وہ اب قدم اٹھاتا تھا تو سر میں دھمک ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا وہ زیرِ تعمیر عمارت کی جانب آ گیا۔

یہاں آگے جانا منع تھا۔ مگر وہ کچھ پڑھنے دیکھنے سے معذور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا چندرا کی پہلی بات طمانچہ تھی اور دوسری۔۔۔ دوسری کیا تھی۔ ہر مسلمان زنا کار کے لیے ایک گالی جیسی یا تحفہ جیسی۔۔۔ مگر وہ بات کیا تھی۔ اسے ذہن پر زور دینے پر بھی یاد نہ آ رہی تھی۔

''اللہ مجھے معاف کر دے۔'' وہ گڑگڑایا۔

"اے رکو۔۔۔رکو آگے مت جانا آگے جانا منع ہے۔"

ہیلمٹ والے شخص نے اچانک ہی اسے دیکھا تھا۔ وہ پوری طاقت سے چلّایا اور اس کے متوجہ نہ ہونے پر بھاگا مگر۔۔۔

مگر تب تک۔۔۔

زیر تعمیر عمارت کے اوپر کرین سے کرش چھتوں پر پہنچایا جا رہا تھا۔

ٹرالی پہلے سے خراب تھی یا ابھی اسے دیکھ کر۔۔۔ وہ عین نیچے تھا اور اوپر سے گرتا کرش۔۔۔

اسے چیخنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ وہ پہلے ہی سے دم نیم جان تھا۔ وہ گر گیا سجدے کی سی حالت۔۔۔ وہ بچ سکتا تھا مگر جب خود ہی گر گیا کہ۔۔۔

لوگوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ بھاگ دوڑ، چیخ و پکار۔۔ مگر وہ پرسکون ہو گیا تھا خاموش۔

کرش کی چھوٹی سی پہاڑی زمین پر نمودار ہو گئی۔ جس کی تہہ میں وہ پرسکون ہو چکا تھا۔ بے دم بے جان۔۔۔

سنگساری۔۔۔عیب پوشی، انصاف، اس کے دماغ میں آنے والی آخری سوچ۔

✿✿✿✿

ایک موت سا سناٹا، ہول سب ایک دوسرے سے نظریں چرائے اپنی اپنی سوچوں میں گم۔۔۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کیوں اور کیسے جیسے سوال اب بے معنی تھے۔

سجا بنا گھر قیمتی آرائشی سامان، ہر شے سے جھلکتی امارت ایک مسلسل خوشی تھی جیسے مگر اب یوں لگتا جیسے گہن لگ گیا ہو۔

وہ بیرونی سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ خاموش مگر آج آنکھوں میں خالی پن نہیں تھا جو ایک ماہ سے اسے مردہ بنا کر پیش کرتا تھا۔ آج ان آنکھوں میں حزن آر کا تھا۔ تکلیف، اذیت اور آخر میں ترحم۔۔۔

اس کے تینوں بچے اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ فائق اور شائق سائیکل چلا رہے تھے جبکہ فارا اپنا واکر بھگاتی تھی اور چھن چھن کے کھلونے پر ہاتھ مار کے قلقاریاں مارتی۔ وہ کبھی کبھی بچوں کی جانب متوجہ ہو جاتی یا پکارنے پر کوئی جملہ کہہ دیتی مگر سوچوں کا جہان دوسرا تھا۔

اور سب سے پہلے عتیقہ بیگم ہی متوجہ ہوئی تھیں پھر حسنہ بیگم اور وقفہ وقفہ سے سب کو احساس ہوا کہ آج وہ کچھ جدا لگ رہی ہے۔ نئی نئی سی کل رات تو اس کے رونے کی آوازیں سب کو جگاتی رہیں۔ وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔ نہ جانے کس سے لڑ رہی تھی اور اب اس وقت اس نے کتنے دنوں بعد نہا کر لباس بدلا تھا۔

ایک نیا لباس۔۔۔ اور اپنی وہ چوڑیاں جو اصدق نے اسے شادی کے فوراً بعد دبئی سے بنوا کر دی تھیں اور فائق، شائق کی پیدائش پر دی جانے والی گردن سے چپکی مدراسی چین اور فارا کی دفعہ دیے جانے والے جھمکے۔۔۔

وہ لاکھ چڑے یا عذر پیش کرے عتیقہ بیگم کو وہ سجی بنی ہی اچھی لگتی تھی۔ خوب صورت لباس، قیمتی اور شوخ، ننگے ہاتھ اور جس قدر ممکن ہو سارا زیور چڑھا کر کے، کاجل سرخی تو لازمی۔

مگر جس دن سے خبر آئی تھی پہلے تو وہ حیران پریشان ہو گئی۔ بے یقین پھر جیسے سکتے میں چلی گئی۔

سب بے یقین تھے۔مگر اس کی بے یقینی کی حد کہاں۔۔۔وہ اسکائپ پر آنا کم ہو گیا تھا لیکن اس پر کام کا دباؤ تھا۔وہ الجھا ہوا پریشان تھا۔اس کے ہمیشہ کے مسائل جو صرف فائزہ سے کہتا تھا اور فائزہ کے پاس ماسوائے تسلی کے کوئی لفظ نہ تھا بعض اوقات تو وہ بھی نہ دے پاتی۔نظریں چراتی یا موضوع بدل دیتی لیکن کچھ عرصے سے وہ بولنا بھی کم ہو گیا تھا۔وہی بچوں کی حرکتیں،نئی باتیں،شرارتیں بتا کر خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتی۔

وہ بیمار تھا۔اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور چہرے سے رونق ختم ہو چکی تھی۔وہ بات کرتے ہوئے جبڑے سے بھینچ لیتا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود۔۔۔یوں ہو جائے گا،یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص۔۔۔

اس نے رو رو کر زمین آسمان ایک کر دیا۔وہ بین ڈالنا چاہتی تھی اپنا منہ سر نوچ لینا چاہتی تھی۔

کسی کی نصیحت اس پر اثر نہ کرتی۔اجڑی بجڑی ویران آنکھوں کے ساتھ جہاں بیٹھ جاتی۔۔ سوچتی رہ جاتی کہ۔۔۔کیوں کب کیسے؟

اور وہ ہی کیوں؟اس کے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟

اتنا برا۔۔۔

کس لیے۔۔۔

کس لیے۔۔۔کوئی ایسے بھی اجڑ جاتا ہے۔

❁❁❁❁

وہ سارا خط اذیت کی داستان تھی۔شرم و حیا کے مقام سے گزرتی سوچ کے در وا کرتی سچی کہانی۔

اصدق کا لکھا مکتوب دراصل ایک آئینے کی مانند تھا۔جس میں سب ہی اپنا چہرہ دیکھ سکتے تھے۔ اپنے عیب اور اپنے چہرے پر لگا ہر دھبا۔۔

یہ آئینہ صرف چہرے کے اوپر بظاہر نظر آتے خیالات کا ترجمان نہیں تھا۔

بلکہ یہ جادو کا آئینہ تھا۔

کھول کھول کر بیان کرتا۔جزئیات نگاری کرتا۔معنی و تشریح کے فن میں طاق۔۔۔

یہ آئینہ ایک عدالت تھا۔مجرم خود بخود ہی کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو۔۔۔اور بخوبی جانتا ہو کہ وہ سزا کا حق دار ہے۔

مرکزی خیال اصدق عبدالقیوم کا تھا۔

مگر اسکرین پلے میں ہر شخص نے اپنی مرضی کے ڈائیلاگ دیے تھے۔اصدق نے ان گزرے سالوں کا پل پل بیان کیا تھا تو خط پڑھ کر سب ہی کو گزرے سالوں کے پل یاد آ رہے تھے۔ہر بندے کو اپنے پل،اپنی سوچ،اپنی کار گزاری۔۔۔

ہر شخص اپنی جگہ مجرم تھا۔مگر کچھ بے ضمیر ”ہونہہ“ کہہ کر پھر سے خود میں مگن ہو گئے اور کچھ باضمیر ہر سانس کے ساتھ اپنا جرم ترتیب وار لگاتے تھے۔اپنی غلطی تسلیم کرتے تھے۔ان ہی میں ایک حسنہ بیگم بھی تھیں۔

ایک روایتی عورت پانچ بیٹیوں کی ماں۔۔۔بیٹے کی خواہش اور کم آمدنی۔۔زندگی کا واحد سبق صبر

وشکر رہا، سراور پیر ڈھانپنے کی خواہش میں سرگرداں مڈل کلاس عورت۔۔۔
اور زندگی اتنی مشکل بھی نہیں تھی۔
تمام خدشات سے پرے شادی شدہ زندگی بہت ہی سہل اور آرام دہ محسوس ہوئی۔ قناعت صبر وشکر کا زمانہ تھا۔ تھوڑے پر صبر اور زیادتی پر شکر قابلِ فخر ہوتا تھا اور کچھ طبیعت میں بھی اعتدال پسندی تھی۔
اور تربیت میں الحمد اللہ کی تسبیح ہمراہ کر دی گئی تھی سو کوئی مشکل نہ لگی۔
شوہر بہت اچھے تھے اور سسرال کے نام پر ایک چھوٹا دیور۔۔۔ اور جب دیورانی بھی اپنی سگی بہن ہو تو کیا ہی کہنے۔۔۔
ماں باپ کے گھر بھی دو بہنیں اور اب سسرال میں بھی۔۔۔ دونوں کے شوہر اسٹور جاتے اور یہ سارا دن گھر کو سجا بنا کر رکھتیں۔
وہ خود شادی کے دس ماہ بعد ہی ایک بیٹی ناعمہ کی ماں بن گئی تھیں اور عتیقہ بیگم اور عبدالقیوم تو خوشی سے پھولے نہ سمائے ایک بھانجی، ایک کی بھتیجی۔
دونوں بچوں کی طرح ناعمہ کے حصول کے لیے چھینا جھپٹی کرتے۔ رونق ہی رونق ناعمہ کے دو سال بعد عائزہ بھی خوشی بن کر آئی تھی۔ اس کی آمد کو بھی جشن کی طرح منایا گیا۔ مگر عتیقہ بیگم کو اپنی خالی گود کا احساس تھا۔ پانچ سال کم عرصہ تو نہیں ہوتا وہ خاموش پژمردہ رہنے لگی تھیں تو دوسری طرف حسنہ بیگم بھی چھوٹی بہن کے دکھ پر اندر ہی اندر کڑھتیں۔ دعائیں اور وظیفے کرتیں اور ایسے میں فائزہ کی آمد کی اطلاع پر انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ پیدا ہونے والے بچے کو بہن کی گود میں ڈال دیں گی۔ ان کے اس ارادے میں حائل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔
مگر پھر اچانک۔۔۔ اصدق عبدالقیوم نے عتیقہ بیگم کی گود میں آکر سب کو حیران کر دیا۔
فائزہ اور اصدق آگے پیچھے آئے پہلے اصدق اور پھر فائزہ۔۔۔
اور حسنہ بیگم کو اصدق بہت پیارا تھا۔ بہت زیادہ پیاری اکلوتی چھوٹی بہن کا پیارا اکلوتا بیٹا لاڈلا بھانجا۔۔۔ ان کی تین بیٹیاں اور وہ گھر کا واحد لڑکا۔۔۔ انہیں بعض اوقات لگتا کہ وہ سب سے زیادہ پیار بھی اسی سے کرتی ہیں اور بعد کے بہت سے سال۔۔۔ جب انہوں نے اپنے لیے بیٹا مانگا اور ناکام رہیں تو رائحہ زائرہ آگئیں۔۔۔ اور سالوں بعد عارفہ اور آصفہ۔۔۔
لاڈلا بھانجا داماں بن جائے بھی کوئی پلاننگ نہیں کی خیال ارادہ فائدہ نقصان۔
لیکن بعد کے سال۔۔۔
سال نہیں دن۔۔۔
دن نہیں گھنٹے۔۔۔ گھنٹے اور پل۔۔۔ اور ہر سانس کے ساتھ جیسے ہر شے طے شدہ ہوتی گئی۔
وہ قطعاً منصوبہ ساز نہیں تھیں کبھی نہیں۔
لیکن۔۔۔
شریکِ کار تو بن گئی تھیں۔ جانے انجانے میں قصداً۔۔۔ پتا نہیں کیسے مگر آج انہیں سارے قصور ما نوا پنے ہی لگ رہے تھے۔

وہ اپنی بہن سے محبت کے معاملے میں ہمیشہ پر خلوص رہی تھیں۔
تو دوسری جانب۔
عبدالجبار بھی اپنے بھائی عبدالقیوم سے محبت میں بے ریا تھے۔ سیدھے، ستھرے، سچے۔
مگر!
ان ہی کے ہاتھوں پرورش پانے والی اولادیں اپنی فطرت کے تناظر میں الگ ہی رنگ ڈھنگ سے ابھریں۔
ناعمہ کی شادی صحیح عمر میں ہوگئی تھی۔ شوہر بھی قبول صورت، شریعت اور محنتی ملا۔ اولاد میں بیٹے بھی ملے اور بیٹیاں بھی۔۔۔ سسرال کے حوالے سے ٹھنڈا گرم چلتا رہتا تھا مگر یہ کوئی ایسا قابل ذکر معاملہ نہیں رہا کبھی بھی۔
میکے میں اسے بیاہی بیٹی والا سارا پروٹوکول بڑے پرجوش انداز میں دیا جاتا تھا۔ اس کے بچے بہت لاڈلے تھے اور داماد کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ لیکن جب کچھ اور وقت گزرا اور عائزہ کی شادی ہوئی تب دل سے محبت تو کم نہ ہوئی مگر لین دین کی وہ رفتار نہ رہی جو پہلے تھی۔ ناعمہ خاموش رہ کر بس اشارہ کر کے من مانی کروالی تھی تو دوسری جانب عائزہ دھڑلے سے اپنے مطالبات سامنے رکھتی تھی اور وہ اب ناعمہ کی نسبت زیادہ حق رکھتی تھی کہ گھر والوں کی ذمے داری تھی جبکہ ناعمہ کا مطالبہ پورا کرنا اب اخلاقی جواز کے خانے میں بیٹھتا تھا۔ کچھ کہے سنے بغیر گھر کی بیٹیاں پہلی ترجیح بن گئیں اور وہ اور ان کے بچے پس پشت چلے گئے۔
ایسے میں اصدق کے دبئی جانے کی خبر۔ ہر بندے نے اپنے حساب سے ری ایکشن دیے۔ مایوسی کے اندھیرے میں کرن پھوٹی تھی۔
اصدق ہمیشہ سے گھر سے، گھر والوں سے اپنے محلے، اپنے شہر سے جڑ کر رہنے والا شخص رہا تھا۔ گلیاں، راستے، آسمان اسے ہر شے بھاتی تھی۔ وہ ماں باپ میں، بہنوں میں، خالہ، تایا کے ہمراہ بیٹھ کر وقت گزارنا پسند کرتا تھا۔ اکیلا رہنا اس کی سرشت میں تھا ہی نہیں۔
وہ کام کرتی ماں کو محض دیکھنے کے لیے کچن میں جا کر سلیب پر چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ وہ لاکھ گرمی کا ڈراوا دیتیں مگر وہ ٹکا رہتا۔ ''آپ بھی تو ہیں نا۔''
''مگر میں تو کام کر رہی ہوں۔'' وہ اپنے سے انداز میں کہتا۔ ''آپ کو دیکھنے سے اچھا کام کون سا امی۔۔۔''
''یہی بات تم کل اپنی خالہ سے کہہ رہے تھے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے جتاتیں۔
''تو جھوٹ تھوڑی کہہ رہا تھا۔ آپ نہا رہی تھیں نا امی۔۔۔! دراصل خالہ جان کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے۔ اس لیے میں دل بہلانے گیا تھا۔''
''اور خالہ سے تم کہتے ہو کہ ماں کے پاس اس لیے جانا پڑتا ہے کہ خالہ جانی وہ آپ سے ملتی ہیں۔''
''اوہ تو آپ چھپ کر ہماری باتیں سنتی ہیں۔''
''ماں کے پاس سے اٹھتا تو کامن میں جا کر صوفے پر دراز ہو جاتا جہاں تمام گرلز پارٹی اپنے اپنے کاموں میں الجھی ہوتی۔

چھوٹی بہنیں ہوم ورک کر رہی ہوتیں۔ فائزہ اور عارفہ کوئی کپڑا لے کر اس کے ڈیزائن کو ڈسکس کرتیں۔ ناعمہ کوئی رسالہ پڑھتی اور عائزہ اپنے منہ پر کچھ مل کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتی اور ایک مسلسل ''بھن بھن'' کمرے کے سکوت کو تار تار کرتی رہتی۔

آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں۔۔۔ تو وہ وہیں غافل ہو جاتا۔ ''بھن بھن'' اگر زیادہ بلند ہو جاتی تو وہ ذرا سا کسمسا کر ''اونہوں'' کر کے دھیما رہنے کی تادیب کرتا، وہ ساری کبھی تو مدھم پڑ جاتیں اور کبھی جھنجھلا کر ہم آواز اسے سنانے لگتیں۔

اب ایسی صورت حال میں اصدق عبدالقیوم گھر سے دور رہنے کا سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن اس نے سوچ لیا بلکہ عمل بھی کر لیا۔

ہاں مگر ایک بات اس کے ذہن میں اول روز سے واضح تھی اسے بس دو چار سال باہر لگانے ہیں۔

تھوڑی سی ذمے داریاں کم ہوں۔۔۔ تھوڑی آسانی۔۔۔ تھوڑا سرمایہ۔۔۔ اور صبر و شکر کے ساتھ گھر واپسی۔

اصدق عبدالقیوم فطرتاً وہ شخص تھا جو فیملی مین ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے گھر اپنے شہر اپنے لوگوں سے دور رہ نہیں سکتے۔

لیکن ارادہ کرنے میں انسان بااختیار ہے پر عمل کروانے والا مختار اپنی ڈھب سے چلتا ہے۔

اس کے پاس ہر شے طے شدہ ہوتی ہے۔ ہمیشہ۔

✡ ✡ ✡ ✡

جیب میں پیسے گنتی کے ہوں تو ناک کی سیدھ میں چلنا سب کو آتا ہے۔ ذہن واضح۔۔۔ ٹارگٹ پر نگاہ۔ خریداری اور گھر واپسی۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں۔۔۔ چٹکی بجا کر۔۔۔

مگر۔۔۔

اصدق کا بتایا ٹارگٹ، منصوبہ، خیال پیش بندی سب کو مد نظر تھی مگر ایک ہلکا پن اک عجیب سی بے نیازی و بے فکری ہر جنبش پر بولنے لگی تھی۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمیشہ سے تھا مگر ایک تبدیلی ماحول میں رچنے لگی تھی۔ گفتگو میں، لباس میں، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں۔۔۔ طرزِ زندگی بدل رہا تھا۔

اصدق نے دو سال بعد گھر لوٹ کر جس طرح اپنی بہن عارفہ کی خواہش پوری کیں۔ جس شان و شوکت سے بہن کو بیاہا، وہ سب کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اس نے اسٹور کے لیے بہت اچھے فیصلے کیے۔ وہ سب ہی کے لیے تحائف لایا تھا۔ منہ مانگے بھی اور اپنی پسند سے بھی۔۔۔

وہ سب پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا مگر بعض لوگ محبت کا خراج مانگتے ہیں۔

ناعمہ نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس نے بچے آگے کر دیے۔ خواہشوں کو ضرورتوں کا روپ دے کر بچوں کے منہ سے کہلوانا شروع کر دیا۔ وہ اب اپنے اماں ابا سے کچھ نہ کہتی تھی۔ یونہی باتوں باتوں میں سرسری سا عتیقہ خالہ کا عبدالقیوم چچا کے کانوں میں کچھ بھی انڈیل دیا۔ جلد یا بدیر مگر بات پوری ہو جایا کرتی۔

دوسری جانب عائزہ تھی۔ وہ دھڑلے سے کچھ بھی مانگ لینے کو حق کہتی تھی۔

وہ سب محفل جمائے بیٹھے تھے۔
جب عائزہ نے ذکر چھیڑ دیا اس کے سرتاج کو موٹر سائیکل کی ضرورت ہے۔ موجودہ بائیک بہت زیادہ تنگ کرنے لگی ہے۔ اگر امی ابا لے دیں تو۔۔۔
''بیٹا ابھی تو ہم عارفہ کی شادی سے فارغ ہوئے ہیں۔۔۔ تھوڑا صبر کرو، اسی کو ٹھیک کرواؤ۔۔۔ ابھی تو ہم سب کا ہاتھ تنگ ہے۔''
''لو تو آپ کو کون کہہ رہا ہے اسٹور سے رقم نکالیں۔ کریں نا اصدق کو فون کہ وہ پیسے بھیج دے۔''
عبدالجبار اور حسنہ بیگم ہیں ہیں کرتے رہ گئے۔ آنکھوں سے اشارے کیے کہ چپ رہے مگر آگے عائزہ تھی۔
''اشارے کس بات کے کر رہے ہیں آپ لوگ۔۔۔؟ بھائی کہتا ہے نا سب کو۔۔۔ تو بھائی بن کر دکھائے۔۔۔ عارفہ کے لیے تو پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔''
''بیٹا! اس کی شادی تھی اور شادی پر تو۔۔۔'' عتیقہ بیگم کے لب کھلے۔
''ہماری شادی کو تو شادی کی طرح نہیں منایا گیا تھا۔ بس کھینچ تان کے پورا کیا جا رہا تھا پھر وہی بات کہ وہ اپنی سگی بہن تھی اور ہم بس نام کو۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ گھسیٹیں گے زندگی کو۔۔۔ پہلے ہی گھسیٹ رہے ہیں۔''
''ایسی کوئی بات نہیں بیٹا! بس وہ اصدق ابھی ابھی گیا ہے نا۔۔۔ نیا معاہدہ ہونے میں کچھ دن لگ گئے۔ ڈیڑھ ماہ تو جاب لیس رہا ہے۔''
چچا عبدالقیوم کی زبان بھی ناکردہ گناہ کی صفائی دیتے ہوئے لڑکھڑا گئی۔
''فائزہ کو تو چوڑیاں بنوا کر فوراً بھیج دیں۔ تب نہیں تھا جاب لیس؟ ہاں بھئی ایک جانب بہن، دوسری جانب بیوی۔'' وہ ہاتھ نچا نچا کر بول ہی گئی۔ وہ ہمیشہ کی منہ پھٹ تو تھی مگر اتنی دیدہ ہوائی ہوگی۔
اصدق نے سب سے پہلے خرچا بھیجنے سے بھی پہلے فائزہ کے لیے چوڑیاں بھیجی تھیں۔
''بیٹا! تم جانتی تو ہو کن حالات میں شادی ہوئی۔ فائزہ تو اتنی صابر شاکر ہے اصدق ہی کو فکر لگ گئی ورنہ فائزہ نے کب کیں ایسی فرمائشیں؟'' عتیقہ بیگم نے فائزہ کے اڑتے رنگ کو دیکھ کر صفائی دی۔
''ہاں ایک میں ہی بے صبری اور ناشکری ہوں۔'' وہ اپنی چوڑیوں پر نگاہیں جمائے سر جھکائے مجرم بنی فائزہ کو دیکھ کر اب اور بھڑکی۔
''ٹھیک ہے بھئی! آج پتا لگ گیا۔ بھائی ماں جایا ہی ہوتا ہے۔ کوئی لاکھ کہے یقین دلوائے کبھی اعتبار نہ کرنا۔ سب سراسر لفاظی ہونہہ!''
وہ پتھر جیسے جملے پھینک کر خود پیر پٹختی روانہ ہوگئی۔
سب ہی ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے بیٹھے تھے۔
عبدالقیوم ہی اٹھے۔ وہ فون پر اصدق سے کہہ رہے تھے۔
''فوری طور پر پیسے بھیجو۔ شاہد کو بائیک لے کر دینی ہے۔''
وہ شاید کچھ کہہ رہا تھا، اللہ جانے کیا؟ عبدالقیوم بہت تحمل سے اسے سن رہے تھے۔
''تمہاری ساری بات درست ہے اصدق۔۔۔! مگر میرا تقاضا اب بھی وہی ہے۔''

انہوں نے فون رکھ دیا۔

✿✿✿✿

''ابھی تو وہ مل کر گیا۔ پیچھے بیوی بچے بلوا لیے کہ دل نہیں لگ رہا تھا۔ وزٹ ویزا۔۔۔ اور اب نئی سننے کو مل رہی ہے کہ وہ کوشش کرے گا کہ فائزہ مستقل وہاں رہے اور آپ غلطیوں پر غلطیاں کر رہی ہیں۔ ہونہہ!'' نائمہ ٹہل ٹہل کر مسلسل بول رہی تھی۔ حسنہ بیگم کو اس بلاسبب غصے کی وجہ سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

''اف امی!'' وہ دھپ سے بیٹھ گئی۔ ''آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھ لیتیں کہ فائزہ کو یہیں رہنا چاہیے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

''لیکن کیوں؟'' حسنہ بیگم نے بھی اسی کے سے انداز میں کہا۔

''امی!'' اس نے محتاط انداز میں چہار اطراف دیکھا۔ تسلی سے تو وہ خیر بیٹھی تھی۔ وہ ماں کے نزدیک کھسک آئی۔

''پتا ہے آپ کو دبئی جیسے علاقے میں بیوی بچوں کے ساتھ رہنا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ پاکستانی لاکھوں ہوں تو وہاں متوسط طبقے والی رہائش رکھ سکتا ہے بندہ۔''

''ہاں تو اصدق بھی ماشاءاللہ ڈھیروں کما رہا ہے۔'' حسنہ بیگم نے اسے ٹوک کر بڑے فخر سے کہا تھا۔ بے وقوف نائمہ۔۔۔ ہونہہ۔''

''میری سیدھی ماں۔۔۔ اف!'' نائمہ نے سر پیٹنے سے خود کو بمشکل باز رکھا۔ ''وہاں کے کمائے درہم کو یہاں اڑانے میں مزا ہے۔ وہیں کما کے وہیں لگانے ہوں نا تو آٹے دال کا بھاؤ پتا لگ جاتا ہے۔ ہوش ٹھکانے آ جاتے ہیں۔

حسنہ بیگم کی آنکھیں پھیلیں پھر کچھ دھیان آیا تو چہرے پر خفگی سی آٹھہری۔

''میری فائزہ صابر شاکر۔۔۔ سلیقے طریقے والی۔۔۔ کرے گی گزارا۔۔۔ سلائی کڑھائی میں ماہر ہے۔ میں نے تو سنا ہے وہاں کی عورتیں، مرد درزی سے کپڑے نہیں سلواتیں۔۔۔

''اچھا تو اب فائزہ کو درزن بنائیں گی آپ؟'' اسکول کی نوکری پر تو ہزار باتیں کرتی تھیں۔'' نائمہ نے بہت برا منہ بنایا جیسے درزن ہونا خدانا خواستہ۔۔۔

''میں نے ایسا کب کہا'' امی کو برا لگ گیا۔ ''اور میری فائزہ تو پڑھی لکھی ہے۔ وہ اپنے حساب سے کام کرے گی۔ بوتیک کھول لے گی اور۔۔۔''

''کیا وہ آپ کو بتا کر گئی ہے۔ سب طے کر لیا کیا۔۔۔؟'' نائمہ نے دفعتاً چونک کر ماں کی صورت دیکھی۔

''نہیں بھئی۔۔۔ یہ تو مجھے یونہی خیال آ گیا۔ وہ ٹی وی کے پروگراموں میں بتاتے ہیں نا'' حسنہ بیگم نے سادگی سے بتا دیا۔

''اچھا اب چھوڑو ان باتوں کو، میں تو اللہ کا شکر کر رہی ہوں کہ چلو ذرا دیر ہی سے سہی دونوں کو ایک ساتھ وقت گزارنے کا موقع تو ملا۔ شادی ایسی آپا دھاپی کے عالم میں ہوگئی۔ پھر بچوں کی دفعہ آیا تو فائزہ بستر سے لگی پڑی تھی اور ہلکان۔۔۔ اب دونوں ساتھ رہ رہے ہیں۔ محبت بڑھے گی ایک دوسرے کو سمجھیں گے۔ بیاہتا کا کیا کام کہ وہ اتنے اتنے عرصے میاں کا منہ دیکھنے ہی کو ترس جائے۔'' حسنہ بیگم کی

باآواز بلند خود کلامی کو ناعمہ نے جلبلاتے ہوئے سنا تھا۔
''محبت کی تو آپ رہنے دیں۔ وہ پہلے ہی بہت ہے۔'' ناعمہ نے ناگواری ولاپروائی سے ہاتھ چلایا۔''اور زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ کوئی ایک دو سال کی کہانی نہیں۔۔۔ ساتھ ہی رہنا ہے انہیں۔ اِدھر رہیں یا اُدھر۔۔۔ مگر امی یہ چند سال۔۔۔ فائزہ کو اِدھر ہی رہنے دیں اور اصدق اُدھر ہاتھ پیر مارے۔۔۔ آج جوانی ہے تو کمالے گا بچت بھی ہوگی تو کل کو سکھ سے کھاتے رہیں گے یہ کیا کہ اس ہاتھ کماؤ اور اس ہاتھ لٹاتے جاؤ۔ وہ بھی اندھا دھند۔''
''کون سی مصیبتیں تباہیاں آرہی ہیں۔ دو بوڑھے ماں باپ ہیں۔ بہن کو عزت سے بلکہ شان و شوکت سے بیاہ دیا۔ چھوٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ پیچھے کیا بچا۔ فائزہ اور دو بچے۔۔۔ وہ بھی ماشاءاللہ سے بیٹے۔۔۔ خوب گزرے گی عزت وقار سے۔۔۔ اللہ تنگ ہاتھ سے بچا کر رکھے۔''
''بہت اچھے ماں۔۔۔!'' ناعمہ نے آنکھیں نچائیں اور دانت کچکچائے۔
''بڑا ہی سیدھا حساب رکھا آپ نے، سبحان اللہ۔۔۔ بے عیب، مجھے یہ بتائے کہ اس سارے میں ہم سب۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ لوگ یعنی۔۔۔ فائزہ، رائحہ ان کا کیا ہوگا؟ انہیں کیسے بیاہیں گی آپ۔۔۔ اس اسٹور سے جو پہلے ہی سسک سسک کر چلتا ہے اور وہ بھی چچا کی شراکت کا۔۔۔ اس سے گھر چلائیں گی۔ بڑھاپے کا آسرا بنائیں گی یا بیٹیوں کو دیکھیں گی۔۔۔ آیا کچھ سمجھ۔''
''اصدق کرے گا نا۔۔۔ اس نے خود کہا ہے۔ وہ زائرہ رائحہ کو عارفہ سے بھی اعلیٰ طریقے سے بیاہے گا۔ اصدق زبان کا پکا ہے اور چھوڑو اس بات کو، فائزہ کے وہاں رہنے سے اس سب کا کیا تعلق۔''
''فائزہ ہی کا تو تعلق ہے امی۔۔۔! فائزہ وہاں رہنے چلی گئی تو چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پائے گی۔ شادی کرنا تو دور کی بات۔۔۔ وہ تو شرکت سے بھی جائے گی۔ بھیج دے گی عین ٹائم پر ایک ڈنر سیٹ، دو سوٹ اور بیڈ شیٹس کا جوڑا۔''
''لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی۔ میری فائزہ ایسی نہیں ہے۔ بڑی ہی ایثار پسند، بھولی بھالی، محبت کرنے والی۔''
''مگر آپ اس چیز کو سمجھیں کہ وہ کرنا بھی چاہے گی تو کر نہیں پائے گی۔ کہاں سے کرے گی بچت۔۔۔ وہاں کی کمائی وہیں لگائے گی۔ ادھر خالہ، چاچو اور آصفہ کا خرچا تو ذمہ داری ہے سو نبھانی پڑے گی۔
چند سال ایسے ہی چلتے رہیں کہ جیسے چل رہے ہیں تو سارے مسئلے حل ہوں گے۔ آپ بہت بھالی ہیں امی۔۔۔! میرا رشتہ آسانی سے آ گیا۔ سیدھے سادھے لوگ تھے انہوں نے نہیں دیکھا گھر کیسا ہے، در و دیوار کا کیا حال ہے۔ بس لڑکی سے غرض رکھی۔
عائزہ کو شاہد نے پسند کر لیا سو باقی چیزیں ثانوی ہوگئیں اور عارفہ کا تو رشتہ دو دوستوں میں بچپن ہی سے طے تھا لیکن اب آگے کا زمانہ۔۔۔ خاندان میں دور پرے تک زائرہ رائحہ کے لیے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ غیروں کو رجھانے کے لیے گھر کا حلیہ اچھا ہونا ضروری ہے۔ پھر ان کی شادیاں اور دیگر اخراجات۔ فائزہ وہاں رہ گئی تو کہانی یہ ہوگی کہ آپ کی ایک بیٹی تو عیش کر رہی ہوگی اور باقی حسرت پال رہی ہوں گی میرا مطلب۔۔۔ زائرہ، رائحہ۔۔۔

''تو اب ہم کیا کریں۔۔۔ کیا کرنا چاہیے؟'' حسنہ بیگم کو انکشافات نے شل کر دیا تھا۔ اتنی بھیانک منظر کشی کی تھی ناعمہ نے۔۔۔

''کرنا ورنا کچھ نہیں ہے۔ بس آپ فوری طور پر فائزہ کو بلوالیں۔'' ناعمہ نے وہ بات کہہ دی جس کے لیے اس نے گھنٹوں مغز ماری کی تھی۔

''لیکن میں کیا کہہ کر بلواؤں کون۔۔۔ سی بات؟'' حسنہ بیگم نے بچوں کی سی معصومیت سے ناعمہ کا چہرہ دیکھا۔

''آپ کو فائق شائق یاد نہیں آتے؟'' اس نے دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا تھا۔

''اے لو، وہ بھولتے ہی کب ہیں، یہ کیا بات کردی۔'' حسنہ بیگم کی آنکھیں یک بیک بھر آئیں۔

''بس آپ بیمار پڑ جایئے۔۔۔ رونا ڈال دیں۔۔ اتنا دبال پڑ جائے کہ فائزہ خود الٹے قدموں دوڑ پڑے۔ بس جو ہم کہیں خاموشی سے کرتی جائیں۔''

''ہم۔۔۔ ہم کون؟'' حسنہ بیگم ہم کے صیغہ پر چونکی تھیں۔

''افوہ امی۔۔۔! ہم مطلب میں اور عائزہ۔۔۔''

''تو۔۔۔ تو کیا عائزہ بھی وہ سب کہہ رہی تھی۔'' حسنہ بیگم کی حیرانی کی حد نہ رہی۔

''ہاں امی! عائزہ بھی۔'' ناعمہ نے اپنے دکھتے جبڑے کو ہاتھوں سے دبایا تھا۔

✡ ✡ ✡ ✡

کچھ لوگ فطرتاً حاسد ہوتے ہیں۔۔ بے یقین، بدگمان، بدنیت۔۔۔ تنگ دل اور تنگ نظر اور عائزہ انہی سب خوبیوں کی مالک تھی اور اس پر بعد کے حالات نے اسے منتقم مزاج بھی بنا دیا وہ خود نا خوش ہے نا آسودہ ہے تو کوئی اور کیوں۔۔۔

کسی بھی مسکراتے انسان کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ ہنستے کو دیکھ کر بلا وجہ ہی نتھنے پھولنے پچکنے لگتے۔

پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ فائزہ کی خوشیاں دیکھ لیتی۔ ہاں بھلے وہ سگی بہن تھی۔

اصدق اور فائزہ کا ایک دوسرے کی جانب ملتفت ہونا ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب عائزہ اصدق کو کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی اور فائزہ کو بھی۔۔۔ فائزہ کی سادہ دلی، مروت، نرمی، احساس مندی کو فقط بے وقوفی کہہ دیتی تھی۔ پھر ایک اچھے گھر میں رشتہ ہو جانے کے بعد تو اسے سب ہی حقیر نظر آنے لگے۔ ایک شخص اسے خود سے پسند کر کے بیاہ لے گیا تھا۔ اس فخر سے ابھرنے میں اسے بہت وقت لگ گیا۔ شاہد نے اسے پسند کرنے میں اپنی مرضی چلائی تھی تو زندگی کے ہر معاملے میں بھی وہ اپنی پسند کو اولیت دینے کی فطرت رکھتا تھا اور اسی پسندیدگی میں ایک شے ہڈحرامی بھی تھی، آرام طلبی۔

وہ نائن ٹو فائیو کی ایک ملازمت کو حاصل سمجھ کر خوش تھا اور چاہتا تھا کہ عائزہ بھی اس خوشی کو جی بھر کے منائے۔ اور شادی کے سال ڈیڑھ سال تک عائزہ بھی مست رہی مگر جب فیملی بڑھنے کا وقت آیا اور اس نے سوچا کہ وہ بڑے آرام سے اس وقت کو گزارے گی اور بچے کو بہت مزے سے پالے گی تب اسے احساس ہوا کہ آرام سے پالنے اور مزے اڑانے کے لیے شاہد کی آمدنی بہت ہی کم ہے۔

"شاہد کوئی اچھی نوکری تلاش کرو۔" اس نے حل پیش کیا۔
"برائی اس میں بھی کیا ہے۔ میں مطمئن ہوں۔ گھر سے نزدیک ہے۔ عزت ہے، کام بھی میری پسند کا ہے۔ شام ڈھلے ہی گھر واپسی اور کیا چاہیے۔"
"برائی یہ ہے کہ ہماری ضرورتیں اس آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں۔ اچھا چلیں اسے نہ چھوڑیں تو پھر شام کے بعد کچھ پارٹ ٹائم دیکھ لیں۔"
"پاگل ہوئی ہو۔۔۔ سارے دن کی خواری کے بعد گھر لوٹو اور پھر دوبارہ کمر کس لو۔"
فائزہ بھونچکی رہ گئی۔
"دنیا کیا نہیں کرتی بہترین معیارِ زندگی کے لیے۔"
"تم نوکری کیوں چھوڑ رہی ہو؟"
"میں اس حالت میں نوکری کیوں کروں؟" وہ چلائی۔
"حالت۔۔۔ کیا مطلب؟ تم کوئی بیمار ہو؟ ایک نیچرل چیز ہے اور دوسرے اپنے خرچے محدود کرو۔"
"کیا؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ تو پورا پلان ترتیب دے کر میاں کے پاس بیٹھی تھی۔
مگر ادھر طمانیت اور قطعیت کا عالم۔۔۔
اور یہ بحث آغاز تھا۔
عائزہ میں بے صبری تھی۔ وہ جلد ہتھے سے اکھڑ جاتی۔ وہ کم پر ٹھہرنے پر تیار ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اب تو اسے ہر شے کا تقابلی جائزہ لینے کی عادت پڑ گئی تھی اور مقابل ایک ہی بندہ تھا یا۔۔۔ چلو دو بندے، اصدق اور فائزہ۔
"تم باہر جانے کے لیے کیوں نہیں ٹرائی کرتے شاہد! اب اصدق کو دیکھو۔" وہ شروع ہوئی۔
"اصدق۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔ وہ تو بے وقوف ہے۔ کون چھوڑتا ہے اس کی طرح گھر کا عیش و آرام۔۔۔ اور چلو چھوڑ بھی دیا تو ٹھیک ہے۔ بیاہ تو دی اس نے اپنی بہن، ایک وہ چھوٹی مگر اب تائے کی بیٹیوں کو بھی ٹھکانے لگائے گا۔۔۔ یار پاگل صرف پاگل خانے میں تھوڑی ہوتے ہیں۔۔۔ ہاہاہاہا۔" وہ اتنا بے حال ہو کر ہنسا کہ عائزہ کی ہیں ہیں کرتی چیخ بھی دب گئی۔
شاہد کی آرام طلبی نے اسے ایک چھوٹا سا گوشت کا ڈھیر بنا دیا تھا جبکہ جدوجہد مسلسل نے اصدق کو ویسا ہی لونڈا لپاڑا رکھا تھا۔ جینز اور جاگرز میں وہ کہیں سے بھی دو بچوں کا باپ نہ لگتا۔۔۔ عائزہ کے حسد نے نیا رخ بدلا۔
اسے تو کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آیا تھا کہ ایسے ہی آوارہ پھرنے والا اصدق اتنا ذمہ دار نکلے گا اور نوٹوں میں کھیلے گا۔
فائزہ کے چہرے پر پھیلی آسودگی، چاچو اور خالہ کی بے اندازہ محبت۔۔۔ اس کے عیش و آرام۔۔۔ اس کے بچوں کا اچھا اسکول۔۔۔ اصدق نے خود آ کر بیٹوں کا ایڈمیشن وہاں کروایا جہاں کبھی وہ خود پڑھنا چاہتا تھا۔
اس کے بچوں کا لباس، خوراک، دودھ کے ڈبے۔۔۔
شادی کے بعد گھر کے بیچ دیوار اٹھا دی گئی تھی مگر فائزہ دونوں جانب چہلیں کرتی۔ وہ بیٹھی تھی مگر بہو والا

پروٹوکول تھا بلکہ کبھی یوں لگتا کہ وہ بیٹی کبھی تھی ہی نہیں۔۔۔وہ لاڈوں نازوں سے لائی گئی بہو ہی ہے۔

عتیقہ بیگم کو تو وہ ہمیشہ ہی سے پیاری تھی۔ وہ اس پر نثار ہونے کو ہمہ وقت تیار رہتیں۔ جو مقام فائزہ کا تھا ہو کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

فائزہ کو ملنے والی اہمیت، اس کی فطری بے نیازی، لاپروائی، بے فکری۔۔ عائزہ کو کس کس طرح کلساتی تھی۔ یہ بیان کرنا مشکل۔۔

یہ سب اسی کو کیوں ملا۔۔اسے یعنی عائزہ کو بھی تو مل سکتا تھا نا۔اور دوسری جانب۔

شاہد نے شادی پسند کہہ کر کی تھی مگر زمانے گزرے وہ اس بات کو بھول گیا تھا یا پھر وہ ایک جھوٹ تھا اور یہاں اصدق کی محبت۔۔۔بے تابیاں، تیار ہوتی، جذبے لٹاتی نگاہیں، وہ بانگ دہل محبت کا اظہار کرتا تھا۔

کون سی منحوس گھڑی تھی جب۔۔۔شاہد نے اسے پسند کیا تھا۔

شاہد اتنا بھی برا آدمی یا نکما نہیں تھا مگر عائزہ کی توقعات بہت زیادہ ہو چکی تھیں وہ ہر چیز کا موازنہ اصدق اور فائزہ کے حوالے سے کرتی۔

وہ بے صبری تو تھی ہی زبان دراز بھی ہو گئی اور ایک دن بکتی جھکتی اس گھر سے نکل آئی، بچے ہمراہ تھے۔ تعلق کی ڈور ٹوٹی تو نہیں۔۔۔مگر تن ضرور گئی اور تنی ڈور کے ٹوٹنے میں دیر نہیں لگتی۔

مگر عائزہ کو قطعاً احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی کو مشکل بنا چکی تھی۔ وہ فائزہ کی زندگی کو مشکل ترین بنا دینا چاہتی تھی۔

✪✪✪✪

میاں بیوی کے رشتے میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔

مخلص سے مخلص فرد بھی اس رشتے کے گرد دائرے کی صورت رہ سکتا ہے۔ دائرہ کے اندر کبھی نہیں اور اگر اس رشتے کے دائرے کے اندر کوئی گھس آئے اور وہ دشمن ہو تو۔۔۔

حاسد ہو، خائن ہو، کینہ پرور اور سب سے بڑھ کر مار آستین ہو تو۔۔۔

عائزہ ان دونوں کے درمیان آ کھڑی ہوئی تھی ایسے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

''پہلے کی بات اور تھی امی۔۔۔! اصدق کو خود تو خیال آئے گا نہیں، وہ مرد ہے، مرد ایسی نزاکتوں کا کہاں سمجھتے ہیں۔ گھر میں تین جوان کنواری لڑکیاں موجود ہیں۔ چلو آصفہ کو نہ گنو، وہ اپنی میڈیکل کی سخت پڑھائی کے باعث اِدھر اُدھر دھیان نہیں دیتی مگر زائرہ اور رائحہ بچی نہیں ہیں۔ کیا کیا نہ سوچیں گی کہ ابھی تو اصدق بھائی دو ماہ گزار کر گئے ہیں اب ایسی کون سی آفت آ گئی کہ فائزہ محض دس روز کے لیے جا رہی ہے۔ وہ بھی بچوں کو چھوڑ کر۔'' عائزہ حسنہ بیگم کو کہتی۔

''آنے جانے کا کرایہ خرچہ الگ پھر وہاں رہ کر فائزہ ہی اندھا دھند خرچ کرتی ہے یہ تھیلوں پر تھیلے۔''

''تو میں اب اس سب میں کیا کروں؟'' حسنہ بیگم ناسمجھی سے سوال کرتیں۔

''کرنا ورنا کیا ہے۔ آپ فائزہ کو بلا کر سمجھائیں کہ بہنوں کے جذبات کے بارے میں سوچے، وہ سوچتی تو ہوں گی۔ یہ اصدق بھاگ بھاگ کر تین روز کے لیے بھی کیوں آ جاتا ہے۔ فائزہ بھی آرام سے کہہ دیتی ہے کہ اصدق ہفتہ بھر کے لیے بلوانے کا کہہ رہے ہیں۔ بہن کے جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچتی ہوگی، ہاں

نہیں تو۔" عائزہ جملہ مکمل کر کے کسی ایسے کام میں الجھ جاتی جیسے کچھ بھی نہ بولی ہو اور کچھ نہ جانتی ہو۔
ناعمہ ہم خیال ہوتی، وہ بھی تاسف کی لکیریں اپنے منہ پر کھینچ کر بیچ و پیچ کیے جاتی۔
"اب ایسا بھی کیا چونچال۔"
حسنہ بیگم کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔
"بیٹا! اس طرح اچھا تو نہیں لگتا۔۔۔ گھر میں کنواری بہنیں ہیں پھر یہ بھی سوچو، خوامخواہ اتنا خرچا۔۔۔"
اور فائزہ لب کچلتی جی بھر کے عرق عرق ہوتی اسکائپ پر جاتی۔
"میں کیسے آجاؤں اصدق۔۔۔! آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" اور پھر اصدق کے لاکھ سمجھانے پر بھی اس کی نفی اثبات میں نہ بدلتی۔
"اچھا تو پھر میں آجاتا ہوں، ابھی تین روز کی چھٹی پر۔۔۔"
"نہیں، نہیں۔" وہ بول پڑتی۔ "اتنا خرچ ہو جائے گا۔ آپ پیسہ جمع کریں نا۔"
"اس طرح۔۔۔ اس طرح تو میں شاید زندگی بھر واپس نہ آسکوں۔ یونہی مشقت کرتا رہوں اور ابھی تو میرے سارے کام باقی ہیں۔ زائرہ، رائحہ کی شادیاں اور آصفہ کی میڈیکل کی پڑھائی۔۔۔ اتنی اچھی لڑکیاں تو ہیں پھر آخر اب تک ان کے رشتے کیوں نہیں ہوتے؟"
فائزہ چپ رہ جاتی۔ اتنی رشتے والی مائیاں گھر کے چکر کاٹتی تھیں۔ اب تو ہر شے ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ مگر بات آگے بڑھتی ہی نہیں۔
جواب یہ تھا کہ زائرہ، رائحہ نے اپنا معیار بہت بلند کر لیا تھا۔ گھر ذاتی ہو اور بہت بڑا ہو۔ علاقے کے سب سے پوش ایریا میں ہو۔ اعلا تعلیم یافتہ ہو اور سب سے اہم کسی گملے میں اگا یعنی آگے پیچھے کم سے کم رشتے دار ہوں۔ اسمارٹ ہو۔"
ان کو بھی فائزہ کی خوش حالی رشک میں مبتلا کرتی تھی۔
دوسری جانب آصفہ نے ڈاکٹری پڑھنے کی فرمائش کی تھی۔
سب نے ہنس کر ہامی بھری تھی۔ آٹھویں کلاس کے بعد نویں میں جاتے وقت ہر بچہ سینہ تان کر ڈاکٹر اور انجینئر بننے کا اعلان کرتا ہے۔
مگر ایف ایس سی پاس کرنے میں دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔
اور انٹری ٹیسٹ۔۔۔ لوہے کا چنا۔
حیران کن بات یہ ہوئی آصفہ نے ایف ایس سی، انٹری ٹیسٹ مکھن کی ٹکی کی طرح نگل لیا۔
یہ سب گھر والوں کے لیے اور اصدق کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ وہ بھی پڑھنا چاہتا تھا۔ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا مگر حالات نے ساتھ نہیں دیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے بچوں کو بہت بہترین تعلیم دلوائے گا اور وہ جو بننا چاہیں گے، وہ ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔۔۔ لیکن بچوں سے پہلے لاڈلی چھوٹی بیٹی جیسی بہن، پیارا تو تھا۔۔۔
اصدق اپنی بہت سی ضرورتوں، خواہشوں سے پہلوتہی کر جاتا لیکن آصفہ کی ڈاکٹری۔۔۔ نہیں کبھی نہیں۔

گھر از سر نو بنایا جا چکا تھا۔ نوک پلک سے تیار، اسٹور کا شمار اب علاقے کے سب سے اچھے اسٹورز میں ہونے لگا تھا۔

آصفہ کی پڑھائی تو زندگی کا سب سے اہم مقصد تھی۔ وہ اتنے پیسے جمع کر چکا ہے کہ پاکستان جا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔

وہ کوئی پہلے کی طرح خالی ہاتھ تو نہیں۔

ظفر اور دیگر دوست اس کے ہم خیال تھے۔ صائب مشورہ دینے والے لوگ پر خلوص، تنہائیوں کے ساتھی۔۔۔ اور اس نے اپنے اس ارادے سے کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ اسے اپنے گھر والوں کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سب اس سے محبت کرتے تھے، احساس مند تھے۔ احسان مندی کا خواہاں وہ کبھی رہا نہیں جو اس نے کیا وہ اس کا فرض تھا۔ لیکن دوستوں کے تلخ تجربات اور لاکھ پہلو تہی کرنے پر بھی کیا جانے والا مشاہدہ۔۔۔

اسے باور کراتا تھا کہ گھر کے حالات بہت بدل چکے ہیں۔

وہ جیسا گھر چھوڑ کر آیا تھا وہ بدل چکا تھا۔

مادیت پرستی، ظاہری شان و شوکت، مصنوعی قہقہے اسے سب کچھ اوپرا لگتا۔

نائمہ کے بچوں کے تعلیمی اخراجات۔۔۔ نانا، نانی پورے کر رہے تھے۔

عائزہ گھر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اسکول میں ملازمت کرتی تھی مگر اس کی آمدنی اس کے شاہانہ اخراجات سے میچ نہیں کرتی تھی۔ اس نے بیٹی کو اپنے اسکول میں داخل کروا دیا تھا لیکن بیٹے کو فائق، شائق والے اسکول میں۔۔۔

اور اصدق جانتا تھا۔۔۔ اس نے اپنے بچوں کے لیے ایک بہترین مگر مہنگا اسکول چنا ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ کسی کمپرومائز پر تیار نہیں تھا۔

”وہ اپنے ساتھ ہی رکھتی نا بیٹے کو۔۔۔ اس نے کیوں اسکول بدلا۔۔۔ کیسے افورڈ کرے گی وہ۔ کتنی کم تنخواہ ہے اس کی فائزہ۔۔۔!“

”وہ تو چچا ابو افورڈ کر رہے ہیں۔ وہ فیس بھرتے ہیں۔“ فائزہ نے کہا۔

”لیکن کیوں۔۔۔؟ وہ کیوں بھر رہے ہیں؟ اور عائزہ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی، میں باہر سے درہم بھیج رہا ہوں پھر بھی پوری پلاننگ کر کے بچوں کا یہاں ایڈمیشن کروایا ہے۔ تین سال تک کی فیس علیحدہ نکال کر رکھی ہے اور یہ ایک دو بار کا خرچا نہیں ہے۔ تم پہلی فرصت میں عائزہ سے اس حوالے سے بات کرو۔“

فائزہ متامل نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ تم نہیں کر سکتیں تو میں کروں گا۔ سمجھاؤں گا اسے۔“

”ہم اپنے دو بچوں کو افورڈ کر رہے ہیں نا اصدق۔۔۔ ایک بچہ اور سہی کیا فرق پڑتا ہے۔“

کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کرنے سے پڑتا ہے۔۔۔ کرنے سے پڑتا ہے۔“ اصدق نے ہارے لہجے میں کہا۔ ”ایک بار کی بات ہونا تو پتا نہیں چلتا مگر۔۔۔“

ادھر نائمہ کے بچے تو سب سے آگے تھے۔ وہ خود ہی فون کر دیتے۔

ماموں یہ۔۔۔ماموں وہ۔۔۔لیپ ٹائپ اور نیو موبائل جینز۔

✿✿✿✿

فائزہ بے وقوف یا عقل کی اندھی نہیں تھی۔ اپنا اچھا برا سب سمجھتی تھی مگر یہاں مسئلہ تھا کہ وہ اپنے اندر سے جتنی پرخلوص صاف دل تھی۔ وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔

اور اس کی فطرت کی ایسی خوبی یا خامی عائزہ کا ہتھیار تھی۔

ناعمہ پیسے کے جوڑ توڑ میں لگی رہتی تھی۔ اسے فائزہ اور اصدق کی دوری کا ایک ہی فائدہ سمجھ آتا تھا۔

جبکہ عائزہ اپنی ناکام ناآسودہ ازدواجی زندگی کے بعد فائزہ اور اصدق کی نزدیکیاں اور عائزہ کی برداشت کا امتحان تھیں جیسے۔ وہ حسد کا شکار ہوگئی تھی اور دنیا کا سب سے خطرناک دشمن حاسد ہوتا ہے۔

سورہ فلق یونہی تو نہیں اتاری گئی؟

ماں کے آپریشن میں اس نے کراچی کے رہائشی ایک دوست کے ذریعے سارے انتظامات کروائے تھے۔ آخر میں وہ ماں کی محبت میں خود بھی کراچی آ گیا۔

کامیاب آپریشن کے دو دن بعد وہ مسلم آباد کے لیے نکلا، اس نے فون پر زائرہ کو اطلاع دی کہ وہ رات تک گھر آئے گا۔

عائزہ ناعمہ کے بیٹے کے ساتھ کراچی جانے کو تیار تھی۔ نجانے اسے کیا سوجھی۔۔۔اس نے عین ٹائم پر اسکول کی اہم ورکشاپ کا ذکر کر دیا جہاں اس کا کل پہنچنا بہت ضروری تھا۔ قرعہ فال فائزہ کے نام نکلا اور بنا کسی ردوکد کے مان گئی۔

جس وقت اصدق نے گھر میں قدم رکھا تب فائزہ ٹرین کا آدھا سفر کر چکی تھی۔ اصدق بہت خوش تھا کامیاب آپریشن۔

آپریشن کی ٹینشن سے نکلنے کے بعد وہ پرسکون تھا۔ اس نے سوچا وہ گھر جا کر دو تین روز آرام کرے گا۔ پھر فائزہ اور بچوں کو لے کر کراچی واپس آئے گا وہ گھومیں پھریں گے مگر۔۔۔

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اس اتنے بڑے پورے گھر میں کوئی اور نہیں تھا کہ جو تیمارداری کے لیے جاتا۔ فائزہ ہی کیوں؟'' وہ چلایا۔

جبکہ اتنے لوگ تھے۔ تم چلی جاتیں۔ یہ زائرہ، رائحہ تھیں۔''

''میں نے کہا تھا اصدق! وہ کہنے لگی زائرہ، رائحہ کنواری لڑکیاں، انجان شہر۔۔۔''

''تو خالہ امی کیوں نہ گئیں۔۔۔اور تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ زائرہ پر چلایا۔

''میں نے اسے آواز دے کر کہا تھا اصدق۔۔۔! مگر وہ گھر میں ہڑبونگ سی تھی نا'' عائزہ بولی۔

اس نے فائزہ کو فون کیا تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ عائزہ نے تو اس سے کہا تھا کہ تم چلی جاؤ۔ اسی بہانے اصدق بھائی سے بھی مل لو گی اور وہ خوشی خوشی نکل پڑی تھی۔

کس نے کس سے کیا کہا تھا۔ کون سچا اور کون جھوٹا۔ مگر ایک غلط فہمی تو حائل ہوگئی۔ ناراضی اور بدگمانی۔

وہ کیا صفائی دیتی اور کیا صفائی مانگتی؟
وہ اصدق سے خفا ہوگئی۔۔۔اصدق اس سے خفا۔

❁❁❁❁

لیکن یہ چھوٹی موٹی ناراضی ان کے رشتے کے آگے کچھ نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ روٹھنے منانے کا خوب صورت عمل ٹائم مانگتا ہے اور وہی ان کے پاس نہیں ہوتا تھا۔

زائرہ کی شادی کا معاملہ تو نجانے کہاں گیا بیچ میں فارا کی آمد کا اعلان ہوگیا۔ اصدق سمیت عتیقہ بیگم اور عبدالقیوم بھی زیادہ بچوں کے خواہش مند تھے۔

عورت اور مرد کا رشتہ صرف میاں بیوی کا نہیں۔ اس رشتے کے اور بھی پہلو ہیں۔ ماں کا رشتہ، بہن کا رشتہ، بیٹی کا رشتہ۔

نسوانیت کسی بھی روپ میں ہو۔ مرد کی زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔

عمر کے ہر دور میں مرد کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔ ہاں بس اس کے روپ بدل جاتے ہیں۔

اور وہ اصدق عبدالقیوم۔۔۔سالہا سال سے عورت کے بغیر رہ کر پاگل ہوگیا تھا۔

اسے سب سے زیادہ غصہ فائزہ پر آتا۔

اسے سب سے بڑی قصور وار وہی لگتی اور وہ تھی بھی۔۔۔ ہمدردی، لگاؤ سب اپنی جگہ۔۔۔مگر آنکھیں کھلی رکھنے میں کیا حرج تھا۔ اگر اصدق ان کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں تن من دھن لٹا رہا تھا تو کچھ ذمہ داریاں فائزہ کی بھی تو تھیں۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا۔

سب قصوروار تھے مگر سب سے بڑا قصور فائزہ ہی کا تھا۔ فائزہ نے بھی آسان راستہ منتخب کیا۔ پیار لاڈ اٹھاتے رشتے، بچے، بے فکری وہ اپنوں کے درمیان خوش تھی اور مطمئن بھی۔

اور اصدق کو لگا وہ کبھی واپس نہ جاسکے گا۔ وہ ہمیشہ یہیں رہ جائے گا۔ مایوسی اور بے یقینی نے اسے چندرا کے دروازے پر پہنچا دیا۔

چندرا جو عورت تھی۔ جو باتیں کرتی تھی۔ ایسی باتیں جو کبھی کسی نے نہیں کیں اور وہ جو۔۔۔بس سننا چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہے یا کوئی بھی بولتی رہتی۔

اور پھر جو کچھ چندرا نے کہا۔

کیسے کہہ دیا اور اگر کہا بھی تو۔۔۔

چندرا کے منہ سے تو ہمیشہ غلاظت میں لتھڑے الفاظ نکلتے تھے۔

پھر اس دن۔۔۔

آئینہ دکھاتے جملے۔۔۔

لیکن وہ جملے چندرا ہی نے کیوں کہے؟

چندرا کہہ کیسے سکتی تھی۔

❁❁❁❁

”پتا نہیں کہاں کہاں کی عقلیں سمجھاتی رہیں تم لوگ۔۔۔مجھے تو بار بار وہی مثال یاد آتی، یہ سونے کے

انڈے دینے والی مرغی۔۔۔زیادہ لالچ میں اسے ہی ذبح کر دیا گیا تھا میرے دکھ کی انتہا کوئی نہ پوچھے۔۔۔
نجانے کیسی پٹی آنکھوں سے باندھ دی نہ صحیح نظر آیا نہ غلط۔اپنے ضمیر کی ماری ہی سہ سہ ادھ مری ہو گئی میں۔
وہ گھر والوں کی محبت میں اندھی۔۔۔جسے کچھ عقل نہ آئی اور میں بھی غرض کی پتلی۔''
حسنہ بیگم بول رہی تھیں۔
ناعمہ کے چہرے پر افسوس کے ساتھ شرمندگی، پچھتاوا تھا۔خامشی شاید اظہار تھا اور عائزہ کا چہرہ، اس کے تاثرات پہچان میں نہ آتے تھے۔
وہ کچھ غصیلے پن سے ماں کو سن رہی تھی۔حسرت آمیز افسوس پل کو چھب مارتا پھر دوبارہ ''میں کیا کروں'' جیسا تاثر آ جاتا۔
اور فائزہ یونہی اس جانب نکل آئی تھی۔ہر جگہ وہی موضوع گفتگو تھی۔سو ہر جگہ سے اکتا کر اٹھ جاتی تھی۔یہ اس وقت ماں بہنیں کون سا قصہ لے کر بیٹھی تھیں اور اتنی محو سنجیدہ رنجیدہ، مایوس بے بس۔چلو کچھ تو موضوع بدلے۔وہ ان میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھی۔مگر بڑھتے بڑھتے رک گئی۔
یہاں بھی اصدق اور فائزہ کا تذکرہ۔۔۔
مگر۔۔۔
کس انداز میں۔۔۔وہ کیا باتیں کر رہی تھیں۔کیسے لتاڑ رہی تھیں۔
اور یہ سب جو ہو گیا، اس میں حسنہ بیگم کا یا کسی اور کا کیا قصور۔یہ سب تو نصیب میں لکھا تھا اور ہو کر رہنا تھا اس کی بدنصیبی۔۔۔بس۔
اور وہ تینوں تسلی سے بیٹھی تھیں اور بس بولتی جاتی تھیں۔
ساری پلاننگ اور عمل اور طریقہ اور پیش بندیاں اور تادیب کب کیسے کیوں کر۔۔۔سب بیان کرتی جاتی تھیں۔ایک چپ کرتی تو دوسری بولنا شروع کر دیتی۔
اور جب سب کچھ واضح ہو گیا تو پتا چلا۔۔۔
وہ اپنے ہی خونی رشتوں کے ہاتھوں مار کھا گئی تھی۔
خلوص اچھی خوبی ہے مگر عقل کے ساتھ۔۔۔کھلی آنکھوں کے ہمراہ۔
کسی کو کیا الزام دیتی، وہ خود ہر شے کی ذمے دار تھی۔
اور وہ اسے بلاتا تھا۔اسے اپنی مجبوریاں بتاتا تھا۔مگر وہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے اڑا دیتی تھی۔
''ایسا بھی کیا اتاؤلا پن اور بے صبری۔دنیا جہان کے لاکھوں مرد کمائیاں کرنے جاتے ہیں، دور دیس۔اصدق کوئی انوکھا ہے۔'' کبھی دل کے بہت اندر اصدق کی پکاریں دستک دینے لگتیں تو وہ لتاڑ دیتی تھی۔
''ہاں واقعی اصدق بہت عجیب ہی مرد ہے اور کتنا برا لگے گا، شرم آئے گی کہ وہ تین روز کے لیے میاں سے ملنے جائے یا دس روز کے لیے۔''
اور اصدق کی آمد پر بھی۔۔۔ناعمہ یا عائزہ گھورتیں۔
''تم کیا چوتھی کی دلہن بن کر گھومنے لگتی ہو۔گھر میں جوان بہنیں ہیں۔''

کبھی کبھار حسنہ بیگم بھی ہنکارا بھرتیں۔
اور وہ کٹ کٹ جاتی۔ یہ اصدق بھی نا ایک پل کے لیے بھی نظروں سے ہٹنے نہیں دیتے۔ عجیب مرد ہیں۔ ہر شخص کے پریشر سہنے کا میٹر الگ ہوتا ہے۔
اور کچھ نہیں سہ سکتے۔
اور اصدق نہیں سہ سکا تھا۔۔۔ اس لیے۔۔۔ آہ!
اسی لیے آج فائزہ اصدق۔۔۔ اجڑ کر بیٹھی تھی۔ برباد۔۔۔ ہاہ! اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو ہتھیلیوں سے رگڑا۔ کیا آیا اس کے ہاتھ۔۔۔ تہی داماں۔ سب کا سب کچھ سنور گیا۔ بس وہی رہ گئی حساب سود و زیاں کے لیے۔۔۔
''ایک بار اور کہہ کر دیکھ لیتے اصدق!'' اس نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے فریاد کی۔
لیکن اگر وہ کہہ دیتا تو کیا وہ چل پڑتی اس کے ساتھ؟
''نہیں کبھی نہیں۔۔۔'' وہ ہزار بار تو کہہ چکا تھا۔ اشارے کنائے میں بھی۔۔۔ اور صاف صاف بھی۔۔۔ مگر۔۔۔
شادی کے بعد فائزہ کی پہلی ترجیح اصدق کی منشا اور خوشنودی ہونا چاہیے تھی اور اس نے وہی اہم شق بھلا دی۔

❂❂❂❂

''امی کے آپریشن تک سب ٹھیک تھا اور۔۔۔ میرے پاس ہر شے کا پلان موجود تھا مگر۔۔۔ بعد میں خالہ امی کا بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو جانا۔۔۔ میری ساری جمع پونجی ختم ہو گئی۔ میں مزدور ہی تو تھا نا۔۔۔ قطرہ قطرہ سے دریا کرنے والا۔۔۔
میں تو اس سال کے آخر میں واپس آجانے والا تھا۔ مگر اب کیا خالی ہاتھ آتا۔۔؟ پھر سے زیرو۔
اور تمہاری بے اعتنائی، عائزہ کہتی تھی کہ تم۔۔۔ بازاروں میں نوٹ اڑاتی ہو۔۔۔ تمہیں پتا ہے پردیس کی نوکری میں نوٹ ملتے تو ہیں مگر ایسے جیسے بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنا۔ ملے گی ضرور مگر تم نے کبھی بھوسے کا ڈھیر دیکھا ہے؟
میں دن گن گن کر تم لوگوں کے پاس آتا، تمہارے پاس اور تم دامن بچا بچا کر بھاگتیں نجانے کہاں۔۔۔ مجھ سے جان بچاتیں۔ فائزہ! مجھ سے جس نے تمہارے سوا کسی کو نہ دیکھا۔
لیکن پھر وہ چندرا۔۔۔ وہ چندرا تھی۔
لیکن نہیں چندرا سے پہلے ظفر۔۔۔
تمہیں ایک نصیحت کروں، اپنے بیٹوں کے لیے۔۔۔ بلکہ نہیں اپنے بچوں کے لیے۔
ان کے دوستوں پر گہری نگاہ رکھنا۔
نائی کے بیٹوں سے دوستی ہو تو۔۔۔ تو دیگیں بنانی آجاتی ہیں۔
درزی کی دوستی ہو تو۔۔۔ بٹن ٹانکنا آجاتا ہے۔
اور ایسے ہی اگر ظفر کی دوستی ہو تو۔۔۔ سارا خلوص، محبت، دردمندی اپنی جگہ لیکن اگر دوست ظفر ہو

تو۔۔۔آپ شرابی بن سکتے ہیں۔۔آپ زانی ہو سکتے ہیں۔
ہاں!
میں نہیں ہوا۔بچ گیا فائزہ!
اور پتا ہے کیسے؟ تم یقین نہیں کرو گی۔کوئی بھی نہیں کرے گا۔ میں خود ابھی تک بے یقین ہوں کہ ہدایت آئی تو کہاں سے آئی۔
چندرا میری بپتا سن کر بپھر گئی تھی۔پتا ہے اس نے کیا کہا۔
"تمہاری کہانی میں مجھے ذرا ترس نہ آیا۔۔۔کوئی ہندو یا انگریز یہ داستان سنا تا نا۔۔۔تو میں ساتھ ساتھ روتی، کندھا دیتی۔تمہارے لیے کب تھی ایسی کوئی مصیبت؟ یہ تو دوسرے مذہب کے لوگ ہیں جن کے لیے ایک عورت شرط ہوتی ہے، دوسری گناہ، سزا، جرم۔
تم تو نکاح کر سکتے تھے۔ایک نہیں دو۔۔۔دو نہیں تین اور تین نہیں چار۔۔۔۔تمہارا مذہب تو تمہیں آسانی دیتا ہے۔مجھ جیسی کو سب کچھ پتا ہے۔سب ہی پڑھ ڈالا۔۔۔تو تمہیں کیوں نہیں پتا چلا؟ تم نے کیا اپنی کتابیں نہیں پڑھیں؟"
اور ہم واقعی کتاب نہیں پڑھتے۔۔۔ہمیں عیاشی کے لیے چار کا پہاڑہ یاد آ جاتا ہے مگر ضرورت کے وقت کا فتویٰ یاد نہیں رہتا۔
اور چڑھ جاتے ہیں چندرا جیسی کی سیڑھیاں۔
اور میں سوچتا رہا کہ گناہ سے بچ گیا ہوں بس یونہی جاتا ہوں۔
لیکن پتا ہے چندرا نے کہا۔
میں گناہ کر چکا ہوں۔حیرت ہے کہ شعور نہیں رکھتا۔
تم حیران ہو رہی ہونا۔۔۔چندرا اور ایسی۔۔۔باتیں۔وہ ایسی ہی ہے اور میں نے تمہیں سب کچھ لکھ کر تو دے دیا نا۔۔۔میں جب پہلی بار چندرا سے ملا۔اس کا حلیہ، اس کا رنگ روپ۔۔۔اس کا لباس اور اس کی باتیں۔میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔
گناہ گار ہونے سے زیادہ خطرناک یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے گناہ کو گناہ سمجھتا ہی نہ ہو۔
اور میں نے۔۔۔
اور میں نے فائزہ! پہلے اپنے گناہ کو سمجھا اور پھر اس کی سزا کو دیکھا۔
پتا نہیں فرشتوں کے رجسٹر میں کیا درج ہے۔
مگر میں نے گناہ کیا۔۔۔اور اگر چلو دل کی تسلی کے لیے کہہ دوں۔نہیں بچ گیا ابھی کیا نہیں تو۔۔۔فائزہ! اگر یہ سب نہ کرتا تو خدا کی قسم اگلا قدم مجھے گناہ کی دلدل میں گھسیٹ لیتا۔
میں کوڑوں کی مار نہیں سہہ سکتا تھا۔میں رجم و سنگسار ہونا نہیں چاہتا تھا۔کیا تم اس چاہتیں کہ مجھے سنگسار کر دیا جاتا فائزہ؟
اور اس نے صبح فون پر بھی رو رو کر اس سے یہی کہا تھا۔یہی پوچھا تھا۔
اسی لیے۔۔۔اسی لیے فائزہ۔۔۔! بس میں نے اسی لیے دوسری شادی کر لی۔۔۔"

فائزہ نے اس لائن کو ہزار بار پڑھا تھا اور ہر بار اس کے دل میں انی گڑ جاتی تھی۔
وہ اس کے نیچے والی لائن پڑھ ہی نہیں پاتی۔ ذہن کی رو پلٹ جاتی۔
وہ چندرا کے بارے میں سوچنے لگ جاتی۔
مشکی جلد والی ساحرہ۔۔۔ ایک تجربہ کار گھاگ عورت۔۔۔ کیسی دکھتی ہوگی وہ۔۔۔ کیسے جھیلا جائے گا اس کو۔۔۔
وہ ہارے جواری کی طرح آخری لائن پڑھے بغیر خط کو مٹھی میں بھینچ چکی تھی۔

✿✿✿✿

سجے بنے اس کمرے میں آج تاریکی کا راج تھا۔ ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔ یک دم اندر آنے والے کو تو کچھ پتا نہ چلتا مگر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی تھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ہی عکس کو کھوج رہی تھی۔
سیاہ تاریک کمرے میں بیٹھی۔۔۔ سیاہ عورت۔
اس کی نگاہیں اندھیرے سے مانوس تھیں۔ وہ اپنی ہی آنکھوں کو دیکھ کر دکھی تھی۔ بہتی ڈبڈباتی، ویران سوچی نظریں ان کے خالی پن سے اسے خود خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پپڑی زدہ لبوں پر پیاس ثبت ہو چکی تھی۔
وہ بار بار زبان پھیر کر انہیں تر کرتی مگر بے سود۔
ہونٹوں پر نمی تھی۔ آنسوؤں کا نمک۔۔۔ اور زندگی میں مٹھاس پہلے ہی کب تھی۔ تلخی۔۔۔ مگر تلخی کا احساس۔
کیا چلا گیا وہ شخص۔۔۔؟
سچ کہتے ہیں طوائف کو دل نہیں لگانا چاہیے مگر اس نے دل تو نہیں لگایا تھا بس خود بخود ہی نجانے کب۔۔۔ کیا ہو گیا اور کیوں۔۔۔
طوائف کو انتظار نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ کوئی آتا ہے تو آئے اور نہیں تو نہ سہی۔۔۔ رنگ برنگے لوگ گھڑی بھر کے مہمان۔۔۔
یونہی جیسے کوئی چلتے چلتے مل جائے سرِ راہ۔۔۔
ہر رات کی پامالی اتنی اذیت ناک نہیں تھی بلکہ احساس بھی نہیں تھا۔

دہلیز پہ ٹوٹے ہوئے پیالے کی مانند
اک شخص نے پھینکا ہے مجھے پیاس بجھا کے

اور ہمیشہ یہی ہوا تھا چندرا کے گھر پر۔۔۔ پھر اس بار یہ کیا۔۔۔ کہ رونا اس بات کا تھا کہ وہ چھوئے بنا چلا گیا۔
کون تھا وہ؟
کہاں سے آ گیا۔۔۔
راستہ بھٹک جانے والا۔۔۔ پتا نہیں کیوں آ گیا تھا۔ وہ ہنستی بستی خود میں مگن چندرا کی زندگی میں طوفان برپا کر دینے۔
کتنی مزے دار آسودہ زندگی تھی۔

بے فکری، ہنسی، نیند، خوش باشی، وہ من پسند لباس زیب تن کرتی۔ اپنی نیند سوتی، اپنی جاگتی۔ نہ گناہ کا احساس، نہ ثواب کی جستجو۔ زندگی بس جسم تھی۔ روح اور دل نہیں اور دل کے اندر صرف خوشی کا خانہ نہیں ہوتا۔

دل دکھتا ہی ہے۔

اور

چندرا کا دل دکھ گیا تھا۔

کیسا شخص تھا، کہاں چلا گیا؟ دوبارہ لوٹا ہی نہیں اور کتنی بڑی بے وقوفی ہوگئی چندرا تجھ سے۔۔۔ آنے دیتی اسے ایسے ہی۔۔۔ کیوں جھپٹ لینے کا قصد کیا۔ ایک شخص کو دل کے لیے اور آنکھوں کے لیے بھی تو رہنے دیتی۔

کوئی ہو جاتی ہے ایسی بے وقوفی۔۔۔ پورا کا پورا ہڑپ کر لینے کی خواہش۔۔۔ ہمیشہ ہاتھ ملنے پر لے آتی ہے۔

اور باہر دمکتی گنگناتی رات محوِ رقص تھی۔

اور اندر وہ کیا شامِ غریباں منا رہی تھی۔

اور شامِ غریباں ہر روز تو منائی نہیں جاتی تو پھر وہ کیوں سرِ شام بال کھول کر اجڑے اجڑے حالوں میں اندھیرا کر کے اپنے نقش کھوجنے لگتی تھی اور خود کو کوسنے۔۔۔ اور یاد کرنے۔

اور اس شخص کو ڈھونڈ بھی لے تو کیا کرے گی۔ کیا یہاں لے آئے گی۔ کیا اسے اپنے پاس رکھ لے گی؟

مگر رکھ کے کیا کرے گی؟

وہ رکھنے کی چیز ہی نہیں تھا۔

اسے چلے ہی جانا تھا۔

مگر۔۔۔ گیا کیوں؟ اس نے جانے ہی کیوں دیا؟

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اور وہ ہر روز اسی طرح بے آواز روتی تھی۔ مگر رونے سے جانے والے واپس تھوڑی آتے ہیں اور اگر جانے والا اصدق جیسا ہو۔۔۔ جو آیا ہی نہیں تھا۔ بس یونہی خوامخواہ لایا گیا تھا۔ غلطی سے بھٹک گیا تھا۔

بھٹک گیا تھا لہٰذا احساس ہوا تو پلٹ گیا۔

وہ اب زندگی بھر ماتم مناتی رہے۔۔۔ مگر کیا حاصل۔۔۔

چندرا کی زندگی میں کوئی نیکی نہ تھی۔ وہ گناہوں میں یوں لتھڑی تھی جیسے کیچڑ میں ڈبکی کھا کر آئی ہو۔

مگر اصدق کی واپسی کا ایک کارن تو وہ بھی تھی۔

اس کے جملے۔۔۔

اور اللہ ہر شے لکھواتے رہتے ہیں۔ نیکی بھی، بدی بھی، فرشتوں کو سونپ رکھا ہے یہ کام۔

ہاں۔۔۔

مگر فیصلہ خود کرتا ہے تو شاید چندرا کی بھی بخشش ہو جائے۔

دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جائیں، اتنا حق تو وہ رکھتی ہے نا۔

✿✿✿✿

اور خدیجہ بہت اچھی ہے۔ وہ سالوں سے اسے جانتا تھا۔ وہ اس کی کمپنی میں کام کرتی تھی۔ وہ مینٹی نینس ڈیپارٹمنٹ تھا اور وہ لیدر گارمنٹس میں سلائی کرتی تھی اور جب اس کی شادی ہوئی تب بھی وہ اسے دیکھتا تھا۔ خوش، بے حد خوش۔۔۔ اور پھر جب وہ بیٹے کی ماں بنی۔۔۔ تب خوشی اس کے قدموں سے پازیب کی طرح بندھ گئی تھی۔ ہر جنبش پر بج اٹھتی۔

پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بیوہ ہو گئی۔

اس کی بھاری پپوٹوں والی آنکھوں میں غم کاجل کی لکیر کی طرح پھر گیا تھا اور پھر جب اس کا بیٹا ایک حادثے کا شکار ہو کر چٹ پٹ ہو گیا۔ تب ان سوجی آنکھوں میں دکھ سیاہ رات بن کر ٹھہر گیا۔

سفید اسکارف میں اس کا گول گیند چہرہ۔۔۔ اور موٹی آنکھیں جو گالوں میں دھنس کر اور چھوٹی دکھتیں۔۔۔ ناک پہلے عام سی تھی۔ (ہاں اب لونگ کے بعد کچھ بہتر لگتی تھی)

وہ سر جھکائے آتی تھی اور جاتی بھی خاموش۔ اپنے کام میں مگن۔۔۔ تنہا، اداس، بے بس۔۔۔

لیکن اصدق کی زندگی میں شامل ہو کر وہ مسکرانے لگی تھی۔ وہ اب بھی کام کرتی تھی مگر اصدق کی غیر موجودگی میں۔ اسے ملائیشیا میں رہنے والے اپنے بوڑھے والدین کو سپورٹ جو کرنا تھا اور اصدق نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ہاں مگر جب اصدق ہو تو وہ اس کے سامنے ہی رہے۔

اور فائزہ اصدق کے خط کو ہمیشہ ادھورا پڑھتی رہی۔ وہ تصور کی آنکھ سے چندرا کو دیکھتی اور سب باتوں پر یقین کرنے کے باوجود ڈگمگا جاتی کہ اصدق چندرا کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا اور اس لیے اس نے اس سے۔۔۔ وہ تمام حقیقتوں سے واقف ہونے کے باوجود۔۔۔ اس بات پر آ کر متزلزل ہو جاتی۔

چندرا۔۔۔ چندرا۔۔۔

لیکن وہ بھونچکی رہ گئی۔

اسکائپ پر ڈری جھجکی، موٹے موٹے نین نقش والی وہ عورت۔۔۔ وہ تھی اصدق کی زندگی کی ساتھی۔

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ خدیجہ کو دیکھ کر یقین آ گیا۔

زندگی پر پیچ ہوتی ہے۔ اونچے نیچے راستے، پتھر جھاڑیاں، ڈگمگا دینے کی سوتا دلیلیں۔

مگر انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ سب رکاوٹیں ہٹا کر اپنے لیے راستوں کو سیدھا کر لے۔

اور سیدھے راستے کی موجودگی میں گھاٹیوں پر قدم جمانے والے۔۔۔ منہ کے بل گرتے ہیں، منہ اور سر پر خاک پڑتی ہے اور حصے میں آتی ہے لعن طعن۔۔۔

مہم جوئی اچھی بات ہوتی ہے مگر سیدھی سڑک کے ہوتے ہوئے کٹھنائیوں کو راہ گزر بنانے والے ذلیل و خوار ہوں نہ ہوں۔۔۔ بعض اوقات گناہ گار ضرور ہو جاتے ہیں۔

✿✿✿✿